دسمبر 2015

# ماہنامہ کرن

## انٹرویو



## ناول



## مکمل ناول



## ناولٹ



## افسانے




خط و کتابت کا پتہ

کرن

37 - اردو بازار کراچی



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے

## مستقل سلسلے




دسمبر 2015

جلد 38 شمارہ 9

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی



Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com
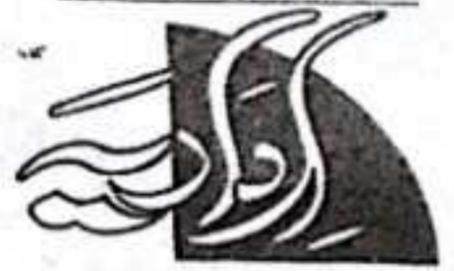
دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
ماہ دسمبر، سال کا آخری مہینہ۔ دسمبر ایک طرف جدائی اور ہجر کا استعارہ ہے اور دوسری جانب نئے آنے والے سال کی امید بھی۔
ماہ وسال کی آمد و رفت کا سلسلہ تو ازل سے لے کر ابد تک جاری رہے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا کھویا اور کیا پایا۔
گزرے ہوئے کل کے آئینہ میں اپنے عمل کا محاسبہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ہم زمانہ شناس بھی تب ہی ہو سکتے ہیں، جب خود شناس ہوں۔ حالات کی تبدیلی ہمارے ہاتھ میں نہیں لیکن کوشش کرنا ہمارا فرض ہے اور انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔
ماہ دسمبر میں بابائے قوم قائد اعظم کا یوم پیدائش ہے۔ صرف یوم پیدائش منانے سے ہی ان کا حق ادا نہیں ہوتا بلکہ ان کی زندگی میں ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ نیک نیتی، ثابت قدمی اور مسلسل کوشش ہی وہ واحد ہتھیار ہیں جن سے ہر جنگ جیتی جا سکتی ہے اور یہ اصول صرف سیاست پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے ہر میدان میں کامیابی کے لیے اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

## شادی مبارک ہو،

شادی ہر انسان کی زندگی کا اہم موڑ اور خوشی ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کرن کی قارئین بھی آپ کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ اپنے رشتہ داروں، دوست احباب کی شادی کا احوال (تصویر کے ساتھ) لکھ کر بھجوائیں۔ ہم شائع کریں گے۔

## سالِ نو نمبر،

جنوری کا شمارہ سالِ نو نمبر ہوگا۔ سالِ نو کی مناسبت سے قارئین سے سروے بھی اس شمارے میں شاملِ اشاعت ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔
1۔ نئے سال کے آنے پر آپ خوشی محسوس کرتی ہیں یا اُداس ہوتی ہیں؟
2۔ گزشتہ سال پڑھی جانے والی "کرن" کی کس تحریر نے آپ پر گہرا اثر چھوڑا؟
3۔ کرن کی مصنفین کے نام کوئی پیغام ان کی تحریر کے حوالے سے۔
اپنے جوابات اور ایک عدد تصویر (اگر دینا چاہیں) ہمیں جلد از جلد روانہ کریں تاکہ سالِ نو نمبر میں شاملِ اشاعت ہو سکیں۔ قارئین اور مصنفین سالِ نو نمبر کے لیے اپنی تحریریں جلد از جلد ارسال کر دیں۔

## اس شمارے میں،

- معروف آسٹرولوجسٹ "علی محمد" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "نمرہ بُچہ" کہتی ہیں "میری بھی سُنیے"، ● "آواز کی دُنیا سے" میں اس ماہ مہمان ہیں ناصر ایمینوئیل،
- اس ماہ شنا شہزاد کے "مقابل ہے آئینہ"، ● تنزیلہ ریاض اور فرحین اظفر کے سلسلے وار ناول،
- نایاب جیلانی، مصباح علی اور زرین آرزو کے مکمل ناول، ● بشریٰ سیال کا ناولٹ "یہ تغافل دل یار"،
- "چلو اقرار کرتے ہیں" حمیرا نوشین کا ناولٹ،
- راشدہ رفعت، رابعہ افتخار، بنت سحر اور دیا شیرازی کے افسانے اور مستقل سلسلے،

## مفت،

کرن کتاب "موسم سرما کا استقبال کیجیے" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیشِ خدمت ہے۔

ستاروں کا جہاں دیکھوں فلک پر کہکشاں دیکھوں
مہ و خورشید میں، ذرّوں میں، مَیں تجھ کو نہاں دیکھوں

تجھے پتھر کے کیڑوں کے لیے رساں دیکھوں
ہوا، بادل، شجر کا، بحر و بر کا حکمراں دیکھوں

گھڑی جب آزمائش کی کہیں بھی ناگہاں دیکھوں
لرزتے قہر سے تیرے میں اپنے قلب و جاں دیکھوں

میں تیری حمد لکھنے کو قلم کاغذ کہاں دیکھوں
کہیں ایک کاش کوئی روشنائی کا کنواں دیکھوں

چرندوں اور پرندوں کو جو نجمہ مدح خواں دیکھوں
تو سجدہ ریز خود کو عجز سے گریہ کناں دیکھوں

نجمہ انصار نجمہ

تُو روحِ ازل، نورِ ابد، جانِ دو عالم
محبوبِ خدا، یوسفِ جاناں دو عالم

تُو حامد و محمود ہے تُو شاہد و مشہود
قائم ترے جلوے پہ ہے ایوان دو عالم

توفیق خدا دے تو تری ایک نظر پر
قربان کروں دولتِ امکان دو عالم

اللہ کے جلووں کا ہے آئینہ تری ذات
آئینہ ترا دیدۂ حیرانِ دو عالم

کعبہ ہے وہی، طالب و مطلوب جہاں ہوں
طیبہ ہے وہی تو ہے جہاں، جانِ دو عالم

دیکھے ہیں ظفر گنبدِ خضرا کے وہ انوار
نظروں میں ٹھہرتی ہی نہیں شانِ دو عالم

یوسف ظفر

# علی محمد سے ملاقات

شاہین رشید

دنیا بھر میں آسٹرولوجی کے علم کو مانا جاتا ہے۔ گو کہ ہمارے مذہب میں اس علم کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ کیونکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ غیب کا علم اللہ ہی جانتا ہے مگر اس کے باوجود لوگ اس علم کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور باقاعدہ اس علم کی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور علم حاصل کرنے کو گناہ کے زمرے میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

علی محمد کا نام بھی اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے عامر لیاقت کے پروگرام نے انہیں پہچان دی ہے مگر ان کی اپنی بھی ایک پہچان ہے کہ ان کی Prediction (پریڈیکشن) تقریباً" 80 فیصد صحیح ہوتی ہیں۔ علی محمد صاحب کا اپنا ذاتی آفس بھی ہے جہاں لوگ ان کے علم سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایف ایم 91 سے بھی ستاروں کے حوالے سے یہ پروگرام کرتے ہیں۔ اپنی بے حد مصروفیات کے باوجود انھوں نے ہمیں ٹائم دیا اس کے لیے ان کا شکریہ۔۔۔۔ آسٹرولوجی کے حوالے سے جو باتیں ہوئیں آپ بھی پڑھیے۔

★ "کیسے ہیں۔۔۔ علی محمد صاحب؟"

☼ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "ہمارے ملک میں کافی آسٹرولوجسٹ ہیں۔ جو پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ کیا اس علم کو باقاعدہ پڑھنا پڑھتا ہے یا آپ آسٹرولوجی کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

☼ "جی آسٹرولوجی باقاعدہ ایک علم ہے۔ ہمارے یہاں Fake (فیک) لوگ بہت ہیں۔ پاکستان میں علم

نجوم کی طرف رجحان بہت ہی کم رہا ہے اور علم نجوم دیکھا جائے تو بہت پرانا علم ہے تقریباً" 8 ہزار قبل "بابل اور نینواں۔" سے اس کی تاریخ ملتی ہے۔ یہ علم حضرت ادریس کو بطور معجزہ دیا گیا بائبل میں بھی اس کا ذکر ہے اور پھر یہ علم کئی سالوں تک چلتا رہا اور مختلف اقوام میں بھی رہا اور باقاعدہ ایک قوم کا تذکرہ بھی ملتا ہے کہ روایت ہے کہ کچھ بچوں کے پاس حضرت عزرائیل السلام آئے اور کہا کہ آپ نے عزرائیل کا

ہے اور انسان خطا کا پتلا ہے غلطی سے پاک صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم علم حاصل کرتے ہیں مگر ہم محتاج اللہ کی ذات کے ہی ہیں اگر ہم کہیں کہ فلاں ڈاکٹر کے علاج سے شفا ملتی ہے ہمیں، تو یہ بھی شرک کے زمرے میں آجاتا ہے۔"

★ "تو اس کے لیے آپ نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہوگی؟"

* "جی بالکل میں نے 2002ء میں بھارت کے شہر
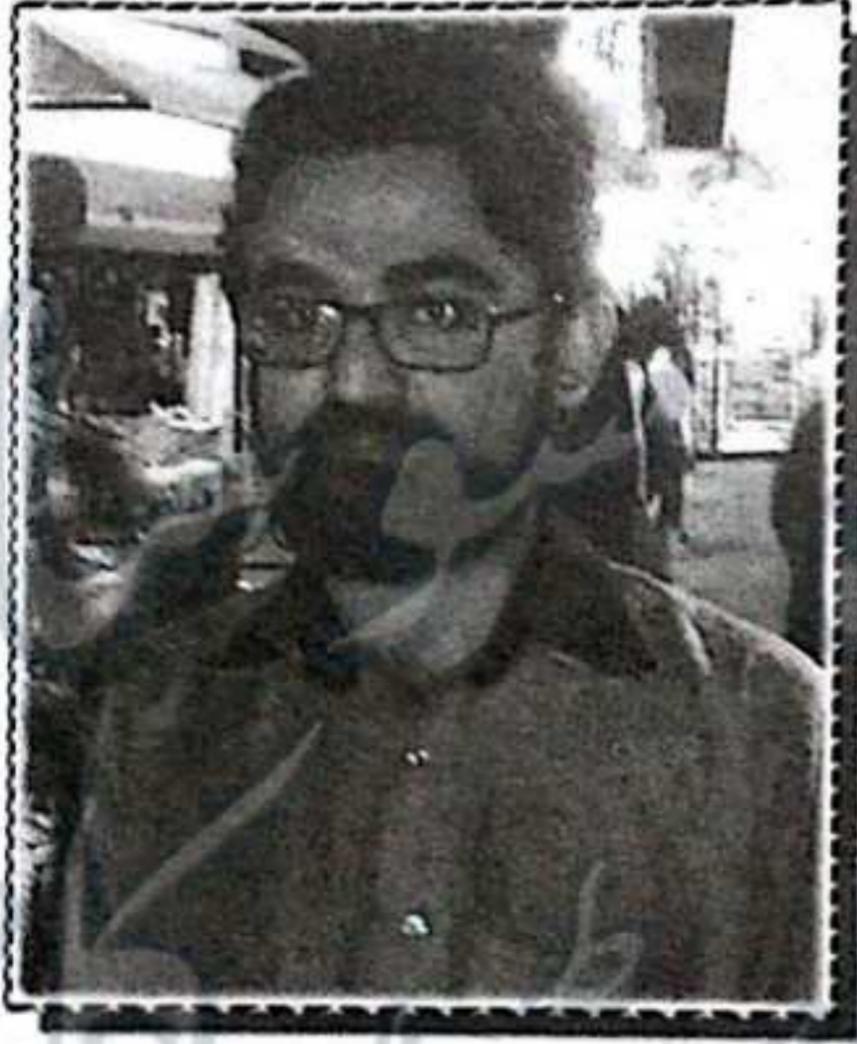
نام سنا ہے تو انہوں نے کہا کہ سنا ہے اور وہ "فرشتہ" ہیں پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں تو حساب لگا کر بتایا کہ وہ سات زمینوں میں نہیں ہیں، سات آسمانوں میں بھی نہیں ہیں۔ پھر حساب لگایا تو کہا کہ چھ زمینوں میں نہیں ہیں ساتویں میں ہیں اور یہیں کہیں قریب میں ہیں اور اس علاقے میں نظر آرہے ہیں، ہم میں سے تو کوئی نہیں ہے شاید آپ ہی ہوں گے.... بات یہ ہے کہ ہر علم کی ایک باؤنڈری ہے اور اس باؤنڈری سے آپ آگے نہیں جاسکتے اور اس کا مثبت استعمال ہوتا ہے آپ کا عقیدہ اللہ کی ذات پہ ہونا چاہیے کہ ہر چیز پہ اللہ قادر ہے ہم "بشر" ہیں اور بشر کے ساتھ "شر" لگا ہوا

"پونا" سے ایک سال کا ڈپلومہ کیا تھا اور خط و کتابت کے ذریعے اور انٹرنیٹ کے ذریعے ڈپلومہ کورس کیا اور الحمدللہ اس میں مجھے کامیابی ہوئی اور اپنے علم سے سب سے پہلے جو پیش گوئی میں نے کی وہ پرویز مشرف صاحب کے بارے میں تھی (جو کہ ایک اخبار میں چھپی) کہ یہ وہ واحد صدر ہوں گے جو اپنی مرضی سے بہت عزت کے ساتھ اور بہت وقار کے ساتھ اور خوشی کے ساتھ اپنے عہدے کو چھوڑ کر جائیں گے اور کچھ عرصہ ملک سے باہر گزار کر واپس ملک میں آئیں گے اور ان کا سیاست میں کوئی بڑا رول نہیں رہے گا اور ایسا ہی ہوا اگرچہ اپنی پارٹی بھی بنائی مگر کوئی بڑا رول ادا

نہیں کر سکے۔ اس طرح سما ئی وی پہ 2013ء میں الیکشن کے حوالے سے میں نے پیش گوئی کی تھی اس وقت پروگرام ہوتا تھا "صبح سویرے صنم بلوچ کے ساتھ" میں نے بتایا تھا کہ نواز شریف حکومت میں آئیں گے اور عمران خان بھی حکومت بنائیں گے اور نواز شریف کو ٹف ٹائم دیں گے۔ اس وقت اس پروگرام میں اور لوگ بھی تھے اس حوالے سے اس سے قبل 2013ء کی جنوری میں میں نے ٹی وی ون سے جنید اقبال کے پروگرام الیکشن کے بارے میں ہی پیش گوئی کی تھی۔"

★ "ریحام خان اور عمران خان کے بارے میں بھی کوئی پیش گوئی کی تھی آپ نے؟"

✻ "عمران خان کے زائچے میں ہی ہے کہ یہ ایک حسن پرست انسان ہیں اور یکسوئی نہیں ہے ان کے کام میں جسے کہتے ہیں ناکہ کسی کام پہ فوکس ہو جانا بہت جلد باز انسان ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی فیصلہ ہو بہت سوچ سمجھ کر اور دور اندیشی سے کرنا چاہیے اور شادی کا فیصلہ تو بہت ہی سمجھ بوجھ کر کرنا چاہیے۔ انہوں نے غلط وقت میں شادی کی جس کا انجام یہی ہونا تھا۔ کیونکہ ستاروں کے حساب سے ان کے لیے یہ وقت درست نہیں تھا۔"

★ "آپ نے کہا کہ آپ نے انڈیا کے شہر پونا سے تعلیم حاصل کی' پاکستان میں کیوں نہیں؟"

✻ "پاکستان کے لیے میں نے آپ کو بتایا کہ ہمارا جو مذہبی حلقہ ہے وہ اسے شرک سمجھتا ہے جبکہ قدیم مسلمان سائنس دان "البیرونی" "جابر بن حیان" "الموسیٰ خوارزمی" اور اماموں میں امام جعفر صادق اس علم میں بہت مہارت رکھتے تھے چونکہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو بہت متنازعہ ہیں اس لیے اسلامی ممالک میں اس علم کو اہمیت نہیں دی جاتی۔"

★ "ہماری ملک میں' ہمارے مذہب میں لوگوں کی اکثریت اس علم کو نہیں مانتی مگر پھر بھی لوگ ...مذہبی لوگ آپ سے رجوع کرتے ہیں؟"

✻ "بالکل کرتے ہیں اور بڑی حیران کن بات بتاؤں کہ کبھی کبھی علماء کرام بھی مجھ سے رابطہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عوام الناس میں اس چیز کو نہیں سمجھا جاتا اس لیے ہم آپ کو ڈیکلیرڈ نہیں کر سکتے کہ آپ صحیح ہیں۔"

★ "لیکن ڈر بھی تو لگتا ہی کہ کچھ بری یا غلط باتوں کا علم نہ ہو جائے؟"

✻ "میں سمجھتا ہوں کہ یہ علم اللہ تعالیٰ پہ ایمان پر مزید پختگی لے کر آتا ہے کہ آپ سب کچھ جاننے کے باوجود کر کچھ نہیں سکتے کہ ہوگا وہی جو آپ کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے کچھ حد تک آپ بدل سکتے ہیں مگر وہ بہت معمولی ہے جس طرح امتحانی پیپر میں غلط یا صحیح کے سوالات ہوتے ہیں اور خالی جگہ پر کرنی ہوتی ہے جو ہمارے اختیار میں ہوتی ہے۔ اس طرح ہماری کہانی جو لکھی جا چکی ہوتی ہے اس میں بھی کہیں کہیں فل ان دی بلینک کی جگہ چھوڑی گئی ہوتی ہے جس میں ہم جنتی یا دوزخی بنتے ہیں وہ جگہ پر کرنے کا ہمیں اختیار ہوتا ہے۔"

★ "لوگ آپ سے کب رجوع کرتے ہیں۔ پریشانی میں یا کسی خاص موقع پر؟ اور کس طرح؟"

✻ "دونوں موقعوں پر کرتے ہیں اور نیٹ سے میرا نمبر لے کر لوگ مجھ سے رابطہ کرتے ہیں کیونکہ نیٹ پر میرا نمبر لکھا ہوا ہے۔"

★ "لوگ شغل میں بھی آتے ہوں گے؟ اور آفس کے علاوہ بھی کہیں بیٹھتے ہیں؟"

✻ "میری فیس چونکہ کافی ہے اس لیے شغل والے لوگ میرے پاس نہیں آتے اور آفس کے علاوہ ایف ایم 91 سے پروگرام کرتا ہوں منگل کی رات بارہ سے دو بجے تک میرا پروگرام ہوتا ہے اور اتوار کی رات بارہ بجے سے رات دو بجے "تک پروگرام ہوتا ہے اور میں اپنے پروگرام میں صاف طور پر یہ کہہ دیتا ہوں کہ میں تفریح کے لیے یہ کام نہیں کرتا اس لیے جو واقعی ضرورت مند ہیں۔ پریشان ہیں وہ مجھ سے بات کریں۔

★ "کونسی بنیادی باتیں ہیں جو ایک آسٹرولوجسٹ کو

پتا ہونی چاہیے؟"
* "بغیر میتھ میٹک کو جانے آسٹرولوجسٹ بن ہی نہیں سکتے۔ کسی بھی جگہ کا طول بلد اور ارض بلند جاننا بہت ضرور ہوتا ہے۔ پھر جس شہر کی آپ بات کر رہے ہوں اس کا لوکل ٹائم آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ پھر اسے اسٹینڈرڈ ٹائم سے منفی کر کے ستاروں کی پوزیشن معلوم کرنی ہوتی ہے جو کہ ہر دن کی الگ ہوتی ہے۔ ہر ستارے کی اسپیڈ جیسے چاند دو گھنٹے میں ایک درجے چلتا ہے اور یوں 29۔30 دنوں میں وہ بارہ برج کراس کر لیتا ہے۔ اس طرح ہر ستارے کے بارے میں مکمل معلومات آپ کو ہونی چاہیے۔"

★ "بچپن میں بچوں کو کچھ نہ کچھ بننے کا شوق ہوتا ہے جو کہ بہت کامن ہوتا ہے۔ آپ کو کیا بننے کا شوق تھا؟.... آسٹرولوجسٹ یا کچھ اور کچھ؟"

* "جب میں چھ سات سال کا تھا تو مجھے پائلٹ بننے کا شوق ہوا مگر بدقسمتی کہ میں سڑک پر گر گیا تو میری "آئی سائیڈ" متاثر ہو گئی تو ظاہر کہ جن کی آنکھیں کمزور ہوں وہ پائلٹ نہیں بن سکتا۔ پھر میرا میڈیکل کی طرف رجحان ہو گیا۔ پھر میں نے گریجویشن کی مائیکرو بیالوجی میں (بی ایس سی مائیکرو بیالوجی) پھر میں نے ایم بی اے کیا فارماسوٹیکل میں اس طرح میڈیسن سے میرا بہت زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ اور کافی عرصہ کام بھی کیا اور پھر میرا رجحان آسٹرولوجی کی طرف ہو گیا اور پریکٹس تو میں 2003ء اور 2004ء سے ہی کر رہا ہوں اور 2007ء کے بعد میں نے اپنی فارماسوٹیکل کی فیلڈ کو خیرباد کہہ دیا اور مکمل طور پر آسٹرولوجی کی طرف آگیا اور اس طرف اس لیے آیا کہ میری جاب بہت ٹف تھی اور مجھے کوئی خاطر خواہ مالی فائدہ بھی نہیں تھا تو اس لیے پھر میں نے فیلڈ بدل لی اور الحمدللہ مجھے یہ فیلڈ راس آئی۔ اب بیرون ملک میرے کلائینٹس بھی ہیں اور میرے اسٹوڈنٹ بھی ہیں۔ جو میری خواہش کے مطابق مجھے فیس دیتے ہیں اور جو باہر سے کرنسی آتی ہے اس کو پاکستانی روپے میں convert(تبدیل) کریں تو اچھے خاصے پیسے بن جاتے ہیں۔"

★ "عامر لیاقت کے پروگرام میں آپ بتاتے ہیں کہ آپ کا آج کا دن کیسا گزرے گا۔ تو ظاہر ہے آپ اپنے بارے میں بھی ضرور جانتے ہوں گے تو اس پروگرام کے ذریعے پتا چلا کہ ایک دن آپ بھی لٹ لٹا گئے تو کیا آپ کو اپنے بارے میں پہلے سے علم نہیں ہوا تھا؟"

٭ ”ہاں مجھے اندازہ تھا کہ آج میرے ساتھ کوئی بڑا حادثہ ہونا ہے۔ اصل میں علم نجوم کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید کوئی فلم چل رہی ہوتی ہے ہمارے سامنے تو ایسا نہیں ہے اصل میں ہنٹس ہوتے ہیں کہ آج کا دن آپ کے لیے اچھا نہیں ہے آپ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے اب میں گھر سے نکلا تو چار لوگ ٹارگٹ کر کے بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے لوٹ لیا... تو دن برا ہو گا اور وہ ہو گیا۔“

★ ”لوگوں نے کہا تو ہو گا۔ تھوڑا بہت مذاق بھی بنا ہو گا؟“

٭ ”جی بالکل لوگوں نے بہت کہا تو میں نے کہا کہ دیکھیں جی میں بھی اللہ کی مخلوق ہوں اور ایک بشر ہوں 100 فیصد تو صرف اللہ کی ذات ہے اللہ نے نقصان لکھا ہے تو ہو کے رہے گا اور فائدہ لکھا ہے تو ہو کے رہے گا۔“

★ ”عامر لیاقت صاحب سے آپ کی کب اور کیسے ملاقات ہوئی؟“

٭ ”عامر لیاقت بھائی کو اللہ تعالیٰ بہت ترقیاں عطا کرے۔ اصل میں میں کسی زمانے میں ”پورٹ گرینڈ“ میں بیٹھتا تھا بہ حیثیت آسٹرولوجسٹ کے عامر بھائی بارہ ربیع الاول کا ایک پروگرام ریکارڈ کرنے پورٹ گرینڈ آئے تو میری ان سے دعا سلام ہوئی اور پھر میں اپنے اسٹال میں آکر بیٹھ گیا۔ پھر جب وہ واپس جانے لگے تو انہوں نے مجھے دیکھا اور میرے پاس آکر بیٹھ گئے ڈاکٹر عامر لیاقت بہت قابل آدمی ہیں اس علم سے **شغف** رکھتے ہیں، علمی گھرانے سے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے نانا بھی نامور نجومی تھے۔ سردار علی صابری صاحب تو عامر بھائی نے مجھے بہت عزت دی اور کہا کہ آ کر ملاقات کریں اور بس پھر ان سے رابطہ رہا اور ان شاء اللہ تا قیامت رہے گا۔ انہوں نے ہی مجھے پروگرام میں آنے کا مشورہ دیا۔“

★ ”آپ ریڈیو سے تو پروگرام کرتے ہیں۔ کسی چینل سے بھی آفر آئی آپ کو؟“

٭ ”اگر کسی اچھے چینل سے اچھی آفر آئے گی ان شاء اللہ ضرور پروگرام کروں گا۔“

★ ”چلیں جی اب آپ چلتے چلتے مجھے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟“

٭ ”میری پیدائش کراچی کی ہے میرے والد ڈاکٹر تھے اور میرے دادا وکیل تھے۔ نانا جج تھے۔ پڑھی لکھی فیملی سے تعلق ہے میرا اور میں جب اس فیلڈ میں آیا تو والد صاحب نے کہا کہ بیٹا اس فیلڈ میں بہت شکوک و شبہات ہیں۔ لیکن جب مجھے ان کی زندگی میں ہی شہرت ملنی شروع ہو گئی تو پھر انہوں نے کچھ کہنا چھوڑ دیا۔ تو میں 27 اگست 1980ء کو پیدا ہوا میری والدہ ہاؤس وائف ہیں اور میرے تین بھائی اور ایک بہن اور میں گھر میں بڑا ہوں۔“

★ ”شادی ہوئی؟“

٭ ”جی الحمد للہ شادی ہو چکی ہے اور میری دو بیٹیاں بھی ہیں اور میری شادی پسند سے ہوئی اور میری بیگم ٹیچر ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بیوی کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے تاکہ وہ بچوں کی تربیت اچھے انداز میں کر سکیں۔“

★ ”کبھی شوبز کی فیلڈ سے کسی اور شعبے میں آفر آئی تو کریں گے کام؟“

٭ ”ضرور کروں گا اگر اچھی آفر آئی تو اور میں جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ اپنا 100 فی صد دوں۔ تو جو بھی اچھی آفر ہو گی اسے اپنا 100 فیصد دوں گا میرا ستارہ ورگو ہے اور ورگو لوگ پرفیکشن کے ساتھ کام کرتے ہیں۔“

★ ”ورگو والے تھوڑی مشکلات میں بھی رہتے ہیں؟“

٭ ”ایسا نہیں ہے اور ہر ایک کا ستارہ اس کی پیدائش کے ٹائم سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے اگر کسی کا ورگو ہے تو سب کے لیے ایک جیسا نہیں ہو گا۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے علی محمد صاحب سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات سے ٹائم دیا۔
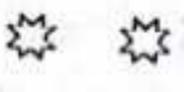
٭ ٭

میری بھی سنیے

# نمرہ بچہ

شاہین رشید
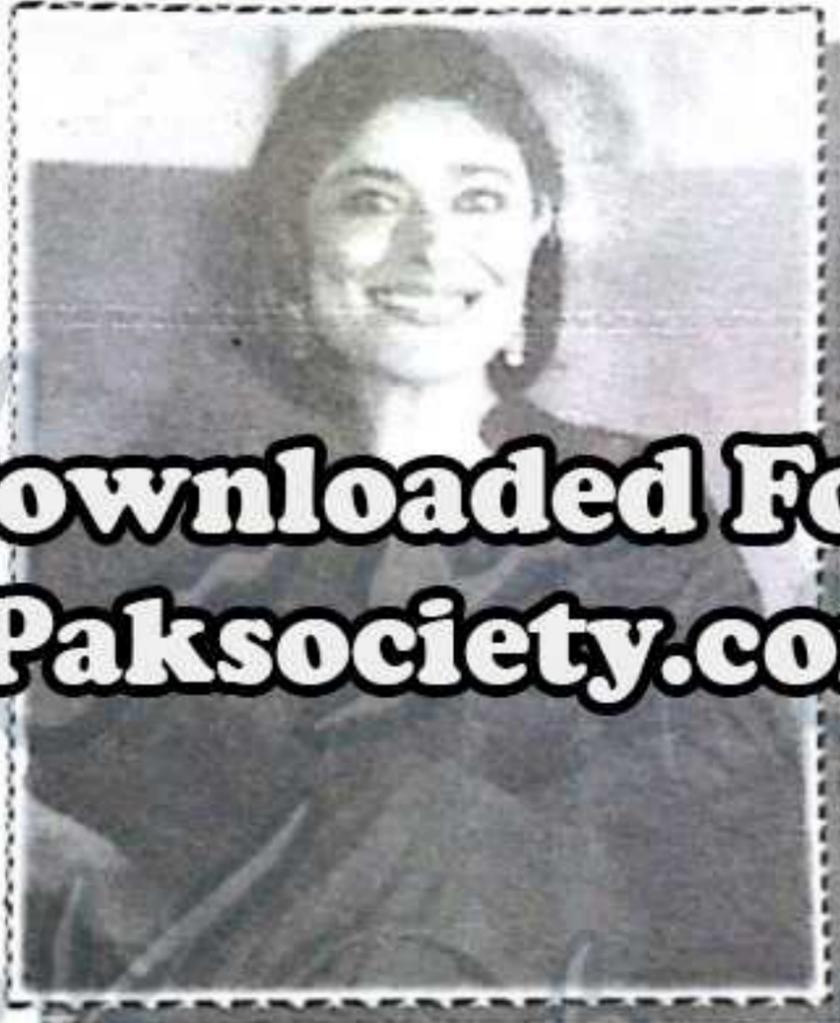


1 "میرا نام؟"
"نمرہ بچہ۔"

2 "پیدائش کا دن؟"
"دن تو یاد نہیں' ہاں مہینہ نومبر کا اور تاریخ 21 تھی۔"

3 "بہن بھائی؟"
"ہم تین بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ میرا نمبر پہلا ہے۔"

4 "تعلیم کہاں سے حاصل کی؟"
"ابتدائی تعلیم کراچی سے اور پھر امریکہ سے۔"

5 "والد کی جاب؟"
"پی آئی اے میں پائلٹ ہیں۔"

6 "شادی؟... بچے؟"
"جی ماشاء اللہ شادی شدہ ہوں... دو بیٹے ہیں بڑے بیٹے کا نام چانن ہے اور چھوٹے کا چنگیز خان ٹیپو ہے یہ نام میرے بڑے بیٹے نے رکھا۔"

7 "دونوں بچوں میں گیپ؟"
"سولہ سال... دیکھ لیں خدا کی قدرت۔"

8 "منٹو کا ریسپانس؟"
"بہت اچھا۔ مگر مجھے مزہ نہیں آیا۔"

9 "بچپن کا پسندیدہ کھیل؟"
"جب چھوٹی تھی تو پارک میں جانا اور درختوں پہ چڑھنے کا بہت شوق تھا۔"

10 ''آج کل کی مصروفیات؟''
''بچے پال رہی ہوں۔''
11 ''اداکاری کا شوق؟''
''جی بچپن سے ہی تھا' کم عمری سے ہی تھیٹر کررہی ہوں اور تھیٹر میں ہی میری پرفارمنس دیکھ کر مہرین جبار نے رابطہ کیا ٹی وی کے لیے اور یوں پہلا ڈرامہ ''دام'' تھا جو بہت زیادہ ہٹ گیا تھا۔''
12 ''کمائی کا عمل شروع ہوا؟''
''جب میں پڑھنے کے لیے امریکہ گئی تھی وہاں ایک پروفیسر کو اسسٹ کیا تھا تو انہوں نے 75 ڈالر دیے تو بس کمائی کا عمل شروع ہو گیا اور پھر باقاعدہ جاب کی ایک میگزین میں تو 6 ہزار تنخواہ لگی۔''
13 ''کم کام کرنے کی وجہ؟''
''گھریلو مصروفیات اور پھر اچھے کرداروں کا نہ ملنا ہے۔ جس طرح کے کردار میں چاہتی ہوں مجھے ملتے نہیں ہیں۔''
14 ''فیوچر پلاننگ؟''
''ان شاءاللہ تھیٹر ڈائریکٹر بنوں گی۔''
15 ''زندگی کا یادگار وقت؟''
''ویسے تو بہت سارے ہیں' لیکن اپنی نانی کے ساتھ جو وقت گزارہ وہ یادگار ہے۔''
16 ''اگر کوئی میرا بیگ کھول لے تو؟''
قہقہہ'' بہت سارا گند بلا ملے گا۔ کام کی کوئی چیز نہیں ملے گی۔''
17 ''بڑے ہو کر کیا بننے کی خواہش تھی؟''
''ڈاکٹر... مگر افسوس کہ بن سکی۔''
18 ''بازار سے خوشیاں ملتیں تو کیا خریدتی؟''
''جو پیارے لوگ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ہیں ان کی زندگی خرید لیتی... تاکہ ان کے ساتھ مزید وقت گزار سکتی۔''
19 ''ایک سوچ جو شرمندہ کردیتی ہے؟''
''جب میں سوچتی ہوں کہ کبھی تو وہ وقت آئے گا جب ہمارا ملک بھی ترقی یافتہ کہلائے گا۔ تو پھر خود ہی شرمندہ ہو جاتی ہوں کہ میری سوچنے سے ایسا کب ہو گا۔''
20 ''کبھی نہیں بھول سکتی؟''
''جب پہلی بار ماں بنی تھی اور پھر ہم نے اس کا نام چانن رکھا جس کے اردو معنی روشنی کے ہیں وہ آیا تو میرا گھر مکمل ہوا۔''
21 ''زندگی کا خوب صورت دور؟''

"سب ہی دور اچھے ہوتے ہیں مگر ہمیں ان کی قدر گزر جانے کے بعد ہوتی ہے۔"

22 "پریشان ہوتی ہوں تو؟"

"خود کو بہت زیادہ مصروف رکھتی ہوں اور دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ اس پریشانی سے نجات دلا۔"

23 "زندگی میں محبت کتنی ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے' بلکہ بہت زیادہ ضروری ہے اور محبت ہی تو سارے کام کرواتی ہے۔ اگر زندگی میں محبت نہ ہو تو جینے کی امنگ بھی نہ ہو۔"

24 "زندگی کونسی بہتر ہے' شادی شدہ یا.....؟"

"زندگیاں تو دونوں ہی اچھی ہیں مگر لڑکیوں کے لیے شادی بھی بہت ضروری ہے۔ شادی سے پہلے والی زندگی میں ذمہ داریاں نہیں ہوتیں مگر شادی کے بعد ذمہ داریاں بہت ہوتی ہیں اور اصل زندگی شادی کے بعد کی ہی ہے جس میں اولاد جیسی نعمت مل جاتی ہے۔"

25 "کیا رشتے بدلے جاسکتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں خاص طور پر وہ رشتے جو خدا بناتا ہے۔ بھلا ہم اسے کیسے بدل سکتے ہیں۔"

26 "شاپنگ میں بارگیننگ پسند ہے؟"

"نہیں بالکل نہیں۔ وقت ضائع ہوتا ہے۔ جو قیمت لکھی ہوتی ہے وہ ہی ادا کردیتی ہوں۔"

27 "کس عادت سے گھر والے چڑتے ہیں؟"

"کہ میں بہت زیادہ سوشل نہیں ہوں۔"

28 "ملک سے باہر رہنے کی خواہش ہے؟"

"بالکل بھی نہیں زندگی کا کافی حصہ باہر گزارہ ہے۔ اب اپنے ملک میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ اپنے ملک سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔"

29 "دل کی مانتی ہیں یا دماغ کی؟"

"جب بھی دماغ سے کوئی فیصلہ کیا غلط ہی ثابت ہوا۔ اس لیے پھر دل کی ہی مانتی ہوں۔"

30 "کوئی کام جس کا ارادہ کرتی ہوں مگر ہوتا نہیں ہے؟"

قہقہہ... "روز سوچتی ہوں کہ اپنی الماری صاف کر لوں اور ہر چیز قرینے سے رکھوں کتابوں کو ترتیب سے رکھ دوں۔ مگر نہیں ٹائم ہی نہیں ملتا۔"

31 "فیشن میں زمانے کے ساتھ چلتی ہوں؟"

"کبھی کبھی زمانے کے ساتھ چلتی ہوں۔ ورنہ تو اپنی مرضی کا ہی فیشن کرتی ہوں۔"

32 "لوگوں کی ایک بات جس پہ مجھے یقین نہیں؟"

"کہ مرد نرم دل نہیں ہوتے۔ میں کہتی ہوں کہ مرد ہی تو نرم دل ہوتے ہیں۔ عورت کے مقابلے میں۔"

33 "میں حیران ہوتی ہوں کہ؟"

"ان سیاست سے وابستہ لوگوں پہ کہ انہیں جب کوئی عہدہ مل جاتا ہے تو وہ کام کیوں نہیں کرتے۔"

34 "دل چاہتا ہے کہ گزرا وقت لوٹ آئے؟"

"نہیں ہرگز نہیں' جو کام ہوتا ہی نہیں اس کے لیے خواہش کیا کرنی اور گزرا وقت تو ویسے بھی کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔"

35 "اپنی شخصیت کے لیے کچھ لفظ؟"

"میں ایک بہت ہی عام سی' سادا سی خاتون ہوں۔ جسے اپنے گھر والوں سے بہت پیار ہے۔"

36 "سینما میں پہلی فلم کونسی دیکھی تھی؟"

"کنگ کانگ' بڑی اسکرین پہ فلم دیکھنے کا پہلا تجربہ تھا۔"

37 "کہاں خرچ کر کے مزہ آتا ہے؟"

"اپنے پیاروں پر' اپنے پر خرچ کروں تو لگتا ہے کہ میں بہت بڑی فضول خرچی کر رہی ہوں۔ اس لیے اپنے اوپر بڑی مشکل سے خرچ کرتی ہوں۔"

38 "غصہ کب آتا ہے؟"

"جب جانوروں پہ ظلم ہوتے دیکھتی ہوں تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ مگر سہ جاتی ہوں' خاموش رہتی ہوں۔"

39 "برداشت نہیں ہوتی؟"

"ظلم و ناانصافی۔"

40 "تھیٹر کا کونسا ڈرامہ کرتے وقت خوفزدہ تھی؟"

"بیگم جان پتا نہیں کیوں۔"

41 "موبائل زندگی کے کتنا ضروری ہے؟"

"ضروری تو ہے' مگر زندگی اس کے بغیر بھی بہت اچھی گزر جاتی ہے۔"

42 "کام کاج سے فارغ ہو کر کہاں جانے کو دل چاہتا ہے؟"

"سچ بتاؤں.... میرا دل تو آرام کرنے کو چاہتا ہے۔"

43 "کیا کام روٹین کا حصہ ہے؟"

"ورزش... باقی کام تو پھر بھی کبھی کبھار چھوڑ دیتی ہوں مگر ورزش نہیں چھوڑتی۔"

44 "گھر سے نکلتے وقت کیا لینا نہیں بھولتی؟"

"بھلکڑ بہت ہوں۔ پھر بھی فون اور پیسے لے جانا نہیں بھولتی۔"

45 "اگر پہلے سے (خدانخواستہ) موت کا علم ہو جائے تو؟"

"تو پھر چاہوں گی کہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنوں کے ساتھ گزاروں۔"

46 "جینا مشکل ہے یا آسان؟"

"یہ تو آپ کی مالی حیثیت پر بھی منحصر ہے اور بہت سی باتوں پر بھی منحصر ہے کہ جینا مشکل ہے یا آسان۔ ویسے یہی کافی نہیں کہ آج کا انسان زندہ ہے۔"

47 "کیا واقعی مرد کی کامیابی میں عورت کا ہاتھ ہوتا ہے؟"

"ضروری نہیں ہے۔ دنیا میں بہت سے حضرات ہیں جن کی کامیابی ان کی اپنی محنت کی مرہون منت

ہے۔"

48 "انٹرنیٹ اور ایس ایم ایس سے دلچسپی؟"

"انٹرنیٹ سے تو پھر بھی ہے مگر ایس ایم ایس سے بالکل نہیں ہے۔ بہت مجبوری میں جواب دیتی ہوں۔"

49 "میں اکثر مسکرا دیتی ہوں؟"

"اپنے بچپن کو یاد کرتی ہوں تو اپنا وہ پالتو کتا بہت یاد آتا ہے جو مجھے بہت پیارا تھا میرے قد سے بھی لمبا تھا۔"

50 "کھانے میں پسندیدہ ڈش؟"

"میری پسند کا تعلق موسم سے ہوتا ہے مثلاً گرمیوں میں دال چاول اور سبزیوں سے بہتر کوئی پکوان نہیں اور سردیوں میں سوپ کے بغیر گزارہ ممکن نہیں۔"

51 "پکانے کا شوق؟"

"نہیں جی پکانے سے بالکل بھی لگاؤ دلچسپی نہیں ہے۔"

52 "کن ایشوز پہ بہت اچھا تبصرہ کر لیتی ہوں؟"

"کھانے پر.... مذاق کر رہی ہوں۔ ہر اہم ایشوز پہ بہت اچھا تبصرہ کر لیتی ہوں۔"

53 "انسان کس سے سیکھتا ہے' زندگی سے یا اپنے بزرگوں سے؟"

"دونوں سے.... زندگی بھی ماشاء اللہ انسان کو بہت کچھ سکھا کے انسان بنا دیتی ہے اور بزرگ تو خیر سکھاتے پڑھاتے ہی رہتے ہیں۔"

54 "ایک خواہش جو ادھوری رہ گئی؟"

"کہ میں بہت زیادہ پڑھتی.... بہت سی ڈگریاں لیتی۔"

55 "دل کا حال کس سے بیان کرتی ہوں؟"

"زیادہ تر اپنے میاں صاحب سے۔"

56 "تنقید پہ میرا ردعمل؟"

"میں ہوں یا کوئی بھی تنقید وہی اچھی لگتی ہے جو آپ کے مفاد میں ہوں.... صرف اچھا یا برا کہنے کو میں تنقید نہیں مانتی۔"

57 "مطالعہ پسند ہے؟"

"مطالعہ میری کمزوری ہے.... جب مطالعہ نہ کروں مزہ نہیں آتا زندگی کا۔ مجھے زیادہ تر روسی اور امریکن لکھاری پسند ہیں۔"

58 "بچوں کو ہمیشہ نصیحت کرتی ہوں کہ؟"

"کہ جانوروں سے پیار کریں۔ یہ بے زبان ہوتے ہیں ان کی دعائیں لیا کریں۔"

59 "پسندیدہ کھیل؟"

"نہیں جی کھیلوں سے بالکل لگاؤ نہیں۔"

60 "شہرت نے شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے؟"

"بہت اچھے.... اچھے اور قابل لوگوں سے ملنے کا موقع ملا تو سوچ میں تبدیلی آئی۔"

# نادیہ ایمینوئیل

شاہین رشید

آواز کی دنیا سے تعلق بنانے کے لیے خوب صورت آواز کا ہونا ہی ضروری نہیں ' بلکہ خوب صورت خیالات کا ہونا بھی بہت ضروری ہے معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے اور بات کرنے کا انداز خوب صورت ہونا بھی ضروری ہے اور جن میں یہ خوبیاں ہوتی ہیں وہ ہی ریڈیو کا ایک اچھا "آرجے" ثابت ہوتا ہے اور Nadia Emanuel میں یہ خوبیاں یقیناً ہوں گی تب ہی تو وہ گزشتہ چار سال سے ایف ایم 105 میں بہ حیثیت آرجے کے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ "آواز کی دنیا سے" اس بار Nadia Emanuel جو کہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں ہمارا انتخاب ہیں۔

★ "جی کیسی ہیں نادیہ اور کہاں مصروف رہتی ہیں ' ماشاءاللہ سے کہ ہاتھ ہی نہیں آتیں؟"

✱ "جی میں ٹھیک ہوں اور ایسی بات نہیں کہ ہاتھ نہیں آتی اصل میں بات یہ ہے کہ میں ایک پیٹرولیم کمپنی میں بھی جاب کرتی ہوں اور ریڈیو بھی تو اس لیے کچھ زیادہ ہی مصروف رہتی ہوں۔ تبھی محنت

کرنے والی بچی ہوں۔۔۔" (ہنستے ہوئے)

★ "کمپنی میں کیا عہدہ ہے آپ کا؟"

✳ "جی میں اٹک پیٹرولیم کمپنی میں "ایڈمن" ڈیپارٹمنٹ میں ہوں اور ایک ایڈمن کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں کہ کمپنی کی مینجمنٹ کو ہینڈل کرنا۔"

★ "سب مانتے ہیں آپ کی بات؟"

✳ "جی بالکل مانتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ پیار محبت اور میٹھے لہجے میں بات کی جائے تو سب آپ کی بات مان لیتے ہیں۔"

★ "آواز کی دنیا سے آپ کا تعلق ہے ریڈیو پہ تو سب سنتے ہیں یہ آواز کہیں اور بھی گونجتی ہے؟"

✳ "نہیں فی الحال تو نہیں کیونکہ میری جاب تھوڑی ٹف ہے اور ڈبنگ کے لیے یا وائس اوور کے لیے ٹائم ذرا مشکل سے ہی نکال پاؤں گی، لیکن مجھے آفرز بہت ہیں اور ہو سکتا ہے کہ چند دنوں میں یا چند مہینوں میں میں یہ ذمہ داری یا آفرز کو قبول کرلوں۔ کیونکہ چاہے ریڈیو ہو یا میری جاب۔ دونوں کام میں اپنے شوق کے لیے کرلی ہوں۔ میں اپنی تعلیم کو گھر بیٹھ کر ضائع نہیں کرنا چاہتی۔"

★ "اور پھر اپنی کمائی کا مزہ ہی کچھ اور ہے اور آگے سے آگے بڑھنے کو دل چاہتا ہے؟"

✳ "بالکل جی، جب ہم خود اپنی ضروریات کو پورا کرنے لگتے ہیں اور ہمیں کسی سے مانگنا نہیں پڑتا اور بہت اچھا لگتا ہے جب مہینے کے آخر میں آپ کو سیلری کی شکل میں آپ کو اپنی محنت کا صلہ ملتا ہے اور ویسے بھی اب انسان کی ضروریات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ گھر کے ہر فرد کو کمانا چاہیے۔"

★ "گھر میں سب خوش ہیں آپ کی جاب سے؟"

✳ "بہت خوش ہیں اور ویسے بھی میں گھر کی لاڈلی ہوں اور گھر کی بڑی ہوں، کہا جاتا ہے کہ چھوٹے گھر میں لاڈلے ہوتے ہیں، مگر ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بڑے سب کے لاڈلے ہوتے ہیں۔ یہاں میں آپ کو بتاؤں کہ بیٹیوں میں میں بڑی ہوں اور مجھ سے بڑے بھائی ہیں۔ ہمارا ایک ہی بھائی ہے

اور ہم تین بہنیں ہیں۔"

★ "کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟"

✳ "میری ایک عدد اماں ہیں اور ایک ہی عدد ابا بھی ہیں۔ ایک بڑا بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں اماں ہاؤس وائف ہیں جبکہ ابا نیشنل ریفائنری کمپنی میں کام کرتے ہیں، مطلب جاب کرتے ہیں اماں گھر رہ کر اچھے اچھے کھانے پکا کر ہم سب کی خدمت تواضع کرتی ہیں۔ بڑے بھائی آغا خان، ہاسپٹل میں میل نرس ہیں اور دو چھوٹی بہنیں پڑھ رہی ہیں۔ مختصر مگر خوشحال فیملی۔ الحمد للہ اور میں نے بی کام کیا ہے اور مزید پڑھنے کا ارادہ ہے اور میری تاریخ پیدائش 10 مئی 1988ء ہے۔"

★ "لڑکیوں کے لیے تو کہا جاتا ہے کہ بس پڑھ لکھ لیا۔ اب ان کی شادی کرو اور بس؟"

✳ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن جہاں آپ کی فیملی کی، آپ کے ماں باپ کی سپورٹ حاصل ہوتی ہے وہاں پھر کوئی مشکل پیش نہیں آتی میں بہت چھوٹی عمر میں پریکٹیکل لائف میں آگئی اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ میں بہت بڑی ہو گئی ہوں اور مجھے یاد ہے کہ جب میں نئی نئی پریکٹیکل لائف میں آئی تو بہت ڈرتی تھی۔ کیونکہ گھر سے کبھی زیادہ نکلی نہیں تھی۔ لیکن شکر ہے کہ کبھی میرے ساتھ برا نہیں ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جہاں جہاں بھی گئی مجھے لوگ بہت اچھے ملے اور میں اس معاملے میں بہت لکی ہوں اور ہاں یہ تو بتاؤں کہ میری شادی ہو چکی ہے تقریباً" 7 ماہ قبل اپریل 2015ء میں اور میرے میاں کا نام Gill Nov JoJious اور میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں اور انہیں میری جاب پہ کوئی اعتراض نہیں ہے اور انہوں نے ریڈیو پہ میری آواز سنی بھی اور انہیں میرا اسٹائل پسند آیا۔"

★ "آپ کے میاں کا نام Nov Gill JoJious ہے۔ کیا آپ عیسائی فیملی سے ہیں مطلب عیسائی مذہب سے؟"

✳ "جی بالکل عیسائی مذہب سے ہوں۔"

★ "ہوں.... یہ بتائیں کہ ریڈیو پہ آمد کیسے ہوئی؟"

✳ "اٹک پیٹرولیم کو جوائن کرنے سے پہلے میں "ہم" ٹی وی میں تھی اور وہاں کافی لوگوں نے مجھے کہا کہ تمہیں ریڈیو پہ پروگرام کرنے چاہئیں شاید انہیں میری آواز اچھی لگتی تھی یا میرا انداز تو سب کے کہنے پر میں نے ایف ایم 105 پہ انٹرویو بھی دیا اور آڈیشن بھی۔ ورنہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں ریڈیو پہ کام کروں گی۔ ایف ایم 105 والوں نے مجھ سے بہت محنت کروائی، بہت پریکٹس کروائی اور اس سارے کام میں دس دن لگے اور 10 دن کے بعد انہوں نے کہا کہ اب آپ پروگرام کریں کہ آپ کی آواز اور آپ کی باتیں اتنی مزیدار ہو گئی ہیں کہ سب آپ کو سننا پسند کریں گے اور یوں میں نے مختلف آرجیز کے ساتھ کمبائن پروگرام کیے اور جب میں یوز ٹو ہو گئی تو میں نے "سولو" پروگرام کرنے شروع کر دیے۔"

★ "کتنے سال ہو گئے ریڈیو سے وابستہ ہوئے؟"

✳ "مجھے تقریباً" چار سال ہو گئے ہیں اور تین سال تک میں نے "پرائم ٹائم" اور "آفٹرنون" میں جو "سنڈے شوز" ہوتے ہیں وہ کیے۔ وہ فرمائشی پروگرام بھی ہوتے تھے اور لوگ کال کر کے اپنی فرمائش بتاتے تھے اور ہم وہ گانے پلے کرتے تھے اور اب تقریباً" ایک سال سے میں اب صرف سنڈے کو پروگرام کرتی ہوں

اور میرے پروگرام کا نام "ٹاپ لائٹ" ہوتا ہے۔ تین سال جو پروگرام کیے ان میں رمضان کے پروگرام عید کے پروگرام کیے ہیں بلکہ ہر تہوار پر پروگرام کیے ہیں۔"

★ "رمضان المبارک کے پروگرام کرنے اور عید شو پروگرام کرنے میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آتی تھی۔ کیونکہ یہ آپ کے تہوار تو نہیں ہوتے تھے؟"

✻ "نہیں نہیں بالکل بھی نہیں ہوتی تھی کیونکہ ہمارے ایف ایم 105 کا ماحول بہت اچھا ہے اور میں ریڈیو پہ کسی آر جے کے ساتھ رمضان اور عید کے پروگرام کر رہی ہوتی ہوں تو ہماری کیمسٹری اتنی اچھی میچ ہو رہی ہوتی ہے کہ پروگرام کرنے میں مزہ آتا ہے اور بالکل بھی احساس نہیں ہوتا کہ ایک مسلمان ہے اور دوسرا غیر مسلم اور عید کے دن تو مجھ میں ایک خاص ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے اور مجھے خود بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عید کے دن میں سب سے زیادہ تیار ہو کر جاتی ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ جیسے یہ میری ہی عید ہے۔"

★ "کیا شروع سے ہی ایف ایم 105 میں ہیں اور کسی اور چینل سے آپ کو آفر آئی؟"

✻ "جی میں شروع سے ہی ایف ایم 105 میں ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ آئندہ بھی میں 105 میں ہی نظر آؤں گی اور دیگر چینلز سے آفرز آئیں لیکن مجھے FM-105 کا ماحول بہت اچھا لگتا ہے اور میں کہیں بھی کام کروں خواہ ریڈیو ہو ٹی وی ہو کوئی کمپنی ہو یا کوئی بھی جگہ میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت اس جگہ کے ماحول کی ہوتی ہے۔ کیونکہ ماحول اچھا ہو گا تو آپ ایزی ہو کر کام کر سکیں گی ورنہ آپ ایڈجسٹ نہیں ہو پائیں گی۔"

★ "لائیو کالز میں لوگوں کا بی ہیویئر کیسا ہوتا ہے؟"

✻ "بہت اچھا بی ہیویئر ہوتا ہے۔ کیونکہ میرے زیادہ تر سامعین وہی ہیں جو مجھے شروع سے سن رہے ہیں۔ کچھ کا اضافہ بھی ہوا ہے اور سب ماشاءاللہ بہت اچھے ہیں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ کالز لے کر ان سے بات کروں۔"

★ ”عید اور رمضان کے پروگراموں کو سن کر لوگوں نے یا کسی نے فورس کیا کہ آپ مسلمان ہو جائیں۔ مذہبی آزادی ہے؟“

✲ ”بالکل کرتے ہیں لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہو گا۔ مگر میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا‘ اور ہاں جی ہمیں ہر طرح سے مذہبی آزادی ہے اور مجھے کسی سے اور نہ ہی حکومت سے کوئی شکایت ہے۔“

★ ”شادی سے پہلے آپ جاب کے ساتھ تین دن پروگرام کرتی تھیں اور اب ایک.... تو جب فیملی بن جائے گی تو ریڈیو اور جاب کو خیرباد کہہ دیں گی؟“

✲ ”نہیں ان شاء اللہ ایسا نہیں کروں گی کیونکہ آگے جو دور آرہا ہے اس میں اپنے بچوں کے لیے اور اپنے گھر کے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا اور میں نے ریڈیو کو اور اپنی جاب کو کبھی بھی اپنے لیے بوجھ نہیں سمجھا اور بہت شوق اور دلچسپی کے ساتھ اپنے کام کرتی ہوں۔“

★ ”کمبائن شو کرنے میں زیادہ اچھا لگتا ہے یا سولو؟“

✲ ”زیادہ تر تو میں سولو شو ہی کر رہی ہوتی ہوں ہاں کمبائن شو تو رمضان اور عید کا ہی ہوتا ہے یا کوئی خاص ایونٹ کا ہوتا ہے اور اس چیز کو ہم سب انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔“

★ ”کبھی ایسا ہوا کہ کسی وجہ سے پروگرام کرنے کو دل نہیں کر رہا ہو تو پھر کیا کرتی ہیں؟“

✲ ”ایسا تب ہوتا ہے جب میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو۔ آواز خراب ہو اور مائیک پہ اچھی نہ لگ رہی ہو‘ مگر ایسا ہونے کے باوجود ہم اپنی کیفیات کو شو پر محسوس نہیں ہونے دیتے اور اسی طرح پوری انرجی کے ساتھ شو کرتے ہیں جس طرح ہم روزانہ کرتے ہیں اور ایسا میں ہی نہیں ہمارے سارے پریزنٹرز ایسا ہی کرتے ہیں۔“

★ ”لوگ ریڈیو شوق سے سنتے ہیں؟“

✲ ”جی بالکل.... لوگ بہت شوق سے ریڈیو سنتے ہیں پسند کرتے ہیں اور فون کرتے ہیں اور کتنے ہی سامعین ایسے ہیں کہ جن کو ہم آواز سے پہچاننے لگے ہیں کہ آپ فلاں بول رہے/ رہی ہیں۔ ریڈیو میں بہت فیملی والا ماحول ہے۔“

★ ”پریکٹیکل لائف میں کب آئیں؟“

✲ ”کافی کم عمری میں آگئی۔ اسٹارٹ میں نے ٹیچنگ سے کیا پھر میں نے ایک کمپنی Mistileishi میں جاب کی‘ اس کے بعد ہم ٹی وی میں جاب کی‘ پھر ایک بنک میں جاب کی۔ پھر ریڈیو اور ساتھ ساتھ پیٹرولیم کمپنی میں جاب۔“

★ ”کیمرے کے پیچھے رہ کر سارے کام کیے‘ کبھی کیمرے کے آگے آکر بھی کام کرنے کو دل چاہا؟“

✲ ”کیمرے کے آگے بھی کام کیا ہے‘ مگر بہت زیادہ نہیں۔ بس ایسے چھوٹے چھوٹے سین کر لیے تھے اور ڈراموں میں کام کرنے کا میں نے کبھی سوچا نہیں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ ایکٹنگ کرنی مجھے آتی نہیں ہے۔ جبکہ آفرز تو مجھے بہت ساری تھیں۔“

★ ”مجھ سے دھیمے لہجے میں بات کرنے والی نادیہ اصل لائف میں کیسی ہے۔ تیز مزاج کی یا نرم؟“

✲ ”ویسے تو بہت ٹھنڈے مزاج کی ہوں‘ مگر جب بگڑ جاتی ہوں تو پھر بہت بری طرح بگڑتی ہوں اور پھر مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کر کیا رہی ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن شکر ہے کہ ایسی کوئی حرکت نہیں کی کہ جس سے کسی کو کوئی پریشانی یا تکلیف ہوتی ہو۔“

★ ”گھرداری سے کتنا لگاؤ ہے؟ گھر اور سسرال میں بہت فرق ہوتا ہے؟“

✲ ”گھرداری سے تو بالکل لگاؤ نہیں تھا اور واقعی سسرال اور میکے میں فرق ہوتا ہے۔ گھر میں بالکل نواب ٹائپ کی تھی‘ اور سسرال میں آکر بہت سارے کام کرنے شروع کر دیے ہیں۔ مثلاً ”مجھے چائے بنانی بالکل نہیں آتی تھی اور جب میں چائے بناتی تھی تو گھر والے کہتے تھے کہ آپ چائے بنانے کی زحمت نہ کیا کریں۔ چنانچہ چار پانچ سال سے میں نے واقعی چائے بنانے کی زحمت نہیں کی‘ لیکن جب شادی ہوئی تو

معلوم ہوا کہ میاں صاحب تو چائے کے بے حد شوقین ہیں۔ تو میں نے سوچا کہ اب تو اس کام میں پرفیکٹ ہونا ہی پڑے گا اور اب میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے اچھی چائے کوئی نہیں بنا سکتا۔"

★ "اسپورٹس سے لگاؤ ہے؟"

✻ "بہت کم.... ہاں کرکٹ میچ دیکھنا پسند ہیں اور میں شوق سے دیکھتی ہوں۔ بیڈ منٹن مجھے اچھا بھی لگتا ہے اور میں کالج کے زمانے میں کھیلتی بھی تھی' اسکول کالج کے زمانے میں تو کرکٹ بھی کھیلتی تھی' بیٹنگ بہت اچھی کر لیتی تھی۔"

★ "رات کو جب جاب سے تھک کر آتی ہیں تو کیا دل چاہتا ہے کہ کھانا ہو' بستر ہو اور خوب صورت گہری نیند؟"

✻ "ہاں جی بالکل ایسا ہے' کیونکہ اگلے دن کی روٹین بھی نظروں کے سامنے ہوتی ہے۔ تو بس پھر سب کچھ جلدی جلدی فارغ ہو کر بستر کی راہ لیتی ہوں اور صبح جلدی اٹھ جاتی ہوں اور تھوڑی دیر لیٹی رہتی ہوں کہ ابھی اٹھ جاتی ہوں۔"

★ "کھانے پینے سے لگاؤ ہے؟"

✻ "جی بالکل ہے اور کھانے میں مجھے میکرونی بہت پسند ہیں اور اٹالین فوڈ مجھے بہت پسند ہیں۔ لیکن میں دیسی کھانے بھی بہت شوق سے کھاتی ہوں اور مجھے "چکن تکہ" بہت پسند ہے۔"

★ "سیاست سے لگاؤ ہے؟"

✻ "نہیں جی.... کچھ خاص نہیں۔"

★ "اور کچھ کہنا ہے؟"

✻ "نہیں جی.... بس آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا انٹرویو لیا۔"

اور ہم نے بھی شکریے کے ساتھ نادیہ سے اجازت چاہی۔

✡ ✡

# ثناشہزاد

ادارہ

س : "آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

ج : "میرا یوں تو نام ثناء شہزاد ہے البتہ گھر والوں نے بہت سارے نام دے دیے ہیں۔ ممی کی گڑیا ہوں فیضان کی ثانیہ، شاہ رخ کی چھموز اور فوزیہ خالہ کی شنو تھی۔"

س : "کبھی آئینہ نے آپ سے یا آپ نے آئینہ سے کچھ کہا؟"

ج : "جی ہاں جناب آئینہ مجھ سے ہمیشہ کہتا ہے ثناء تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو خوشیوں پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا سب کا ہے خوش رہا کرو اپنے لیے۔"

س : "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

ج : "میری بچپن کی ساتھی میری ڈائریاں، کرن ڈائجسٹ اور عزیز از جان دوست نوشین۔"

س : "اپنی زندگی کے دشوار لمحے بیان کریں؟"

ج : "جب فوزیہ خالہ کی ڈیتھ ہوئی اور ابھی 19 دن پہلے جب سب سے چھوٹے چاچو کی اچانک ڈیتھ ہوئی"

س : "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

ج : "محبت دنیا کا سب سے خوب صورت جذبہ ہے مگر لوگوں نے اسے ٹائم پاس بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس رشتے کی خوب صورتی کو ختم کر دیا ہے۔"

س : "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا ہو؟"

ج : "میں کوئی منصوبے نہیں بناتی کیونکہ سب منصوبے اس اوپر والے کی ذات کے سامنے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں ہوتا وہ ہی ہے جو رب چاہتا ہے۔"

س : "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور مطمئن رکھا؟"

ج : "بریانی بنائی پہلی بار جو سب کو بہت پسند آئی۔"

س : "آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گے؟"

ج : "صبر و شکر کرنے والی اللہ کی رضا میں خوش رہنے والی۔"

س : "آپ اپنے آپ کو بیاں کریں؟"

ج : "ہر ایک کو اپنے جیسا مخلص سمجھنے والی صرف اپنی ذات سے دوسروں کو خوشی دینا چاہتی ہوں، محبتیں بانٹتی ہوں اور محبتیں سمیٹتی ہوں۔"

س : "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

ج : "نہیں جی ایسا کوئی ڈر نہیں ہے الحمدللہ۔"

س : "آپ کی کمزوری... آپ کی طاقت کیا ہے؟"

ج : "میری کمزوری میری چھٹکی ہماری بکری کا بچہ، میری طاقت میرے بابا جان۔"

س : "آپ کے نزدیک دولت؟"

ج : "دولت بہت زیادہ ضروری ہے آج کے دور میں اس کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا لیکن اتنی زیادہ بھی نہ ہو کے بندہ اپنے پروردگار کو بھول جائے۔"

س : "آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

ج : "اپنی فیملی کے ساتھ بھرپور طریقے سے انجوائے کر کے کیوں یہ وہ پل ہوتے ہیں جو ہمیں ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔"

س : "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج : "پرسکون گوشہ، دنیا میں جنت، سب سے قیمتی متاع جہاں کسی بات کا ڈر نہیں ہوتا۔"
س : "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کردیتی ہیں؟"
ج : "بھول بھی جاتی ہوں اور معاف بھی کردیتی ہوں دل میں نہیں رکھتی کوئی بات۔"
س : "کامیابی آپ کی نظر میں؟"
ج : "کامیابی محنت کا بہترین پھل ہے۔"
س : "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کردیا ہے یا یہ واقعی ترقی ہے؟"
ج : "مشینوں نے ہمیں کاہل نہیں بنایا بلکہ وقت کی بچت کرنا سکھادیا ہے۔"
س : "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"
ج : "عجیب خواہش تو کوئی نہیں خواب ضرور ہے مدینہ منورہ کی زیارت کا اللہ پاک میرا یہ خواب جلد سے جلد پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ (آمین)"
س : "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"
ج : "جب دل اداس ہو تو دور سے صرف دیکھ کر اور خوش ہو تو بارش میں نہا کر پکوڑے اور چائے کے ساتھ لطف اندوز ہو کر۔"
س : "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتی تو پھر کیا ہوتی؟"
ج : "یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے ویسے میں ایک ڈاکٹر ہوتی مگر افسوس کچھ وجوہات کی بنا پر پڑھائی چھوڑ دی۔ مگر میں اس حال میں بھی خوش ہوں۔"
س : "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"
ج : "مجھے خوب صورت نظارے اور بچے بہت متاثر کرتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں دیوانہ کردیتی ہیں مجھے اور حسین مناظر مجھے مبہوت کردیتے ہیں۔"
س : "آپ کیا مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں؟ یا خوف زدہ ہوجاتی ہیں؟"
ج : "میں کسی سے مقابلہ نہیں کرتی مجھے ہارنے سے ڈر لگتا ہے میں نہیں چاہتی میری جیت کسی کی ہار کا سبب بنے بس ایسی ہی ہوں میں ڈرپوک۔"
س : "متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟"
ج : "پیر کامل، عمیرہ احمد، ہم ساتھ ساتھ ہیں۔"
س : "کوئی ایسی شکست جو آج بھی اداس کردیتی ہے؟"
ج : "نہیں جی ایسی کوئی شکست نہیں ہوئی آج تک اللہ کا کرم ہے۔"
س : "آپ کا غرور؟"
ج : "میں غرور نہیں کرتی کیونکہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے ہاں مجھے فخر ضرور ہے کہ میں ایک اچھی بیٹی ہوں اپنے بابا جان کی۔"
س : "کیا آپ نے پالیا جو کچھ پانا چاہتی تھیں؟"
ج : "ہم جو چاہتے ہیں ہمیں وہ نہیں ملتا جو رب چاہتا ہے وہ ملتا ہے اور رب ہمارا کبھی برا نہیں چاہ سکتا یہ میرا ایمان ہے۔"
س : "اپنی ایک خوبی یا خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"
ج : "خوبی یہ ہے کہ سب سے خوشی میں خوش ہوتی ہوں خامی یہ ہے غصہ بہت جلد آتا ہے۔"
س : "کوئی ایسا واقعہ جو آپ کو شرمندہ کردیتا ہے؟"
ج : "ایسا تو کوئی واقعہ نہیں ہے ہاں اگر جانے انجانے میں کسی کا دل دکھادیتی ہوں تو اس سے فوراً معافی مانگ لیتی ہوں۔"
س : "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جو آپ کو حسد میں مبتلا کردیتی ہو؟"
ج : "میں کسی سے حسد نہیں کرتی یہ بہت بری بلا ہے میں اس سے بچ کر رہتی ہوں۔"
س : "مطالعہ آپ کی نظر میں؟"
ج : "دماغ کی غذا ہے مطالعہ کے بغیر میں ادھوری ہوں۔"
س : "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے؟ جو آپ اپنے علم، تجربہ، مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟"
ج : "زندگی صرف چلتی سانسوں کا نام ہے یہ چلتی رہیں تو ہم زندہ ہیں اور رک جائیں تو ختم۔"
س : "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"
ج : "نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی نہیں۔"

تنزیلہ ریاض

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراض رہتی ہے اور ان کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی' وہ ابا سے جتنی نالاں اور متنفر رہتی' لیکن ایک بات حتمی تھی کہ امی سے اسے بہت محبت تھی' لیکن اسے محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان ہمیشہ کڑوی ہی رہتی۔ نینا اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔

سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ چند سال پہلے میٹرک کا رزلٹ پتا کر کے وہ خوشی خوشی گھر واپس آرہا تھا کہ ایک گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے اور وہ ایک ٹانگ سے معذور ہوجاتا ہے۔ ذہنی بیمار ہونے کی وجہ سے اس کی ماں نے مثبت قدم اٹھاتے ہوئے محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوا دی' سلیم نے پرائیویٹ انٹر کر کے بی اے کا ارادہ کیا۔ سلیم کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہوجاتی ہے' جو اس نے نینا کے ہاتھ بھجوائی تھی۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا۔ وہ اپنی بہنوں میں قدرے دبی ہوئی رنگت کی مالک' لیکن سلیقہ شعاری میں سب سے آگے تھی۔ صوفیہ کی شادی جب کاشف نثار سے ہوئی تو پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنا دیا گیا۔ کاشف نہ صرف چلتے ہوئے کاروبار کا اکلوتا وارث تھا' بلکہ وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ کاشف خاندان کی ہر لڑکی اور

دوستوں کی بیویوں سے بہت بے تکلف ہو کر ملنا' جو صوفیہ کو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ صوفیہ کو خاص کر اس کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی تھی۔ جو بہت خوب صورت اور ماڈرن تھی اور اس کی خاص توجہ کاشف کی طرف رہتی۔ حبیبہ کی وجہ سے کاشف اکثر صوفیہ سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا تھا۔ صوفیہ کے شک کرنے پر کاشف کا کہنا تھا کہ یہ اس کا کاروباری تقاضا ہے۔

بی بی جان' صوفیہ کی ساس کو کاشف سے جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں' لیکن صوفیہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اکثر و بیشتر کاشف سے بحث کرنے لگتی جو کاشف کو ناگوار محسوس ہوتا۔ صوفیہ پریگننٹ ہو جاتی ہے اور بی بی جان کاشف سے صوفیہ کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔

شہرین نے ضد کرکے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر سمیع سے شادی تو کرلی' لیکن پچھتاوے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ سمیع اسے بہت چاہتا ہے' اس کے باوجود اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور زیادہ تر پلز لے کر اپنے بیڈ روم میں سوئی رہتی ہے۔ سمیع نے اپنی بیٹی ایمن کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا جو گھر کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔ سمیع اور شہرین دونوں ایمن کی طرف سے لاپروا ہیں اور ایمن اپنے والدین کی غفلت کا شکار ہو کر ملازموں کے ہاتھوں پل رہی ہے۔ اماں رضیہ کے احساس دلانے پر سمیع غصہ ہو جاتا ہے اور ان کو ڈانٹ دیتا ہے۔ شہرین کے بھائی' بہن راستے میں ملتے ہیں اور سمیع کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔

اب آگے پڑھیے

## چھٹی قسط

"نیناباجی چپلی کباب اس کی امی نہیں بنا رہیں بلکہ میری امی بنا رہی ہیں اور یہ بات اسے میں نے ہی کہی تھی کہ امی نے کہا ہے پڑھنے کے بعد آپ کے لیے کباب لے جاؤں۔" برکت روہانسا ہو کر بولا۔ نینا کو مزید ہنسی آئی جسے اس نے چائے کے کپ کی آڑ میں چھپایا تھا۔ زری بھی پاس آکر بیٹھی ہی تھی۔ اس نے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"حمزہ کے بچے' بہت چالاک ہو گئے ہو۔ کسی دن' بہت پٹائی کروں گی میں تمہاری۔۔۔ چلو اپنی کتاب کھولو اور پڑھنا شروع کرو۔" نینا نے ٹوکا تھا' پھر وہ برکت کی طرف متوجہ ہوئی۔

"برکت تم جلدی سے آؤ۔۔۔ بتاؤ کون سی ایکسر سائز سمجھنی ہے۔۔۔ جلدی جلدی سمجھو' پھر اپنے گھر جاؤ۔۔۔ اور امی کو بتا دینا میں آٹھ بجے سے پہلے کھانا کھا لیتی ہوں۔۔۔ آٹھ بجے سے پہلے کباب لے آنا۔" وہ اس کی جانب انگلی کرکے بولی۔ اسی دوران امی بھی آکر ان کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

"آٹھ بجے کے بعد آؤ تو زیادہ لے کر آنا' کیونکہ آٹھ بجے میرے ابا آجاتے ہیں اور میری امی کھانے کی سب اچھی چیزیں ان کو دے دیتی ہیں۔۔۔ سمجھ گئے نا۔" یہ بات امی کو چڑانے کے لیے کہی گئی تھی۔ امی کچھ چپ چپ سی تھیں اور یہ محسوس کرکے ہی اس نے امی کو ہنسانے کی خاطر کہی تھی لیکن وہ اس کے شرارت بھرے انداز پر صرف مسکرائیں اور وہ بھی لمحہ بھر کے لیے۔ نینا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں زری سے پوچھا بھی کہ امی افسردہ سے کیوں نظر آتی ہیں لیکن اس نے بھی کندھے اچکا دیے۔ وہ برکت کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ اسے پڑھا کر فارغ ہوئی' پھر حمزہ کو اس کی ایکسر سائز سمجھائی تب تک مغرب کی اذان ہو گئی تھی۔

نینا کو یاد آیا تھا کہ سلیم نے کہا تھا شام کو رانیہ والا مسئلہ دوبارہ یاد کروا دینا۔ اس نے حمزہ کی نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑ کر اس پر بڑے حروف تہجی میں "راہنزل" لکھا تھا اور ساتھ ہی سوالیہ نشان بنا دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ

سلیم اس لفظ کو دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ وہ کیا یاد کروانا چاہ رہی ہے۔ دونوں بچوں کو چھٹی دیے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ حمزہ دوبارہ آگیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی کاغذ تھا جس پر اس نے بڑا سا راپنزل لکھ کر بھیجا تھا۔ نمنا نے کھول کر دیکھا۔

"اوہ تیری خیر۔" اس کے منہ سے پہلا جملہ یہی نکلا تھا۔ سلیم نے اس کاغذ پر راپنزل کے بالکل نیچے ایک بہت ہی خوب صورت اسکیچ بنا کر بھیج دیا تھا۔ سلیم کی ہینڈ رائٹنگ تو پیاری تھی ہی لیکن وہ اسکیچز بھی بہت خوب صورت بنالیتا تھا۔ اس کاغذ پر اس نے ایک بڑی سی دیوار میں ایک کھڑکی بنائی تھی اور اس میں ایک لڑکی کا چہرہ نمایاں تھا۔ چہرے کے خدوخال پر تو کوئی محنت نہیں کی گئی تھی لیکن اس کی چٹیا سلیم نے بہت خوب صورت بنائی تھی۔ چٹیا اتنی لمبی تھی کہ کھڑکی سے ہوتی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ کاغذ کے کنارے تک آگئی تھی۔ اس لڑکی کے سر کے اوپر تیر کا نشان بنا کر سلیم نے راپنزل سے بھی بڑا "نمنا" لکھ دیا تھا۔ نمنا کے چہرے پر مسکراہٹ اور شرارت ایک ساتھ در آئی۔ اس نے اسی صفحے کی الٹی سائیڈ پر ایک ہاتھ کا آڑا ترچھا اسکیچ بنایا تھا اور اس پر "فتنے منہ" لکھ کر حمزہ کے ہاتھ واپس بھیجا تھا۔ وہ ابھی کمرے میں آئی ہی تھی کہ اس نے ابا کے کمرے کا دروازہ دھڑام کی آواز کے ساتھ بند ہوتے ہوئے سنا۔ وہ پریشان سی ہو کر باہر نکلی۔ زری اس سے بھی پہلے کچن سے نکل کر آگئی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔ نمنا نے کندھے اچکائے۔

"آج صدیق کیوں نہیں آیا؟" اس نے فون پر کاشف سے شکایت، گلہ اور سوال ایک ساتھ کرتے ہوئے ڈرائیور کی بابت پوچھا تھا۔

زرمین سوا سال کی ہو چلی تھی اور صوفیہ دوبارہ امید سے تھی۔ اس بار پریگننٹ ہو کر اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ وہ بے حد نکھر گئی تھی اور رنگ روپ میں واضح فرق آیا تھا جبکہ زرمین کی دفعہ وہ بہت بھدی اور بد مزاج ہو گئی تھی۔ اب کی بار وہ بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ بی بی جان اور اس کی بہنوں بھائیوں کا خیال تھا کہ وہ اس بار ضرور ہی بیٹے کی ماں بنے گی۔ وہ ذہنی طور پر بہت مطمئن ہو چلی تھی کیونکہ کاشف اب مکمل طور پر اس کا تھا۔ حبیبہ تو قصہ پارینہ ہو گئی تھی۔ پہلے خاندان برادری کی شادیوں یا تقریبات میں وہ اس کے ہمراہ جاتا تھا تو اپنی دور پار کی کزنز کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرتا ہوا بھی صوفیہ کو الجھن میں مبتلا کرتا تھا لیکن اب صورت حال بدل گئی تھی۔ اس کے اندر ذمہ داری پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ کچھ سنجیدہ طبیعت ہو گیا تھا۔ اس کی کاروباری مصروفیات نے اسے خاندان سے کسی قدر دور بھی کر دیا تھا۔ اب بی بی جان اور صوفیہ زیادہ تر تقریبات میں اس کے بغیر ہی شرکت کیا کرتی تھیں۔ اس ساری صورت حال سے صوفیہ بے حد مطمئن تھی جس کی وجہ سے وہ بہت تر و تازہ اور نکھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

"نہیں آیا کیا...؟" کاشف جواب دینے کی بجائے سوال کرنے لگا۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ نہیں آیا کیا؟" صوفیہ ہنسی تھی۔ یہ اس کی عجیب عادت تھی۔ سوال کو دوہرا کر پوچھتا ضرور تھا۔

"ابھی تک نہیں آیا تو اس کا مطلب آج چھٹی کر لی ہے اس نے۔ شاید کوئی مسئلہ ہو گیا ہو گا۔ اب کیا کرو گی تم... کیسے جاؤ گی؟" کاشف کی اطمینان بھری آواز سنائی دی تھی اس نے اپنی خالہ کی طرف جانا تھا۔ اس کی ایک بھابھی اس کی خالہ کی بیٹی تھیں۔ وہ آج کل اپنے میکے آئی تھیں۔ وہ صوفیہ اور بی بی جان سے آکر مل گئی تھیں اب

بی بی جان چاہتی تھیں کہ صوفیہ اور وہ خود خالہ کے گھر جائیں اور اس کی بھابھی کو باقاعدہ کھانے کی دعوت دیں۔ صوفیہ کو بی بی جان کی یہ وضع داریاں خوب بھاتی تھیں۔ اس لیے وہ خوشی خوشی اپنا بہترین لباس زیب تن کیے' زرمین کو بھی اچھے طریقے سے تیار کرنے کے بعد گھر پر ڈرائیور کا انتظار کر رہی تھی جو بارہ بج جانے کے بعد بھی نہیں آیا تھا۔ صوفیہ کو خوشی ایس بات کی تھی کہ اب کاشف کو خود آکر انہیں لے جانا پڑے گا۔ شوہر کے ساتھ جانے میں جو عزت افزائی ملتی تھی وہ اسے ہر چیز سے زیادہ پسند تھی۔"

"آپ بتائیں۔ اب کیا کروں؟ وہ اسی کے انداز میں بولی۔"

"میرا خیال ہے آج کا پروگرام ملتوی کردو۔ کل چلی جانا۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ صوفیہ نے اس کی بات کاٹی۔

"جی نہیں۔ میں اب تیار ہو چکی ہوں۔ بی بی جان بھی منتظر بیٹھی ہیں۔ زرمین بھی اپنا نیا فراک پہن کر خوشی سے پھولی نہیں سما رہی۔ ہمیں آج ہی جانا ہے۔" وہ اٹھلا کر بولی تھی۔

"اچھا..." اس کی پرسوچ آواز ابھری تھی۔

"چلو میں ایسا کرتا ہوں اپنے اسٹاف میں سے کسی کو ڈرائیور کے طور پر بھیج دیتا ہوں۔" اس نے اتنا کہا تھا کہ صوفیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ خود آجائیں نا۔ خالو جان بھی آپ سے مل کر خوش ہو جائیں گے۔ کافی پسند کرتے ہیں آپ کو۔"

"ارے میں کوئی فارغ بیٹھا ہوں۔ دکان داری کا وقت ہے۔ کسٹمرز کا آنا جانا لگا ہے۔ میں کیسے آسکتا ہوں؟" وہ سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ہم کون سا روئی کاتنے جا رہے ہیں۔ سمجھیں یہ گئے اور یہ آئے۔ انہیں کھانے کی دعوت ہی تو دینی ہے۔" صوفیہ کا اصرار جاری تھا۔

"اچھا... میں ایک گھنٹے تک دیکھتا ہوں۔" اس نے اتنا کہا اور ابھی صوفیہ نے اپنی گرم جوشی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا کہ اس کی سماعتوں نے اگلا جملہ سنا۔

"او ہو یار۔ میری گاڑی تو ورکشاپ میں ہے۔ سروس کے لیے چھوڑ کر آیا تھا۔"

"نواب کاشف صاحب آپ کے پاس کون سی ایک ہی گاڑی ہے۔ آپ کے آفس میں تین تین گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔" وہ اٹھلا کر بولی تھی۔ یہ احساس کہ وہ ایک رئیس آدمی کی بیوی تھی نے اسے اتراہٹ میں مبتلا کرنا شروع کر دیا تھا۔

"وہ میرے اسٹاف کے لیے ہیں جناب اور شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا' تمہیں ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ نواب کاشف صاحب کسی کی گاڑی ڈرائیو نہیں کرسکتے۔" وہ بولا تھا۔

"کیوں بھئی؟" صوفیہ کو واقعی اس بات کا نہیں پتا تھا۔ کاشف ہنسا۔

"میں یہ بے وفائی نہیں کرسکتا یار۔"

"یہ کیسی عجیب دلیل ہے۔" صوفیہ بھی ہنسی تھی۔

"دلیل نہیں میری فطرت ہے یہ..." اور اپنی گاڑی کے علاوہ میں کوئی اور گاڑی ڈرائیو کروں تو مجھے بے چینی ہونے لگتی ہے کہ جیسے میں کچھ غلط کر رہا ہوں۔ اس نے لاچاری بھرے لہجے میں کہا پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں کسی دوسرے کی کسی چیز کے ساتھ کمفرٹیبل نہیں رہتا۔ میں نے کبھی کسی کی کوئی چیز استعمال نہیں کی۔ کسی کا کپڑا نہیں پہنا۔ کسی کے بستر پر نیند بھی نہیں آتی مجھے۔ حتیٰ کہ میں اسکول میں بھی کسی کی پنسل' ربڑ یا بال پوائنٹ استعمال کرتے ہوئے بھی کتراتا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" صوفیہ نے گہری سانس

بھری۔ اپنے شوہر کی ان نزاکتوں سے تو واقف تھی وہ۔ اتنے عرصے میں وہ بھی اس کے ساتھ اپنے سسرال یعنی صوفیہ کے میکے جاکر ایک دن بھی نہیں ٹھہرا تھا۔ کھانے کی میز پر بھی وہ اپنی مخصوص کرسی کے علاوہ کسی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھنجلا جاتا تھا۔

"اس لیے میری جان میری مجبوری کو سمجھو۔ اور پلیز آج کا پروگرام ملتوی کردو۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔ صوفیہ اس کے انداز پر پگھل ہی گئی۔

"میں دراصل خالہ کو فون کرچکی ہوں۔ بی بی جان کی آمد کا بھی بتایا تھا انہیں۔ اب وقت ایسا ہے کہ مجھے خدشہ ہے وہ کھانے کا اہتمام نا کرکے بیٹھی ہوں۔ اس لیے مناسب نہیں لگتا کہ اب عین وقت پر ان کو انکار کروں۔" وہ مجبور ہو کر بولی تھی۔ کاشف نے ہنکارا بھرا۔

"ہاں ہاں.... پھر تو ضروری ہی جاؤ بھئی' یہ منظور نہیں ہمیں کہ کوئی ہماری زوجہ کو بدتہذیب سمجھے۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آپ بھجوادیں گاڑی بمع ڈرائیور کے۔ ہم انتظار کررہے ہیں۔" صوفیہ نے ہامی بھری۔

"حکم کی تعمیل ہوگی مادام۔ بس واپسی ذرا ہمارے گھر آنے سے پہلے ہوجائے تو فدوی سدا زندگی آپ کا غلام رہے گا۔" وہ شرارت بھرے لہجے میں التجا کررہا تھا۔ صوفیہ نے ہنستے ہوئے فون بند کردیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"امی میں جارہی ہوں۔" اس نے سر پر دوپٹے کا سرا رکھتے ہوئے بیگ اٹھایا تھا اور پھر کچن کی جانب منہ کرکے

خدا حافظ کہنا چاہا تھا۔ امی نے جواب نہیں دیا تھا لیکن کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں اور اسے اندازہ تھا امی کچن میں ہیں۔ وہ ان کے بیڈ روم کی جانب دیکھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کچن کی طرف آئی۔ اسے اور زری دونوں کو اندازہ تھا کہ امی کا مزاج کچھ ٹھیک نہیں ہے اور پھر رات کو بھی ابا کا انداز دیکھ کر تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ کسی بات پر برہم ہیں۔

امی اور ابا نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا حالانکہ زری گرم کر کے کمرے میں بھی لے گئی تھی لیکن ابا نے تو دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور امی نے ٹرے پکڑ تو لی تھی لیکن آدھ گھنٹے بعد وہ ٹرے کچن میں جوں کی توں رکھ گئی تھیں۔ ان کے والدین کی لڑائی ایسی ہی ہوتی تھی اور یہ بات وہ دونوں بہنیں بچپن سے دیکھتی آرہی تھیں۔ اس کے امی ابا کی عجیب کیمسٹری تھی۔ اس نے ان دونوں کو کبھی زندگی میں بہت زیادہ چیختے چلاتے ایک دوسرے کو کوستے دیکھا یا سنا نہیں تھا۔ ان دونوں کے چہرے اور انداز ہی جتا دیا کرتے تھے کہ کوئی گڑ بڑ ہے۔ ابا کو جب بھی غصہ آتا تھا ان کا چہرہ تن جاتا تھا۔ اور ناک پھول ہوئی رہتی تھی۔ جب جب ابا کا مزاج بگڑتا تھا امی کا کھانا پینا بالکل بند ہو جاتا تھا۔ ابا کی پیشانی پر ایک تیوری امی کی آنکھوں سے کم از کم ایک لیٹر آنسوؤں کی صورت میں بہتا تھا۔ گھر میں سناٹے کا راج ہو جاتا۔ امی بوتل کے جن کی طرح گردن جھکائے ابا کے احکامات پر بھیگی آنکھوں کے ساتھ عمل درآمد کرتی نظر آتی تھیں اور ابا بد مزاج غصیلے انسان کی طرح اینٹھے اینٹھے نظر آتے تھے مگر ایک یا دو دن بعد سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جاتا تھا۔ امی بھول جاتی تھیں کہ انہوں نے رو رو کر اپنی کتنی انرجی ضائع کی تھی یا وہ ابا کی کسی بات پر خفا تھیں جبکہ نینا کو اس صورت حال سے سخت چڑ تھی۔

اس نے کچن میں جھانکا۔ امی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوگئی تھی پھر اس نے بلا ضرورت فریج کھولا' پانی کی بوتل نکالی اور کیبنٹ سے گلاس اٹھاتے ہوئے کن انکھیوں سے امی کو بھی دیکھا۔ حسب توقع ان کی آنکھیں سوجی ہوئی اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔

"امی میں جا رہی ہوں۔" اس نے دو سپ پانی پیا اور دوبارہ سے انہیں اپنے جانے کے متعلق بتایا تھا۔

"جاؤ۔ جہاں مرضی جاؤ۔ جس کا دل جہاں چاہے جدھر چاہے جاؤ۔ مجھے بخشو سب۔" انہوں نے آٹے والے برتن میں ہاتھوں کی مٹھیاں بنا کر زور زور سے مارتے ہوئے کہا تھا۔ نینا کو امی کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔

"کیا ہوا۔ کیوں رو رہی ہیں۔" اس نے بہت نرم لہجے میں پوچھا تھا لیکن امی نے مڑ کر اسے غصیلی نگاہوں سے گھورا تھا۔

"جس کی تمہارے جیسی اولاد ہو اس کے نصیبوں میں رونے کے علاوہ کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ جاؤ یہاں سے۔"

"میں نے کیا کر دیا اب جو مجھ سے خوامخواہ ناراض ہو رہی ہیں آپ" وہ ناک چڑھا کر پوچھ رہی تھی۔ امی نے گندھے ہوئے آٹے کو ایئر ٹائٹ باکس میں رکھ کر کیپ لگایا اور پھر جھٹکے سے فریج کا دروازہ کھولا تھا۔ باکس کو اس میں رکھ کر انہوں نے اسے گھورا تھا۔

"کسی نے کچھ نہیں کیا۔ جو کیا ہے میں نے کیا۔ میں نے ہی تربیت کی ہے تم لوگوں کی ایسی کہ ماں باپ کو زمانے بھر میں ذلیل کراؤ۔ جی بھر کر کرواؤ۔" وہ تنک کر بولی تھیں۔

"مگر پتا تو چلے کہ ہوا کیا ہے؟" وہ نرم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ امی کے آنسو اس کے دل پر براہ راست وار کرتے تھے اسے یاد بھی نہیں آرہا تھا کہ اس سے غلطی کیا ہوئی جو امی اسے اس طرح جلی ہو کر رہی ہیں۔

"تم جاؤ یہاں سے۔ کہا نا کچھ نہیں ہوا۔" وہ اسی انداز میں بولیں۔ نینا کا صبر بھی بس اتنا ہی تھا۔

"اچھا نا سہی۔ جا رہی ہوں میں۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ آج سارا دن گھر میں یہی اسٹار پلس کا ڈراما چلنا ہے گا۔ لیکن امی یاد رکھیے گا آپ کے یہ دو دو لیٹر آنسو ابا جیسے آدمی پر ضائع کرنے کے لیے نہیں تھے۔ ان کو بچا کر

رکھیے۔ ابا کے علاوہ بھی اور لوگ ہیں آپ کے اردگرد جن کے لیے یہ آنسو بہائے جاسکتے ہیں۔" وہ سیڑھیوں کی طرف جاتی ہوئی بولی تھی۔ امی کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

"اللہ کرے نہنا تو مر ہی جائے۔ سکون ہو جائے گا میری جان کو۔ ذلیل کرکے رکھ دیا ہے تیری حرکتوں نے مجھے۔ نا مرتی ہے نا جان چھوٹتی ہے۔" امی اس کے عقب سے چلا کر بولیں۔ وہ تن فن کرتی سیڑھیاں اتری تھی اور وہ دیوان پر بیٹھ کر پھر سے رونے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"عجیب سسٹم ہے ہمارے گھر کا بھی۔" زری نے توے پر پڑے بل دار پراٹھے کا پہلو بدلتے ہوئے یاسیت سے سوچا تھا۔ ابا گھر سے جا چکے تھے اور امی اپنے کمرے میں بند تھیں۔ اسے اندازہ تھا آج سارا دن ایسے ہی گزاریں گی۔ اپنے کمرے میں بند رہیں گی۔ دل چاہے گا تو اٹھ کر آنسو بہاتے ہوئے ابا کی پسند کا کھانا بنائیں گی۔ دل چاہے گا تو اسے مخاطب کرلیں گی ورنہ نہیں۔ جب رات کو ابا آئیں گے اور اگر ان کا غصہ اتر چکا ہوگا ان کا مزاج نارمل ہوگا تو ان کو دیکھتے ہی امی بھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ وہ اپنے اور ان کے لیے معمول کے مطابق ناشتا بنا رہی تھی حالانکہ جانتی تھی کہ ان کو کھلانے کے لیے سخت محنت کرنی پڑے گی۔ اس نے اپنا پراٹھا تو عام گھی سے بنایا تھا لیکن ان کا پراٹھا زیتون کے تیل سے ہلکا سا گریس کیا پھر فریج میں پڑا دو دن پرانا امی کا پسندیدہ بھنڈی گوشت کا سالن نکالا تھا۔ اسے اوون میں رکھا' پھر اپنے لیے بنایا آملیٹ پراٹھا اور چائے کے کپ ٹرے میں سجائے اور پھر اوون کی بیپ بجنے پر اس نے سالن بھی نکالا۔ یہ سب لوازمات لے کر وہ کمرے میں جا رہی تھی کہ پھر کچھ یاد آیا۔ اس نے ٹرے شیلف پر رکھی اور پھر کیبنٹ سے اچار والا جار نکال کر بھی ٹرے میں رکھ لیا۔ امی سالن کے ساتھ اچار بھی شوق سے کھاتی تھیں۔ اور وہ چاہتی تھی کہ امی کچھ نا کچھ کھالیں۔ اس نے اپنی طرف سے ناشتے کی ٹرے کو امی کی مرضی و منشا کے مطابق سجانے کی بھرپور کوشش کی تھی وہ سب لے کر امی کے کمرے میں آگئی۔

"امی آئیں ناشتا کرلیں۔ آج تو ٹی وی بھی نہیں لگایا آپ نے۔ کون آیا ہے آج مارننگ شو میں۔" اس نے روز کے انداز میں مرکزی تپائی پر ٹرے رکھی اور ٹی وی لگا لیا۔ امی دروازے کی طرف پشت کرکے لیٹی تھیں۔ انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا تھا زری نے ٹی وی آن کرنے کے بعد ان کا پسندیدہ چینل لگایا پھر کھڑکی کے پردے ہٹا کر وہ ان کے بستر کی طرف آگئی۔ "امی اٹھیں نا امی۔ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا" وہ بہت قریب سے بولی تھی۔

"جاؤ زری یہاں سے۔ کرلو ناشتا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ میری چائے رکھ جاؤ بس میز پر۔" انہوں نے بازو آنکھوں پر رکھا ہوا تھا لیکن آواز گلوگیر ہو رہی تھی۔ زری کو سخت رنج ہوا "امی ناشتے سے کیا لڑائی ہے آپ کی۔ کچھ تو کھالیں ورنہ شوگر لو ہو جائے گی۔ پلیز اٹھ جائیں۔" اس نے ان کے سر کے نیچے بازو رکھ کر انہیں کسی مریضہ کی طرح اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کی تھی۔

"اچھی بات ہے لو ہو جائے۔ مر جاؤں گی تو ان مصائب سے جان تو چھوٹ جائے گی نا۔" امی بہت آرام سے اٹھ کر بیٹھی تھیں اور روتے ہوئے بولی تھیں۔

"اللہ نا کرے امی۔ کیسی باتیں کر رہی ہیں صبح صبح۔ چلیں اٹھیں۔ ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو کر آئیں۔ اتنا خستہ پراٹھا بنایا ہے میں نے آپ کے لیے۔" زری لاڈ سے بولی تھی۔ امی نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

"زری مجھے بھوک نہیں ہے بیٹی۔ تم کھالو۔ میں چائے پی لیتی ہوں۔" امی نے عاجز ہو کر کہا تھا۔ زری کا خلوص انہیں مزید دکھی کر گیا تھا۔ نہنا اور اس میں کتنا فرق تھا۔

"امی آپ کھائیں گی تو میں کھاؤں گی۔ آپ اٹھیں فریش ہو کر آئیں۔ پھر مجھے بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے۔ ابا کیوں ناراض ہیں۔" اس نے ریموٹ اٹھا کر چینل تبدیل کرنے شروع کیے تھے۔ امی بھی اس کے اصرار پر اٹھ گئی تھیں اور پھر چند لمحوں میں فریش ہو کر آگئی تھیں۔ زری کو دوبارہ کہنا نہیں پڑا تھا۔ وہ رات سے بھی بھوکی تھیں اور بھوک تو انہیں لگ ہی رہی تھی۔ پراٹھا اور بھنڈی کا سالن ان کو ویسے بھی مرغوب تھا۔ ناشتے کی خوشبو اور بیٹی کے اصرار نے، زری نے ہمیشہ انہیں ایک جذباتی سہارا فراہم کیا تھا۔ انہوں نے زری کے کہے بنا ہی کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ زری بھی سکون سے ٹی وی پر میک اپ کے متعلق کوئی پروگرام دیکھتے ہوئے اپنا ناشتا ختم کرنے لگی تھی۔ چائے کا کپ ہاتھ میں آیا تو امی کافی پرسکون ہو چکی تھیں۔"

اب بتائیں کہ کیا ہوا ہے۔" اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"کچھ نہیں۔ بس تمہارے ابا کبھی کبھی بلاوجہ..." انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ زری نے دوسرا سوال نہیں کیا لیکن وہ ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اسے پتا تھا امی بالآخر اسے بتا ہی دیں گی۔ اسے لگتا تھا جیسے اس بات کا تعلق نمنا سے ہی ہے۔

"تمہارے ابا کہہ رہے ہیں میں آپا سے سلیم اور نمنا کے رشتے کی بات کروں۔" امی نے بالآخر اگل دیا تھا۔ زری جتنی حیران ہوئی اس سے زیادہ حیران ہونے کی اداکاری کی۔ نمنا نے اگر اس کے سامنے سلیم کے متعلق اعتراف نا کیا ہوتا تو شاید اسے زیادہ شاک لگتا۔

"انہیں نمنا کی سلیم کے ساتھ حد درجہ بے تکلفی کی وجہ سے غلط فہمی ہوگئی ہے کہ..." وہ چند لمحے خاموش رہیں۔ بیٹی کی سامنے مناسب الفاظ تلاش کرنا بھی بڑی ہمت کا کام تھا۔

"انہیں شک ہو گیا ہے کہ نمنا اور سلیم کے درمیان کچھ سلسلہ ہے۔" انہوں نے لاچار لہجے میں اگل ہی دیا پھر یہ سوچ کر کہ بیٹی کو باپ سے متنفر نہیں کرنا بعجلت اگلا جملہ بولا۔

"ان کا بھی کیا قصور ہے بھلا۔ کوئی بھی باپ وہم کا شکار ہو ہی سکتا ہے یہ سب دیکھ کر۔ بتاؤ اسے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے بچے کے ہاتھ میں وہ پرچی دیکھ لی۔ تب سے آگ بگولا ہوئے ہیں۔ پہلے ہی ناراض رہتے ہیں کہ اسے کیا ضرورت ہے صبح شام اس کی دکان پر حاضری دینے کی۔ اور پھر خود بتاؤ سیڑھیوں چبوتروں پر بیٹھ کر بلاوجہ ہی ہو ہو کرتے رہنا کوئی مناسب بات ہے کیا۔ کسی کو بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ تمہارے ابا اسی بات پر ناراض ہیں۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ میں آپا سے آج ہی بات کروں کہ وہ نکاح کر کے لے جائیں اسے۔ تمہارے ابا اتنے غصے میں تھے کہ کہہ گئے ہیں ایک مہینے کے اندر اندر اسے رخصت کر دیں گے۔ سب کچھ اس نمنا کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے مجھے باپ کے سامنے شرمندہ کروا کر رکھ دیا ہے۔ تم ہی کہو کیسے دور کروں میں ان کی غلط فہمی" وہ سب بتاتے ہوئے روئی تو نہیں تھیں لیکن لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ زری نے سر ہلایا پھر جھجک کر بولی۔

"امی کیا پتا یہ غلط فہمی نا ہو۔ میرا مطلب... نمنا کی سلیم کے ساتھ..." وہ کچھ کہتی کہتی رک گئی تھی۔

"میرا مطلب انڈر اسٹینڈنگ تو ہے دونوں میں۔ یہ تو حقیقت ہے۔" اسے مناسب لفظ مل گیا تھا۔ امی نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"زری اس نے کبھی کچھ کہا تم سے اس بارے میں۔" زری نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔ ہاں کہہ دینے کی صورت میں نمنا نے اس کا سر پھاڑ دینا تھا۔

"اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن امی مجھے لگتا ہے وہ سلیم کو پسند تو کرتی ہے۔ آپ خود دیکھیں نا اس کے ساتھ جتنی فرینک ہے اتنی کسی کے ساتھ نہیں ہے۔" اس نے بعجلت کہتے ہوئے اپنا موقف واضح کیا تھا۔ امی نے سر جھٹکا۔

"اس بات سے کون کمبخت انکار کر رہا ہے کہ وہ اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہے۔ اگر کسی سے ہنس کر بات کر لیتی ہے تو وہ سلیم ہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اپنی بہن سے رشتہ مانگنے چل پڑوں۔ ان کا تو جوڑ ہی نہیں ہے کوئی۔" وہ اکتا کر بولی تھیں۔ زری نے سر ہلایا پھر جب بات سمجھ میں آئی تو فوراً" بولی۔

"امی ویسے سلیم اچھا لڑکا ہے۔ خیال رکھنے والا۔ تمیزدار ہے۔ اب اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا اس میں اس کا کیا قصور۔ یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا نا۔ وہ کیوں ناپسند ہے آپ کو۔" اس نے ایک اور سوال پوچھا تھا۔ امی کے چہرے کے تاثرات مزید اکتاہٹ کا شکار ہوئے۔

"میں کیوں ناپسند کروں گی۔ میری بہن کی اولاد ہے۔ مجھے اپنی اولاد کی طرح پیارا ہے۔ ناپسند تمہارے ابا کو ہے۔ بلکہ سخت خار کھاتے ہیں اس سے۔ اور نینا یہ بات جانتی ہے لیکن پھر بھی جان بوجھ کر انہیں غصہ دلانے کی غرض سے یہ سب کرتی ہے۔ مجھے کتنی باتیں سننی پڑی ہیں اس کی وجہ سے۔ کہتے ہیں یہ کیسی تربیت کی ہے بیٹی کی تم نے۔ تمہاری ناک کے نیچے خط و کتابت ہو رہی ہے اور تم سوئی ہوئی ہو جیسے۔ اب بتاؤ میں بولوں بھی تو کیا بولوں۔" امی کی آنکھوں سے پھر پانی ٹپکا تھا۔

"وہ خط وط نہیں تھا امی۔ میں وہیں بیٹھی تھی۔ اپنی کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں حمزہ کی نوٹ بک سے کچھ پھاڑ کر کچھ پوچھ رہی تھی وہ اس سے کچھ۔" زری نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"دیکھو زری' خط تھا یا نہیں تھا۔ جو بات غلط ہے وہ غلط ہے۔ لڑکیوں کو ایسے کام نہیں کرنے چاہیے جن سے ان کی حرمت پر نقطہ برابر بھی حرف آئے۔" ان کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ زری کے موبائل پر بیپ بجی تھی اور پھر بجتی چلی گئی تھی۔ واٹس ایپ مسیج موصول ہو رہے تھے۔ اسے یکدم شرمندگی سے محسوس ہوئی۔ اسے لگا امی نینا کو نہیں اسے اشاروں میں کچھ کہہ رہی ہیں۔ اس نے سیل فون اٹھا کر اس کی بیپ بند کر دی تھی۔

"امی آپ اسے ایک بار پیار سے سمجھا دیں نا۔ آپ سمجھائیں گی تو وہ سمجھ جائے گی۔" اپنی شرمندگی کو کم کرنے کی خاطر اس نے مشورہ دیا تھا۔

"پیار سے خاک سمجھتی ہے وہ۔ اسے پتا چل گیا نا کہ اس کے باپ نے سلیم کے ساتھ بے تکلف ہونے سے منع کیا ہے تو یقین کرو۔ تین وقت کھانا بھی اس کی دکان پر بیٹھ کر کھانا شروع کر دے گی۔" امی بے زار کن لہجے میں بولی تھیں۔ زری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ہنکارا بھر کر سیل فون اور برتن اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔



✡ ✡ ✡

سالگرہ والا دن ایک یادگار دن تھا۔ شاید کبھی نا بھولنے والا۔

وہ ایمن کی سالگرہ تھی اور راپنزل اس کی سالگرہ والے دن ہر چیز پر حاوی تھی۔

ہال کی پوری دیوار پر وال اسٹیکر چسپاں تھا جس میں بھوری بھوری اینٹوں والا وہ قلعہ خوب نمایاں ہو رہا تھا۔ پوری دیوار کے ساتھ اتنی بڑی تصویر لگانے سے پورا ہال ہی کچھ مختلف مگر خوب صورت لگنے لگا تھا۔ اسٹیکر بنواتے وقت تصویر کے رنگوں کو بہت شوخ کر کے پرنٹ کروایا گیا تھا۔ جو دیکھنے میں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ قلعے کی کھڑکی بھی خوب بڑی کر کے بنائی گئی تھی اور اس میں موجود لڑکی کے فراک اور اس کے لمبے بالوں کا رنگ بہت گہرا کیا ہوا تھا۔ اس کے بال بالکل زمین تک آ رہے تھے اور پہلی نظر میں صرف بال ہی تھے جو ساری دیوار پر بکھرے نظر آتے تھے۔ اس کے چہرے پر ایمن کے چہرے کی بڑی سی تصویر بالخصوص فوکس کر کے لگائی گئی تھی۔ دیوار پوری طرح سج گئی تھی اور اس کے علاوہ بھی پورے ہال میں یہی تھیم نمایاں تھی۔ ڈسپوزیبل کپس' پلیٹس' کیپس اور گڈی

بھکس پر بھی یہی کردار نمایاں تھا۔
ایمن کا فراک خوب گھیردار اور لمبا تھا جو اس کے پاؤں تک آ رہا تھا۔ اس کے اپنے بال بھی لمبے تھے لیکن راپنزل کا گیٹ اپ دینے کے لیے اس کو مصنوعی بالوں کی چٹیا بھی لگائی ہوئی تھی۔ شہرین نے اسے باقاعدہ پارلر سے تیار کروایا تھا۔ اس چار سالہ بچی نے اتنی گیدر رنگ پہلی مرتبہ دیکھی تھی پھر اس کا لباس اور بال خوب بھاری بنادیے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ گھبرائی گھبرائی سی بیٹھی تھی۔ شہرین نے خود نمائی کی حد کردی تھی۔ اس نے ملازمین کی بات کو ذہن پر اتنا سوار کرلیا تھا کہ ایک سالگرہ کی تقریب کرنے کے لیے ہی شادی کے ولیمہ جتنا خرچ کرلیا تھا۔ سمیع کے کولیگز اپنی جان پہچان کے لوگ اور پڑوسیوں کے علاوہ تقریب کے مہمان خصوصی اس کے میکے کے لوگ تھے جنہیں اس نے بہت تاکید اور اصرار کرکے بلوایا تھا۔ سمیع کو اس کی خوشی اس قدر عزیز تھی کہ اس نے چاہتے ہوئے بھی اسے ایسا کرنے سے روکا نہیں تھا لیکن اس نے اپنے گھر والوں کو انوائٹ نہیں کیا تھا۔
اسے پتا تھا کہ فیصل آباد سے اس کے گھر والے بھی نہیں آئیں گے۔ اسے خدشہ تھا کہ شہرین کی امی اور بہنیں بھی نہیں آئیں گی اور شہرین کو ہونے والے دکھ کا سوچ کر وہ بے چین بھی تھا لیکن توقع کے بالکل برعکس اس کی امی دو بہنیں اور بھابھی اپنے بچوں کے ساتھ پارٹی میں آگئی تھیں۔
جب یہ لوگ آئیں تو پارٹی اپنے عروج پر تھی۔ تمام ہی مہمان آچکے تھے۔ سمیع ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا تھا اور شادی کے ابتدائی مہینوں کے بعد سے اس کی ان سے بات چیت بالکل بند تھی لیکن پھر بھی ان کو دیکھ کر اسے اچھا لگا تھا۔ کیک ان کی آمد کے بعد ہی کاٹا گیا تھا پھر جب سب اپنی اپنی پلیٹ لے کر ادھر ادھر بکھر گئے تو شہرین ایمن کو بطور خاص اپنی امی اور بہنوں کے پاس لے آئی تھی۔
"یہ ایمن تو بالکل تمہارے جیسی ہے شہرین۔" اس کی بھابھی نے ایمن کو دیکھ کر کہا۔ وہ سب ایمن کو پہلی بار مل رہے تھے اور شہرین کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے ایمن کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھابھی کے سامنے کیا تھا۔
"ہاں جی۔ سب یہی کہتے ہیں۔" وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی تھی۔ یہ بھابھی اس کی خوب صورتی کو ہمیشہ سراہتی آئی تھیں۔ شہرین کو ان کی بات سن کر بہت فخر محسوس ہوا تھا۔
"سب یہی کہتے رہیں گے۔ یہ بالکل تمہارے جیسی ہے اور اس کی عادتیں حرکتیں بھی تمہارے جیسی ہی ہوں گی۔" اس کی بڑی بہن نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ شہرین نے طنز بھانپ لینے کے باوجود اپنی مسکراہٹ کو بحال رکھا تھا۔
"بیٹیاں ماؤں جیسی ہی تو ہوتی ہیں باجی۔" وہ سہلا کر بولی تھی۔ اس کی امی نے ہنکارا بھرا۔
"کچھ بیٹیاں رنگ روپ تو ماؤں سے لے لیتی ہیں لیکن عادات میں ماؤں پر نہیں پڑتیں۔ تم جتنی خودسر اور ضدی تھیں اتنی تو میری کوئی اور بیٹی نہیں ہے۔"
شہرین نے امی کی بات پر ان کی جانب دیکھا۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ سمیع اور اس کی شادی والی بات اور اسی ضمن میں کی گئی ضد کا حوالہ دے رہی تھیں۔ اور وہ جب بھی بھی اس سے ملتی تھیں یہ حوالہ دینا بھولتی نہیں تھیں۔ اس نے مصنوعی انداز میں مسکرانے کے لیے ہونٹ پھیلاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کے ساتھ دعا بھی کی تھی کہ سمیع کہیں قریب نا ہو، لیکن وہ پاس ہی اپنے کولیگ اور ان کی مسز سے باتیں کررہا تھا۔ شہرین کو اس کے چہرے کے بدلتے رنگ صاف نظر آئے تھے۔
"اللہ نا کرے ایسی خودسر کسی کی بیٹی ہو۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے بڑی آزمائش ہوتی ہے پھپھو۔" اس کی بھابھی نے ناک چڑھا کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ شہرین کا چہرہ بالکل سپاٹ ہوگیا تھا۔ اپنی اولاد کی خوشی میں اس نے کسی کو بھی کوسنے بددعائیں دینے کے لیے تو نہیں بلایا تھا۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں بھابھی لیکن شہرین کی بیٹی تو شہرین سے بھی دو ہاتھ آگے ہوگی۔ ابھی سے تربیت ایسی کررہی ہے شہرین۔ آپ نے دیکھا نہیں اس نے سالگرہ کی تھیم کیسی چنی ہے۔ راپنزل۔" اس کی بہن نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔
"یہ تصویر دیکھیں نا ذرا... کمرے کی چار دیواری میں جب کوئی رستہ نہیں نظر آیا تو لڑکی نے اپنی زلفوں سے ہی لڑکا پھنسالیا۔ آنکھ مٹکا کر کے جی نا بھرا تو خوب طریقہ ڈھونڈا کہ اپنی زلفوں سے باندھ کر یار کو کمرے میں بلوالیا۔ واہ واہ۔"
یہ اس کی بھابھی کے الفاظ تھے جو سیسہ بن کر شہرین کے کانوں میں اترے تھے۔ اس بھابھی کے بھائی سے شہرین کی بچپن میں منگنی ہوئی تھی۔ بہت سی نگاہیں ان کی بلند آواز کے باعث ان کی جانب مبذول ہو چکی تھیں۔ راپنزل کی تشریح پر وہی نگاہیں دیوار کی جانب گئی تھیں جس پر سالگرہ کی تھیم کا بڑا سا اسٹیکر چسپاں تھا۔ سمیع کی برداشت اتنی ہی تھی۔ وہ سرخ چہرہ لیے آگے آیا تھا۔
"چپ کریں آپ لوگ... آپ کو ہماری بے عزتی کرنے کے لیے انوائٹ نہیں کیا گیا۔" شہرین کی امی نے اس کی بات کاٹ دی۔
"تم تو چپ ہی رہو چوہدری سمیع صاحب... تم نیچ ذاتوں کو کیا پتا کہ بے عزتی کیا ہوتی ہے۔ جن کی اپنی کوئی عزت ہی نا ہو انہیں اس لفظ کے مطلب بھی کیا پتا ہوں گے۔ تم نے پٹھانوں میں جنم لیا ہوتا تو پتا چلتا کہ عزت کسے کہتے ہیں۔ کسی کی بیٹی پر ڈورے ڈالنے والے ہمیں سکھائیں گے عزت کیا ہوتی ہے۔ تم تو دیکھنا تمہارے ساتھ اللہ کیا کرے گا۔ ہر سانس کے ساتھ بددعا نکلتی ہے میرے دل سے تمہارے لیے... یہ چار سال کی ہوئی نا تمہاری اولاد ابھی... چند سال اور گزرنے دو پھر دیکھنا کیسے تمہارے شملے میں تارے ٹانکے گی۔ سارے زمانے میں تمہاری پگڑی نا اچھالی اس نے تو میرا نام بدل دینا... ان شاء اللہ... میری بددعا ہے تجھے شہرین... جیسے میرا دل توڑا تو نے... اپنے باپ کو رسوا کروایا نا... تیری بیٹی بھی یہی کرے گی تیرے ساتھ... بالکل یہی..." وہ چلا رہی تھیں۔ شہرین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ان سب کی جانب دیکھا پھر وہ جھول کر پاس پڑے کاؤچ پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے۔" حبیبہ نے اپنی ڈرنک والا گلاس ہاتھ میں لے کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔
"یہ کیسا سوال ہے؟" کاشف مسکرایا تھا۔ ان کے تعلقات کو کافی مہینے گزر چکے تھے اور اس دوران حبیبہ نے پہلے کبھی یہ سوال نہیں کیا تھا۔ وہ ایک دل پذیر میٹھے جھرنے کی طرح اس کی زندگی میں نرمی سے بہتی چلی جارہی تھی یعنی کاشف کا جب دل چاہتا تھا اس میٹھے جھرنے کے پانی سے لطف اندوز ہولیتا تھا اور جب دل چاہتا تھا اس سے کنی کترا کر اپنے معمول کی زندگی گزارنے لگتا تھا۔ اتنے مہینوں میں وہ اتنا تجربہ کار تو ضرور ہو چکا تھا کہ یہ سیکھ لیتا کہ ذہنی سکون اور عیاشی کو کیسے الگ الگ خانوں میں رکھنا ہے۔
اب صوفیہ بے خبر رہنے لگی تھی تو خوش رہنے لگی تھی جس سے گھر کا ماحول بھی پرسکون ہو گیا تھا اور ظاہر ہے اس کا کاشف پر مثبت پڑا تھا۔ گھر بار دونوں طرف بہت سکون ہو گیا تھا۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا، لیکن اس ساری صورت حال میں جو سب سے زیادہ ناخوش تھا وہ حبیبہ تھی۔
اسے چند مہینوں میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس کے لیے نقصان کے سودے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ کاشف

کی ظاہری شخصیت کی چمک دمک سے متاثر ہو کر اس کی زندگی میں شامل تو ہو گئی تھی، لیکن اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ مجید کی زندگی میں بھی وہ آزادانہ روش والی عورت تھی۔ اب سے نہیں، بہت عرصے سے وہ ایک سوشل بٹر فلائی بنے رہنے میں خوش تھی۔ اسے وجیہہ مرد بھاتے تھے ان کی معیت میں وہ بہت خوش رہتی تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا جب لوگ اس کے لباس، شخصیت، اس کے حسن کو سراہتے تھے، کمپلیمنٹ پاس کرتے تھے، لیکن وہ ایک خوش حال عورت تھی اور ایک مرد کی منکوحہ تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے کوئی اس کے لیے کوئی غلط الفاظ استعمال کرے۔ اس کی غیر موجودگی میں کوئی کچھ بھی کہتا، لیکن اس کے سامنے سب اسے سراہتے تھے، اس کی عزت کرتے تھے۔

کاشف کی زندگی میں شامل ہو کر وہ اپنی مرضی کے برعکس زندگی گزار رہی تھی۔ اس کی سوشل لائف ختم ہو کر رہ گئی تھی کیوں کہ ان کے سرکل میں سب جان چکے تھے کہ اس کا اور کاشف کا مخفی افیئر چل رہا ہے۔ وہ خود کو کاشف کی "دوست" بنائے رکھنے میں تو خوش تھی، لیکن یہ اسے منظور نہیں تھا کہ لوگ اسے بی گریڈ عورت یا طوائف کہتے اور وہ بھی اس عورت کے مقابلے میں جو شکل عقل میں اس سے بے حد کمتر تھی۔ اسے صوفیہ سے سخت جلن محسوس ہوتی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی اور چونکہ وہ خود کو عام عورتوں سے مختلف قرار دیتی تھی اس لیے اپنے اندر کے حسد جلن اور ذہنی کشمکش کو ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن ایک روز وہ یہ بات کر ہی بیٹھی تھی۔

"یہ سوال لگ رہا ہے تمہیں؟" اپنے لہجے میں سادگی شامل کر کے وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کی سلیولیس قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے، ہمیشہ کی طرح بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اور کیا ہے یہ؟" کاشف نے صوفے پر ذرا سا ترچھا ہو کر اپنا سارا رخ اس کی جانب مبذول کیا تھا۔

"یہ میری رائے ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم شادی نہیں کرو گے مجھ سے۔" وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے اپنے بارے میں نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ کاشف نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"شادی بہت بڑی ذمہ داری ہے بھئی اور میں تو پہلے ہی ایسی ایک ذمہ داری کا طوق گلے میں ڈالے ادھ موا ہوا پڑا ہوں۔۔۔ میں مزید یہ بوجھ کیسے برداشت کر سکتا ہوں۔ رحم سرکار رحم۔۔۔ بندہ عاجز پر اتنا ظلم نہ کریں۔" وہ اسی کے انداز میں، لیکن ہنستے ہوئے بولا۔ حبیبہ ہنسی تو نہیں، لیکن اس کی مسکراہٹ کافی دل نشین تھی۔

"یہ بوجھ، ذمہ داریاں، مسائل، مجبوریاں خوب صورت عورتوں کی ڈکشنریوں میں نہیں ہوتے۔۔۔ یہ تو صوفیہ کاشف جیسی عام عورتوں کے دکھڑے ہیں۔ میں بوجھ ڈالنے نہیں بوجھ بانٹنے پر یقین رکھتی ہوں۔"

"اچھا کرتی ہو۔۔۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں۔"

"تمہاری سوچ کافی ملتی جلتی ہے۔" حبیبہ مسکرائی تھی۔

"صرف سوچ ہی نہیں۔۔۔ ہمارے دل بھی ملتے ہیں۔ تب ہی تو سب کچھ بھول بھال کر یہاں تمہارے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ جتنا وقت گزرتا ہے وہ میری زندگی کا بہترین وقت ہوتا ہے۔" کاشف نے اپنے لہجے میں حتی المقدور سچائی سمو کر اس برے رویے کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی جو شادی جیسے اہم موضوع پر انکار کر کے اس نے حبیبہ کے ساتھ برتا تھا۔

"مجید بھی یہی کہا کرتا تھا۔" حبیبہ نے نہ جانے کتنے دن بعد مرحوم شوہر کو یاد کیا تھا۔ کاشف نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا بات ہے۔ آج تو پرانی فلمی ہیروئنوں کی طرح بہت جذباتی ہو رہی ہو۔ مرحوم شوہر کا ذکر کر رہی ہو۔ کہیں

مجید کو خواب میں تو نہیں دیکھ لیا تھا رات۔" وہ مذاق اڑا رہا تھا۔
"اتنے ڈراؤنے خواب نہیں دیکھتی میں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔ کاشف نے پھر بلند و بانگ قہقہہ لگایا تھا۔
"اچھا کرتی ہو۔" وہ اپنی ڈرنک والا گلاس اس کے گلاس سے چھو کر بولا۔
"میں نے ہمیشہ منفرد اور اونچے خواب دیکھے ہیں اور ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے محنت کی عادت بھی ہے مجھے۔" وہ پھر اسی نزاکت بھرے لہجے میں بولی جو اس کا وطیرہ تھا۔ کاشف کی کولڈ ڈرنک ختم ہو چلی تھی۔
"کیا بات ہے۔ آج تو اپنی ہی تعریفیں کیے چلی جا رہی ہو۔" وہ لہجے میں مزاح کا عنصر پیدا کر کے بولا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس بے کار کی گفتگو سے بوریت کا شکار ہونے لگا تھا۔
"تم تو میری تعریف کرو گے نہیں۔۔۔ میں نے سوچا میں ہی کر لوں۔" اب کی بار حبیبہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لہجے کی شکستگی چھپا نہیں پائی تھی۔ کاشف نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر نرمی سے اپنی انگلیاں اس کی ہتھیلی پر مسلتا ہوا بولا۔
"بہت قیمتی ہو تم میرے لیے۔۔۔ تم نے کبھی کلی دیکھی ہے، جو کوٹ کے اوپر سجائی جاتی ہے، جس سے پورا کوٹ سج جاتا ہے۔ وہ کلی ہو تم میرے لیے۔۔۔ یہاں پر سجا کے رکھا ہوا ہے تمہیں۔۔۔ یہاں۔۔۔ اپنے دل میں۔" اس نے اپنا دوسرا ہاتھ سینے پر رکھا تھا۔ حبیبہ کے چہرے پر مسکراہٹ بڑھی۔
"جب اتنا ہی قیمتی سمجھتے ہو مجھے تو پھر اپنانے سے ڈرتے کیوں ہو۔" وہ سوال پر سوال کر رہی تھی۔ کاشف نے اس کا ہاتھ ابھی بھی نہیں چھوڑا تھا۔
"اپنانا کسے کہتی ہو تم۔۔۔ تمہیں اپنا ہی تو رکھا ہے۔ گھر میں بیوی بچی کو چھوڑ کر تمہارے پاس بیٹھا رہتا ہوں اور کیا کروں، بتاؤ۔" وہ مزید محبت سے اس کے ہاتھ کو سہلانے لگا تھا۔
"تم شادی نہیں کرو گے مجھ سے۔" اس نے وہی بات دہرائی جو وہ دہرانا چاہتی تھی۔
"اب یہ کیا۔۔۔ سوال یا رائے یا پھر تمہارا اندازہ۔۔۔؟" کاشف کے چہرے پر سنجیدگی ابھری تھی۔ حبیبہ نے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔ ان دونوں کے دل میں کیا چل رہا تھا وہ دونوں ہی اس بات سے ناواقف تھے۔

★ ★ ★

"میں اگر یہ کہوں کہ یہ میرا مطالبہ ہے۔۔۔ تو۔۔۔؟" حبیبہ اب اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ کاشف نے قہقہہ لگایا۔ اتنا اونچا کہ ہر دوسری آواز اس قہقہے کی آواز میں دب کر رہ گئی لیکن یہ ایک بے کار، کسی بھی جوش یا حقیقی خوشی سے مبرا قہقہہ تھا کیونکہ جعلی ہمیشہ خالی ہوتا ہے۔
"تو میں یہ کہوں گا کہ جی بھر کر کرو۔۔۔ یہ تمہارا حق ہے۔۔۔ آخر حسن والے مطالبے نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔" وہ بات کرتا اس کے مزید قریب ہوا۔ حبیبہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ کاشف کو اللہ نے صرف شکل سے ہی نہیں نوازا تھا۔ وہ گفتگو کے فن میں بھی ماہر تھا۔ اسے بات کو اپنی مرضی کی جانب موڑنا بخوبی آتا تھا۔
"تم میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع ہو۔۔۔ تم مطالبے نہ کیا کرو۔۔۔ حکم کیا کرو۔" وہ لہجے میں شہد جیسی مٹھاس سمو کر بولا تھا۔ حبیبہ کو بس اسی انداز نے ہی ٹریپ کر رکھا تھا۔ یہ بات فی الوقت دب گئی لیکن چند دن بعد پھر حبیبہ نے یہ موضوع چھیڑ دیا۔ کاشف اکتا کر اس روز اپنے گھر جلدی واپس آ گیا۔ حبیبہ اور اس کے درمیان بحث معمول بنتی جا رہی تھی۔ کاشف کے پاس تو اپنے گھر بیوی بچی کا آسرا تھا۔ وہ وقت کو گزار سکتا تھا لیکن حبیبہ کے پاس ایسی کوئی سپورٹ نہیں تھی۔ اس سے وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ اسے تو یہ فیصلہ کرنا ہی تھا اور اس نے کر لیا۔

☆ ☆ ☆

"سلیم کے بچے کتنے وہ ہو نا تم۔" وہ کیمپس سے واپس آئی تو عادت اور روٹین کے مطابق پہلے اس کی دکان پر آئی تھی اور قریب آتے ہی چلائی تھی۔ سلیم نے انجان پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے گردن اچکائی' پھر منہ بنا کر بولا۔
"کتنے وہ سے کیا مراد ہے۔ دو درجن ہوں میں... خوش؟" وہ استفہامیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔
"دو درجن...؟" وہ اسی انداز میں چلائی تھی۔
"صحت دیکھی ہے اپنی مسٹر دو درجن... جتنا تمہارا وزن ہے نہ امریکہ اور یورپ میں لوگ اتنے وزن کی بال سے رگبی کھیل لیتے ہیں۔ تمہاری یہ بیساکھی نہ ہو تو شمال سے آنے والی ہوائیں تمہیں اڑا کر جنوب میں پھینک آئیں۔" وہ اسی طرح ناک چڑھا چڑھا کر بولا تھا۔
"اور تم خود تو جیسے شاہدہ منی ہو نا... جتنا تمہارا وزن ہے نا اس سے زیادہ وزن تو ٹنڈولکر کے بلے کا ہو گا۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا' کیونکہ وہ بھی دبلی پتلی ہی تھی۔
"اچھا ٹھیک ہے... اب فلموں اور کرکٹ کی باتیں کر کے یہ مت بتاؤ مجھے کہ تمہاری جنرل نالج بہت اچھی ہے۔ میں یہ بات تب تک نہیں مان سکتی جب تک مجھے اپنے کام کا پتا نہ چل جائے۔" وہ لاجواب ہو کر اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے بولی تھی۔
"کون سا کام؟" سلیم نے سوال کیا تھا۔ نینا نے آنکھیں پھیلائیں۔
"تم میرا کام کیسے بھول سکتے ہو... اسی لیے کہا تھا کہ کتنے وہ ہو تم۔" وہ دوبارہ چلا کر بولی۔
"بی بی نینا صاحبہ آپ کوئی ایک کام کہتی ہیں مجھ سے... دن میں ستر بار کام پڑتے ہیں آپ کو مجھ نا چیز سے..." اس نے ہیل چیئر کو گھسیٹ کر آگے کیا تھا۔ نینا نے آنکھیں پھیلائیں۔
"احسان جتانے کی بجائے اللہ کا ہزار ہا شکر ادا کیا کرو کہ میں تم سے کام کروا کر تمہیں عزت بخش دیتی ہوں۔ خوش قسمتی ہے یہ تمہاری کہ تم میرے کام آ رہے ہو' ورنہ تمہاری یہ ننھی سی جان اس سڑی ہوئی دکان میں سڑ سڑ کر سیاہ ہو جاتی۔" وہ ہاتھ کاؤنٹر پر مار کر بولی۔
"وہ... مجھے ایک بات بتاؤ... تمہیں میری دکان سے کیا مسئلہ ہے... میری دشمنی میں اس بے چاری کو کیوں گھسیٹ لیتی ہو... جانتی ہو نا کتنی محبت ہے مجھے اس سے..." وہ مصنوعی انداز میں چڑ کر پوچھ رہا تھا۔ نینا نے کاؤنٹر پر پڑے ٹافیوں وغیرہ کے ڈبوں میں سے اپنی پسند کی ببل گم نکالی تھی۔
"خدارا... اب مجھے اپنی اور اپنی اس دکان کی عشقیہ داستان نہ سنانا... میں رونا نہیں چاہتی۔" وہ ریپر اتار کر ببل منہ میں رکھ رہی تھی۔ سلیم کو اس کی بات پر ہنسی آئی۔
"اچھا تو تم بتادو... کیا سننا چاہتی ہو تم؟" وہ بالآخر مدعے پر آگیا تھا۔
"وہ میرے خالہ زاد بھائی... میرے پرچون کی دکان والے کزن... میری خالہ کے اکلوتے بیساکھی والے بیٹے' تمہیں کل ایک پرچی بھیجی تھی' جس پر راہنزل لکھ کر بھیجا تھا۔ آیا کچھ یاد... وہی پرچی جس پر تم نے پھول بوٹے بنا کر واپس کردی تھی... اور پھر میں نے..." وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھی کہ سلیم نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کروایا' پھر پوچھا۔
"بس... بس... آگیا یاد... راہنزل کا پوچھا تھا نا تم نے؟"
"ہاں جی... رانیہ کا مسئلہ بتایا تو تھا۔" نینا اب کاؤنٹر والے چبوترے سے اتری تھی۔
"رانیہ کو چھوڑو... راہنزل کی بات کرو... کتنا اچھا اسکیچ بنا کر بھیجا تھا میں نے تمہیں۔" وہ اسے اس کی پوچھی گئی بات بتانے کی بجائے اپنی تعریف اپنے منہ سے کرتے ہوئے اترایا تھا۔
"میں نے بھی تو جواباً "کتنا اچھا اسکیچ بنایا تھا۔ اس کی تعریف بھی تو کرو۔" وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔

"تم نے تو جواب ہی نہیں دیا۔ اسکیچ تو دور کی بات ہے۔" سلیم نے جتایا۔ نینا نے مصنوعی قہقہہ لگایا۔
"ہاہا... اب تو یہی کہو گے تم۔ اتنا مزے کا جواب، جو دیا تھا میں نے۔" وہ چڑا رہی تھی۔
"کون سا جواب... حمزہ تو واپس ہی نہیں آیا وہ پرچی لے کر۔" سلیم کو یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے، جبکہ اس نے ناک پھلائی۔
"کیا حمزہ کا بچہ واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی تو آج میرے ہاتھوں وہ شامت آئے گی کہ یاد رکھے گا۔ شام کو خبر لیتی ہوں اس کی۔" نینا نے بلاوجہ مڑ کر اس سمت میں دیکھا جس طرف حمزہ کا گھر تھا۔ سلیم ایک ثانیے کے لیے کچھ نہیں بولا، پھر اس نے وہیل چیئر کو بالکل کاؤنٹر کے قریب کیا تھا۔
"اچھی بات ہے وہ نہیں آیا... مناسب بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ خط یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں لے کر آتا۔ کوئی دیکھ لیتا تو نہ جانے کیا سمجھتا۔" اس نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا تھا۔
"ارے اس میں نامناسب کیا ہے۔ وہ کوئی عشقیہ خطوط نہیں تھے۔ ایک عام سی پرچی تھی جس پر صرف ایک لفظ "راہنزل" لکھا ہوا تھا۔" وہ بہت ہی برا مان کر بولی تھی۔ سلیم نے سر ہلایا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ بات سمجھے بنا غصہ کر جاتی تھی۔
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو یار... لیکن لوگ اپنے حساب سے جج کرتے ہیں، اپنے ذہن سے سوچتے ہیں۔ مجھے نامناسب لگا اس لیے میں نے کہہ دیا۔ مجھے اسکیچ بنا کر بھجوا دینے کے بعد احساس ہوا کہ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے۔" وہ اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"اوہو... خیر ہے... سارا محلّہ مجھے جانتا ہے... اور خیر سے تمہیں بھی سب جانتے ہیں... انہیں پتا ہے کم از کم نینا، سلیم کو لو لیٹر نہیں لکھ سکتی۔" وہ ناک سے مکھی اڑا رہی تھی۔
"اوہو نینا... کیسے کیسے الفاظ استعمال کرتی ہو... لو لیٹر، عشقیہ خطوط... اچھا نہیں لگتا... میں تمہیں کیا سمجھا رہا ہوں اور تم..." وہ پھر اسے ٹوکتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ گیا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ اب گھر کی سمت ہوئی تھی۔
"اب غصہ کر گئی ہو نا... ویسے تمہارا مزاج بالکل خالو جیسا ہے۔ گھڑی میں تولہ... گھڑی میں ماشہ۔" وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بولا تھا۔
"اتفاق سے میں تمہارے خالو کی بیٹی ہوں نا تو مزاج ان ہی سے ملنا تھا۔ اب ڈاکٹر عامر لیاقت سے تو ملنے سے رہا۔" وہ بنا مڑے، بنا اس کی جانب دیکھے بولی تھی اور پھر اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی تھی اور اسی لمحے اسے یاد آیا تھا کہ ابا بھی تو اسی وقت گھر آئے تھے جب اس نے وہ کاغذ کی پرچی حمزہ کے ہاتھ واپس بھجوائی تھی۔ سیڑھیوں تک پہنچنے میں وہ دل ہی دل میں اس بات پہ یقین ہو چکی تھی کہ ابا کا موڈ اسی لیے خراب ہوا تھا کہ انہوں نے وہ پرچی دیکھ لی تھی۔ سلیم کو جو بات نامناسب لگ رہی تھی۔ ابا کے لیے تو وہ بات بہت ہی زیادہ بری تھی۔ ہونٹ چباتے ہوئے وہ چند لمحے ایسے ہی دروازے پر کھڑی رہی تھی، پھر عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی تھی۔
"مزے کی بات ہے... انجوائے کریں ابا... میں بھی یہ ہی کر رہی ہوں۔" پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے اس نے خود کلامی کی تھی۔

☆ ☆ ☆
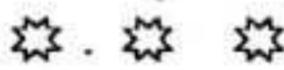
"مجھے مجید کی سب انویسٹمنٹ واپس چاہیے۔" حبیبہ نے بالآخر اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ کاشف

نے حیران نہ ہونے کی بھرپور اداکاری کی اور اتنے ہی بھرپور طریقے سے ناکام ہو گیا۔
"کیا مطلب؟" وہ یہی سوال کر پایا تھا۔
"میں قطر میں سیٹلڈ ہونے کا پلان بنا رہی ہوں۔" حبیبہ نے ہمیشہ کی طرح سادہ مگر لگاوٹ بھرے انداز میں کہا تھا۔
"اچانک۔۔۔ مگر کیوں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ وہ کافی دن کے بعد حبیبہ سے ملنے آیا تھا اور آتے ہی اسے یہ اطلاع ملی تھی۔ اس کے ذہن میں فوراً" جمع تفریق شروع ہو گئی تھی۔ حبیبہ کے ارادے کے آفٹر میتھس اس نے سوچنے بھی شروع کر دیے تھے۔
"یہاں سے جی بھر گیا ہے۔ دل نہیں لگتا میرا اب یہاں۔" حبیبہ نے کہا تھا۔ اس نے اس کے اتنے دن غیر حاضر رہنے کے متعلق کوئی استفسار بھی نہیں کیا تھا، جس سے کاشف مزید تخمینے لگانے پر مجبور ہوا جا رہا تھا۔
"اور میں۔۔۔ میرا کیا ہوگا۔۔۔ میرے بارے میں سوچا ہے۔۔۔ میرا دل کیسے لگے گا تمہارے بغیر۔" وہ جھلا کر بولا تھا۔ حبیبہ کی ایک بہن قطر میں ہوتی تھی اور اس کے شوہر کا شمار وہاں سیٹلڈ پاکستانی کمیونٹی کے رئیس بزنس مینوں میں ہوتا تھا۔ سیٹھ مجید نے جو دبئی میں بزنس سیٹ کیا ہوا تھا اس میں بھی اسی بہنوئی نے ان کی مدد کی تھی۔ وہ کافی اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔
"تمہارے بارے میں سوچ کر ہی تو یہ فیصلہ کیا ہے۔" حبیبہ نے اسی انداز میں کہا تھا۔
"میں چاہتی ہوں تم دبئی والا سارا بزنس خود سنبھالو۔ میں اس جھنجٹ سے نکلنا چاہتی ہوں۔" کاشف کی سانس میں سانس آئی۔ دبئی میں سارا پیسہ مجید کا تھا اور اس کی موت کے بعد سے حبیبہ نے وہ سب کاشف کے حوالے کر رکھا تھا لیکن کوئی قانونی لکھت پڑھت کبھی نہیں ہوئی تھی۔
"تمہاری معاونت کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔ تم یہیں رہو گی بس۔۔۔ میرے پاس۔۔۔ میرے قریب۔" اس نے کہا تھا۔ حبیبہ نے نفی میں سر ہلایا۔
"میں صرف تین مہینے کے لیے ہی تو جا رہی ہوں۔ واپس آجاؤں گی۔" حبیبہ نے اسے تسلی دی تھی، پھر اس کے بولنے کا انتظار کیے بغیر بولی۔
"وہاں جا کر دیکھتی ہوں کہ کون سا بزنس کیا جا سکتا ہے۔ میری بہن بیوٹی سیلون بنانا چاہتی ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ کافی اسکوپ ہے وہاں اس بزنس کا۔ اس لیے تم میری ساری رقم واپس کر دو۔" اس نے جتنا سادہ انداز میں ساری بات کی تھی، اتنی سادہ تھی نہیں۔
"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں تمہیں پچاس ساٹھ ہزار دے سکتا ہوں۔" کاشف نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی تھی، جب بات اس طرح غیروں کی طرح ہی ہونی تھی تو اسے بھی بے تکلف ہو کر بیٹھنے کی ضرورت کیا تھی۔ حبیبہ نے اسے گھورا۔
"پچاس ساٹھ ہزار میں تو دس دن بھی نہیں گزر سکیں گے قطر میں۔۔۔ مجھے سارا پیسہ چاہیے۔۔۔ اپنا پیسہ۔۔۔" اس نے "اپنا" پر سارا زور لگاتے ہوئے کہا تھا۔
"اپنا پیسہ۔۔۔؟" کاشف نے دہرایا، پھر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔
"کون سا پیسہ؟" اس نے استفہامیہ انداز میں حبیبہ کا چہرہ دیکھا۔
"میں اس ایک کروڑ روپے کی بات کر رہی ہوں، جو مجید نے تمہارے بزنس میں انویسٹ کیا تھا اور جس میں سے تم نے ایک ہزار بھی کبھی واپس نہیں کیا۔" حبیبہ نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔ کاشف کے چہرے کی طنزیہ مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"سیٹھ مجید کی وفات کو تقریباً" ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ اس دوران تمہارا گھر کیسے چل رہا ہے۔ کبھی یہ سوچا ہے تم نے۔۔۔ تمہارے چار ملازمین کی تنخواہیں، تمہاری گاڑی کا پیٹرول۔۔۔ آئے روز تمہاری عیاشیاں، مہنگے ہوٹلوں میں کھانا۔۔۔ قیمتی کپڑوں اور زیورات کی شاپنگ۔۔۔ ہمہ وقت تمہارا نوٹوں سے بھرا ہوا پرس۔۔۔ یہ سب کیسے اور کون پورا کر رہا تھا۔۔۔ اس وقت اپنا پیسہ کیوں یاد نہیں آیا تمہیں۔"

"کاشف تم گھما پھرا کر بات مت کرو۔۔۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہہ ڈالو۔" حبیبہ نے بھی سرد مہر لہجہ اپنایا تھا۔

"صاف صاف بات یہ ہے کہ حبیبہ کہ پیسہ اس کا ہوتا ہے جو محنت کرتا ہے۔۔۔ جو محنت نہیں کرتا پیسہ اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگتا ہے۔ مجید بھائی کی بہت عزت ہے میرے دل میں۔۔۔ انہوں نے بہت ساتھ دیا ہے میرا۔۔۔ اس بنا پر تمہاری بھی عزت کرتا ہوں میں۔۔۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی محنت کی کمائی اندھوں کی طرح تمہارے ہاتھ میں دے دوں۔۔۔ اس کاروبار کو اپنا خون پسینہ دیتا ہوں میں۔۔۔ جان توڑ محنت کرتا ہوں۔۔۔ اب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اس میں سے ایک کروڑ روپیہ نکال کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں۔" وہ چپ ہوا تھا۔

"تم قطر چلی جاؤ۔۔۔ گھوم پھر آؤ۔۔۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔۔۔ لیکن میں زیادہ سے زیادہ دو لاکھ دے دیتا ہوں تمہیں۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔ حبیبہ نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہے۔ قطری دینار کتنے کا ہے۔ دو لاکھ کے تھوڑے سے دینار بنیں گے۔ میں وہاں شاورما کھانے نہیں جا رہی۔۔۔ بزنس کرنے جا رہی ہوں۔۔۔ دو لاکھ میں تمہیں دے دیتی ہوں۔۔۔ تم میرا بیوٹی سیلون سیٹ کر آؤ وہاں۔" حبیبہ کا انداز طنزیہ ہو گیا تھا' کاشف ہنسا۔

"تو پھر چپ چاپ یہاں میرے پاس رہو۔ میں ہر مہینے تمہیں پچاس ہزار دیتا رہوں گا۔ اتنا کافی رہے گا تمہارے لیے۔" اس نے آفر دی تھی۔ حبیبہ کو اس وجیہہ چہرے والے مرد کے اندر چھپے مکروہ شیطان پر بے حد غصہ آیا۔

"کاشف۔۔۔ میں کوئی بی گریڈ عورت نہیں ہوں۔ جسے پچاس ہزار مہینے پر باندھ کر اپنی عیاشی کے لیے بٹھا کر رکھ لو گے تم۔۔۔ اب تک تم مجھ پر جو بھی خرچ کرتے رہے وہ میرا حق تھا۔ میرے مرحوم شوہر نے اپنی ساری جمع پونجی تمہارے بزنس میں انویسٹ کر رکھی تھی۔ تم خیرات نہیں دیتے تھے مجھے۔" وہ انگلی اٹھا کر غرا کر بولی تھی۔

"یہ مجھے بتا رہی ہو تم؟" کاشف نے اسی کے انداز میں پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی طنزیہ مسکراہٹ حبیبہ کو مزید غصہ دلا رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ تمہیں بتا رہی ہوں۔۔۔ تاکہ تمہیں یاد رہے کہ حبیبہ تم پر جو کچھ لٹا رہی تھی وہ سب۔۔۔ سب کا سب۔۔۔ محبت کے نام پر تھا۔۔۔ دولت کے نام پر نہیں۔۔۔ تمہارے چند ہزار روپوں کی خاطر تم پر نہیں مر مٹی تھی حبیبہ۔۔۔ تاکہ تمہیں یاد رہے کہ حبیبہ طوائف نہیں ہے۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔ حبیبہ طوائف نہیں ہے۔" اس کے منہ سے الفاظ کے ساتھ دھواں نکلتا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کاشف نے پھر ایک جعلی قہقہہ لگایا۔

"حبیبہ طوائف نہیں ہے۔۔۔ واقعی۔۔۔" وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ حبیبہ کا دل چاہا اس کا گلا دبا دے یا اس کی آنکھوں میں انگلیاں گھونپ کر اسے اندھا کر دے۔ وہ چند ثانیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس چہرے پر کیسے مر مٹی تھی وہ۔۔۔ پھر اسے برداشت نہ ہو سکا تھا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ کاشف کے چہرے پر دے مارا تھا۔

پہلی خوب صورت دلفریب کہانی اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔

☆ ☆ ☆
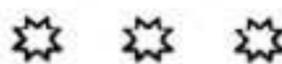
"شہرین باجی کی امی تو بڑی ہی بدتمیز ہیں جی۔" رانی نے پانی کا گلاس اماں رضیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ ماں رضیہ نے بے چینی اور بے بسی سے چور انداز میں اسے دیکھا۔ ان کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے ٹوک دیتیں۔ انہوں نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے پانی کے ساتھ گولی نگلی تھی۔ رانی ان کے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ گھر کے ملازمین بھی آج تو الجھے الجھے سے نظر آتے تھے لیکن اماں رضیہ کا دل بہت ہی بوجھل تھا۔ آج کی تقریب کے لیے گھر کی مالکن کا جوش و ولولہ ان سے چھپا نہیں تھا۔ انہوں نے ایک ایک چیز پر شہرین کو پیسہ پانی کی طرح بہاتے دیکھا تھا اور پھر جس طرح وہ یہ سب کرتے ہوئے خوش اور مطمئن نظر آتی تھی یہ بھی ان سے ڈھکا چھپا نہیں تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا اس کا تو کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا۔ شہرین کا اترا ہوا بجھا ہوا چہرہ ان کی نظروں کے سامنے سے ہی نہیں ہٹ رہا تھا۔

وہ بہت دکھی تھیں اگر گھر کی عام ملازمہ ہوتیں تو شاید دو باتیں کرکے' تقریب کے اس طرح خراب ہو جانے پر مرچ مسالے لگا کر افسوس کرتیں اور سو جاتیں لیکن چونکہ وہ صرف ملازمہ نہیں تھیں۔ وہ خود کو گھر کے مالکوں میں بھی شمار ہوتی تھیں۔ انہوں نے سمیع کو بھی پالا تھا اور اب اس کی اولاد کو بہت محبت سے پال رہی تھیں۔ شہرین سے بھی لگاؤ رکھتی تھیں۔ اس بدقسمت جوڑے کی ایک ایک بات ان کے سامنے عیاں تھی۔ وہ ماں نہیں تھیں لیکن ان کے دل میں اس گھر کے مالک کے لیے ماؤں جیسا ہی پیار تھا' سو تکلیف بھی ان کی حد سے سوا تھی۔ سب پھیلاوا اسمیٹ کر اب وہ اپنے بستر پر آئی تھیں۔ سر درد کی دوا لی تھی اور اب رانی سے پاؤں دبوا رہی تھیں۔

"یہ ایسی ہی بدزبان ہیں شروع سے... ایک دو بار ہی ملی ہوں ان سے... لیکن جب بھی ملی ہوں کبھی اچھی نہیں لگیں مجھے... پتھر دل والی عورت ہے۔" اماں رضیہ نے سرہانے سے سر ٹکا کر بازو آنکھوں پر رکھا۔

"اماں... صرف پتھر دل نہیں... بہت بڑے والے پتھر دل والی عورت... ایمن کے بارے میں کیسے کہہ رہی تھی اور سمیع بھائی کو تو ایسے گھور رہی تھی جیسے کچا کھا جائے گی۔" رانی کو اپنی رائے درمیان میں دینے کا بہت ہی شوق تھا۔

"چل تو چپ کر کے اپنا کام کر... زیادہ مت بولا کر ہر بات میں..." اماں رضیہ اکتا کر بولی تھیں۔ ان کے دل میں بھی غبار جمع تھا لیکن کیا کرتیں' رانی کے سامنے زیادہ بات بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

"میرا دل تو اسی وقت بولنے کو چاہ رہا تھا... جب وہ موٹی بھینس سمیع بھائی کو کوس رہی تھیں... بھلا اپنے داماد کو بھی ایسے کہتا ہے کوئی... توبہ توبہ..." رانی ان کے پاؤں دباتی ہوئی سابقہ انداز میں بولی تھی۔

"کہہ تو رہی ہوں ایسی ہی ہیں وہ... شہرین کے خاندان والوں نے کبھی اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا۔ سمیع کو کبھی وہ رتبہ ہی نہیں دیا جس کا وہ مستحق ہے... بتاؤ ہیرے جیسا بچہ... چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نا ملتا لیکن ان کو قدر ہی نہیں... کیسے گالیاں دے رہی تھی بے چارے بچے کو..." اماں رضیہ تاسف بھرے لہجے میں بولی تھیں۔

"سمیع بھائی تو بالکل فرشتہ صفت ہیں۔ ایسے داماد ہمارے جیسے گھروں میں ہوں تو ساس ان کے پاؤں دھو دھو کر پئیں۔" رانی نے سارا زور ان کے پاؤں پر لگاتے ہوئے کہا تھا۔ اماں رضیہ نے ناگواری سے اس کے انداز کو دیکھا۔

"چل... رانی تو بھی مبالغہ آرائی کی حد ہی کر دیا کر... جہالت کی پوٹلی... مت بولا کر یہ محاوروں کی زبان... بجتی نہیں ہے تجھ پر... کون پیتا ہے کسی کے پاؤں دھو دھو کر..." وہ جھنجلائی تھیں۔

"سچ کہہ رہی ہوں اماں... میری بہن کا خاوند ہے' اتنا مارتا ہے میری بہن کو... کپڑا لتا تو کیا لے کر دیتا ہے... دو

وقت کھانے کو بھی ترسا کر دیتا ہے مگر جب بھی ہمارے گھر آتا ہے میری ماں کا بس نہیں چلتا کہ اس کے لیے اپنا دل ہی نکال کر رکھ دیں۔ اس کے لیے بوتل، پھل سب منگوائے گی۔ آپ خود سوچیں اماں سمیع بھائی جیسا داماد ہو میری ماں کا تو پاؤں دھو دھو کر ہی پیے گی نا۔" رانی نے اب کی بار اپنے الفاظ پر زیادہ اور ان کے پاؤں پر مناسب سا زور دیا۔

اماں رضیہ نے سر ہلایا۔

"داماد کی عزت تو کرنی ہی چاہیے... ہمارے گھروں میں بھی اسی طرح ہوتا بھئی... داماد کو گھر کے بیٹوں سے بڑھ کر پیار اور تکریم دی جاتی ہے لیکن سمیع کی تو قسمت ہی خراب ہے۔ بہت بغض پال رکھا ہے شہرین کی ماں نے اپنے دل میں۔" اماں رضیہ نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"لیکن اماں کیوں... اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں شہرین باجی کے گھر والے سمیع بھائی سے۔" وہ ان کے مزید قریب ہو کر ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"ارے دونوں طرف یہی صورت حال ہے۔ سمیع کے گھر والے کون سا کم ہیں کسی سے... انہوں نے بھی شہرین کو ہر جگہ بے عزت ہی کیا ہے۔ سمیع کی ماں نے کبھی بیٹی کہہ کر نہ دیا ہوگا بے چاری بچی کو... نندیں بھی بھاوج کی رتی برابر عزت نہ کرتی تھیں۔ روز کا جھگڑا فساد تھا۔ اسی لیے تو سارا گھر چھوڑ چھاڑ یہاں آگیا بیوی کو لے کر..."

"لیکن کیوں اماں... ایسا کیوں..." رانی کا تجسس عروج پر تھا۔ اس نے ان کی بات کاٹ کر سوال کیا تھا۔ اماں رضیہ بھی اپنی دھن میں سب بتا دینے پر تیار تھیں آج... حالانکہ وہ پہلے بھی باتوں باتوں میں رانی کو بتا چکی تھیں لیکن اس کے سوال پر پھر سے بولنے لگیں۔

"دونوں گھر راضی نہیں تھے اس شادی پر... پہلے دن سے قبول نہیں کیا دونوں خاندانوں نے ایک دوسرے کو... ادھر والے پٹھان تھے... ادھر والے پنجابی... بس یہی رونا تھا... ورنہ تو دونوں مسلمان... فرقہ مسلک کی بھی کوئی لڑائی نہیں... مال مرتبے میں بھی ایک برابر تھے... بچے بھی ایک دوسرے کے جوڑ کے تھے۔ یہ ہیرا تھے تو بچی بھی کندن جیسی تھی... بچوں کی ضد پر مجبور ہو کر بیاہ تو کر دیا لیکن دوبارہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کو تیار نہیں ہوئے۔ سمیع کے گھر والے شہرین کو کوسنے دینے سے باز نہیں آتے اور یہاں سمیع کو شہرین کے خاندان والوں کی الٹی سیدھی سننے کو ملتی رہتی ہیں... چار سال گزر گئے لیکن دلوں میں کشادگی ناپید ا ہو سکی دونوں طرف..." اماں رضیہ نے تاسف سے گردن ہلائی... وہ تو ہر واقعے اور ہر رنجش کی وجوہات سے واقف تھیں۔ رانی نے بھی سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے اماں آپ پڑھے لکھے مال دار لوگوں کے مسئلے مسائل بھی ہم جیسے ان پڑھ غریب کمی کمینوں والے ہی ہوتے ہیں۔" وہ اپنی رائے دے رہی تھی۔ اماں رضیہ کو اس کی رائے بڑی ناگوار گزری۔

"ارے ہاں بس ہاں... سچ کہہ رہی ہے تو۔" انہوں نے ناپسندیدگی سے کہا تھا۔ رانی افسوس سے سر ہلاتے ہوئے ان کے پاؤں دبانے لگی تھی۔



☆

"میرا قصور کیا ہے شہرین؟" سمیع کے لہجے میں اس کے سوال سے بھی زیادہ چبھتا ہوا تجسس تھا۔ شہرین نے پیشانی میں اٹھنے والی چبھن کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ساری نگاہ ہاتھوں کی انگلیوں کی جانب مبذول رکھی۔ اس کا دل بالکل ٹوٹ چکا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کے دل کا حال اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ آنکھیں نہ رونے کے باوجود

اتنی سرخ تھیں کہ لگتا تھا گھنٹوں روتی رہی ہے۔ یہ دگرگوں حالت صرف اس کی ہی نہیں تھی۔ سارا گھر سناٹے میں ڈوبا تھا۔ کیٹرنگ والے اپنا سامان سمیٹ کرلے جاچکے تھے اور ملازمین نے بھی سب پھیلاوا سمیٹ کر اپنے اپنے مسکن میں پناہ لے لی تھی۔ وہ دن جس کو خوب صورت بنانے کی خاطر اتنے دن صرف کیے گئے تھے وہی دن عجیب بدصورتی میں گزر گیا تھا۔ شہرین کی امی اور اس کی بہنوں کے کوسنوں طعنوں اور بددعاؤں نے سارے ماحول کو اتنا داغ دار کردیا تھا کہ کوئی مہمان بھی زیادہ دیر نہیں رکا تھا۔ ان کے واویلوں کے بعد اگرچہ کھانا فوراً" سرو کردیا گیا تھا لیکن پھر بھی کسی سے ٹھیک سے کھایا ہی نہیں گیا اور چونکہ بچے زیادہ اور ان کے لیے ہی گیمز وغیرہ کا اہتمام بھی تھا لیکن بچوں کے شور سے شہرین کے سر میں جو درد اٹھا تو پھر اس سے بیٹھا ہی نہیں گیا۔ وہ سمیع کو بتا کر اپنے کمرے میں آگئی تھیں اور پھر جن کو پتا نہیں چلا تھا ان کو بھی اندازہ ہوگیا کہ کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ سارا ماحول ہی الٹ پلٹ کر ہو کر رہ گیا تھا' سب ہی مہمان صورت حال کی نزاکت کو بھانپ کر دھیرے دھیرے اجازت لے کر چلے گئے تھے۔ سمیع کا خفگی اور غصے کے مارے برا حال تھا۔ سب کو رخصت کرکے وہ کمرے میں آیا تو پھر عادت کے برعکس شہرین پر برس پڑا تھا۔

"میری نفرت میں تمہارے گھر والے اتنا گر جائیں گے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تمہارے گھر والے مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے مہمانوں کی موجودگی کا بھی خیال نہیں کیا۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔ انہیں ترس نہیں آتا ہم پر۔۔۔ میری بچی کی پہلی خوشی تھی۔۔۔ پہلی۔۔۔ چار سالوں میں پہلی بار اس کے لیے یہ سب ارینج کیا تھا ہم نے۔۔۔ کس لیے؟ اس لیے کہ وہ آئیں اور جھولی بھر بھر کر میری بیٹی کو بددعائیں دے کر جائیں۔۔۔ میری ننھی سی بیٹی کے بارے میں ایسی ایسی غلیظ باتیں کر کے جائیں۔۔۔ اس لیے۔۔۔؟" وہ بے بسی سے چور لہجے میں چلا رہا تھا۔ شہرین نے شادی کے بعد پہلی بار اسے اس طرح چلاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ بالکل برف کی طرح سرد ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے وجود میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہو رہی تھی۔

"میں نے کیا کردیا ہے ایسا کہ وہ مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں۔۔۔ کیا تم سے شادی میرا گناہ ہے شہرین۔۔۔ کیا میں نے تمہیں گھر سے بھگا کر شادی کی تھی۔۔۔ تمہارے گھر میں گھس کر تمہیں اٹھا کر لے آیا تھا۔۔۔ ایسی کون سی کالک مل دی تھی ان کے منہ پر۔۔۔ کیا تمہیں پسند کرنا میرا گناہ ہے۔۔۔ یا میرے نام کے ساتھ لگا "لاحقہ" میرا گناہ ہے۔ اتنی سی بات ہے نا کہ تم شہرین خان تھیں اور میں سمیع رندھاوا۔۔۔ صرف اتنی سی بات نا۔۔۔ جسے وہ بھول نہیں پاتے۔۔۔ ذات پات برادری شملہ پگڑی ان سب چیزوں کی بہت حرمت ہے ان کے دل میں لیکن بیٹی۔۔۔ بیٹی کا شوہر۔۔۔ نواسی۔۔۔ ان کا کوئی احساس نہیں انہیں۔۔۔ اور پھر یہ سب دنیا کی چیزیں ہیں جو انسان کی آسانی کے لیے بنائی گئی ہیں نا کہ انسان کی گردن کے گرد طوق لٹکانے کے لیے۔۔۔ مرنے کے بعد تو ان کی بھی حیثیت نہیں رہے گی۔۔۔ قبر میں کون شناختی کارڈ مانگے گا۔۔۔ یہیں رہ جائے گا سب۔۔۔ لیکن تمہارے گھر والے یہ بات بھولتے ہی نہیں۔۔۔ ان کے لیے میں پنجابی ہوں تو سمجھو گلی کا کتا ہوں۔۔۔ مجھ سے جب ملیں گے، مجھے ذلیل کریں گے۔۔۔ میری بیٹی کو بددعائیں دیں گے۔"

وہ برس رہا تھا۔ وہ اسے طعنے نہیں دے رہا تھا لیکن اس کے دل میں جو غبار جمع تھا وہ اسے نکالے بغیر رہ نہیں پا رہا تھا۔ شہرین کو اس کے الفاظ اور انداز کچھ بھی برے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ صحیح ہی تو کہہ رہا تھا۔ اس کے گھر والے صرف ذات برادری کے فرق کی وجہ سے ان کے رشتے کے خلاف تھے' پھر اس کی ضد سے عاجز آکر شادی تو کردی لیکن معافی نہیں دی۔ وہ بیٹی کی جائز خواہش کو بیٹی کے گناہ کے طور پر یاد رکھتے تھے۔

"میں تنگ آچکا ہوں ان سب سے۔۔۔ جب بھی ملتے ہیں دل پر وار کرتے ہیں۔۔۔ کیا کوئی ایسے بھی بددعائیں دیتا

ہے کسی کو۔۔۔ میں ذہنی طور پر تھک گیا ہوں شہرین۔ صرف ان لوگوں کی ان باتوں کی وجہ سے میں ایمن سے بھی دور ہوتا جاتا ہوں۔۔۔ مجرم سمجھنے لگا ہوں اپنے آپ کو۔۔۔ اسے کبھی گود میں اٹھالوں تو ڈر جاتا ہوں کہ کہیں میرے حصے کی بددعائیں اسے نا کھا جائیں۔ تمہیں کہا تھا کہ چھوڑو یہ برتھ ڈے پارٹی وارٹی۔۔۔ ہمارا کوئی نہیں ہے۔ جو ہماری خوشی میں خوش ہو۔۔۔ لیکن تمہیں شوق اٹھا تھا کہ نہیں۔۔۔ لوگ کہتے ہیں ہمیں اپنی بیٹی سے پیار نہیں ہے۔ دیکھا اب کیسے تحفے ملے بیٹی کو۔۔۔ کیسے کیسے الفاظ استعمال کیے انہوں نے میری چھوٹی سی بچی کے لیے۔"

وہ اب کی بار چلا نہیں رہا تھا لیکن اس کا لہجہ بے حد لاچار تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ ان دونوں کے اعصاب کے لیے بہت زیادہ تھا۔ ہر حال میں پرسکون رہنے والا سمیع بے سکونی کی عجب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ شہرین نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ اسے کبھی وہ خوشی نہیں دے پائی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو بھی وہ محبت نہیں دے پائی تھی جس کی وہ متقاضی تھی۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے کتنی محبت سے آج کے دن کو ایمن کے لیے اسپیشل بنانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے تھے اور نتیجہ کیا نکلا تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کو مسلا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی' کیونکہ وہ جانتی تھی اس وقت اس کے آنسو سمیع کے غصے کو بھڑکا دیں گے لیکن ملال دکھ اور پچھتاوا اس کی آنکھوں سے یک دم پانی بن کر بہنے لگا تھا۔ سمیع نے اس کی جانب دیکھا اور توقع کے عین مطابق اس کی پیشانی پر تیوریوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو۔۔۔ رونا تو مجھے چاہیے۔۔۔ میں۔۔۔" وہ الفاظ کی کمی کا شکار ہوا تھا اور اس کے یہ چند الفاظ شہرین کا مزید حوصلہ بہالے گئے تھے۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی تھی۔

"میں ہمیشہ تمہارے لیے دکھ کا باعث بنتی ہوں نا۔۔۔ کاش میں تمہاری زندگی میں آئی نہ ہوتی۔۔۔ کاش میں نے تم سے شادی ہی نہ کی ہوتی۔" وہ روتے روتے بول رہی تھی۔

"شہرین خدا کا واسطہ۔۔۔ یہ دیکھو میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے آگے۔۔۔ تمہیں اگر یہ شادی تمام مسئلوں کی جڑ لگتی ہے تو ختم کر دیتے ہیں اسے۔۔۔ چھوڑ دو مجھے۔۔۔ جانا چاہتی ہو اپنے ماں باپ کے پاس تو چلی جاؤ۔۔۔ میں رہ لوں گا اکیلا لیکن میرے صبر کا امتحان مت لو۔ مرے ہوئے کو کون مارتا ہے بھلا۔" وہ تڑپ کر بولا تھا۔

شہرین نے اس کا چہرہ دیکھا' جہاں خفگی اور غیض کے وہ رنگ بکھرے تھے جو اس نے اس چہرے پر پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس کے دل میں درد کی نئی لہر اٹھی اور یک دم اس کا سر چکرایا تھا۔ درد کا اتنا تیز جھٹکا لگا تھا اسے کہ وہ خود کو کراہنے سے روک نہیں پائی تھی۔ ایک لمحے کے لیے درد تھما اور پھر ایک اور جھٹکا لگا اور اب کی بار یہ اتنا شدید تھا کہ وہ مزید زور سے چلائی۔ سمیع نے اس کی جانب دیکھا۔

"اب کرلو اپنی طبیعت خراب۔۔۔ شروع ہو گیا نا سر میں درد۔۔۔ اسی لیے منع کر رہا تھا میں۔۔۔ صرف اسی لیے۔۔۔" وہ اکتا کر بولا تھا شہرین سے لیکن شہرین سے کچھ نہیں بولا گیا تھا۔ اسے ایسے درد کے جھٹکے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھم لیا۔ سمیع کو تب ہی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

"کیا بہت زیادہ درد ہے۔۔۔ اچھا چھوڑو۔۔۔ مت سوچو کچھ۔۔۔" وہ اس کے قریب آیا تھا اور اسے دونوں بازوؤں سے تھامنا چاہا تھا لیکن وہ اس کی بازوؤں میں جھول گئی تھی۔

"شہرین۔۔۔ شہرین۔۔۔" سمیع نے چلا کر اسے پکارا تھا۔ وہ اپنے ہوش کھو رہی تھی۔ صورت حال سمیع کی توقع سے زیادہ سنگین تھی۔

"تنہا۔۔۔"

وہ اپنی اسائنمنٹ کا کام مکمل کر کے سونے کی تیاری کر رہی تھی، جب امی کی آواز سنائی دی۔ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ امی اور ابا دونوں ہی جلدی سونے کے عادی تھے۔ وہ اور زری جاگتی رہتی تھیں لیکن زری آج جلدی سو گئی تھی۔ وہ جو بستر پر نیم دراز سی تھی امی کی آواز سن کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جی امی۔۔۔" اس نے فوراً" جواب دیا تھا۔ امی کا مزاج سارا دن خراب نہ دیکھ چکی ہوتی تو شاید اتنی مؤدب ہو کر کبھی نا دکھاتی۔

"جاگ رہی ہو؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔ نینا نے ان کی جانب بغور دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ وہ صبح کی نسبت اب بالکل ٹھیک لگتی تھیں۔ چہرے پر سوچوں کا جال تو بکھرا نظر آتا تھا لیکن اداسی اور رنجیدگی کے رنگ غائب تھے۔ نینا نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

"جی۔۔۔ سونے ہی لگی تھی۔ آپ سنائیں، آپ کے مجازی خدا کا مزاج شریف درست ہو گیا۔" وہ شرارت بھرے لہجے میں سوال کر رہی تھی۔ امی نے اسے دیکھا، پھر انہیں افسوس ہوا۔ دلی افسوس۔۔۔ وہ اپنے باپ کے متعلق کس قدر بدگمانی کا شکار رہتی تھی کہ ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایک لاتعلقی اس کے انداز پر چھائی رہتی تھی اور انہوں نے محسوس کیا تھا کہ جب بھی کبھی وہ غصے میں آتے تھے یا ناراضی کا اظہار کرتے تھے اس روز نینا کی ہنسی سارے گھر میں گونجتی رہتی تھی۔ بات بات پر ہنسی کا فوارہ منہ سے پھوٹتا رہتا تھا۔ وہ نہ جانے ایسی کیوں تھی۔ اسے باپ کو زچ کرنے میں لطف آتا تھا۔ وہ ان کی بے بسی کا مزہ لیتی تھی اور یہ بحیثیت ماں ان کی بہت بڑی ناکامی تھی۔ اسی لیے وہ اس وقت اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

"تمہیں اچھا لگتا ہے اپنے ابا کے بارے میں اس طرح بات کرنا۔" انہوں نے سوچا نہیں تھا کہ گفتگو کی ابتدا ایسے کریں گی یا اس کے پاس بیٹھتے ہی اسے ٹوکیں گی لیکن وہ سرزنش کیے بنا رہ نہیں سکی تھیں۔

"میں نے بادشاہ سلامت کی شان میں کون سی گستاخی کر دی ہے امی۔۔۔ میں تو بس پوچھ رہی تھی۔" اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی، کیونکہ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ سیل فون آجانے کے بعد سے لینڈ لائن کا استعمال بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ یہ فون خال خال ہی بجتا تھا، اس لیے اس کا بجنا پریشان بھی کر دیتا تھا۔ ویسے بھی رات کے بارہ بج رہے تھے۔

"اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے؟" امی نے بستر سے اٹھتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا۔ وہ فون اٹھانے کے لیے کمرے سے باہر نکلی بھی نہیں تھیں کہ گھر کا دروازہ بجنے لگا۔ اب کی بار نینا بھی چھلانگ لگا کر بستر سے اتری۔ فون کی گھنٹی بند ہو گئی تھی۔

"خالہ دروازہ کھولیں۔۔۔ میں ہوں علیم۔۔۔" دستک کے ساتھ آواز بھی آئی تھی۔ امی نے جھری سے دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔

"خالہ آپ کو امی بلا رہی ہیں۔" وہ اندر آتے ہوئے بولا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے اثرات نمایاں تھے۔

"اللہ خیر کرے سب ٹھیک ہے نا؟" امی بھی بدحواس سی ہوئی تھیں۔

"نوشی باجی کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔۔۔ باتھ روم میں پھسل گئی تھی۔۔۔ ایمرجنسی میں ہے۔" علیم کی آواز میں کپکپاہٹ سی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

راشدہ رفعت

وہ خاندان کا سب سے حاضر جواب' بذلہ سنج اور ہنس مکھ لڑکا تھا۔ ہر محفل کی جان تھا اور اس کی شمولیت سے ہر تقریب کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ نام تھا اس کا عالیشان اور شخصیت نام کے عین مطابق تھی۔ دماغ بھی اللہ نے بہت زرخیز دیا تھا۔ سال کے اختتام پر گھر کے لان میں سب کزنز کی جو منفرد سی تقریب منعقد کی جاتی تھی یہ بھی تو عالیشان کے زرخیز دماغ کی ہی پیداوار تھی۔

یہ نئے سال کے جشن کے نام پر ہلڑبازی کی تقریب نہ تھی بلکہ بہت پر لطف اور اچھوتی سی تقریب ہوتی تھی۔ کزنز کی ٹیمیں بنا کر بیت بازی کے مقابلے ہوتے۔ سریلے گلے والے دھیمے سروں میں کوئی گیت یا غزل سناتے۔ خاندان کے کسی دلچسپ کردار کی کوئی پیروڈی پیش کی جاتی اور عموماً عالیشان ہی یہ پیروڈی پیش کرتا تھا اور سب سے دلچسپ تقریب کا آخری آئٹم ہوتا تھا۔ تقریب میں شامل افراد کو طرح طرح کے ٹائٹل سے نوازا جاتا۔ کوئی لڑکی "میک اپ کٹ" کا خطاب پاتی۔ کوئی "پڑھا کو حسینہ" تو کوئی ماڈرن "چھمک چھلو" لڑکے بھی ان خطابات کی زد سے نہ بچ پاتے۔ بڑے تایا کا چھوٹا بصیر جو غصے کا کچھ زیادہ ہی تیز تھا اور ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتا تھا "مولا جٹ" کے ٹائٹل سے نوازا جاتا۔ چھوٹی پھوپھو کا عاشر جو فیملی پالیٹکس میں گھر کی عورتوں سے بڑھ کر دلچسپی لیتا سال کے اختتام پر "بی جمالو" کا خطاب پاتا۔ سب سے زیادہ شامت ان لڑکوں کی آتی جو نئے نئے شادی شدہ افراد کی فہرست میں شامل ہوئے ہوتے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں تو نئی نویلی بیویوں کے نخرے ضرورت سے زیادہ اٹھائے جاتے ہی ہیں سو ان تازہ تازہ بنے خاوندوں کو "جورو کا غلام" یا اس سے ملتے جلتے کسی ٹائٹل سے نواز دیا جاتا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس رات کوئی کسی کی بات کا برا نہ مانتا تھا۔ ہنسی مذاق اور قہقہوں کے طوفان میں کیسے رات کٹتی پتا بھی نہ چلتا۔

☼ ☼ ☼

سال کے اختتام پر ہونے والی یہ تقریب گزشتہ کئی برسوں سے بہت کامیابی سے منعقد ہو رہی تھی لیکن اس بار تقریب کا انعقاد کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ وجہ تھی عالیشان کی شادی جو دسمبر کے پہلے ہفتے میں ہونا قرار پائی تھی۔ عالیشان کی امی نے خاندان کی سب لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنی کسی سہیلی کی دختر نیک اختر کو بہو بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لڑکیوں کی ماؤں نے آپس میں کہہ سن کر تو دل کی خوب بھڑاس نکالی لیکن چونکہ وہ سب بہت "پڑھے لکھے" اور "مہذب" لوگ تھے سو دل کی "کھولن" دل میں چھپا کر عالیشان کے والدین کو رشتہ طے ہونے پر خوب مبارکباد دی اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا البتہ عالیشان کو شادی شدہ کزنز نے چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔

"کیوں یار اب تیرا شمار بھی ہماری فہرست میں ہونے والا ہے ہمارا جتنا مذاق اڑاتا تھا اڑا لیا بچو۔ اب اپنے لیے تیاری پکڑ۔" تایا جی کے شہزاد نے عالیشان کے کندھے پر زوردار دھپ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

عالیشان جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"شہزاد بھائی بھلے سے شادی کروا رہا ہوں لیکن اللہ کے فضل و کرم سے آپ لوگوں کی فہرست میں پھر بھی

شامل نہیں ہوں گا۔ آپ لوگوں کا تو وہ حال ہے کہ ہوئی شادی، ختم آزادی۔ جبکہ میں اپنی آزادی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ نو، نیور۔" عالیشان کا انداز قطعیت بھرا تھا۔

"خوش گمانی اچھی چیز ہے یار۔ لیکن حقیقت وہی ہے جو میں نے کہی تجھے ہماری فہرست میں شامل ہونا ہی پڑے گا۔" شہزاد بھائی مسکرائے۔ ان کا ساتھ دینے کو قاسم اور عاصم بھی آگئے دونوں کی پچھلے برس ہی شادی ہوئی تھی اور دونوں شادی کے دو ماہ بعد متفقہ طور پر "زن مرید" کے ٹائٹل سے نوازے گئے تھے۔

"تو مان یا نہ مان اس بار یہ ٹائٹل تجھے ہی ملے گا۔" قاسم نے بھی وثوق بھرے لہجے میں کہا۔

"میں ایک ناممکن بات کیسے مان سکتا ہوں۔" عالیشان دلکشی سے مسکرا دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے پھر لگا شرط۔ اگر اس بار زن مرید کا ٹائٹل تجھے نہ ملا تو ہم پرانے شادی شدہ، سب کزنز کو یکم جنوری کی رات شان دار ساؤنڈ دیں گے اور اگر سب کزنز کی طرف سے متفقہ طور پر یہ خطاب تجھے دے دیا گیا تو یکم جنوری کو تجھے ساری پلٹن کو شان دار ضیافت دینی پڑے گی۔" شہزاد بھائی نے شرط لگانا چاہی۔

"منظور۔" عالیشان نے شرط ماننے میں چند لمحوں کا

بھی تامل نہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دسمبر کے پہلے ہفتے میں دھوم دھام سے عالیشان کی بارات روانہ ہوئی اور باربی ڈول سی خوب صورت ہنیہ عالیشان کے سنگ رخصت ہو کر سسرال آگئی۔ گھر کے باقی افراد شادی کی تھکن اتارنے لگے تو عالیشان اور ہنیہ دعوتیں بھگتانے لگے۔ ہنی مون کا پروگرام' موسم سرما گزرنے تک ملتوی کرنا پڑا کہ ہنیہ بہت نازک مزاج لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ سردی تو اس سے برداشت ہی نہ ہوتی تھی۔ عالیشان اپنے ماموں کے گھر اسے گاڑی کے بجائے بائیک پر بٹھا کر لے گیا۔ پرتکلف ڈنر کے بعد جب واپسی ہوئی تو واپسی کے سفر میں ہنیہ نے چھینکیں مار مار کر اپنا برا حال کر لیا۔

گھر واپس آکر ہنیہ فوراً" بیڈ روم میں گھس کر ہیٹر آن کیے بیٹھ گئی۔ عالیشان نے اسے فوراً" چائے بنا کر پلائی لیکن صبح تک وہ تیز بخار چڑھا بیٹھی۔ عالیشان کو خود پر رہ رہ کر تاؤ آرہا تھا کیا ضرورت تھی بائیک کے سفر کے ایڈونچر کی۔ اس کی ایسی نازک اندام سی تو بیوی تھی۔ اس کا خیال رکھنا اب عالیشان کی ہی تو ذمہ داری تھی۔ یہ احساس ذمہ داری ہی تھا کہ وہ اگلے دن آفس نہ گیا۔ اس نے گھر پر رہ کر ہنیہ کا خیال رکھنے کو ترجیح دی۔ حالانکہ امی نے بہتیرا کہا۔

"میں ہنیہ کو خود لے جاؤں گی ڈاکٹر کے پاس۔ آفس چلے جاؤ۔ شادی پر کم چھٹیاں ہوئی ہیں۔ بلاوجہ چھٹی کرنے کا فائدہ۔" عالیشان نے ماں کی بات سنی پھر نظر اٹھا کر ہنیہ کو دیکھا۔ ہنیہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے گھر رکنے کی استدعا کی تھی۔

"میں ہنیہ کی طبیعت کی وجہ سے کب چھٹی کر رہا ہوں امی۔ آج ویسے بھی میرا آفس جانے کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے لاپروا سے انداز میں ماں کو جواب دیا۔ ہنیہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ عالیشان زیر لب مسکرا دیا۔ آنکھوں کی زبان پڑھنے کا کیسا انوکھا سا تجربہ تھا۔ محض چند دن کی رفاقت میں عالیشان خاصا "ٹرینڈ" ہو گیا تھا۔ دو چار روز میں ہنیہ کی طبیعت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ پھر اکتیس دسمبر کا دن آن پہنچا۔

ہنیہ دیکھ رہی تھی کہ اس دن گھر کی ساری نوجوان پارٹی میں عجیب سی ہلچل مچی ہے۔ وہ سب رات منعقد ہونے والی کسی تقریب کا ذکر کر رہے تھے' لڑکوں نے سر شام ہی لان میں کرسیاں سجادیں خاطر خواہ لائٹنگ کا بھی انتظام کیا گیا۔ سب ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ہنیہ چونکہ ابھی سب سے گھلی ملی نہ تھی اس لیے کسی سے اس بارے میں نہ پوچھ سکی۔ عالیشان آفس سے آیا تو ہنیہ نے اس سے ہی گھر میں مچی ہلچل کا تذکرہ کیا تھا۔

"ارے کچھ نہیں یار' بس یونہی سب مل بیٹھتے ہیں ذرا سا ہلہ گلہ کرتے ہیں۔ آج تم بھی میرے ساتھ چلنا خوب انجوائے کرو گی۔" عالیشان نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا۔

"میں کوئی پاگل ہوں جو اتنی سردی میں لان میں جا کر بیٹھوں گی میرا پھر سے بیمار پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔" ہنیہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ عالیشان ذرا کی ذرا چپ ہوا۔

"تھوڑی دیر کے لیے چلی چلنا' ویسے بھی ہر سال اس تقریب کا ماسٹر مائنڈ میں ہی ہوتا تھا۔ چلو اس بار میں اور تم تماشائی کی حیثیت سے شریک ہو جائیں گے۔ مزہ رہے گا۔" عالیشان نے بیوی کو پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

"ہرگز نہیں۔ آپ اور میں مل کر آج رات مووی دیکھیں گے۔ آج رات ایک چینل پر میری فیوریٹ مووی آرہی ہے۔ شادی سے پہلے میں یہ ہی سوچتی تھی کہ بعد میں آپ کے کندھے پر سر رکھ کر یہ مووی دیکھوں گی۔ سچی بہت رومانٹک اور اموشنل مووی ہے۔ چلغوزے' مونگ پھلی کھائیں گے اور مووی دیکھیں گے۔" ہنیہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ چلغوزوں اور مونگ پھلیوں سے تو عالیشان کو خاص شغف نہ تھا' لیکن کندھے پر سر رکھ کر مووی دیکھنے کی معصوم سی

فرمائش وہ کیسے رد کرسکتا تھا سو سرِشام ڈنر کرکے وہ ہنیہ کے ساتھ بیڈ روم میں بند ہوگیا۔ شومئی قسمت ابھی کسی کزن سے سامنا نہ ہوا تھا۔ ان کے ممکنہ طعنوں سے صبح نمٹا جاسکتا تھا فی الوقت بیوی کی دلجوئی زیادہ عزیز تھی۔

☼ ☼ ☼

مقررہ وقت پر مووی شروع ہوگئی تھی۔ ہنیہ اتنی مگن ہوکر فلم دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ عالیشان کا دھیان فلم سے زیادہ لان میں منعقد ہونے والی تقریب کی جانب لگا ہوا تھا۔ پھر اس کے موبائل پر پہلی مسیج ٹون بجی تھی یہ بصیر تھا جو اسے للکار رہا تھا۔

"مرد کا بچہ ہے تو کمرے سے باہر نکل۔"

"مولا جٹ نہ ہو تو۔" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے بصیر کا مسیج ڈیلیٹ کردیا۔

پھر طیبہ کا مسیج آیا۔ "عالیشان بھائی آپ کے بغیر تقریب بالکل پھیکی ہے' کچھ دیر کے لیے سہی۔ پلیز آجایئے۔"

"ہنیہ کی طبیعت کچھ ناساز ہے گڑیا ورنہ میں ضرور آجاتا۔" اس نے طیبہ کو جوابی مسیج کیا تھا۔

"بھابھی کو پین کلر دے کر آجا' یا ساری رات سر دبانے کا ارادہ ہے۔" عاصم نے بھی مسیج کے ذریعے پوچھا تھا۔

عالیشان نے اس فضول مسیج کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا' لیکن پھر تو مسیجز کی قطار ہی بندھ گئی۔ عالیشان کو لگا وہ سب سر جوڑ کر بیٹھے ہیں اور باہمی مشورے سے یہ پیغامات سینڈ کررہے ہیں۔ عالیشان کو اب تپ چڑھنے لگی تھی۔

"میں اپنا سیل فون آف کررہا ہوں۔ برائے مہربانی تم لوگ بھی کوئی اور کام کرو۔" اور اگلے ہی پل شہزاد بھائی کا برق رفتار پیغام موصول ہوا۔

"سچی بات تو یہ ہے یار کہ تیرے بغیر تقریب بالکل پھیکی رہی اس لیے سب نے باہمی مشورے سے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ تقریب کا انعقاد نہیں کیا جائے گا۔ ہر بار تیرا دماغ لڑتا تھا اور تو لوگوں کو ٹائٹل سے نوازتا تھا اس بار ہم سب کی طرف سے متفقہ طور پر تجھے ایک ٹائٹل سے نوازدیا گیا ہے۔ ٹائٹل کیا ہے بتانا غیر ضروری ہے تو خود سمجھدار ہے ہاں کل تیری طرف سے ڈنر پکا ہے وہ ہم کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔ انڈراسٹینڈ۔" شہزاد بھائی کا معنی خیز مسیج پڑھ کر وہ ڈیلیٹ کرنے ہی والا تھا کہ ہنیہ نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔

"آپ کا مووی کی طرف تو دھیان ہی نہیں' مستقل سیل فون پر لگے ہوئے ہیں۔ دکھایئے کس کا مسیج ہے۔" ہنیہ نے مسیج پڑھا پھر سوالیہ نگاہوں سے عالیشان کو تکا۔

"کیا مطلب' کیسا ٹائٹل' مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔" عالیشان کے لبوں پر بڑی پھیکی اور بے بس سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"مسیج کو چھوڑو ڈارلنگ یہ بتاؤ دو چار دنوں کے لیے مجھے کچھ پیسے ادھار دے سکتی ہو ایکچوئلی میری سیلری پانچ تاریخ تک ملتی ہے اور کل میں نے سب کزنز کو اچھے سے ہوٹل میں شان دار سا ڈنر دینا ہے۔" عالیشان نے ہنیہ کو مخاطب کیا تھا۔

اچھے سے ہوٹل میں شان دار سا ڈنر... ہنیہ نے پہلے اس کی بات دہرائی پھر تیوریاں چڑھائیں۔

"مگر کس خوشی میں؟" سوال قدرے تیکھا تھا۔ عالیشان ایک لمحے کو گڑبڑا گیا' مگر اگلے ہی پل اس کی حاضر جوابی عود کر آئی۔

"تمہاری شادی کی خوشی میں ڈیئر۔" اس نے ہنیہ کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بہت ملائمت سے بتایا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے دے دوں گی' لیکن پلیز اب ساری باتیں چھوڑو اور مجھے مووی انجوائے کرنے دو۔" ہنیہ نے پھر سے اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔ عالیشان بھی اپنی لمبی سی جماہی کا گلا گھونٹتے ہوئے بہ جی جان سے ٹی وی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

☼ ☼

مصباح خالد

وہ ست روی سے چلتی اپنے کمرے میں آگئی جہاں نا صرف مہیب اندھیرا تھا بلکہ گہرا سناٹا بھی تھا۔ اندھیرا اور سناٹا تو صرف ایک سوئچ کا محتاج تھا جو غیر ارادی طور پر بٹن پر ہاتھ پڑتے ہی غائب ہوگیا۔ مگر اپنے اندر اترتے سناٹے اور اندھیرے کا کیا کرتی جس کا کوئی سوئچ نہیں تھا۔ وہ کتنی دیر کمرے کے وسط میں کھڑی خوامخواہ پردے، صوفہ، الماریاں، کارپٹ، ایل سی ڈی تکتی رہی پھر وہاں سے نظر ہٹی تو بیڈ کے بالکل سامنے لگے فوٹو فریم پر رک گئی۔ بہت خوب صورت، بہت مکمل لمحہ قید تھا۔ سرخ عروسی لباس میں اس کا چہرہ حدید کی آف وائٹ شیروانی سے اٹھنے والے کلون کی مہک سے کھل رہا تھا۔ زندگی مکمل ہوگئی تھی۔ پھر یہ نامکمل کیوں بن جاتی ہے...؟ کیوں اتنی گنجائش نکل آتی ہے کہ دونوں سراپے موجود اور آمنے سامنے ہوں مگر فاصلے اتنے آجائیں کہ کاٹے نہ کٹیں۔

گہری ہچکی میں بہت سی سسکاریاں ملیں اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور وجود دھیرے دھیرے لرزنے لگا۔ اس کی زندگی کی یہ طویل ترین اماوس کی رات تھی۔ بہت تکلیف دہ پل۔ اور ہر پل کے ہزارویں حصے میں بھی سانس لینا دشوار۔ وہ بہت دیر کارپٹ پر بیٹھی لرزتی رہی بلکتی رہی۔ اور وہی رات کسی کے لیے شادمانی کا سماں تھی۔ کتنی عجیب بات ہے ناں کہ زندگی کا ایک ہی پل کسی کے لیے کٹنے میں نہ آرہا ہو اور دوسرا اسے قید کرلینا چاہتا ہو اور اس سے بھی عجیب بات جب یہ پل ایک ہی گھر میں دو باہم وابستہ افراد کو ٹھہرا رہا ہو۔

وہ پشت پر ہاتھ باندھے بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ بہت دیر بعد سڑک پر گاڑی آکر رکی اور وہ اسی کے ساتھ نکلی۔ نہایت بے ہودہ انداز میں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

"کہاں سے آرہی ہو تم۔"

"ان کی گرج دار آواز پر وہ ٹھٹکی غالباً" اس کے خیال میں وہ سوگئے ہوں گے یا اسٹڈی میں مگر یہ کیا وہ تو اس کے انتظار میں آگ بگولا ہوئے کھڑے تھے۔ اس نے تھوک نگل کر جواب سوچا۔

"وہ... رائمہ کے گھر پارٹی..."

"اچھا۔ اب آگئی ہے تو آرام سے پوچھ لیں۔" بیگم کی بے جا مداخلت پر وہ بھنا گئے اور انہیں گھورا۔ جب کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھاتی تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔

"جوان اولاد ہے ذرا سنبھل کر۔"

بیگم کی مزید حمایت پر وہ چلا کر کہنے لگے۔

"تمہارے اسی رویے کی وجہ سے یہ دونوں ہاتھوں سے نکل رہے ہیں، اگر تم اپنے سوشل سرکل کے بجائے اولاد پر ٹائم لگالیتیں تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔"

وہ غصے سے وہاں سے چلے گئے تھے اور وہ صوفے پر ڈھے سی گئیں۔ بے شک انہوں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا مگر اب اس غلطی کو درست کرنے کے لیے کوئی راہ فرار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آزادی اور لبرل کے نام پر جو اولاد کا مستقبل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بہت بھیانک تھا۔ جونی لڑکا تھا اپنی تمام حرکتوں کے ساتھ بھی

معاشرے کو قبول تھا مگر یہ لڑکی.... ؟ کاش کوئی راہ نکل آئے' اسے اس سرکل سے کس طرح دور کریں وہ سوچتی رہ گئیں۔

"اگر اب بھی یہ خبیث نہیں سدھرتا' تو اسے ٹھیلا لگوا دیتا ہوں' ٹنڈے کدو بیچے گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے تمہارے سپوت کے۔" خواجہ نیاز کے

ہمیشہ کے شکووں پر برجیس نے ناگواریت کا اظہار کیا۔

"میں کیا کروں۔"

"اب اور تم نے کیا کرنا ہے' ستیاناس تو کر دیا اس کا' چھوٹا چھوٹا بنا کر سر پر بٹھا رکھا ہے' پڑھا اس سے نہیں جاتا' فیکٹری کہہ دو بھائی کے ساتھ چلے جاؤ تو کمینہ ساری رقم اڑا جاتا ہے' اور اگر کبھی تخی کی اولاد کو

زمینوں پر بھیج دو تو اپنے آپ کو حاتم طائی سمجھ کر ساری فصل مزارعوں کو اٹھوادیتا ہے۔ بہت شوق ہے نا اسے فاقے کاٹنے کا' تو ریڑھی لگوادیتا ہوں۔ دو دن میں عقل ٹھکانے نہ آگئی نانجار کی' تو کہنا۔"

خواجہ نیاز نامناسب القابات میں صفی کی عزت افزائی کرتے باقاعدہ اسے گھور بھی رہے تھے جیسے ابھی کچا چبا جائیں گے۔ فریحہ چچی کو اس پر ترس آگیا تو حمایت کرڈالی۔

"کیا ہوا بھائی جان' ابھی تو بچہ ہے' خود ہی عقل آجائے گی۔"

"ہاں بھئی کل ہی پیدا ہوا ہے۔"

تایا ابا کے جملے پر سب کزنز کی ہنسی نکلی اور انہوں نے باری باری سب کو گھورا۔

"حسام' طیب بھی تو آگے پیچھے کے ہیں' حدید بھی ایسا تھا۔ ایک یہ بے غیرت ہے' لڑکیوں میں گھسا رہتا ہے۔" اس کی حد درجہ عزت افزائی کے بعد وہ تو چلے گئے مگر ان کے جاتے ہی سب میں جان پڑ گئی اور قہقہوں کی آواز گونجنے لگی۔ رباط تو بلند بانگ قہقہے کے ساتھ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے دہری ہو گئی اور ایسے بولی جیسے ضروری اعلان کرنا ہو۔

"لو بھئی تائی اماں! آپ کی روز روز سبزی ترکاری کا مسئلہ حل گیا۔"

فریحہ نے اس کو غصہ سے دیکھا اور کہا۔

"چل اٹھو یہاں سے بدتمیز اور چائے بنا کر لاؤ سب کے لیے۔"

"آپ کو جب غصہ آتا ہے تو فوراً" کچن کی دفع لگا دیتی ہیں۔" وہ جھنجلائی۔

"تی بی جی ! اگر چائے بنانے جارہی ہو تو پکوڑے بھی عنایت کردو۔" صفی اترا کر بولا۔

"یہ چلغوزے جیسا تمہارا وجود بار برداشت کرلے گا پکوڑوں کا۔" وہ دانت جما کر پاؤں پٹخ کر مڑی پھر لمبا سا "اوہ" میں ہونٹ سکیڑے' بھنوئیں اچکیں اور پھر پنجوں پر گھومی۔

"تائی امی ذرا اپنے بیٹے سے آلو اور پودینہ منگوادیں' پکوڑے بنانے ہیں۔"

"چچی اسے منع کرلیں۔" اس نے غصے سے گھورا۔

"مجھے جلائے نہیں۔" وہ ناک چڑھا کر ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ باہر بھاگنا ضروری تھا یقیناً" اب پشت پر فریحہ کی چپل پڑنی تھی یا پھر صفی سے گشن۔ ان کی ہر وقت کی تکرار تھی۔ کوئی وقت ہوتا جب دونوں خاموش ہوتے ورنہ تو ترکی بہ ترکی جواب حاضر۔ اور ہر جواب دوسرے کو تپا دینے والا۔

آج کل گھر میں کئی شادیوں کا ہنگامہ برپا تھا۔ اسی لیے شام کو سب کسی ایک کی طرف جمع ہوجاتے۔ ینگسٹرز کوئی گیم لگا کر اچھا سا وقت بتاتے اور سب خواتین کپڑوں کی ٹنکائی سلائی' چیزوں کی لسٹوں پر اپنے مشورے دیتیں اور مرد حضرات انتظامی امور پر تبادلہ خیال کرتے تھے۔ آج سب برجیس کے لاؤنج میں اکھٹے تھے۔

خواجہ غیاث کے تین بیٹے خواجہ نیاز' خواجہ رمیز' خواجہ فواد تھے ایک بیٹی ثمرہ تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے لیے دو کنال اراضی پر تین الگ الگ پورشنز بنائے تھے۔ طرز تعمیر کچھ اس طرح تھا مشترکہ لان میں تین الگ بلڈنگ تھیں اور اندر لاؤنجز کے داہنی طرف کھلنے والے بڑے بڑے لکڑی کے دروازے کھول لیے جائیں تو کوئی گمان نہیں کرسکتا تھا کہ یہ الگ الگ گھر ہیں۔ ان کا بزنس لائیو اسٹاک فارمنگ کا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ دودھ کی مصنوعات کی دو بڑی بڑی فیکٹریز میں تبدیل ہوگیا تھا۔ چار مربع زرعی اراضی ان سب کے علاوہ تھی جس سے سب بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ دو بیٹے تو انٹر کے بعد باپ کے ساتھ لگ گئے اور اپنی اپنی ذمہ داریاں اٹھالیں' جب کہ منجھلے بیٹے خواجہ رمیز کو جہاں پڑھائی کا شوق تھا وہاں جہلم جیسے چھوٹے شہر سے الرجی تھی' انہوں نے سی۔ اے مکمل ہوتے ہی کراچی کی راہ لی۔ نوکری بہترین ملی پھر شادی بھی اپنی مرضی سے رچالی۔ کچھ عرصہ گھر والے ناراض رہے پھر وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوتا گیا' مگر آنا جانا برائے نام رہ گیا۔

بڑے بیٹے خواجہ نیاز کے دو بیٹے حدید اور صفی تھے اور ان کے درمیان زرمینہ تھی۔ حدید کی شادی کو تقریباً" آٹھ سال گزر گئے تھے مگر ابھی تک اولاد سے محروم تھے۔ غالباً" پرپزے میں کچھ اندرونی مسائل تھے جو مختلف علاج کے بعد ڈاکٹرز نے لگی لپٹی رکھے بغیر سامنے رکھ دیئے۔ زرمینہ کی شادی چچا فواد کے بیٹے حسام سے طے تھی۔ اور صفی ابھی بی۔ اے میں پڑھ رہا تھا' کارکردگی سے اندازہ ہوتا تھا مزید دو سال تو ضرور لگائے گا۔

خواجہ نیاز سے چھوٹے خواجہ رمیز تھے جن کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی سیما تھی۔ سب سے چھوٹے خواجہ فواد تھے جن کے دو بیٹے طیب اور حسام تھے اور دو بیٹیاں تراب اور رباط تھیں۔ تراب کی شادی کو تین سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا اور آج کل وہ پھر کسی خوشخبری کے زیر اثر تھی۔ جب کہ طیب کی شادی ثمو پھپھو کی منجھلی بیٹی علشبہ سے اور حسام کی زرمینہ سے طے تھی۔ اور اب ان ہی تینوں گھروں کی شادیوں کا غلغلہ تھا۔ ثمو پھپھو کی کوٹھی زیادہ دور نہ تھی وہ اکثر ہی آجاتیں اور ساتھ چھوٹی بیٹی نشا اور بہو الوینہ کو بھی لے آتیں اگر بڑی بیٹی ماہین میکے آئی ہوتی تو وہ بھی ساتھ ہی ہوتی اور خوب مل کر صلاح مشورے سے تیاریاں کرتیں۔

آج وہ سب کارپٹ پر کپڑے پھیلائے ایک دوسرے کو مشورے دے رہی تھیں۔ کون سا کس کے لیے' کس پر کیسی ڈیزائننگ اور ساتھ ساتھ الوینہ نے اپنے تینوں اور ماہین کے دونوں چھلاوا سے بچوں کو قابو کیا ہوا تھا مبادا کپڑوں کو خراب نہ کردیں۔ خواتین کی محفل اپنی جگہ مگر نشا' رباط' زرمینہ اور زرمینہ کی انتہائی کلوز فرینڈ ثمن جس کی فیملی رمیز چچا کے پورشن میں بطور کرایہ دار رہائش پذیر تھی' بیٹھی اکلوتے مسخرے لڑکے صفی کے ساتھ پرچیاں کھیل رہی تھیں۔ الوینہ بھابھی نے نشا کو فارغ دیکھا تو ڈانٹ کر بولیں۔

"کچھ دیر انہیں پکڑ لو بھئی۔"

"جب سنبھال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو۔" نشا کی جگہ پاؤں میں چپل اڑستی رباط نے بالکل فلمی انداز میں جواب دیا تھا اور فریحہ نے اسے قینچی دکھائی۔

"گز بھر کی زبان بتاؤں میں تجھے۔"

اس کے تیزی سے کھسکنے پر بھی فریحہ کے ڈانٹنے میں فرق نہ آیا وہ مسلسل بول رہی تھیں۔

"شرم نہیں آتی' جو منہ میں آئے بک دو۔ میں تو شکر کے سجدے ادا کرتی نہیں تھکتی' دنیا تو ترس رہی ہے اس نعمت کو۔ ذرا ان کے دلوں سے پوچھو۔ میری تو ہر سانس کے ساتھ دعا ہے جیسے تراب' ماہین کی گود اللہ نے سال میں بھر دی تھی اس طرح علشبہ اور زرمینہ کے آتے ہی میرے بچوں کے چہرے کھل جائیں۔"

ان کی دیرینہ دعا پر قریب ہی بیٹھی زرمینہ کے گالوں پر حیا کی لالیاں رینگنے لگیں۔ شرارتی ثمن اور نشا نے اسے مزید تنگ کرنے کے لیے پاؤں کے انگوٹھے سے اس کی کمر پر ٹھوکا دیا تو وہ اور سرخ ہو گئی۔

"کیا ہے بدتمیزوں۔" ان کے ہنسنے پر اس نے گھورا اور وہاں سے اٹھنے لگی۔ چچی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"شرما گئی میری بچی۔ اللہ خوش و آباد رکھے۔" وہ اس کی بلائیں لے رہی تھیں اور ثمو پھپھو ان کے پہلے جملے کو اٹکی ہوئی تھیں۔

"بھابھی جان! ترستی دنیا کے دلوں سے کیا پوچھنا' اپنے گھر میں ہی دیکھ لو۔" ان کا اشارہ حدید کی طرف تھا جو کچھ دیر پہلے ہی فیکٹری سے آکر ان سب میں شامل ہوا تھا۔ کبھی کسی بچے کے گال کو انگلی سے چھوتا' کبھی کسی کی بات پر کمنٹس پاس کرتا مگر پھپھو کے اشارے نے ساکت کر دیا۔

"کیا گھبرو جوان تھا کھلا کھلا مگر اب۔۔۔ آٹھ سال میں بالکل مرجھا کر رہ گیا۔ بے چارہ۔"

"بس بہن' ہا آہ!" برجیس نے بھی سرد آہ کھینچی۔ "اللہ کی مرضی' بہت علاج معالجے کروائے' منت مرادیں چڑھائیں پھر خالی کی خالی۔ اب تو ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا امید بے کار ہے۔" ماں کی ڈوبی آواز نے

اس پر گھڑوں پانی پھینک دیا تھا وہ جبڑے دبائے پاؤں کے انگوٹھے سے کارپٹ کھرچتے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔

"بھابھی مجھے تو خود ترس آتا ہے اس کی زندگی پر' کیسا ویرانہ ہی ویرانہ۔۔۔" اس نے ہر موقع پر سب کو ترس کھاتے ہی سنا تھا اور اب تو اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا تھا۔

"اس ترستی زندگی کو میں بھگا کر نہیں لایا تھا' آپ ہی لوگوں کا انتخاب تھا۔" اس کے اندر کی تمام کڑواہٹ لہجے میں در آئی تھی جس پر ثمرہ دہل گئیں۔

"ہائے میرے بچے! برا کیوں مان گئے' میں نے تو ایسے ہی اک بات کہی تھی' بس دکھ ہوتا ہے تمہیں دیکھ کر۔"

"نہیں ہے کوئی دکھ میری زندگی میں' آپ لوگ پریشان ہونا چھوڑ دیں۔"

اس کے جتا کر جھٹکے سے اٹھنے پر' وہاں پر بیٹھے تمام نفوس پر اک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا اور تیزی سے بڑھتے قدم پریزے کو دیکھتے رک گئے۔ وہ دروازے سے چند قدم باہر ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لیے سن سی کھڑی تھی' حقیقتاً" اس نے اندر ہونے والی تمام گفتگو سن لی تھی۔ اس نے حدید کے لال بھبھوکا چہرے کو سرعت سے دیکھا۔ وہاں اجنبیت' ملال اور غصے کے رنگ تھے۔ وہ چند پل تو اسے ایسے گھورتا رہا جیسے سب کچھ صرف اسی کی وجہ سے سن کر آرہا ہو' اصل مجرم وہ ہو۔ پھر وہ ترچھا ہو کر پہلو بچاتا تیزی سے لابی کی طرف نکل گیا۔

گردن کی معمولی سی جنبش سے پریزے کی پرملال نظریں اس کے تعاقب میں آخر تک گئیں تھیں۔ اور پھر گہری سانس لے کر خود پر بے حسی کے بے شمار چڑھے خول پر ایک خول اور چڑھایا' ہونٹ زبان سے تر کیے اور دھیمی مسکراہٹ سجاتے ہوئے اندر آگئی۔ کتنا دشوار ہوتا ہے ناں تمام حسیات و محسوسات کے ہوتے ہوئے خود کو بے حس ظاہر کرنا ایسے دوراہوں سے وہ اکثر گزرتی تھی وہ بھی مسکرا کر۔ رباط نے اندر ہونے والی کچھ گفتگو تو پہلے سن ہی لی تھی اور باہر لابی میں اپنی سہیلی کا فون سنتے ہوئے حدید بھائی کا انداز باقی گفتگو سمجھانے کے لیے کافی تھا۔ اسے بہت دکھ ہوا تھا۔

غالباً" پہلے تو حدید بھائی ایسے نہ تھے۔ ہنستے مسکراتے پریزے بھابھی کا دم بھرتے' وقت کے ساتھ تو رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے مگر ہر گزرتا پل اور ارد گرد کے لوگ ان کے رشتے کو کمزور سے کمزور تر کر رہے تھے۔ اور بھابھی سارے گھر میں نشانہ بنی رہتیں اوپر سے ثمرہ پھپھو۔ انہیں تو پہلے دن سے ہی بھابھی سے پرخاش تھی کیوں کہ وہ اپنے لائق فائق کماؤ بھتیجے کو اپنی بڑی بیٹی 'ماہین' دینا چاہتی تھیں مگر ان کا رشتہ آتا "فاتا" تایا ابا نے اپنے دور کے ملنے والوں میں طے کر دیا۔ جب پھپھو کو پتا چلا تو وہ خاموش تو ہو گئیں مگر پیٹھ پیچھے اکثر دبے لفظوں میں چھوٹی بھابھی سے شکوہ سا کر دیتیں۔ اور اس شکوے نے 'باقاعدہ زبان' ماہین کی شادی کے بعد لی جب دس ماہ بعد ہی اس کی گود بھر گئی۔

"شکر ہے رب کا' میری بچی کے قدم مضبوط ہوئے' ورنہ خالی کھوکھے کتنے دن کھڑے رہتے ہیں؟" ماہین کے نوزائیدہ بچے کو گود میں لیے پریزے کے وجود میں مرچیں سے بھر گئی تھیں۔ اس نے خود پر حدید کی ترچھی نظریں محسوس کیں اور پھر کہتے سنا تھا۔

"پھپھو' ماہین تو شروع سے لکی ہے۔"

"ہاں بیٹا۔" انہوں نے تائید کی۔ "لک تو شادی کے بعد ہی کھلتی ہے' پہلے اندازہ ہو جائے تو سب قسمت کی دیوی کو ہی چنیں۔" ان کے انداز پر وہ لب کاٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے وہاں سے اٹھنے میں چند پل لگے تھے۔

"امی چلیں؟ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" اس وقت بھی راہ فرار وہاں سے نکلنا تھا اور اب بھی وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ مگر تب میں اور اب میں اتنا فرق ضرور آگیا تھا پہلے وہ پریزے کو اک امید سے دیکھتا تھا مگر اب مجرم کی طرح۔ رباط نے ناگواری سے سوچا اور گہری سانس لے کر کندھے

اچکائے پھر تیزی سے بھابھی کے پیچھے پیچھے اندر آگئی۔

"میری پیاری بھابھی جان! آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہم سب کو اس وقت چائے' پکوڑوں کی شدید طلب تھی۔" اس نے ان کے ہاتھوں سے بڑی سی ٹرے لیتے ہوئے شوخی سے دیکھا۔

"تو ٹھونس لو۔" وہ صفی کے سامنے جھکی۔

وہ جواب میں کچھ نہیں بولا بلکہ ایک فل سائز پکوڑا اٹھا کر املی' انار دانے کی چٹنی میں خوب بھگو کر اسی کے منہ میں ٹھونس دیا۔

وہ جواب تو تب دیتی جب منہ خالی ہوتا' بس اسے کپ اٹھاتے دیکھ کر گھورتی رہ گئی۔ اس نے باری باری سب کو چائے دی۔ پکوڑوں کی پلیٹ اور چٹنی درمیان میں رکھی شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔ جہاں پریزے بھابھی نے ایک اور پکوڑوں کی پلیٹ لا کر رکھی اور خود صوفے پر تراب کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ اپنے مچلتے بیٹے کو قابو کرنے میں بے حال ہو رہی تھی۔

"تنگ کر رہا ہے؟" وہ بہت رسان سے پوچھ رہی تھی۔

"لاؤ اسے مجھے دے دو' تم چائے لو' وہ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" وہ اس کی رسانیت کی پروا کیے بغیر بچے کو تھپکتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ غالباً" ثمرہ پھپھو کی گھوری میں فاصلہ رکھ کر بیٹھنے کی واضح تنبیہہ تھی۔ ان کے خیال میں بانجھ عورتوں پر پرچھاواں ہوتا ہے جو خربوزے سے نکلتی خوشبو کی طرح کسی بھی حاملہ عورت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اسی خوف کے زیر اثر تراب ذرا پرے ہٹی تھی۔

"یہ کہاں آتا ہے بھابھی' کسی کے قابو۔" اس نے برا سا منہ بنا کر اسے تھپکا اور خود اپنا کپ اٹھائے پھپھو کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر تراب ماہین اور الوینہ کو بڑی خواتین سے ڈسکشن کرتے دیکھتی رہی غالباً" دو دن بعد ابٹن کی رسم تھی وہ سب اسی سلسلے میں کپڑے سلیکٹ کر رہی تھیں۔ پریزے بھی اسی خیال سے اٹھ کر ان کے قریب آئی تھی اور اپنی رائے دینے لگی تھی۔ برجیس نے غیر محسوس طریقے سے اسے بہت پیار سے کہا۔

"پریزے تم جا کر رات کے کھانے کا بندوبست دیکھو بیٹا' یہ کام تو یہ بھی کر لیں گی۔ چلو لڑکیوں جلدی جلدی سمیٹو یہ سب۔" دوسرا جملہ انہوں نے باقی لڑکیوں سے کہا تھا اور خود اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

وہ اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں محسوس نہیں کرتی تھی یا شاید کبھی شروع میں محسوس کی ہوں مگر اب تو ایک روٹین بن گئی تھی۔ جب کہیں فوتگی یا میلاد ہوتا تو سب کو پریزے جانے کے لیے فارغ دکھائی دیتی۔

"بچے تم چلی جاؤ' اب ان سب کے تو بچے ہیں' کہاں اللہ رسول کی بات سننے دیتے ہیں' بچے روتے دھوتے لوگوں کو دیکھ کر دہل جائیں گے' اب ماؤں کے بغیر نکلتے بھی تو نہیں۔ مہمان داری ہے' کچن تو دیکھ لو' بچے پہلے ہی رو رہے ہیں مزید تنگ کریں گے تو باپوں سے کہاں برداشت ہو گا۔" اور وہ کچن تک محدود رہ جاتی۔ اور اگر کہیں خوشی یا کوئی شگن کا سماں ہوتا تو نہ بچے روتے' نہ ہی شور ہنگامے سے دہل جاتے بلکہ پریزے کو غیر محسوس طریقے سے دو قدم پیچھے ہی رکھا جاتا تھا۔

زندگی اک گمان بن کر رہ گئی تھی اور وہ سرابوں کی کمان پکڑتے پکڑتے دور' بہت دور خلاؤں میں خود کو بے وزن پتھر کی طرح محسوس کرتی جیسے وہ کسی کیمیائی عمل کے تحت صرف ایک مدار میں طواف کر رہا ہو' جس کے اختیار میں نہ رکنا ہو' نہ ٹھہرنا ہو ہاں البتہ کبھی کسی بھاری پتھر کے ٹکراؤ سے' جسم چور ہو جائے اور بکھر کر خلاؤں سے فضاؤں میں اور پھر گہرے پانیوں کی تہہ میں اتر کر' دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور پھر کسی مدوجزر کے تحت پانی اچھالے' فضا آنکھ چرالے اور خلا آغوش میں لے کر دار پر چلا دے۔

✡ ✡ ✡

سفید پھیکی سی دھوپ نے درختوں کے سروں پر کچھ دیر اپنی چھب دکھائی تھی پھر آسمان پر پھیلی کہر نے کرنوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ موسم کی شدت کے باوجود گھر میں خوب دھما چوکڑی مچی تھی۔ رات

اثر ضرور رہی تھی، مگر ابھی پوری طرح چھائی نہیں تھی۔ آج مہندی کی رسم تھی اور تیاریاں آخری مراحل میں تھیں۔ وہ ہاتھ میں اپنا لمبا سا بندا پکڑے تیزی سے داہنی دروازے سے تائی اماں کے پورشن میں داخل ہوئی۔ سلک کی مرجنڈا رنگ کی میکسی نفاست سے کیا شوخ میک اپ، اسٹیپس میں فریش کٹے بال اس کا سراپا قابل توجہ تھا، لیکن چہرے پر خاصی الجھن۔

وہ پریزے بھابھی کو پورے وثوق سے پکارتی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی اسے یقین تھا کہ وہ ابھی گھر پر ہی ہوں گی۔

"اوہ... ہو..." صفی نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"کیا ہے؟" وہ اس کی نگاہ سے جزبز ہوئی۔

"تم بتاؤ، ڈگڈگی والی بندریا، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔" اس نے گستاخ دل کو ڈپٹ کر اسے چڑانا چاہا جس پر اس نے مسکارے سے بوجھل پلکیں پھاڑیں اور گھورا۔

"میرا منہ مت کھلوانا۔"

"فدویہ بند منہ سے بول دو گونگی کی زبان تاحیات سمجھنے کے لیے تیار ہے خادم۔" وہ باقاعدہ کورنیش بجا لاتے ہوئے بولا تو اس نے دانت اور ہونٹ جمائے۔ اپنے نازک ہاتھ کو مٹھی کی شکل دی "ہونہہ" وہ پھنکاری۔

"اچھا اچھا، سوری سوری۔" اس نے کیمرا ایک ہاتھ میں پکڑا اور دوسرا ہاتھ اٹھا کر ہار تسلیم کی۔

"خوب صورت لوگ غصہ نہیں کرتے..."

"باتیں نہیں بناؤ بھابھی کا بتاؤ وہ کہاں ہیں؟"

"چھوڑو بھابھی کو، وہاں سامنے کھڑی ہو جاؤ تمہاری فوٹو بناتا ہوں۔" وہ اس کی بات سنی ان سنی کر کے اسے گلاس ونڈو کے آگے کھڑے ہونے کا مشورہ دے رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے بھئی، تمہیں تصویر کی پڑی ہے اور یہ دیکھو... میرا یہ ٹوٹ گیا ہے۔" اس کے ہاتھ میں مرجنڈا نگوں والا بندا تھا جس کا درمیانی نگ نکل گیا تھا اور وہ اسے ہاتھ میں لیے پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔

"شاید بھابھی جوڑ دیں۔" اس نے امید سے کہا۔

"کیوں آٹے کی لئی سے جڑوانا ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا اور ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔

"لاؤ ادھر مجھے دو۔"

"تم کیا کرو گے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔

"مادام آکاش سے ستارہ توڑ کر فٹ کر دوں گا... بے وقوف۔" اس نے دھیمے سے گردن ماری۔

"جوڑوں گا اور کیا کروں گا۔" اس نے قریب ہی الماری سے ایلفی نکالی اور ایک قطرہ گہرائی میں ڈال کر نگ فٹ کرتے ہوئے دباؤ ڈالا۔ رباط کی نگاہوں کا مرکز انگوٹھے اور انگلی کے بیچ دبا نگ تھا۔

"جلدی کرو پلیز دیر ہو رہی ہے۔"

"کوئی دیر ویر نہیں ہو رہی بے فکر رہو۔" وہ نگ پر سے انگلی ہٹاتے ہوئے بولا۔ "ابا جان کا حکم تھا کہ جب تک رمیز چچا کی فیملی نہیں پہنچتی رسم نہیں ہو گی اور سو جو..." وہ اسے پھر سے چڑانے لگا۔

"اگر وہ آئے ہی نا تو پھر تمہارے برادران کے سہرا کیسے بندھے گا۔"

"کیوں نہیں بندھے گا، تم جو ہو ہیرو پیچھے سے پکڑ کر کھڑے ہو جانا۔" اس نے بھی ادھار نہ رکھا۔

"تم لوگ نکلے نہیں۔" پریزے بھابھی کی آواز پر دونوں نے موڑ کر دیکھا۔ سی گرین جاموار کے پلازو پر گھٹنوں تک آتی گلابی اور اورنج گاؤن شرٹ جس کے فرنٹ پر گولڈن تلے اور گرین نگوں سے دلکش کام ہوا تھا۔ بڑا سا ملٹی شیڈڈ دوپٹا لمبی سیاہ چٹیا میں رنگین پراندے کے ساتھ موتیے کی کلیوں کو بھی گوندھا گیا تھا۔ اس پر مہارت سے میک اپ اور نازک جیولری ان کے خوب صورت سراپے کو چار چاند لگا رہا تھا۔

"واؤ۔" رباط بے اختیار بول پڑی۔ اس کا دور اندیش دل ابھی حدید بھائی پر ٹوٹنے والی حشر سامانی کا سوچ ہی رہا تھا کہ ان ہی کے بھاری قدم اور گمبھیر آواز گونجی۔

"کمال کر دیا پریزے تم نے، ٹائم دیکھا ہے۔" ان کی

آواز کے ساتھ انداز بھی خاصا کرخت محسوس ہوا تھا۔

"بچوں کی مائیں کب کی تیار ہو کر وہاں پہنچ چکی ہیں' ایک تم ہو اکیلی جان نے تیار ہونے میں سارا دن لگا دیا' ایسی بھی کیا تیاری ہو گئی۔" بھابھی کا چہرہ بلش آن سے اتنا ریڈ نہیں تھا جتنا بھائی کے انداز نے یک لخت کر دیا تھا۔ وہ اچھے خاصے غصے میں لگ رہے تھے۔ ٹائم بھی تو کافی ہو چکا تھا۔ پھر سردیوں کے دن تھے' دن ہوتا ہی کتنا ہے' صبح باقی سب خاصی دیر سے اٹھی تھیں غالبا" بچوں نے رات بھر تنگ کیا تھا اور پریزے عادتا" ذرا جلد اٹھی کچن میں قدم رکھا ہی تھا کہ چائے کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ناشتے تک نہ تھما۔ ناشتا نپٹا تو دوپہر کا کھانا بن کر آگیا بے شک تیار کھانا آیا تھا' مگر اسے لگوانے سمیٹنے کا ہی خاصا کام تھا۔

یہ خالصتا" تینوں فیملیز کا مشترکہ فنکشن تھا اور تینوں گھروں کے مہمان خواجہ نیاز اور خواجہ فواد کے گھروں میں ٹھہرائے گئے تھے۔ ہر فنکشن ہوٹل میں اکٹھے مہندی' بارات اور ولیمہ کے طور پر ارینج تھے' مگر مہمانوں کی آمد سے گھروں میں خوب ہلہ گلہ تھا۔ تراب پریگننٹ تھی۔ ماہین اور الوینہ اپنے بچوں میں گھری رہتیں یا پھر شوہر میں۔ زرمینہ اور علشبہ کی شادی تھی' جب کہ نشا' رباط بچیاں تھیں تھوڑا بہت ساتھ لگ جاتیں' مگر ذمہ داری کا احساس ابھی نہیں تھا۔ بڑی خواتین کے پاس ڈسکشن کے لیے بہت سے موضوع تھے۔ ایسے میں پریزے ہی بچی تھی۔ وہ کوئی کام کرتے تھکتی بھی نہ تھی سو صفورا اور اس کی بیٹی کے ساتھ لگ کر سارے کام نبٹاتی رہی۔ لنچ کے بعد سب نے اپنے بچوں کو بہلا پھسلا کر برجیس کے کمرے میں سلایا۔ رکھوالی کے لیے نشا اور رباط گھر میں تھیں اور انہیں تیار ہونے پارلر جانا تھا اور وہ اپنا اپنا سامان سمیٹ چلی بھی گئیں۔ پریزے کو بھی پارلر جانا تھا اور وہ فارغ ہو کر اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھی کہ نشا بڑبڑاتی ہوئی خالی فیڈر لے کر آئی۔

"بھابھی پلیز یہ بنا دیں۔" غالبا" تراب کا بیٹا اٹھ گیا تھا۔ اس کی آواز سے ایک کے بعد ایک سب اٹھ کر کورس میں رونے لگے۔ ایسے گمان ہوتا تھا جیسے رونے کی کلاس لگی ہو۔ پریزے ٹیپو کا فیڈر رہلاتی کمرے میں آئی وہاں رباط اور نشا غصے سے بھری کھڑی تھیں غالبا" برجیس نماز ادا کر رہی تھیں اور وہ بھی ایک کو کندھے سے لگا کر چپ کرواتیں' کبھی دوسرے کو آخر تنگ آکر نشا نے سونو کو زور سے بیڈ پر پٹخا۔

"کیا مصیبت ہے' چپ نہیں کرتے۔" رباط ہنی کو تھپکتے ہوئے درشتی سے بولی۔ تائی اماں نے جلدی سے سلام پھیرا اور ان دونوں کو اچھی خاصی سنائیں۔

"دفعان ہو جاؤ تم' بچوں کو کیوں ڈانٹ رہی ہو۔" پریزے نے آگے بڑھ کر ٹیپو کو پیار سے اٹھایا اور پھر دلار سے اس کی پشت سہلاتے ہوئے چپ کروایا۔ وہ فیڈر لینے پر آمادہ ہو ہی گیا تھا۔

"دیکھو وہ چپ ہو نہیں گیا۔" انہوں نے جائے نماز لپٹتے ہوئے ان دونوں کو گھورا جس پر انہوں نے ناک منہ چڑھایا اور گردن جھٹک کر تیار ہونے چل دیں۔ کسی بچے کو برجیس نے تھپکا کسی کو پریزے نے بہلایا' کسی کا فیڈر بنایا' کسی کا ڈائپر تبدیل کرتے خاصا وقت لگ گیا تھا۔ پھر برجیس نے اسے بہت رسان سے کہہ دیا۔

"اب سنبھل تو گئے ہیں' ایسا کرتے ہیں ان کے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بھی بدل دیتے ہیں' جانے وہ تو کب آئیں گی۔" وہ بہت شوق سے ان کے کام کر رہی تھی۔ انسان کی تخلیق ایک ہی قانون پر ہوئی ہے جذبات' احساسات' ضروریات وہ بھی انسان تھی اور پھر عورت' اس کے اندر ممتا کے جذبات' جو اکثر بری طرح مجروح کر دیے جاتے تھے ایسے موقعوں پر شاید پر چھاویں کا خوف نہیں دور سوجاتا تھا اور وہ اس اعتماد کی بحالی پر جو لمحے میسر آجاتے ان میں بچوں کا ننھا لمس اپنی ایک ایک نس میں اتار لیتی تھی۔ اب بھی اس نے سب کو لپٹا کر بہلا پھسلا کر کپڑے بدلے۔ وہ پھیلاوا سمیٹ رہی تھی کہ رباط بھاگتی ہوئی آئی۔

"بھابھی' بھابھی۔" پریزے کپڑوں کا ڈھیر ہاتھوں میں لیے کمرے سے نکل رہی تھی جب ہڑبونگ مچاتی

پیاری سی لڑکی کو دیکھ کر مسکرائی۔
"کیا ہو گیا بھئی.... ؟ کیوں شور مچا رہی ہو۔"
"آئیں.... ! آپ ابھی تک ایسے ہی پھر رہی ہیں' پارلر نہیں جانا۔" وہ فی الحال اپنا مسئلہ بھول کر انہیں مطمئن دیکھ کر حیرانی سے پوچھنے لگی۔
"بس ہو گئی ہوں فارغ.... گھر میں ہی تیار ہو جاؤں گی.... تم بتاؤ ہم کیوں پکار رہی تھیں۔"
"ہاں۔" اس نے اپنی عقل پر مہندی سے رچا ہاتھ مارا اور پھر منہ پھلا کر معصومیت سے بولی۔
"بھابھی میری میچنگ چوڑیاں نہیں مل رہی' ساری جگہ تلاش کر چکی ہوں.... اب کیا کروں.... ؟"
"کہاں رکھی تھیں۔" انہوں نے استفسار کیا۔
"یہی تو یاد نہیں آرہا۔"
"اچھا.... ایسا کرو میری ڈریسنگ کے سائیڈ پر چوڑی دان فکس ہے' اس میں دیکھ لو اگر کوئی میچ ہو رہی ہیں تو وہ پہن لو۔"
"اس کلر کی ہوں گی۔" اس نے اپنی مرجنڈا میکسی کی طرف اشارہ کیا۔
"جا کر دیکھ لو۔" وہ کپڑوں کا ڈھیر لے کر لانڈری کی طرف بڑھ گئی تھی اور پھر صفورا کو گھر کی ہدایات دینے کے بعد تیار ہونے کی غرض سے اپنے کمرے میں آئی۔ رباط چوڑیاں پہن کر نکل رہی تھی اسے دیکھتے ہی کلائی بجائی۔
"بھابھی میں نے یہ پہن لیں' ٹھیک ہیں نا....."
"آں.... ہاں....." اسے دیکھ کر تھوڑی سی سراسیمگی سے آنکھیں پھیلیں پھر دھیمے سے ہاں کہہ دیا۔
"آپ نے تو نہیں پہننی تھیں نا۔" اس نے خوشی خوشی پوچھا تھا اور سدا کی موت کی ماری پریزے مسکرا دی۔
"نہیں۔" پھر اس نے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے۔
"بہت پیاری لگ رہی ہو' نظر اتار لینا۔" اپنی تعریف پر وہ کچھ لال ہوئی اور باہر نکلتے نکلتے بولی۔

"جلدی تیار ہو جائیں۔" یہ بات زیادہ دیر پہلے کی نہیں تھی مشکل سے آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا جب وہ بندے کا نگ لے کر پھر آگئی تھی اور بھابھی تقریباً تیار تھیں۔ اتنی جلدی اور اتنا پیارا لگنے پر وہ تو سوچ رہی تھی کہ حدید بھائی کی آج خیر نہیں' مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ وہ بجائے لٹو ہونے کے اچھے خاصے برہم لگ رہے تھے۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک ایک نظر بھابھی کو دیکھا۔
"خاندان کی بڑی بہو ہو تم' تمہیں سب سے پہلے وہاں ہونا چاہیے تھا' مگر احساس ہو تب نا.... نکلو اب۔" وہ کہہ کر مڑے ابھی چند قدم بڑھے تھے پھر کچھ دھیان آنے پر رکے اور گردن موڑ کر پہلے والے انداز میں بولے۔
"اور تم لوگوں کا کیا مسئلہ ہے' تم نے نہیں جانا.... ؟" وہ اب صفی اور رباط سے استفسار کر رہے تھے۔ رباط تو بھابھی کی نم پلکیں دیکھ رہی تھی جب کے صفی نے فوراً کیمرا جیب میں ڈالا۔
"وہ.... میں بس لا رہا ہوں اسے۔" اس نے صفائی پیش کی۔
"کیا لا رہا ہوں' اپنی بائیک پر لاؤ گے اسے.... ؟" انہوں نے ڈانٹا۔
"چلو رباط میری گاڑی میں جا کر بیٹھو۔" بھائی نے تو سارے پلان پر پانی پھیر دیا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ رباط کو بائیک پر لے جائے گا۔ اور پھر رومانٹک انداز میں پرپوز بھی کرے گا' مگر حدید بھائی "ہونہہ" اس نے دانت کچکچائے۔
"خود تو پیدائشی سڑیل ہیں' دوسروں کی خوشی ہضم نہیں ہوتی۔" اس کی بڑبڑاہٹ پر رباط نے ہنسی دبائی اور بھابھی کا ہاتھ تھام کر تیزی سے پورچ کی طرف بڑھی تھی۔

☼ ☼ ☼

چمکتے قمقموں سے سارا ہال سجا تھا۔ ایک طرف ڈیک الاپ رہا تھا دوسری طرف لڑکیوں کا گروپ اسٹیج

پر ڈھول لیے بیٹھا تھا۔ لڑکے کسی سے کم نہ تھے بلکہ ان کے پیچھے کھڑے' کبھی تالیاں بجاتے تو کبھی انگوٹھے نیچے کر کے چڑاتے۔ چچا میز کے پہنچنے میں خاصی دیر تھی' ہال بھی وقت کی پابندی کے مطابق خالی کرنا تھا۔ اسی لیے ثمرہ پھپھو کسی کی بات کا جواب دیتے ہوئے زور سے ہنسیں اور پھر اسٹیج پر چڑھ گئیں۔

"اب بس کرو تم لوگ بھی' رسم کرنی ہے' جلدی کرو۔"

"نہیں ابھی نہیں' پلیز کچھ دیر اور۔۔۔" سب بچوں کا ملا جلا احتجاج فریحہ اور بر جیس کی مشترکہ گھرکیوں نے ختم کیا سب ایک دوجے پر فقرے بازی کرتے نیچے اتر آئے تھے۔ لڑکوں کا گروپ بھنگڑا ڈالتا حسام اور طیب کو لے آیا اور صوفے پر بیٹھا دیا۔ سب لڑکیاں ڈریسنگ روم سے زرمینہ اور علشبہ کو گھونگھٹ کیے سرخ سبز آنچل کے سائے میں لے آئیں اور درمیان کے صوفوں پر بٹھایا۔ علشبہ کے دائیں جانب طیب اور زرمینہ کے بائیں جانب حسام بیٹھا تھا۔ فریحہ ایک ایک کر کے سب جوڑوں کو بلواتیں اور رسم ادا ہوتی گئی۔ حدید اور پریزے خوشگوار موڈ میں ساتھ ساتھ بیٹھے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ حدید مسکرا کر اس کے کان میں کوئی کمنٹ دے دیتا تو پریزے کی مسکراہٹ مزید خوب صورت اور گہری ہو جاتی۔ رباط دلہنوں کے صوفے کے پیچھے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ انہیں اوپر بلانے کے لیے ہاتھ سے اشارے کر رہی تھی پھر خود ہی اتر کر آگئی۔ وہ ابھی چند قدم دور تھی۔ جب اس نے حدید بھائی کو کہتے سنا تھا۔

"تم نے چوڑیاں نہیں پہنیں۔۔۔؟" لہجے میں استفسار تھا۔

"پہنی تو ہوئی ہیں۔" جواب سرسری تھا۔

"میں ان کی بات نہیں کر رہا' وہ جو رباط نے پہنی ہوئی ہیں۔" استفسار کی جگہ تفتیش نے لے لی۔

"اچھا وہ۔۔۔ وہ ایکچوئلی رباط کے سوٹ کے ساتھ میچ کر گئی تھیں تو میں نے۔۔۔"

"تو تم نے اسے دے دیں۔" وہ بات کاٹ کر اندازہ لگانے لگے۔

"یقیناً" پسند نہیں آئی ہوں گی اسی لیے نا' ویسے بھی آج کل تمہیں میری لائی کوئی چیز پسند نہیں آتی' رات میں کتنے دل سے تمہارے لیے لایا تھا اور تم نے۔۔۔"

بھابھی اپنی صفائی میں "نہیں نہیں" میں منمنا رہی تھیں تو رباط کو بہت برا لگا وہ فوراً" سامنے آکر بول پڑی۔

"حدید بھائی یہ مجھے بھابھی نے نہیں دیں تھیں بلکہ میں نے زبردستی پہنی ہیں' آپ کو برا لگا' میں ابھی اتار دیتی ہوں۔" وہ کہتے ساتھ انہیں اتارنے لگی' مگر حدید نے چوڑیوں پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

"نہیں نہیں یہ کیا کر رہی ہو' میں تو ویسے ہی بات کر رہا تھا اور ویسے بھی تمہارے ہاتھ میں بہت پیاری لگ رہی ہیں۔"

"بات چوڑیوں کی نہیں تھی' بات تو لائے گفٹ کی تھی۔" وہ یہ دل میں سوچتا رہ گیا۔ پریزے کے بہت منع کرنے کے باوجود بھی رباط اسے اٹھا کر اسٹیج پر لے گئی۔

"کیوں آپ بھی آگے آئیں' سب رسم کر رہے ہیں آپ بھی کریں۔"

"نہیں نا رباط' تم مجھے رہنے دو' پلیز۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔" وہ اسی لہجے سے کترائی ذرا پیچھے پیچھے تھی' مگر رباط نے ایک نا سنی بلکہ حدید بھائی کو بھی اشارے کرتی رہی وہ اوپر تو نہیں آیا' مگر ذرا اسٹیج کے قریب کھڑا ہو گیا۔ پریزے ابھی علشبہ کے پاس آکر بیٹھی ہی تھی کہ پھپھو کی نند اٹھ کر آئیں۔

"بہو تم برا نہ ماننا' یہ رسم و شگن تو ہری بھری بہو' بیٹیاں ہی کرتی اچھی لگتی ہیں' بھئی ہم نے تو اپنے بڑوں سے سنا ہے بانجھ' بیوہ' بلی ایک برابر ہوتی ہیں' جس کا راستہ کاٹ دیں تو پھر بربادی ہی بربادی ہے۔" اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔ ثمرہ پھپھو نے دل رکھنے کو بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا بلکہ ان ہی کی تائید کر دی۔

"کہہ تو آپا آپ صحیح رہی ہو' اب رسمیں گھر کی آباد کاری کے لیے کی جاتی ہیں' بندہ پہلے ہی بدشگونی کیوں

کرے۔" ثمو کی بات برجیس کو بہت بری لگی تھی آخر پریزے ان کی بہو تھی۔ بے شک وہ خود جو مرضی کہتی رہتیں، مگر کیسی دوسرے سے وہ بھی اتنے لوگوں میں؟ ان کا جی چاہا ثمو اور اس کی نند کو کوئی سخت سا جواب دیں، مگر پھر موقع کی نزاکت کو سمجھا، مگر اندر کی کڑواہٹ پریزے پر ہی اتری۔

"اٹھو پریزے، حدید بلا رہا ہے، کچھ کہنا ہو گا اس نے۔" وہ اس وقت خود کو پہاڑ کی طرح ساکت محسوس کر رہی تھی اوپر سے کسی کی ترحم بھری نگاہ تو کسی کی طنزیہ۔ وہ بہت مشکل سے خود کو نیچے لائی تھی۔ وہ آکر حدید کے پاس کھڑی ہوگئی تھی حدید کے چہرے چند لمحے پہلے والی مسکراہٹ بھی غائب تھی۔

"تمہیں خود معلوم نہیں رسموں رواجوں کا۔" وہ درشتی سے کہنے لگا۔

"وہ تو بچی ہے تمہیں زبردستی لے گئی اور تم بھی چلی گئیں۔ تم جان بوجھ کر ایسا کرتی ہو، تاکہ لوگ رحم کھائیں ہم پر، خود ترسی میں مبتلا ہو تم، خود تو احساس کمتری کی ماری ہو، مجھے خوامخواہ نشانہ بنواتی ہو۔" اس کی دبی آواز میں چبا چبا کر ادا ہوتا ہر جملہ اس کے دل میں انی کی طرح کھب رہا تھا۔ رباط ان سے سوری کرتے نیچے آئی تھی، مگر حدید بھائی کے تیوروں نے قدم روک دیے وہ وہاں ہی رک گئی قریب ہی صفی ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ غالباً" اس کے کانوں میں بھی ایک آدھ جملہ گیا تھا۔ نگاہیں ان دونوں کی سامنے لوگوں پر تھیں، مگر آہستگی سے ہم خطاب تھے۔

"صفی کیا سارے مرد بے حس، بے اعتنا ہو جاتے ہیں، جو عورت کے سارے جذبات، احساسات یا اندر کی توڑ پھوڑ کو مزید کچل کر رکھ دیتے ہیں۔"

"نہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔

"تم جانتی تو ہو بھائی پہلے ایسے نہیں تھے۔ اردگرد کے لوگوں کی باتوں، ترس، رحم نے انہیں چڑچڑا کر دیا ہے۔"

"یہ سب تو بھابھی بھی سنتی ہیں، مگر وہ تو چڑچڑی نہیں۔" رباط نے افسردگی سے کہا۔

"وہ بے چاری کس پر غصہ کریں۔" وہ دلیل دے رہا تھا۔

"تو پھر اس کا مطلب ہے کہ انہیں کمزور جان کر اپنی ساری فرسٹریشن ان پر نکال دو۔"

"یار لوگوں کے رویے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔"

"ہونہہ لوگ" وہ بدمزہ ہوئی۔ "لوگوں کا کیا ہے، وہ تو انہیں اچھوت ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں جیسے یہ کمی ان کی اپنی پیدا کردہ ہو۔" صفی ستون سے ٹیک ہٹا کر ذرا آگے ہوا اور اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بھنوئیں اچکائیں اور پھر زور سے ہنسا۔

"کیا ہو گیا۔۔۔ میڈم۔۔۔؟" پریزے بھابھی جانے کہاں سے برآمد ہوئیں تھیں۔ اسے بے تحاشہ ہنستا دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

"اللہ خیر، ایسے کیوں ہنس رہے ہو۔"

"بھابھی۔" وہ ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے بمشکل بولا۔

"محترمہ فرما رہی ہے میں پاگل ہو گئی ہوں۔"

"رباط۔۔۔ میری جان۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر اس کا خائف سا چہرہ اپنی جانب اٹھایا۔

"کس چیز کی بنی ہے یہ عورت لوہے سے، پتھر سے، یا سیسے سے۔" وہ ان کا پرخلوص مسکراتا چہرہ دیکھ کر سوچتی رہ گئی، پھر یک لخت ہی دونوں بازو ان کے گلے میں ڈال کر لپٹ گئی۔

"کچھ نہیں بھابھی، ایسے ہی بکواس کر رہا ہے۔"

"چلو پھر پھر میری اک خواہش ہی پوری کر دو، دو حسیناؤں۔" وہ اس کی بات سن کر آہستہ سے الگ ہوئی اور پوچھا۔

"کیا۔"

"پاپا کی گاڑی آج میرے پاس ہے اور آپ دونوں میرے ساتھ گھر جائیں گی ٹھیک۔" بھابھی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا تو وہ جھینپ گیا اور منمنایا۔

"پلیز بھابھی۔۔۔ اب یہ محترمہ اکیلی تو میرے ساتھ جائیں گی نہیں اور نہ کوئی جانے دے گا، کہیں سالم

نگل ہی نہ لوں حالانکہ میں حرام چیزیں نہیں کھاتا۔"
"بتاؤں تمہیں میں۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر غرائی۔
"اچھا سوری! سوری۔" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"پھر ٹھیک ہے نا بھابھی۔"
"سوچوں گی۔۔۔ اور چلو نیچے چل کر کھانا کھاؤ۔" وہ اس کی کمر تھپک کر آگے بڑھ گئی تھیں۔
جہاں آج رباط تھوڑی اداس ہوئی تھی وہاں جی بھر کر خوش بھی ہوئی تھی غالباً" وہ آج پر کشش لگ رہی تھی۔ اس لیے صفی کا منہ سے کچھ نہ کہنا مگر پیچھے پیچھے پھرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ فنکشن ختم ہونے کے بعد سب اپنی اپنی چیزیں سمیٹے باہر کی جانب لپک رہے تھے حدید اور طیب گاڑیاں صحیح لگوا رہے تھے۔ رباط بازو پر جرسی اور شال ڈالے بھابھی کے ساتھ آرہی تھی۔
محبت برسا دینا تو کہ ساون آیا ہے
تیرے اور میرے ملنے کا موسم آیا ہے
وہ انگشت میں چابی گھماتا ایک ٹون میں اس کے قریب آکر گنگنایا تھا۔ صفی نے مزید شوخ ہونے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ حدید بھائی تیزی سے اسٹیپ چڑھتے اوپر آگئے۔
"تم لوگ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، چلو گاڑی میں بیٹھو۔"
"وہ۔۔۔ ابا کی گاڑی۔ میرے پاس ہے، انہیں میں لے جاتا ہوں۔" وہ گاڑی کی چابی بطور تصدیق دکھا رہا تھا۔ جب کہ حدید نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا اور لفظ دہرائے۔
"ابا کی گاڑی تمہارے پاس ہے؟" اور پھر کہنے لگے۔
"چلو ٹھیک ہے، امی پھپھو لوگوں کو گاڑی میں بٹھاؤ، اور چلو جلدی۔" وہ مزید بتانے لگے۔
"رمیز چچا گھر پہنچ چکے ہیں، ابا اور چچا کے فون پر فون آرہے ہیں۔ جلدی نکلو۔"
"لیکن وہ۔" اسے کچھ سمجھائی نہ دیا۔
"یار کیا لیکن ویکن، گھر جا کر بات کریں گے، تم جلدی کرو۔ اور رباط۔۔۔" جب اسے پکارا تو اس کا بھی مرا ہوا "جی" نکلا۔
"تم علشبہ اور زرمینہ کو لے کر آؤ، وہاں میری گاڑی میں آکر بیٹھو، جلدی کرو، ہری اپ۔" وہ حکم صادر کر کے مڑے اور ساتھ پریزے کو بھی آہستہ سے کہا۔
"چلو یار" وہ اپنی ہنسی دبائے اندر سے ہونٹ چباتے صفی اور منمناتی رباط کو چور نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"بہت شوق ہے آپ کے میاں کو ظالم سماج بننے کا، لگتا ہے کسی صدی میں ڈکٹیٹر رہے ہوں گے ہونہہ۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھتے بھائی کو گھور رہا تھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے اگلا دروازہ کھولے پریزے کا انتظار کر رہا تھا۔ دھیما سا میوزک بھی آن تھا۔ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی گردن کو جنبش دی اور نگاہ کا رخ اس کی طرف موڑا۔
"ناراض ہو۔" یقیناً" اس کی خاموشی محسوس کی تھی اسی لیے دھیمے سے بولا تھا۔
"نہیں۔" اس کی آواز اس سے بھی کم نکلی۔
"حالانکہ ہونا چاہیے تھا۔" اس نے گاڑی کے ٹائر سیدھے کرتے ہوئے اسے پھر دیکھا وہ مسلسل اسکرین پر چلتے وانھوز دیکھ رہی تھی۔ وہ کھسیانا سا مسکرایا اور اپنا بایاں ہاتھ اس کی گود میں رکھے دونوں ہاتھوں پر رکھ دیا۔
"ایم سوری، پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے یار، رئیلی سوری۔" بس اتنی سی بات تھی ساری خفت مٹ گئی۔ پریزے نے "سوں" سے ناک چڑھائی اور بے اختیار مسکرا کر اسے دیکھا۔ رباط علشبہ اور زرمینہ کو لیے آرہی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ اس کی گود سے اٹھایا اور اسٹرینگ سنبھال لیا۔
گاڑی دھیرے سے پورچ میں رکی تھی۔ صفی تیز ڈرائیو کرتا بوڑھیوں کو "لاحول" پڑھواتا بہت پہلے پہنچ گیا تھا۔ برابر ان کی گاڑی بھی آن کھڑی ہوئی۔ رباط دونوں دلہنوں کو نکال کر آگے بڑھی تھی۔ جب اس نے حدید بھائی کو بھابھی سے کہتے سنا تھا۔
"ابھی چینج نہ کرنا۔" غالباً" اس کو گاڑی میں بھی

ایک آواز کا شک گزرا تھا۔

"پیاری لگ رہی ہو۔"

"واؤ" اس کی آنکھیں پھیلیں اور بھابھی کے ہم قدم ہونے کے لیے لحہ بھر رکی۔

"خوب سود سمیت بدلہ لینا ہٹلر سے" اس کے کان میں سرگوشی کرنے پر پریزے اسے آنکھوں میں ڈپٹتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ہوٹل سے آنے کے بعد سب پر بری طرح تھکاوٹ سوار تھی جلدی جلدی رمیز چچا' ان کی بیوی بیٹی سے مل کر اپنے اپنے ٹھکانے ڈھونڈے۔ نشا' رباط اور سیما کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔ بیٹا ان کا آیا نہیں تھا۔ بڑے سارے خواجہ نیاز کے کمرے میں بہت دیر سے جمع تھے۔ ان سب بڑوں میں حدید، صفی اور طیب بطور خاص بیٹھے تھے۔ کوئی خاص ڈسکشن چل رہی تھی۔ پریزے سیما سے رباط کے کمرے میں مل لی تھی۔ خاصی ماڈرن مگر سنجیدہ لڑکی تھی جینز پہنے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے کہیں سے بھی اس خاندان کی نہیں لگ رہی تھی۔ غالباً" وہ بہت پہلے یہاں آئی تھی مگر تب پریزے نہیں تھی اسے وہ خاصی مختلف لگی تھی۔ اس کی ملاقات ابھی رمیز چچا سے بھی رہتی تھی۔ ان کا تذکرہ تو بہت سنا تھا مگر وہ یہاں آتے ہی بہت کم تھے اس کی شادی کے بعد ایک دوبار ہی آئے تھے تب پریزے میکے گئی ہوئی تھی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے اٹھنے لگی کہ قہوے اور چائے کے جو دھڑا دھڑ آرڈر آئے کہ پھر وہ کچن تک ہی رہ گئی۔ کلاک کی سوئی ایک کے ہندسے کو چھو رہی تھی اور اس کا تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اباجان کی طرف چل دی کہ ان سب کو چائے بھی دے دی گئی اور بہانے سے چچا' چچی سے سلام دعا بھی ہو جائے گی۔ وہ چائے لیے اسی خیال سے وہاں گئی تھی اور کھلے دروازے میں سے باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں لیکن ان سب میں یک لخت نمایاں آواز صفی کی ابھری

اور لہجہ بھی بھنایا ہوا بلکہ گستاخانہ تھا۔

"آپ سب لوگ میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں؟"

چچا' چچی نے جن ملتجی انداز میں بہن بھائیوں سے گزارش کی تھی تو سب کی نظریں صفی پر اٹھیں اسے اپنے والدین کی خاموشی سے خطرہ ہوا اس سے پیشتر کہ کوئی فیصلہ ہوتا وہ بول پڑا۔

"میری رباط کے لیے فیلنگز کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں' اور نا مجھے کسی سے کچھ چھپانے کی ضرورت ہے۔" وہ نہایت دو ٹوک کہتا تیزی سے باہر نکلا' بھابھی پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کمرے میں جاکر دروازہ دھاڑ سے بند کیا تھا۔ پریزے یہ تو جانتی تھی کہ چچا سیما کی طرف سے خاصے پریشان ہیں' پھر ان کے بیٹے جنید نے بھی کسی لڑکی سے شادی کی پھر چھوڑ دیا' اب کسی اور کے چکروں میں ہے' ماڈرن کلاس کی بگڑتی نیچر کا حل خاندان سے وابستگی میں نظر آیا ہوگا۔

"تو کیا انہوں نے صفی کا انتخاب کیا۔ اومائی گاڈ!" وہ سوچتے ہی لرز گئی۔

"رباط تو مرجائے گی' صفی ہر چیز کو تہس نہس کردے گا۔" اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب اندر جائے یا وہاں سے ہی واپس ہولے۔ بہرحال سلام تو کرنا تھا۔ وہ کچھ ہمت پیدا کرکے اندر آگئی۔ صفی کے انداز نے سب کو ساکت کردیا تھا۔ اس نے کبھی غصے میں ری ایکٹ نہیں کیا تھا مگر اب...؟ سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے مگر پریزے کے آنے سے کچھ فضا بدلی۔

"السلام علیکم!" اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی پھر جھک کر دونوں کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" چچا نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "یہ...؟" وہ شاید یادداشت کھنگال رہے تھے فواد چچا نے یاد دلائی۔

"اپنے حدید کی بیوی ہے۔"

"اچھا اچھا' ماشاء اللہ" انہوں نے اسے اپنے پاس ہی بیٹھا لیا تھا۔

"بہت عرصے بعد دیکھا ہے ناں بس بیٹا مصروفیات

ہی ایسی ہیں وقت ہی نہیں ملتا آنے جانے کا' حدید بھی کبھی نہیں لایا۔" انہوں نے پر شکوہ نگاہ سے حدید کو دیکھا پھر اس کی خیریت پوچھی جواب میں اس نے "جی" کہا۔

"حدید! بیوی تو تمہاری بہت پیاری ہے بھئی۔ اور بچے کہاں ہیں' ان سے نہیں ملواؤ گے۔" ان کے سرسری پوچھنے پر ہی ماحول میں پھر بھاری پن آگیا' حدید جو چچا کی تعریف پر مسکرایا تھا یک لخت چہرہ سمٹ گیا۔

"بس بھیا!" ثمرہ پھپھو نے زمانے بھر کی مظلومیت لہجے میں سموتے ہوئے کہا۔

"ہمارے حدید کے ایسے نصیب کہاں' جانے کس بلی نے اس کی بارات کا راستہ کاٹا تھا' جو آج تک خوشی مقدر نہ بنی۔"

اس کا دل چاہا وہ اسی جگہ دھنس جائے۔ کسی کو بھی نظر نہ آئے۔ اس نے بہت آہستہ سے پلکیں اٹھا کر حدید کو دیکھا تھا۔ گاڑی میں کتنا خوب صورت موڈ تھا اس کا مگر اس وقت صرف قلق کا سایہ لہرا رہا تھا۔ وہ تھوک نگل کر کھڑی ہوئی اور خود کو نارمل ظاہر کرتی ہوئی سب کو چائے سرو کی آخر میں حدید کے آگے کپ کیا تو اس نے صاف کہہ دیا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر باہر چلی گئی۔ چچی نے اسے پھیکی سے مسکراہٹ کے ساتھ باہر تک بغور دیکھا تھا۔ وہ بہت بے کلی سے کمرے میں ٹہلتی حدید کا انتظار کرتی رہی تھی۔ کلاک کی سوئی تین کے ہندسے کو بھی کراس کر گئی تھی' مگر وہ ابھی تک کمرے میں نہیں آیا تھا۔ جانے وہاں ایسی کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بہت سے اندیشوں اور وسوسوں میں گھری بار بار کلاک کی سوئیاں دیکھتی رہی۔ آخر تنگ آکر چینج کیا اور لیٹ گئی۔

معمولی سی آہٹ سے دروازہ کھلا تھا اس نے آنکھوں پر رکھی کہنی کی درز میں سے جھانکا۔ وہ کچھ دیر اسے بے سدھ پڑے دیکھتا رہا تھا۔ نائٹ ڈریس پہنا پھر واش روم سے آتے ہی لائٹ آف کی اور گرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھا اور پھر لیٹ گیا تھا۔ وہ بے چینی سے بار بار سائڈ بدل رہا تھا۔ شاید نیند نہیں آرہی تھی جب انسان کا دماغ ایک ہی وقت میں بہت سے راستوں پر سفر کر رہا ہو اور منزل کے تعین کے لیے راہ دشوار بھی نظر آئے' فیصلہ کا وقت محدود اور کم ہو تو ایسے میں نیند تو کیا سانسیں بھی رک جاتی ہے۔ ایسی ہی کچھ اس کی حالت تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ مجھے دھوکے سے لائیں ہیں' یہ زیادتی ہے میرے ساتھ' میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" وہ چیخ رہی تھی۔

"تمہاری حرکتوں نے مجبور کیا ہمیں یہ فیصلہ کرنے پر۔" آواز میں تنبیہہ تھی۔

"میں... میں زہر کھالوں گی ڈیڈ..."

"تم زہر کھاؤ گی ہونہہ؟" انہوں نے حظ اٹھایا۔

"تم کیوں کھاؤ زہر' مجھے دے دو بلکہ تمہارے پاس دو راستے ہیں یا تمہارے باپ کا فیصلہ یا پھر اس کی موت' میں ساری رات کی بحث سے تھک گیا ہوں' اب جو جی میں آئے راستہ چن لو۔" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پریزے کی آنکھ بہت دیر سے اور ہڑبڑاہٹ سے کھلی تھی۔ نماز کو قضا ہوئے بہت سا وقت گزر گیا تھا۔ اس نے کسمساتے ایک نظر حدید کو بے سدھ سوتے دیکھا اور پھر باہر لاؤنج میں آگئی۔ وہاں معمول سے زیادہ سناٹا تھا۔ اس نے ایک چکر سارے گھر کا لگایا پھر گیسٹ روم میں سے آتی آوازوں پر رکی' اس کا ذہن مزید الجھ گیا تھا۔ پھر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ حدید بیڈ پر نہیں تھا۔ واش روم سے تیز شاور چلنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ بہت دیر اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ اس کی بدلی بدلی کیفیت اسے وسوسوں میں دھکیل رہی تھی۔ وہ خاصی دیر بعد ٹاول سے سر رگڑتا باہر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی حدید کے چہرے پر سراسیمگی کا عالم ٹھہر گیا۔ خواہ مخواہ ہی ڈریسنگ پر چیزیں ادھر ادھر کرتا رہا پھر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔" چند پل کی خاموشی کو اسی نے توڑا تھا۔

"جی۔" پریزے نے ابرو اٹھائیں۔ خامشی کے پردے میں وہ اس کے چہرے پر لفظ تراشتا رہا۔

"وہ۔ وہ تم نے ناشتا کرلیا۔۔۔؟" اس کے کنفیوژ لہجے کو یک لخت بدلتا دیکھ کر وہ بھونچکارہ گئی۔

"یہی ضروری بات تھی۔۔۔؟"

"نہیں میرا مطلب ہے پہلے ناشتا کرلو۔"

"آپ بتائیں کیا مسئلہ ہے' کیوں پریشان ہیں۔"

"دیکھو پریزے۔" کچھ دیر لفظوں کی ادھیڑبن کے بعد اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"زندگی میں بہت سے مراحل آتے ہیں' بہت سے فیصلے ناچاہتے ہوئے بھی کرنے پڑتے ہیں' انسان کی مجبوریاں' بے بسی' ضروریات ان فیصلوں کو پختگی عطا کردیتی ہیں۔" اس نے استفہامیہ نظر اٹھائی۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں' پہیلیاں مت بجھوائیں۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"تم بہت سمجھدار عورت ہو' میری مجبوری اور ضرورت سمجھ سکتی ہو' میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا قطعی نہیں ہے' مگر میں انتہائی مجبوری و ضرورت میں ایک فیصلہ کرچکا ہوں۔"

"کیسا فیصلہ۔۔۔؟" اس کا دل خلا سے یک لخت سمندر میں جاگرا تھا اور آواز گھاٹیوں میں دب کر نکلی تھی۔

"پریزے کوئی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔" اس نے خوف اور وسوسوں سے سفید پڑتی پریزے کا ہاتھ مزید گرم جوشی سے دبایا۔

"میرے رویے میں قطعاً" فرق نہیں آئے گا۔" پریزے نے اک موہوم سی امید سے نگاہ اٹھائی تھی مگر اس نگاہ کو پذیرائی کیا ملی۔۔۔؟

"میرا۔۔۔ میرا آج شام سیما سے نکاح ہے۔" وہ کہہ کر مزید نہیں بیٹھا بلکہ اس کے سر کی پشت پر حوصلہ دلاتی تھپکی لگائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم پتھر کی طرح وہاں بیٹھی رہی۔ اس کے اندیشے اور وسوسے صفی اور رباط کے لیے تھے۔ اس نے اس رات ان دونوں کے ملن اور خوشیوں کی دعائیں مانگی تھیں' مگر شاید صفی کی کوئی مجبوری یا ضرورت نہ تھی جو دراڑ ڈالتی۔ یہ نارسائی' بے چارگی تو اس کے حصے آئی تھی پھر نصیب سے کیسے لڑتی۔ وہ کتنی دیر خشک آنسوؤں سے روتی رہی۔

آج کسی کو کچن میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی اسے کسی کام سے بلانے نہیں آیا تھا سب کے کام اچھے سے ہورہے تھے۔ یقیناً" سب کا ایک معمول کا دن تھا' مگر غیر معمولی تو صرف اس کے لیے تھا اور تو اور رباط نے بھی کمرے میں نہیں جھانکا۔ شاید وہ اپنی جان بخشی کا جشن منارہی ہو یا پھر اسے اس حالت میں دیکھ نہ پائے۔ وہ شام تلک ہونقوں کی طرح منہ کھولے سانس محسوس کرتی رہی۔ پھر اپنی بے حس فطرت پر بڑا سا لبادہ اوڑھ لیا اور غیر محسوس طریقے سے معمول کی دوڑ میں شامل ہوگئی۔ جیسے یہ سب اس کے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور کے ساتھ ہورہا ہو۔ رباط اور صفی اندر ہی اندر غم زدہ تھے' مگر اس کے سامنے نہیں آئے۔ غالباً" ان میں بھابھی جتنی ہمت نہ تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے۔۔۔ جھوٹی ہمت کا نام نہاد مظاہرہ تو وہ بھی کررہی تھی' مگر رات۔۔۔ وہ رات بہت بھاری' طویل ترین اماوس کی رات جو کاٹے نہ کٹ رہی تھی۔ اس کے آٹھ سال کے رکے آنسو اس خاموش رات کا پانی بن کر احتجاج پر اتر آئے۔ وہ کارپٹ پر بیٹھی بری طرح سسکتے ہوئے لرز رہی تھی۔ اک وہ رات ہی کیا اب ہر گزرتا دن اسے پل صراط پر کھڑا کردیتا۔ حدید نے درست کہا تھا۔ کوئی اس کی جگہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ سیما خاصی چڑچڑی اور بدمزاج تھی۔ شروع شروع تو سنجیدہ رہی پھر رنگ بدلے۔

☆ ☆ ☆
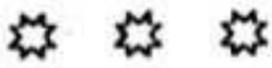
زرمینہ بہت دیر سے اٹھی تھی۔ کمرے سے باہر نکلی تو تھکاوٹ اور کسلمندی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"بچے ذرا جلدی اٹھ جایا کرو۔" فریحہ نے اسے آج پھر ٹوکا تھا۔

"حسام کب کا جا چکا ہے' آج پھر ناشتے کے بغیر گیا ہے۔"

"اٹھا ہی نہیں جاتا چچی اور میں نے انہیں کہا تو تھا ناشتا کر کے جائیں۔" اس نے جمائی روکتے ہوئے اپنے بال کیچو میں جکڑے تھے۔

"اکیلے کیسے کرتا' تم اٹھتیں تو وہ کرتا نا۔"

"چچی' وہ پہلے بھی تو اکیلے کرتے تھے۔۔۔" وہ منہ پھلائے صفائی پیش کرتے ہوئے ان ہی کے پاس دھپ سے صوفے میں دھنس گئی۔

"پہلے اور اب میں فرق ہے' اب وہ شادی شدہ ہے' خیال رکھا کرو اس کا۔" آج انہوں نے قدرے سختی سے کہا تھا اور ناراضی کے اظہار کے لیے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ اسے ان کا یہ انداز بہت برا لگا تھا' ٹپکل ساسوں والا۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ چچی بھی ساس بن جائیں گی۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی رہی پھر اپنا حلیہ درست کیا اور امی کی طرف چلتی بنی۔ وہ وہاں سے ناشتا کر کے خاصی دیر میں واپس آئی تھی۔ فریحہ' رباب اور علشبہ کسی موضوع پر سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ تراب نے اسے فون پر مگن اور داہنی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو اسے اچنبھا ہوا تھا۔

"زری تم سوتی ادھر ہو' اٹھتی ادھر سے ہو' یہ کیا معاملہ ہے بھئی۔" لہجہ مذاقاً تھا۔

"میں ناشتا کرنے گئی تھی۔" اس نے سیل کے اسپیکر پر ہاتھ رکھتے ہوئے لاپروا انداز میں جواب دیا تھا جس پر فریحہ اندر تک کڑھ گئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔؟" علشبہ کو بھی عجیب لگا تھا۔

"بڑی ممانی کیا سوچیں گی' تمہیں یہاں ناشتا نہیں ملتا۔ اور ویسے بھی یہ بات حسام کو بالکل پسند نہیں آئے گی۔"

"حسام کو کیا پسند ہے' کیا ناپسند ہے ایک لسٹ بنا کر دے دیں وہ۔"

"زرمینہ بھابھی کیا ہوا۔۔۔؟" لاؤنج سے آتی آوازوں پر میگزین میں کھوئی رباط چونکی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

"ابھی تو کچھ نہیں ہوا' مگر ہو ضرور جائے گا۔" اس کے دن بدن بدلتے انداز پر فریحہ کڑھتی ضرور تھیں' مگر آج حقیقی معنوں میں غصہ آرہا تھا بلکہ سوچ رہی تھیں کہ بر جیس بھابھی سے جلد از جلد اس مسئلے پر بات کریں گے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔؟" رباط ذرا قریب آکر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تھی۔

"سب کو میری ہر بات پر اعتراض ہے۔" اس نے کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

"دیر سے کیوں اٹھی' وہاں کیوں گئیں' یہاں کیوں نہیں کھایا' علشبہ کا خیال کرو' تراب کے بچے پکڑ لو۔۔۔ یہ سب میری ڈیوٹیز نہیں ہیں' جس آرام و خیال کا سب کو کہا جاتا ہے اس کی مستحق میں بھی ہوں۔" وہ سب کو ششدر چھوڑ کر پاؤں پٹختی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

ان کی شادیوں کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ شروع شروع کے دن تو بہت اچھے گزرے تھے۔ فریحہ نے بھی بہوؤں کے ناز و نخروں میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور علشبہ کی طبیعت خراب تھی۔ ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا جس کی وجہ سے ڈاکٹرز نے اسے وزنی کام اور زیادہ چلنے پھرنے سے منع کیا تھا۔ تراب کا بیٹا اسے بہت تنگ کرتا تھا اور خود بھی تخلیق کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی اسی لیے فریحہ اسے اپنے پاس لے آئیں اور اسی سلسلے میں انہوں نے ایک دو بار زرمینہ کو کہا تھا۔

"بچے علشبہ بہت دیر سے کچن میں کھڑی ہے' ذرا تم دیکھ لو' تم ذرا جلدی اٹھ جایا کرو بیٹا' تمہارے چچا' طیب' حسام نے جلدی آفس جانا ہوتا ہے۔۔۔ زرمینہ دیکھنا ذرا تراب کا بیٹا اتنا کیوں رو رہا ہے۔" اور وہ ان ہی باتوں پر چڑنے لگی تھی کہ میں کسی کی نوکرانی ہوں جو

آگے پیچھے پھروں اور ایک دوبار اسی بنا پر حسام سے جھڑپ بھی ہوئی۔

"جب تم ان مراحل سے گزروگی' تو سب تمہارا بھی خیال کریں گے۔" حسام کے لہجے میں سرزنش تھی جس پر وہ بدکی۔

"تم مجھے طعنہ دے رہے ہو؟" اس نے اتنا شور کیا کہ فریحہ کو مسئلے میں کودنا پڑا اور بہت بہلا پھسلا کر اسے رشتوں کی اونچ نیچ سمجھائی۔ اس وقت تو رودھو کر اسے سمجھ آگئی' مگر پھر کسی دن بگڑ جاتی اور ایسی بوجھل فضا میں رباط کی جان نکل جاتی کہیں ان سب باتوں کا اثر اس کی زندگی پر نہ پڑے۔ غالباً" رمیز چچا کے سامنے صفی کے واضح اعلان پر سب کی آنکھیں کھل گئیں تھیں۔ بجائے یہ کہ بات زبان زدعام ہوتی بڑوں نے شادی سے چند دن بعد دونوں کو انگوٹھی پہنا کر پسند کو رشتے کا نام دے دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آفس سے واپسی پر وہ بہت دیر تلک خوامخواہ گاڑی گھماتا رہا تھا۔ رات پوری طرح چھا گئی تھی اور وقت کا احساس ہوا تو گھر کی راہ لی۔ گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس آنکھوں پر پڑتے ہی اس نے بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور پھر انگلیوں کی جھری میں سے دیکھا۔ وہ آگیا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"تم سوئی نہیں؟" وہ اس کے قریب پڑی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"نہیں... نیند نہیں آرہی تھی۔" اس نے ماربل کے ٹھنڈے اسٹیپ پر سے اٹھتے ہوئے قمیص درست کی۔

"کیوں...؟" وہ کیوں کا کیا جواب دیتی۔ کہنا تو چاہتی تھی کہ وہ تو کئی ماہ سے نہیں سوئی... جانے کیوں؟ مگر وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"چلو اندر جاکر لیٹو...." اس نے ہلکا سا اس کی پشت کو تھپکا تھا۔

"کھانا...؟" پریزے کے استفسار میں کتنا اصرار چھپا تھا' مگر اس بے خبر نے صاف کہہ دیا "کھالیا تھا" وہ کہہ کر اپنے دوسرے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اور دروازہ ٹھک سے بند کر دیا۔ پریزے کو لگا جیسے یہ دروازہ اس کے دل پر بند ہوا ہو۔ وہ سلیولیس شرٹ پہنے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کسی سے فون پر بات کرنے میں منہمک تھی۔ آہٹ ہونے پر مڑ کر اسے دیکھا اور پھر آہستگی سے بات کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

"کس کا فون تھا؟" وہ پوچھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا اور بوٹ اتارنے کے بعد موزے اتار رہا تھا۔

"ڈیڈی کا...." اس نے سیدھے ہوتے ہوئے کمبل اوپر تک کھینچ لیا۔

"ٹھیک تھے...؟"

"میں نے پوچھا نہیں۔" وہ نائٹ ڈریس لینے کے لیے کپ بورڈ کی طرف بڑھ رہا تھا' مگر اس کے جواب پر تعجب ہوا پھر گردن جھٹک کر کپڑے نکالے اور واش روم کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک کپ چائے بنادو۔"

"کیوں؟ میں تمہاری میڈ ہوں' صفورا سے کہو۔" اس کا جواب حدید کو تپا گیا تھا۔ وہ وہاں سے ہی مڑا اور اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں.... تم میری میڈ نہیں ہو۔" وہ لہجے میں وزن پیدا کر کے بولا۔

"اور نہ ہی صفورا میری بیوی ہے' مجھے اس وقت اپنی بیوی کے ہاتھ کی چائے چاہیے۔"

"بیوی تو تم نے ایک اور بھی پال رکھی ہے' اس سے بنوالو۔"

وہ اس وقت برداشت کی انتہا پر تھا صرف دانت جمائے اسے گھورنے لگا۔

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو۔"

"یہی کہ طلاق دو اسے یا پھر مجھے چھوڑ دو...."

"آخر تمہیں اس سے مسئلہ کیا ہے' کیوں چھوڑ دوں اسے....؟"

"تو پھر مجھے چھوڑ دو۔" وہ کمبل پھینک کر چلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"مجھے بٹا ہوا ہزبینڈ نہیں چاہیے۔"

"مائنڈ یور لینگویج۔" اس نے آنکھیں چیر کر انگشت اٹھائی۔

"میں ان لہجوں کا عادی نہیں ہوں' جانے کس مجبوری میں برداشت کر رہا ہوں تمہاری بدتمیزیوں کو۔"

"تو مت کرو برداشت' مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے آٹھ سالہ استعمال شدہ شخص کے ساتھ رہنے کا۔۔۔ ڈیڈی مجھے دھوکے سے یہاں لائے تھے' بلیک میل کیا تھا مجھے۔۔۔ ورنہ میں۔۔۔ ہونہہ۔"

"تو پھر تم ان ہی کے ساتھ لڑو' سمجھیں۔"

"میں ان سے بات بھی کرنا پسند نہیں کرتی۔۔۔" اس نے غصے سے کہتے ہوئے اپنے بازو چھڑوانے کی کوشش کی تھی' مگر وہ غصے سے آنکھیں بھینچ کر رہ گیا تھا۔ اس کا شدت سے جی چاہا کہ اسے زور سے پٹخ دے' مگر وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ غالباً" اس کی حالت اس ردعمل کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ چند ماہ پہلے بھی وہ کسی لاپروائی کا خمیازہ بھگت چکا تھا اور اب نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا گویا وہ اسے دنیا کی بہت بڑی نعمت دینے والی تھی۔ اس نے اس کے بازو چھوڑے اور اپنی بازو پر لٹکا نائٹ ڈریس زمین پر پٹخا۔ وہ نکل کر دروازے سے باہر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ نیم تاریک لاؤنج میں صوفے پر سر نیہوڑے بیٹھی تھی۔ اسے لابی میں کسی ہیولے کا گمان گزرا۔ وہ اپنے کپڑے درست کرتی وہاں سے اٹھی لابی میں آگئی۔ وہ سر پیچھے کیے' آنکھیں بند کیے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے سر ہولے سے آگے کیا بالوں میں چلتی انگلیاں ملال و اضطراب کی ترجمان تھیں۔

"حدید خیریت۔۔۔؟"

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی۔۔۔؟"

"ہاں ٹھیک ہوں اور پلیز جاؤ یہاں سے۔" اس کے انداز کی اکتاہٹ پر وہ چند پل اسے دیکھتی رہی پھر قدرے قریب ہو کر سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے حدید' کیا اب اپنا کوئی مسئلہ بھی مجھ سے شیئر نہیں کرو گے' اب میرا اتنا بھی حق نہیں رہا تم پر۔۔۔؟"

"خدا کے واسطے۔" اس نے دونوں ہاتھ بہت زور سے اس کے سامنے جوڑے تھے۔ "چلی جاؤ یہاں سے' مجھے تنہا چھوڑ دو۔۔۔ تم کس چیز کی بنی ہو' آخر چلی کیوں نہیں جاتیں' چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔۔۔ جہنم بن گئی ہے میری زندگی' پاگل ہو جاؤں گا میں۔۔۔"

"جسٹ لیو می الون۔۔۔ پلیز۔" ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اسے گھور رہا تھا۔ اپنے ستے چہرے اور آنسو بامشکل قابو کرتی ایک ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا یہ حدید ہی کہہ رہا ہے۔ اتنی تذلیل' اتنی بے وقعتی قصور کیا تھا اس کا؟ بے شک وہ شروع سے ہانہو تھا اور یہ پہلی بار نہیں تھا بلکہ اس طرح کی تذلیل چار پانچ ماہ پہلے بھی ہوئی تھی۔ جب اس کی سیما سے شادی کو تقریباً" ڈیڑھ' دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ جب اچانک سیما نے حدید کو فون کیا کہ وہ جلدی اسپتال پہنچے اس کی طبیعت خراب ہے۔ اس دن حدید' برجیس کو لاہور ان کی بہن سے ملوانے لے جا رہا تھا۔ تقریباً" سارا فاصلہ طے بھی کر چکے تھے اس نے موٹروے کے ٹول پلازہ سے گاڑی ٹرن کی اور جہلم پہنچتے پہنچتے تقریباً" تین چار گھنٹے لگ گئے تھے۔ جب تک وہ اسپتال پہنچا تو ناقابل تلافی نقصان ہو چکا تھا۔ وہ گم صم آنکھیں پھاڑے سیما کو بیڈ پر لیٹا دیکھ رہا تھا۔

"آخر یہ سب اچانک کیسے ہو گیا؟ اور وہ اکیلی کیوں آئی؟ پریزے ساتھ کیوں نہ آئی؟ چچی بھی قریب ہیں؟ قریب ہی اتنے لوگ تھے' مگر وہ اکیلی۔۔۔؟" ان سب سوالوں کا جواب سیما نے رو کر بلکہ بے تحاشہ رو کر دیا تھا۔ غالباً" وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں کسی کو کیوں گھسیٹتی۔ وہ ابا کے ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی کہ کسی طرح خود کو سیف کر سکے' مگر جو کچھ ڈاکٹرز نے کہا اس کے بعد صرف ایک حدید ہی تھا جسے وہ اپنا سمجھتی تھی۔ اور پریزے سے تو اسے ویسے ہی خوف رہتا تھا۔ آخر اس نے اپنا وار کر ہی دیا۔ اسی نے کوئی دوا اسے دی تھی۔ یہ سنتے ہی برجیس نے اپنی عقل پر ماتم شروع

کردیا۔ حقیقتاً" وہ خود چشم دید گواہ تھیں جب پریزے نے اسے کوئی دوا دی تھی۔ حدید یہ تو جانتا تھا کہ گزشتہ صبح سے سیما کے سر میں درد تھا۔ اس نے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ مگر شام میں جب برجیس اپنی بہن کے لیے کچھ شاپنگ کرنے مارکیٹ تک گئی تھیں تو سیما کے سر میں درد شدید ہو گیا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھی پریزے نے بھی اس کی تکلیف محسوس کی تھی۔

"ٹھیک نہیں ہوا؟" ترحم آمیز لہجے میں پوچھا تھا۔

"نہیں۔ بہت شدید ہو رہا ہے' پلیز کچھ دے دیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی پٹیاں دبا رہی تھی۔

"میں ایسے' کیسے کچھ دے سکتی ہوں۔۔۔ امی بھی تو گھر نہیں ہیں' تم اندر لیٹ کر آرام کر لو۔" اس نے بے چارگی سے کہا اور ساتھ مشورہ بھی دے دیا۔

"اف خدایا۔۔۔! پلیز۔" اس کے بارہا اصرار پر وہ پریشان ہو گئی اور کچن میں جا کر اس کے لیے چائے بنا لائی' لیکن اسے شدت درد سے صوفہ بیک پر سر پٹختے دیکھ کر کہنے لگی۔

"حدید کو فون کروں۔۔۔؟" مگر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا۔" اس نے کچھ دیر سوچا پھر الماری کی دراز میں سے ایک پین کلر نکال لائی۔ اس نے وہ بے ضرر سی ٹیبلٹ تراب اور ماہین وغیرہ کو بھی باوقت ضرورت استعمال کرتے دیکھا تھا۔ اس نے وہ ٹیبلٹ اس کی ہتھیلی پر نکالی اور پانی کا گلاس دیا۔ وہ گولی پھانکتے ہوئے پانی کا گلاس پکڑ رہی تھی جب برجیس لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"کیا ہوا اسے۔۔۔؟" ان کے چونک کر پوچھنے پر پریزے نے سب بتا دیا۔ ٹیبلٹ کا نام تک۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کہ وہ پریشان ہوتیں یا کچھ کہتیں بلکہ اس وقت وہ پہلا ساری ایکٹ بھی نہیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے اسے چائے پی کر آرام کرنے کا مشورہ دیا اور اپنی شاپنگ پر پریزے کی رائے لینے لگی تھیں۔

اگلے دن ان دونوں کی روانگی کے بعد سیما کی طبیعت پھر کل جیسی ہو گئی تھی۔

"تم ڈاکٹر سے ٹائم لے لو' کہیں بی پی کا مسئلہ نہ ہو۔" پریزے کے مشورے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ توقف کے بعد کل والی دوا کا ذکر کیا تھا۔ اس نے بھی کچھ لمحے تاخیر سے اسے دے دی۔ بس اتنا ہی ہوا تھا پھر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور تقریباً" آدھ پون گھنٹے بعد بہت عجلت میں اسے باہر جاتے دیکھا تو اس نے اس سے بہت پوچھا تھا' مگر وہ سخت سا جواب "آجاتی ہوں ابھی" دے کر باہر نکل گئی تھی۔۔۔ اور اب وہ حدید کے سامنے رو رو کر کہہ رہی تھی کہ اسی پریزے نے کچھ دوا دی تھی' وہ کیوں چاہے گی کہ اس کے اولاد ہو' وہ اب اس کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہ سکتی' وہ اب ایک کو چنے۔ حدید کے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی وہ کنسلٹنٹ سے بھی ملا تھا جو ذرا بھی نروس نہ تھی بلکہ تیار جملے کہہ دیے۔

"ہاں کچھ ایسا پرابلم تھا اگر فوری ڈی این سی نہ کرتے تو ان کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا تھا۔" اس نے مزید رپورٹس یا تفتیش نہ کی بلکہ ڈسچارج کروانے کے بعد سیدھا پریزے کے سامنے سراپا سوال تھا۔ کتنی دیر وہ کسی شیر کی طرح گھورتا رہا پھر دانت جما کر بولا۔

"کیا دیا تھا اسے؟" وہ تو اسی بات پر حیران تھی کہ ان کی واپسی اچانک کب اور کیوں ہوئی اور پھر اسپتال اور سیما کی یہ حالت وہ ناسمجھی سے دیکھ رہی تھی کہ وہ دوبارہ دھاڑا۔

"میں پوچھ رہا ہوں' کیا دیا تھا اسے۔۔۔؟" وہ اس کی آواز سے کانپ گئی تھی۔ اس کا ذہن کام کرنا چھوڑ رہا تھا اور وجود اس کی گرفت میں ہلکورے لینے لگا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا پریزے تم۔۔۔ اتنے چھوٹے دل کی بھی ہو سکتی ہو۔" آنکھیں تحیر سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ برجیس الگ شور مچا رہی تھیں۔

"ہائے! میں کیوں بھول گئی' تم اس کی سوتن ہو' کیوں میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے' کاش! میں نہ جاتی۔۔۔"

"امی۔۔۔ امی میں نے کچھ نہیں کیا' میں نے کچھ

نہیں دیا اسے۔" وہ بھاگ کر برجیس کی طرف بڑھی تھی، مگر انہوں نے بے طرح جھڑک دیا۔

"جھوٹ مت بولو، میں نے خود تمہیں اسے دوا دیتے دیکھا تھا۔"

"امی وہ تو میں نے اسے یہ ٹیبلٹ دی تھی۔" وہ دراز کی طرف دوا کا پتا اٹھانے کے لیے بڑھی تھی جب حدید نے سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔

"پردہ پوشی کے لیے کوئی ڈھنگ کی دلیل تو دو۔" وہ دراز کھولے بغیر واپس پلٹ آئی اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی تھی۔

"میری آٹھ سالہ رفاقت میں تم اتنا بھی نہ جان پائے حدید، میں ایک معصوم کی زندگی لے سکتی ہوں۔۔۔؟ ہونہہ۔" وہ اپنے ہونٹ سختی سے بند کیے اک قابل افسوس نظر سیما کو دیکھا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

پھر کتنے ہی دن خاموشی سے بیت گئے تھے۔ وقت کے ساتھ حدید اور برجیس کے غصے میں فرق ضرور پڑ گیا تھا، مگر ایک ان دیکھی لکیر کھنچ گئی تھی۔ اس لکیر کو دونوں ہی پار کرنے کو تیار نہ تھے حالانکہ خوشی نے بہت جلد دوبارہ دستک دے ڈالی تھی۔ اور پریزے اب خود ہوشیار رہی۔ خود ہی اس سے فاصلہ رکھتی اکیلے میں تو کجا سب کے بیچ بھی فاصلے سے اٹھتی بیٹھتی رہی تھی اور احتیاط کے ساتھ اتنے ماہ گزر جانے کے بعد آج ایسا کیا ہو گیا تھا کہ حدید غصے میں کمرے کے باہر کھڑا ہے اور اس کا انداز، اس کا رویہ، اتنی تحقیر، اتنی تضحیک، وہ کسی ٹرانس کی صورت چلتی بیڈ پر کھڑے قد سے گری تھی۔ وہ کسی بچے کی طرح سر رگڑ رگڑ کر رو رہی تھی ایک آب رواں تھا جو دونوں کن پٹیاں بھگو کر میٹرس میں جذب ہو رہا تھا۔

"اے اللہ! جب میں تیری مخلوق کو تنگ نہیں کرتی، تکلیف نہیں دیتی تو تیری مخلوق مجھے کیوں تکلیف دیتی ہے۔" وہ بہت تکلیف میں تھی شکوہ تو بنتا تھا، مگر کس سے؟ قسمت سے یا اس رب سے جس نے اسے زندگی بخشی تھی۔ "وہ خالق ہے اور خالق سے شکوہ نہیں التجا کی جاتی ہے" اسے اندر سے جھنجوڑا تھا اور فریاد لبوں پر آئی۔

"اے اللہ تو مجھے معاف کر دے، مجھے اپنی مخلوق سے بے نیاز کر دے، کوئی ایسا سبب بنا دے کہ میری زندگی میں سکون و عافیت آ جائے، مجھ میں اور ہمت نہیں ہے سہنے کی، برداشت کی۔" اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں اور گال بے حد بے دردی سے رگڑے تھے اور گہری سانس لی۔

☆ ☆ ☆

گرمیوں کے طویل تھکا دینے والے دن تھے سارا دن درخت اور پودے بے جان ہوئے دھوپ کی چلچلاتی کرنوں کو برداشت کرتے، جیسے جیسے نارنجی شفق پر سیاہی گھل ملنی شروع ہوتی تو ہوا میں جان پڑ جاتی۔ پریزے لان میں پائپ لگائے پودوں پر پانی چھڑک رہی تھی۔ اس کی پالتو سفید مانو نے اس کے پاؤں گد گدائے۔ اس نے بھی شرارت میں چند چھینٹے اس پر چھڑکے، پائپ پھینکی اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ اسے لے کر کرسی پر بیٹھنے لگی تھی جب اندر سے تیز آوازیں محسوس ہوئیں وہ مانو کو لان میں چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھی تھی۔ زرمینہ، برجیس کے گلے لگی زور و شور سے رو رہی تھی۔ خواجہ نیاز بھی یقیناً بیٹی کی آواز پر کمرے سے باہر نکلے تھے۔ دونوں میاں بیوی اس سے ایک ہی سوال کر رہے تھے۔

"آخر بتاتی کیوں نہیں۔ ہوا کیا۔۔۔؟ کچھ تو بتاؤ بیٹا۔"

"ابا۔۔۔!" وہ ہچکولے لیتی ہوئی ماں سے الگ ہو گئی۔

"ابا مجھ میں اب اور برداشت نہیں ہے، میں وہاں نہیں جاؤں گی، کبھی نہیں جاؤں گی۔" اس نے ناک سکیڑی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹا۔۔۔ ادھر آؤ، یہاں بیٹھو۔" انہوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔

"امی۔۔۔" وہ کہتے ساتھ پھر برجیس سے لپٹ کر

رونے لگی۔ ان کے سینے سے ٹکرا کر اس کی آواز دھنسی دھنسی نکل رہی تھی۔
"امی پہلے تو صرف ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے، مگر اب۔۔۔ امی انہوں نے میری کردار کشی شروع کردی' بتائیں امی؟" وہ جھٹکے سے الگ ہو کر ماں کا تیوریوں بھرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔
"کیا جھول ہے میرے کردار میں' کیا آوارگی کی ہے میں نے۔۔۔؟"
"کیا کہا ہے حسام نے۔۔۔؟" خواجہ نیاز یک لخت بھڑک گئے۔
"حسام اکیلے نے کیا' چچی نے بھی اور اور باقی سب مجھے مشکوک نظروں سے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں نے کوئی گناہ کیا ہو۔" خواجہ نیاز اور برجیس سنتے ہی بھنا گئے۔ وہ کچھ عرصے سے ان کے درمیان کھٹ پٹ تو سنتے آرہے تھے۔ غالباً" وہ اکثر ہی غصے میں یہاں آجاتی تھی' مگر گھریلو بحث سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے تھے اور آج تو حد ہو گئی تھی روتی بلکتی ان کی اکلوتی بیٹی۔۔۔؟
"میں آج بات کرتا ہوں فواد سے' آخر مسئلہ کیا ہے؟"
"کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو بات کرنے کی' اپنی بیٹی کی دو روٹی بھاری نہیں ہے ہم پر۔۔۔ حد ہو گئی بھئی روتی دھوتی گھر سے نکال دی' کیوں لاوارث ہے یہ۔" خواجہ نیاز کے ارادے کو برجیس نے درشتی سے رد کیا اور زرمینہ کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے مزید کہا۔
"جب رات کو منہ لٹکا تا آئے گا نہ اسے لینے' تو میں ہرگز نہیں جانے دوں گی' اسے کہنا اپنے اماں ابا کو لے کر آئے' یہاں ہی بات کریں گے۔ ایسے ہی خوامخواہ میں۔" ان کی حمایت طلب جملوں سے زرمینہ کے رونے میں تیزی آگئی۔
"کم آن زرمینہ۔" خاموش تماشائی بنی پریزے آگے بڑھی اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
"کیا ہوا جانو؟ جسٹ ریلیکس۔۔۔" وہ ماں کو چھوڑ کر اس کے گلے لگ گئی اور رو رو کر سب کہہ سنائی۔ وہ اس کی کمر سہلاتے ہوئے پیار سے سمجھا رہی تھی۔
"لیکن زرمینہ' تمہیں ساری بات کلیئر کرنی چاہیے تھی' ایسے نہیں آنا چاہیے تھا۔"
"کیوں نہیں آنا چاہیے تھا۔" برجیس نے ٹوکا۔
"جو اس کے جی میں آئے' اسے سنا تا جائے' کوئی لگام ڈالنے والا نہیں ہے۔"

☼ ☼ ☼

گھر کی فضا بوجھل سے بوجھل بنتی جارہی تھی غالباً" تبدیلی تو پہلے ہی خاصی آگئی تھی پھر زرمینہ کا مسئلہ اور اس کی وجہ سے رباط اور صفی کے رشتے پر آنچ آنے لگی تھی۔ دونوں گھروں میں جامد خاموشی تھی۔ نہ برجیس اور نیاز خود سے بات کرنا چاہ رہے تھے اور نہ ہی فریحہ اور خواجہ فواد۔ ثمرہ پھپھو کو جیسے ہی پتا چلا تو انہوں نے اپنی دوراندیش عقل کو داد دی۔
"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی تین نکاح ایک دن ٹھیک نہیں آخر تین' تیرہ کسی کو تو ہونا تھا۔" پریزے نے اپنی سی کوشش کی تو فریحہ نے صاف کہہ دیا۔
"کون سا ہم نے نکالا ہے' جیسے گئی ہے' ویسے آبھی جائے' اب ہر بار ہمارا بیٹا نیچے ہو کر مناتا پھرے۔۔۔ کبھی کچھ کہا نہیں تو سر پر ہی چڑھتی جارہی ہے اور ان کے ابا تو رباط کے سلسلے میں بھی سوچ رہے ہیں۔"
"کیا سوچ رہے ہیں چچی۔" پریزے فون پر ششدر رہ گئی۔ غالباً" وہ دونوں کے بیچ پل کا کام کررہی تھی۔
"سوچنا کیا ہے۔۔۔ حدید کو تو شروع سے جانتے ہیں یک لخت گرمی کھا جاتا ہے' اب بیٹی کے تیور بھی دیکھ لیے۔۔۔ صفی بھی تو ان ہی پر ہو گا نا۔۔۔ نا بابا نا' ہم تو ایسے رشتے کے بغیر ہی بھلے۔"
"لیکن چچی۔۔۔؟" وہ سمجھاتی رہ گئی۔ صفی نے الگ گھر سر پر اٹھا رکھا تھا جب اسے پتا چلا کہ امی ابا اس کا رشتہ ختم کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ وہ تو سنتے سے اکھڑ گیا۔
"یہ نہیں ہو سکتا' ان کے مسئلے میں مجھے اور رباط کو کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔"
"آرام سے بیٹھو' زیادہ ناچنے کی ضرورت نہیں

ہے۔" اسے سراپا احتجاج دیکھ کر برجیس نے ڈپٹا تھا۔
"آرام سے کیوں بیٹھوں؟ اس سب میں میرا اور رباط کا کیا قصور ہے۔"
"شرم نہیں آتی بے غیرت۔" انہوں نے اسے آنکھیں نکالیں۔
"وہ تمہاری بہن پر الزام تراشیاں کریں اور ہم ان کی بیٹی کو بیاہ لانے کے خواب دیکھیں' ارے واہ!"
"امی جان۔" حدید بہت دیر سے باپ کے قریب ایسے بیٹھا تھا کہ کہنیاں گھٹنوں پر تھیں اور بند مٹھیوں کے انگوٹھوں پر پیشانی ٹکی تھی۔ گویا وہ بہت ڈپریس تھا۔ اس نے آہستگی سے مخاطب کیا تھا۔
"امی آپ جانتی تو ہیں حسام اور زرمینہ کو' دونوں ہی مزاجاً" تیز ہیں' مگر ہمیں اس مسئلے کو مزید الجھانا نہیں چاہیے۔" وہ پیشانی اوپر کر کے ماں کو دیکھ رہا تھا غالباً" زرمینہ کو یہاں آئے مہینہ ہونے کو تھا' مگر کوئی صلح کی پیش رفت نہ تھی۔ دونوں گھروں کے مردوں نے باہر آنے جانے کے اوقات ذرا آگے پیچھے کر لیے تھے غالباً" بولنے میں پہل نہ کرنی پڑ جائے' لیکن حدید صحیح معنوں میں معاملہ سلجھانا چاہتا تھا۔
"تو اسی لیے سلجھانے کا سوچ رہے ہیں۔" برجیس کے جواب پر اس نے سوالیہ نظر اٹھائی۔
"ہاں۔۔۔ ابھی یہ حالات ہیں دس' دس باتیں سناتے ہیں' کل کلاں رباط کے آجانے سے وٹہ بنا لیں گے' پھر جانے کس کس طرح سے تنگ کریں میری بچی کو۔"
"امی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ" وہ الجھ کر رہ گیا۔
"ٹھیک کہہ رہی ہے تمہاری ماں۔"
خواجہ نیاز نے لمبی سانس لی۔ "جو گرہ ہاتھوں سے کھل رہی ہو' اس کے لیے دانت ضرور استعمال کرنے ہیں۔"
"ابا جان! آپ کو ہم یہی سمجھا رہے ہیں۔" پریزے کا لب و لہجہ ہمیشہ رسانیت سے بھرا ہوتا۔ "ابھی تو گرہ ہاتھوں سے کھل رہی ہے' کہیں ایسا نہ ہو ہر گزرتا پل اس گرہ کو اتنا مضبوط کر دے کہ دانتوں سے بھی نہ کھلے۔۔۔ اگر وہ بات نہیں کرتے' تو کیا ہوا ہم سب چلتے ہیں مل بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو تم پریزے۔" وہ سختی سے بولے۔
"فواد مجھ سے چھوٹا ہے اسے آنا چاہیے تھا میرے پاس' اسے پوچھنا چاہیے تھا۔"
"ہو سکتا ہے وہ بھی ہماری طرف سے پہل چاہ رہے ہوں۔" اس کا یوں اپنی تائید میں بولنا حدید کو مسرور کر گیا تھا' مگر خواجہ نیاز نے نخوت بھرا منہ بنایا اور کہا۔
"ہونہہ! پھر بیٹھیں رہیں' ہمیں بھی شوق نہیں ہے کسی کے پیروں میں گر کر بیٹی بسانے کا۔۔۔"
"ٹھیک ہے ابا اگر آپ اپنی انا پر قائم ہیں تو پھر میں بھی اپنے رشتے پر قائم ہوں' زرمینہ ادھر رہتی ہے یا نہیں' مگر رباط ادھر ہی آئے گی ورنہ۔۔۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گا۔" ماں باپ کے انداز میں ذرا بھی لچک نہ دیکھ کر صفی بھڑک کر اٹھا اور خواجہ نیاز بھی آنا" فانا" اٹھے اور کھینچ کر اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔
"دفان ہو جاؤ تم!" اس قدر اچانک حملے پر سب کی آنکھیں اور منہ کھلے رہ گئے تھے۔ گال پر ہاتھ رکھے صفی غصے کو ضبط کرتا ہوا تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سیما پر ویسے ہی قنوطیت طاری رہتی تھی اور آج کل خاصی الجھی ہوئی بھی رہنے لگی تھی۔ گھر کے کسی مسئلے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی اب بھی شور سن کر لابی میں نکل آئی تھی وہاں سے لاؤنج کا تمام منظر آسانی سے سمجھ آگیا اور اولاد کے معاملات میں والدین کی انٹرفیئرنس اس کے لیے کبھی بھی قابل برداشت نہ تھی اب بھی تایا تائی کسی جلاد سے کم نہ لگے تھے۔ وہ ان کی جہالت پر دو حرف بھیج اور واپس اندر چلی گئی۔
چند دن اور خاموشی سے سرک گئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد پریزے تمام کام سمیٹ کر اوپر اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ اپنی الماری کھول کر سیٹ کپڑوں کو پھر سے سیٹ کرنے لگی۔ ہلکی سی ناک کے بعد دروازہ کھلا تھا' اس نے گردن پھیر کر دیکھا تو اپنی حیرانگی چھپانے کے لیے اپنے کام میں مشغول ہو گئی

جیسے کچھ معمول سے ہٹ کر نہ ہوا ہو۔ حدید چند لمحے تو اس کی پشت تکتا رہا پھر بھاری قدموں سے چل کر اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔

"تم اوپر کیوں آگئی ہو؟" اس کے حد درجہ لاپروا استفسار پر وہ مضحکہ خیز انداز میں ہنسی۔

"تو گویا ڈیڑھ ماہ بعد خیال آہی گیا تھا۔" غالباً" اس دن خوامخواہ اتنی تضحیک کے بعد پریزے کے لیے نیچے وہ بھی بالکل برابر کمرے میں رہنا ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ رات تو انتہائی کرب میں گزاری تھی، لیکن اگلے دن سر شام ہی وہ اوپر آگئی تھی۔ جہاں صفی کے کمرے کے علاوہ بھی دو کمرے تھے۔ وہ سب سے پہلے صفی کے پاس آئی تھی اور اس سے کمرہ ایکسچینج کرنے کو کہا، مگر لہجے کا گیلا پن روکنا خاصا دشوار ہو گیا تھا۔ صفی گہری سانس لے کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا کچھ لمحے باہر سے نظر آتے لان پر نظریں جمائے رکھیں پھر آہستہ سے بولا تھا۔

"بھابھی جان! سارا گھر آپ کا ہے، اوپر نیچے اور اوپر میرے کمرے کے علاوہ بھی دو کمرے ہیں، آپ کسی بھی کمرے کا انتخاب کر سکتی ہیں بنا پوچھے۔" وہ چپ کیے سنتی رہی پھر دائیں آنکھ کے کونے کو سختی سے دبایا اور اس کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔

"صفی مجھے اس سارے گھر میں صرف اک گوشہ چاہیے۔" نمی کا گولہ پھندے کی صورت گلے میں اٹکنے لگا، مگر وہ اسے نگل گئی۔ "صرف ایک گوشہ جہاں میں سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔" وہ سنتے ہی آہستگی سے مڑا تھا۔

"حدید بھائی نے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے تھوڑا سا منہ کھول کر سانس لی۔ "حدید نے، امی نے، کسی نے کچھ نہیں کہا، بس میرا اپنا فیصلہ ہے۔"

"کیا میرا نیچے جانا ضروری ہے؟ یہ برابر کمرہ بھی تو ہے۔" اس کے جواب پر آنکھوں میں آنسو روکنا دشوار ہو رہے تھے، ہر چیز دھندلا رہی تھی۔ وہ جلدی سے رخ پھیر گئی۔

"پلیز..." لفظ دیر بعد ادا ہوا۔ "پلیز صفی، مجھ میں اب اور ہمت نہیں ہے، کسی نئے ایشو پر اپنی ذات کی دھجیاں اڑتی دیکھنے کی، میں اور انگلیاں نہیں دیکھ سکتی۔" ان کی بات وہ مکمل سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے بہت پیار سے ان کے شانوں پر ہاتھ جما کر رکھے۔

"آپ میری بڑی بھابھی ہیں، میری ماں کی طرح، میری بہن کی طرح اور ان ہی کی طرح آپ کی بھی عزت کرتا ہوں۔" اور اگر کوئی انگلی اٹھاتا ہے تو میں وہ انگلی توڑنا بھی جانتا ہوں، آنکھیں زبان کھینچنا بھی۔" اس نے چہرہ اٹھا کر صفی کی آنکھوں میں دیکھا۔

"صفی لوگ تمہارے دل یا آنکھ سے نہیں دیکھتے، اپنی شک کی عینک چڑھا کر رشتوں کو تولتے ہیں.... پلیز۔" اس نے التجا پر اپنا غصہ کنٹرول کیا اور قدرے جم کر بولا۔

"مت ڈرا کریں کسی سے، جو جیسی زبان استعمال کرتا ہے، اسے ویسا ہی جواب دیا کریں...." وہ لحہ تاخیر سے کہنے لگا۔

"آپ بتائیں فرنیچر بھی شفٹ کرنا ہے۔" اس سے مزید اس کی ٹوٹ پھوٹ برداشت نہ ہوئی تو موضوع پر آگیا۔

"نہیں بس جو تم لے کر جانا چاہتے ہو لے جاؤ، میں کل اپنا ضروری سامان اوپر لے آؤں گی۔" اور پھر ایسے ہی ہوا تھا۔ صفی نیچے آگیا تھا اور وہ اپنا انتہائی ضروری سامان لے کر اوپر شفٹ ہو گئی۔ برجیس کو خاصا عجیب لگا تھا۔ صفی سے تو نہ پوچھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جواب دیتا اور نہ ہی پریزے سے پوچھا تھا۔ البتہ حدید سے اکیلے میں پوچھا تھا اور اس کا جواب مکمل خاموشی میں تھا۔ دراصل اگلے دن ہی زرمینہ، روبی، دھوتی آگئی تھی تو ہر معاملہ پس پشت ہو گیا سب اس میں ہی الجھ گئے۔ البتہ حدید محسوس ضرور کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ، پریزے کے رویے میں دن بدن خاموشی آتی جا رہی ہے۔ صرف ہوں، ہاں یا پھر کوئی چیز پکڑانے تک رشتہ رہ گیا تھا، مگر پرسوں کھانے کے دوران جب حدید نے پانی مانگا تو اس نے اپنے لیے رکھا پانی کا گلاس

پکڑانے کے بجائے زرمینہ کے آگے رکھا ایکسٹرا گلاس اٹھا کر اسے دیا پہلے تو وہ ایک گلاس ایک پلیٹ میں کھا پی لیتے تھے۔ "کیا اب اپنے برتن بھی الگ کررہی ہے؟" وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گیا تھا اور یقیناً "ڈنر کے بعد وہ اوپر اس کے پاس آگیا تھا' مگر اس کا استفسار اوپر کیوں آگئی ہو' کو اس نے خاصا اگنور کیا اور سرسری انداز میں کہا۔



"ویسے ہی۔"

"ویسے ہی تو کوئی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔۔۔ ناراض ہو مجھ سے۔" اس نے قمیص تہ کرتے ہوئے بمشکل نفی میں سر ہلایا تھا۔

"پھر کوئی بات کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"کرتی تو ہوں۔" اس نے قمیص الماری میں رکھی اور اب ایک ہینگر اٹھا کر اس میں کپڑے سیٹ کرنے لگی۔

"ہر روز ناشتا آپ سے پوچھ کر بناتی ہوں' جو چیز چاہیے پکڑا دیتی ہوں جو کام کہتے ہیں کر دیتی ہوں۔"

"اچھا!" وہ سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے قدرے اس پر جھکا۔

"پھر ان سب باتوں میں پہلی سی محبت اور خیال دکھائی کیوں نہیں دیتا۔" اس نے آگے بڑھ کر ہینگرز راڈ پر لٹکاتے ہوئے اپنے کپکپاتے دل کو بہت ہمت سے سنبھالا اور مڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"آپ کو اب میری محبت اور خیال کی ضرورت نہیں رہی' اسی لیے۔"

"تم سے کس نے کہا کہ مجھے تمہاری محبت اور خیال کی ضرورت نہیں رہی۔" اس نے اپنے ہاتھ کھولے اور اس کی پشت کے گرد باندھنا چاہے تھے۔ وہ اسے اپنے قریب بہت قریب کرنا چاہتا تھا' مگر وہ قدرے ناگواریت سے پرے ہوئی۔ "پلیز۔۔۔"

"مجھے زرمینہ نے بلایا تھا' میں ابھی آئی۔" وہ جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے اور اب بہت دیر نہیں آئے گی۔۔۔ وہ سلگتے وجود کے ساتھ بہت تیزی سے باہر کی جانب لپکی تھی۔ کچھ دیر ٹیرس پر کھڑے ہو کر اس نے خود کو سنبھالا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے کچن میں چلی گئی۔ وہاں کرنے کو کچھ نہ تھا ہاں البتہ آنسو بے حساب تھے جو خاموشی سے بہا دیے۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا' مگر پریزے دل میں میل نہیں رکھتی تھی پر دل توڑ رکھتی تھی نا۔ اسے اپنی بانہیں تھا کر پھر زور سے جھٹکنے کے لیے کب تک خود کو پیش کرتی رہتی۔

اسے بہت رونا آرہا تھا اور وہ روتی بھی رہی پھر سنک کی جانب بڑھ کر اپنے چہرے پر بہت سا پانی ڈالا۔ زرمینہ کے کمرے کی جانب بڑھی۔ اسے معلوم تھا وہ جاگ رہی ہوگی۔ وہ ہلکی سی ناک کے بعد کمرے میں آگئی تھی۔ زرمینہ دونوں ہاتھ جوڑے چہرے کے نیچے رکھے آڑھی ترچھی لیٹی ایل سی ڈی دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے تیرتی لکیر نکلتی جو تکیے میں جذب ہو جاتی۔

"کیا ہوا زرمینہ؟ تم رو رہی ہو!" وہ اپنا اچھل پچھل دل سنبھال کر تفکر سے اس کی جانب بڑھی۔ اس نے چمکتی میوٹ اسکرین کو دیکھا وہاں اس کی شادی کی مووی لگی تھی۔ زرمینہ نے اپنے آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ بھلا نازک بند باندھ لینے سے طوفان بھی تھمتا ہے۔ پانی پلکوں سے رسنے لگا۔

"زرمینہ پلیز۔۔۔!" اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ اٹھ کر اس کے گلے جا لگی۔ آنسوؤں میں آواز بھی گھل مل گئی تھی۔ وہ کتنی دیر اس کی پشت سہلاتی رہی پھر اس کے چہرے کو ہٹا کر اپنی جانب کیا۔

"کیا ہو گیا ہے زرمینہ تمہیں۔"

"بھابھی۔۔۔ حسام کو میری یاد نہیں آتی؟ دو مہینے ہونے والے ہیں اس نے ایک کال تک نہیں کی۔۔۔" اس نے سرخ پڑتی ناک زور سے چڑھائی۔

"مانا میری غلطی تھی' مجھے غصہ آگیا تھا' اب وہ کیا سزا دینا چاہتا ہے مجھے؟ اور۔۔۔" بولتے بولتے اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

"اور اس کی کوئی غلطی نہیں' اس نے کتنی بے رحمی سے کہہ دیا کہ میں آوارہ پھرتی ہوں سمیر کے ساتھ۔" وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔

”بھابھی آپ کو معلوم ہے‘ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بتانے کے دوران اس کی پلکوں کی لرزش پر وہ چونکی اور گہری نظروں سے دیکھا۔

”کک... کیا مطلب؟ کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ زرمینہ نے ایک نگاہ اٹھائی پھر مسکرا کر اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس نے اس کے چہرے پر پھیلی حیا اور خوشی کی سرخی سے اندازہ لگایا۔

”رئیلی... تھینکس گاڈ...“ وہ یک دم کھل گئی۔

”امی کو معلوم ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔

”پھر...؟ یار اتنی بڑی نیوز‘ تم نے حسام کو بتایا...؟“ اس کے چہرے پر پریشانی تھی اور سر نفی میں ہل رہا تھا۔

”ارے اتنی بڑی خبر تم نے اسی سے چھپا رکھی ہے‘ وہ تو دیوانہ ہوا سر کے بل دوڑا آئے گا۔“

”امی نے منع کیا تھا‘ کسی کو بھی بتانے سے‘ وہ کہہ رہی تھیں کہ جب انہیں تمہاری ضرورت نہیں ہے تو کیا ایک بچہ پالنے سے ہمارا دیوالیہ نکل آئے گا۔“ وہ کہتے ہوئے پھر سسکنے لگی۔ ”بھابھی کیا میری ایک غلطی‘ میری عمر بھر کا روگ بن جائے گی۔“

”نہیں‘ نہیں‘ کیا پاگل ہوگئی ہو...“ اس نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”زرمینہ ابتدا میں ہم غلطی چھوٹی سی ہی کرتے ہیں اور اگر اس کی فوراً تصحیح نہ ہوجائے تو وقت اور اردگرد کی ہوائیں اسے ناقابل تلافی گناہ بنا دیتی ہیں‘ ابھی بھی زیادہ وقت نہیں گزرا‘ تم خود حسام کو فون کرو۔“ اس نے ملتجی نگاہوں سے پریزے کو دیکھا۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے‘ میں کچھ کرتی ہوں... تم نے پریشان نہیں ہونا‘ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

☼ ☼ ☼

صفی آج آفس سے سرشام ہی واپس آگیا تھا۔ اپنی گاڑی پورچ میں کھڑی کی پھر برآمدے کی جانب اٹھتے قدم یک لخت رکے اور فوراً فواد چچا کے گھر کی جانب بڑھے۔ وہ داخلی دروازہ کھول کر سیدھا لاؤنج میں پہنچ گیا۔ فریحہ صوفے پر بیٹھیں تراب کی نوزائیدہ بچی کو کھلا رہی تھیں۔ علشبہ خاصے فری انداز میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سیدھی ہو کر دوپٹا پھیلا لیا۔

”السلام علیکم! چچی جان چچا کدھر ہیں؟“ اس نے چونکتی فریحہ سے پوچھا تھا جس پر انہوں نے خفگی سے دیکھا اور صاف کہہ دیا۔

”کیوں؟ کیا کام ہے! وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں‘ میں نے ان کی گاڑی آپ کے پورچ میں کھڑی دیکھی ہے۔“ اسے مزید استفسار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے خود ہی باہر آرہے تھے بلکہ حسام اور طیب بھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر راستے میں ہی رک گئے۔

”کہو‘ کیا بات ہے۔“ انہوں نے عینک اتارتے ہوئے رعب سے پوچھا تھا۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

”ایسی کیا ضروری بات ہے‘ جو تم کرو گے۔“ انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا پر وہ برداشت کر گیا۔

”چچا جان آپ جانتے ہیں میرا بی اے پچھلے سال کمپلیٹ ہوگیا تھا اور تقریباً ایک سال سے میں فیکٹری جا رہا ہوں‘ اپنے باپ کی پراپرٹی میں برابر کا حصہ دار ہوں اور یہ کہ اب میں ایک فیملی کو اچھی طرح رن اپ کرسکتا ہوں۔“

”پھر... مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو۔“ وہ اس کے جتا جتا کر بولنے پر گرجے تھے۔

”آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کی بیٹی میری منگیتر ہے اور میں آپ سے نکاح کی ڈیٹ لینے آیا ہوں۔“

”بکواس بند کرو اپنی اور آئندہ میری بیٹی کا نام اپنی زبان سے مت لینا۔“

”کیوں‘ کیوں نہ لوں... ہزار بار لوں گا‘ منگیتر ہے وہ میری۔“

”صفی دفع ہوجاؤ یہاں سے۔“ وہ غصے میں بھڑکے تو حسام تیزی سے آگے آیا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔

"بیٹھ کر بات کرو' یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔"
اسے حسام کی بے حسی پر پہلے ہی غصہ تھا اب سامنے دیکھ کر تیخ پا ہو گیا اور بازو جھٹکے سے چھڑوائی۔
"کیا بیٹھ کر بات کروں' اس قابل چھوڑا ہے تم نے' جھگڑا تمہارا اور زرمینہ کا ہوا ہے' گھسٹ میں اور رباط رہے ہیں' منگنی کے وقت کسی نے شرط رکھی تھی؟ لڑو گے تم دونوں اور جدا میں اور رباط ہوں گے کیوں۔۔۔؟"
"یار کیا ہو گیا ہے تمہیں' بیٹھ کر بات کرو۔" طیب کو اس کے لہجے اور انداز سے خوف محسوس ہوا تھا۔ علشبہ بھی سہم کر رونے کو ہو گئی۔
"میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا' نکاح کی ڈیٹ کلیئر کرنے آیا ہوں' ورنہ یہ مت کہیے گا۔" اس نے رک کر چچا چچی کو دیکھا۔
"صفی نے وہ کر دکھایا جو خاندان کے کسی لڑکے نے نہیں کیا' رباط میرے ایک اشارے کی منتظر ہو گی۔۔۔!" اس کی ڈھٹائی پر خواجہ فواد بھڑک گئے۔ "صفی" چلاتے ہوئے اپنا ہاتھ بھی اٹھایا تھا' مگر طیب نے انہیں جلدی سے قابو کر لیا۔
"چچا جان غصہ مت ہوں' آپ اور ابو اگر اپنی ضد اور انا پر قائم ہیں نا تو میری رگوں میں بھی آپ ہی لوگوں کا خون ہے۔" وہ قدرے دھیمے لہجے میں دوٹوک کہتا جیسے تن فن کرتا آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ لاعلمی میں دم سادھے رباط پر ایک اچٹتی نظر ڈالی پھر رکا نہیں۔ سب ایسے تھے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو' آج تک وہ صرف ہنستا مسکراتا زندگی کو قہقہہ سمجھنے والا ہی لگا تھا' مگر اس کا یہ روپ تو دہلا گیا تھا۔
"دیکھا بھابھی نے اس جنونی کو بھیج دیا' خود نہ آئیں۔۔۔ یہ نتیجے نکلتے ہیں جلد بازی کے۔۔۔"
صفی کے جارحانہ رویے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ لچک پہلے ہی کوئی دکھانے پر تیار نہ تھا۔ مزید اکڑاؤ آ گیا۔ پریزے پہلی فرصت میں چچا چچی اور حسام سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ ناشتے کے بعد پروگرام بنا رہی تھی' مگر زرمینہ کی طبیعت خراب ہو گئی' اس کا بی پی بہت حد تک لو ہو گیا تھا۔ کھڑے ہونا دشوار تھا۔ وہ اور برجیس اسے ڈرائیور کے ساتھ اسپتال لے گئیں۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے خاصی تسلی کر دی اسے ایڈمٹ کر کے آئرن ڈرپ لگائی۔ وہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد شام ڈھل چکی تھی اگلا دن بھی مصروفیت میں ہی گزر گیا' لیکن دو دن بعد سہ دوپہر وہ خاموشی سے چچی کی طرف چلی گئی تھی۔ برجیس کھانے کے بعد آرام کر رہی تھیں اسے موقع غنیمت لگا تھا۔
فریحہ اسے دیکھ کر حیران ضرور ہوئی تھیں پھر کچھ دیر گلے شکوے کرنے کے بعد وہ انہیں زرمینہ کو گھر لے آنے کے لیے قائل کر رہی تھی جس پر وہ ناصحانہ انداز میں گویا ہوئیں۔
"پریزے اب بات بہت بڑھ گئی ہے' ان ماں بیٹی نے کتنی بڑی خبر ہم سے چھپائی۔۔۔
اب اگر چھپا رکھی ہے تو چھپا رہنے دو' میں بھی دیکھوں کب تک چھپا پائیں گی۔"
"چچی جان آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں' پلیز چچی۔۔۔ غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں' کیا ضروری ہے غلطی پر غلطی کی جائے۔"
"غلطی ہم نے کی تھی۔۔۔؟ حالانکہ اس وقت کتنی پریشانی تھی' مگر ہم روکتے رہ گئے پر ناجی' بیگ میں کپڑے ٹھونس یہ جا وہ جا۔"
عمومی طور پر جھگڑوں کی بنیاد وقتی پریشانی ہوتی ہے' مگر ہم اسے خود پر اتنا سوار کر لیتے ہیں کہ جھگڑا سمیٹنے کے لیے سرا ہاتھ نہیں لگتا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا ثمن (رمیز چچا کے کرائے دار) کی امی کی طبیعت اچانک صبح ہی صبح خراب ہو گئی تھی شوگر لیول حد سے بڑھ گیا تھا۔ بھائی اور ابو شہر سے باہر کسی کام سے تھے اس نے زرمینہ کو فون کیا تھا۔ تراب کی طبیعت کے سبب خواجہ فواد اپنی گاڑی اور ڈرائیور اکثر گھر ہی رکھتے کہ اللہ کا حکم کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ ثمن نے جب فون کیا تو زرمینہ نے اسے تسلی دی اور ڈرائیور کے ساتھ اسے اور اس کی امی کو اسپتال لے گئی۔ اس نے کمرے سے نکلتی فریحہ کو صرف اتنا کہا تھا۔ "میں ابھی آئی۔" وہ

اسے پکارتی رہ گئیں، مگر وہ اتنی جلدی میں تھی کہ فون بھی کمرے میں رہ گیا تھا۔ حسام اسے بار بار کال کرتا رہا، مگر ریسیو کیسے ہوتی۔ دراصل اس کے جانے کے بعد ہی تراب کی طبیعت کا مسئلہ بن گیا۔ ڈرائیور اور گاڑی دونوں غائب تھے۔ خواجہ نیاز کی طرف بھی گاڑی نہ تھی۔ فریحہ نے حسام کو کال کی۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں گھر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ فوراً" گھر پہنچا اور تراب کو اسپتال پہنچایا۔ وہ راستے میں اور اسپتال پہنچنے کے بعد بھی اسے بار بار فون کرتا رہا تھا مگر No.answering پر اس کا غصہ پریشانی میں بدل گیا تھا۔

تراب نے بیٹی کو جنم دیا تھا۔ کچھ پل اس خوشی کو پانے میں گزر گئے تھے۔ تقریباً" شام اتر چکی تھی جب وہ اور فریحہ اسپتال سے گھر کچھ سامان لینے آئے تھے غالباً" وہاں ثمرہ پھپھو اور الوینہ بھابھی بھی آچکی تھیں جب کہ خواجہ نیاز کی طرف ابھی اطلاع نہیں دی تھی کہ گھر جائیں گے تو بتا بھی دیں گے۔ ابھی ان کی گاڑی رکی ہی تھی جب اس کے پیچھے ایک اور گاڑی اندر داخل ہوئی۔ زرمینہ کو ثمن کا بھائی سمیر چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے اسپتال پہنچنے کے بعد اور اس وقت ڈرائیور کے ساتھ اسے اکیلے بھیجنا مناسب نہ سمجھا۔ گاڑی سے اترتی زرمینہ کو دیکھ کر حسام کا چہرہ شدت غصہ سے یک لخت سرخ ہو گیا۔

"کہاں پھر رہی تھیں تم' اس کے ساتھ۔" اس سے پہلے وہ کچھ بتاتی وہ غصے سے اس کی جانب بڑھا۔

"تمہیں آوارہ گردی کے علاوہ اور کوئی کام نہیں، کچھ احساس ہے تمہیں....."

"بتا تو رہی ہوں۔" وہ اس کے قدرے قریب ہوئی تھی، مگر اس کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا بتا رہی ہو؟ صبح دس بجے کی نکلی ہوئی ہو' تمہیں پاگلوں کی طرح ٹرائی کر رہا ہوں میں' شام کے چھ بج گئے اچھے مشاغل ہیں' جو ختم نہیں ہو رہے تھے۔"

"مومین میں پکنک پر گئی تھی۔" اسے بھی غصہ آگیا۔

"اور کیا نام دوں! اس آوارگی کا.....!" اس نے حیرت سے کھلے منہ پر زور سے اپنا ہاتھ رکھا اور ہونق کی طرح اسے گھورنے لگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حسام اس طرح انسلٹ کرے گا وہ بھی سہیلی کے بھائی کے سامنے وہ بھی غصے میں آگئی۔

"تم مجھے کریکٹر لیس کہہ رہے ہو۔"

"فضول باتیں مت کرو' اور جاؤ اندر۔" سمیر ندامت سے پانی پانی ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کاش وہ گھر پر ہوتا تو اپنی ماں کو خود لے جاتا اور پہنچنے کے بعد ان کی سیریس کنڈیشن کی وجہ سے وقت کا اندازہ نہ ہو سکا اس نے وضاحت دینے کے لیے "وہ ایکچوئیلی" کہا ہی تھا جب حسام دو ٹوک بولا۔

"پلیز آپ جائیں اس وقت۔" اب ڈرائیور کی باری آئی تو وہ بے چارہ منمناتے ہوئے اپنے خراب موبائل کا ریزن دے رہا تھا۔

فریحہ بھی گاڑی سے باہر نکل کر سارا تماشا دیکھ رہی تھیں پھر آگے بڑھیں اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کے کندھے کو دبایا۔

"حسام آرام سے۔" مگر وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا اندر کا منظر اسے مزید تپا دینے والا تھا۔ وہ اپنے کپڑے بیگ میں ٹھونسے باہر نکل رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو تم؟" حسام اور فریحہ نے یک زبان پوچھا تھا اور وہ جواب میں روتے ہوئے چلائی تھی۔

"لوز کریکٹر ہوں نا میں' نہیں رہنا مجھے یہاں پاک دامنوں کے ساتھ۔" وہ تیزی سے داہنی طرف بڑھی تھی۔ حسام' فریحہ' علشبہ اسے۔ بات سنو' رکو' کرتے رہ گئے' مگر اس نے ایک نہ سنی غلطی ہی تھی جو ضد کے ساتھ انا میں گوندھ گئی۔ اب اس غلطی کو کوئی بھی سدھارنے کے لیے پہل کرنے پر راضی نہ تھا۔

حالانکہ چند دن بعد سمیر اور اس کی امی نے سب کلیئر بھی کر دیا تھا' مگر انا اتنی آگئی تھی کہ کوئی اسے غلط فہمی کا نام نہ دے رہا تھا۔

"چلیں چھچی غلطی جدھر سے بھی ہوئی' مگر یہ تو ثابت ہو گیا کہ غلطی نہیں بلکہ غلط فہمی تھی۔"

”تو آتے نا بھائی جان بھابھی دور کرنے' خود آنے کے بجائے اس پاگل مجنوں کو بھیج دیا۔“

”کس کو کون آیا تھا؟“ پریزے کو بالکل سمجھ نہ لگی۔

”تمہارا دیور اور کون۔“

”صفی آیا تھا...؟“ اسے اچنبھا ہوا۔

”ہاں آیا تھا اپنے چچا کو دھمکی دینے۔“ وہ پھر تلخی سے بولیں۔ ”کہہ رہا تھا رباط کو بھگا کرلے جائے گا۔ ہونہہ بڑا آیا بھگانے والا' دو دو بھائی ہیں اس کے' ٹانگیں نہیں توڑ دیں گے... شکر کرو طیب نے باپ کو پکڑ لیا جو وہ اپنی ٹانگوں پر واپس چلا گیا' ورنہ اسپتال سے ملتا...“

چچی کی اطلاع پر اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اسے صفی سے اتنی حماقت کی بالکل توقع نہیں تھی۔ اگر اس وقت وہ سامنے ہوتا تو وہ دو تھپڑ ضرور لگاتی۔ اچھی بھلی بات کو نیا رخ دے گیا تھا۔ پھر اس کی حمایت تو آخر کرنا ہی تھی۔

”چچی آپ جانتیں تو ہیں کہ وہ کتنا بے وقوف ہے' پھر آپ اور چچا جان کے لاڈ پیار کی وجہ سے ہی اسے اتنی ہمت ہوئی۔“

”اب نکالیں گے نا اس کے چچا سارا لاڈ پیار۔“

”نہیں چچی' پلیز ایسے نہیں کہیں...“ اس کی منتوں پر ان کا لہجہ بھی خاصا بدل گیا ویسے بھی بہت کچھ سنا دینے سے من ہلکا ہو گیا تھا۔

”دیکھو پریزے! میں خود چاہتی ہوں زرمینہ گھر آجائے' مگر اس کی ضد کی وجہ سے حسام اور تمہارے چچا راضی نہیں' بہت غصہ ہے حسام کو۔“ انہوں نے بات اپنے سر سے اتار دی تھی' مگر پھر بھی پریزے بہت حد تک انہیں راضی کر چکی تھی۔ وہ اسے کھانے پر روکتی رہیں' مگر وہ معذرت کرکے گھر آگئی اور حسام سے خود بات کرنے کی بھی اجازت لی تھی۔ گھر آنے کے بعد رات میں اس سے فون پر بات کی اور ملنے کا کہا۔ حسام نے گھر کے بجائے باہر کو ترجیح دی۔ گھر سے شاپنگ کا کہہ کر نکلی تھی اور سیدھی ”سب وے“ ہوٹل پہنچ گئی۔ وہ پہلے سے ہی منتظر تھا۔ وہ بہت ادب سے ملا رسمی جملوں کے بعد وہ بہت دیر خاموش بیٹھے رہے' آخر پریزے نے پہل کی۔

”حسام کیا ان سب کا کوئی حل نہیں ہے' کوئی راستہ نہیں رہا؟“

”بھابھی راستہ اس نے بند کیا ہے۔“

”راستہ بند کرنے اور جدا کرلینے میں فرق ہوتا ہے حسام' بند راستے کھل جاتے ہیں... مانا اس سے غلطی ہوئی بہت جذباتی ہے وہ' مگر وہ اپنی غلطی پر نادم ہی' پریشان ہے... تسلیم کررہی ہے اسے پھر!“

”پھر رکاوٹ کیا ہے۔“ وہ گاڑی کی چابیاں ٹیبل پر رکھتے ہوئے آرام سے بیٹھا۔ ”گھر آجائے' میں نے منع تو نہیں کیا اسے۔“

”حسام یہ جو ضدی بیوی ہوتی ہے نا' اس کے اندر ہوتا ہوا کچھ نہیں ہے... بس اک انا کی دیمک زدہ شاخ سی ہوتی ہے' جس پر اس کے پورے وجود کی تعمیر ہوئی رہتی ہے اور شوہر کی معمولی سی محبت بھری پیش قدمی اس کی انا' اس کی ضد کو بھربھرا کر دیتی ہے اور وہ لپک کر بڑھتی ہے' پلیز...!“ اس نے اپنا ہاتھ ہونٹوں سے ہٹایا اور دونوں ہاتھ ٹیبل پر بچھا دیے۔ وہ بھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

”جانتیں ہیں صفی کیا کہہ کر گیا ہے۔“ وہ دزدیدہ نگاہ سے انہیں دیکھ رہا تھا اور پریزے نے ناگہانی غصہ دبانے کے لیے لمحہ بھر آنکھیں بند کیں اور اثبات میں سر ہلایا۔ انہیں ایک بار پھر صفی پر شدید غصہ آیا تھا۔

”بتایا تھا چچی نے۔“

”حالانکہ وہ کر کچھ نہیں سکتا۔“ اس نے صفی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”جانتی ہوں۔“

”چچی کے بتانے پر اسے یاد آیا کہ دو دن پہلے صفی بہت دیر سے سو کر اٹھا تھا اس کی آنکھیں بہت سوجی اور ریڈ تھیں۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتایا بلکہ خاموشی سے باہر چلا گیا تھا۔ یعنی اسے اپنی کھوکھلی دھمکی نظر آرہی تھی۔“ پریزے نے لمبی آہ بھری۔

"دیکھو حسام!" وہ کہنیوں پر وزن دیتے ہوئے قدرے آگے ہوئی اور ٹیبل پر لفظ کھوجتی رہی۔
"حسام جب مکڑی نے جالا نیا نیا بنا ہوتا ہے نا تو بہت صاف اور شفاف ہوتا ہے، بے شک اس کے الجھے ہوئے پیچ دار تار بغیر سرے کے ہوتے ہیں، مگر ان تاروں کے آرپار صاف دکھائی دیتا ہے، لیکن ہر گزرتے پل کے ساتھ نہ صرف وہ بڑھتا ہے بلکہ اس پر اتنی گرد پڑ جاتی ہے کہ پہلے شفافیت ختم ہوتی ہے پھر دکھائی دینا اور پھر گرد کا ایک طوفان ہوتا ہے، جس سے وہ اٹ کر جھک جاتا ہے، ہوا کے جھونکے سے جھولتا ہے، کبھی ایک سرا ٹوٹ کے لٹکا رہتا ہے، کبھی آس پاس کی دیواروں پر چپک کر انہیں بھی بدنما کر دیتا ہے، مگر وہ مکمل ٹوٹتا نہیں ہی، جب تک کہ ہم خود اسے صاف کرنا نہ چاہیں اور ایک شفاف سے جالے کی نسبت گرد سے اٹا جالا صاف کرنے میں بہت سا وقت، بہت سی ہمت چاہیے۔۔۔ حسام ابھی جالا گرد سے اتنا نہیں اٹا، ابھی آس پاس کی دیواریں بدنما نہیں ہوئیں کہ انہیں صاف کرتے کرتے سارا وقت کٹ جائے۔" وہ کنفیوژ سا ہو کر پیشانی رگڑنے لگا۔
"دیکھو اگر خدانخواستہ صفی نے واقعی جلد بازی میں کوئی غلط قدم اٹھالیا تو کیا بدنامی کے، رسوائی کے خوف سے ہم مجبور نہ ہو جائیں گے انہیں اپنانے پر، کیا ضروری ہے حالات اس نہج تک لے جائے جائیں۔"
"بھابھی میں نے اسے بہت روکا تھا، مگر اس نے سنی نہیں، خود اپنی مرضی سے گئی ہے۔"
"تو تم اس کی مرضی توڑ دو۔" وہ بے ساختہ بولی تھیں پھر توقف کے بعد کہا۔
"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تمہیں مس کر رہی ہے۔۔۔ وہ کل بھی اسپتال تھی۔"
"اب کیسی ہے؟" اپنی بے قراری پر وہ بھی حیران ہو گیا۔
"ویسی ہی ہے۔" پریزے نے نوٹس نہیں لیا۔
"اور دیکھ لیں اس نے کتنی بڑی خبر مجھ سے چھپائی،

آپ پھر بھی اسی کی سائڈ لے رہی ہیں۔" اس کا شکوہ بجا تھا اور برف بھی شاید پگھلی تھی اور اس کا اعتماد بھی بڑھا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ہونٹ ترکیے۔
"میں اس کی سائڈ نہیں لے رہی، تمہاری لے رہی ہوں، تمہارا خوشیاں منانے کا وقت متاثر ہو رہا ہے، تم متاثر ہو رہے ہو، یہ لمحے اتنی آسانی سے نہیں آتے۔۔۔ پلیز حسام۔" اس کے بااعتماد لہجے میں نارسائی کا دکھ گھل گیا تھا۔ حسام نے آنکھیں بند کرتے ہوئے گہری سانس بھری اور اثبات میں سر ہلایا۔
"میں کرتا ہوں امی ابو سے بات، اگر وہ مان گئے؟"
"تم مناؤ گے انہیں۔" وہ بہت یقین سے بولی تھی۔
باتوں کے دوران اس نے کھانے کا آرڈر بھی دیا تھا، مگر اب کھانا خاصا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ چند نوالے لے کر وہ اٹھ گئے۔ حسام نے ڈرائیور کو گھر بھیج دیا کہ وہ خود انہیں ڈراپ کر دے گا۔ پہلے تو پریزے نے لحہ بھر سوچا پھر کندھے اچکا کر کہا۔
"ٹھیک ہے ایز یو وش۔"

☼ ☼ ☼

حسام کا انتظار کرتے تقریباً تین چار دن گزر گئے تھے۔ ان دونوں کی ملاقات کا صرف زرمینہ یا خود اسے ہی پتا تھا۔ جب کہ خالی ہاتھ گھر آنے پر برجیس نے پوچھا تو اس نے سرسری انداز میں کہہ دیا۔
"کچھ خاص پسند نہیں آیا۔" مگر زرمینہ کو یقین دہانی کرواتی رہی کہ وہ بہت جلد آئے گا۔ ہر گزرتے پل کے ساتھ اس کی امید بھی بودی ہو جاتی اور وہ آتا بھی کیسے ان کی ملاقات کے اگلے ہی روز ناگہانی حادثہ ہو گیا تھا۔ حدید نے گھر فون کے ذریعے اطلاع دی تھی اور برجیس کے تو مانو پیروں تلے زمین ہی نکل گئی۔ زرمینہ اور سیما کی طبیعت کی وجہ سے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ پریزے کو ساتھ لیا، ٹیکسی میں اسپتال پہنچی تھیں۔ ممو پھپھو ان کے میاں اور سوائے علشبہ کے سب گھر والے وہاں جمع تھے۔ ہمیشہ بجی سنوری رہنے والی ماہین

اس وقت ایک پتھر کی مورتی کی طرح بینچ میں گڑھی بیٹھی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے شدید سکتے میں ہو۔ پریزے جاکر اس سے لپٹ گئی۔ اسے حوصلہ دینے لگی۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح کبھی اسے دیکھتی، کبھی خاندان کے مردوں کو جو بھاگ بھاگ کر دوائیں اور خون کا انتظار کررہے تھے۔ برجیس نے روتی ہوئی ثمرہ پھپھو کو حوصلہ دیا۔

ماہین کے میاں اپنے دونوں بچوں کو اسکول سے واپس لارہے تھے اچانک ہی سامنے سے آتے تیز رفتار ٹرک سے ان کی گاڑی ٹکرا گئی۔ بٹی کو تو قدرے معمولی چوٹیں آئی تھیں اسے بینڈیج کرکے ڈاکٹرز نے فارغ کردیا جب کہ بیٹے اور میاں کی حالت زیادہ خراب تھی اور اس وقت دونوں الگ الگ او۔ ٹی میں تھے۔ گزرتا ہر لمحہ ماہین کی سانس کھینچ رہا تھا۔ آنسو تھے، جو رکتے بھی کیسے......؟ اس نے اپنا سر بینچ سے اٹھایا اور پریزے کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"بھابھی، ہمیں معاف کردو، میں نے آپ کا کبھی دل نہیں دکھانا چاہا، امی نے جب، جب آپ کا دل دکھایا، جب، جب طعنہ زنی کی، ہر ایک کی میں آپ سے معافی مانگتی ہوں، بھابھی میں اپنے بچے اور میاں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" وہ ہذیانی کیفیت میں چلارہی تھی اور پریزے سمیت سب اسے سنبھالنے میں ہلکان ہورہے تھے۔

"خدا کے لیے ماہین خود کو سنبھالو، کیوں مایوسی کی باتیں کررہی ہو۔ اللہ سے دعا کرو، ہمت کرو۔"

بہت سا وقت گزر گیا تھا اور پھر ہمت بھی یک لخت آگئی جب ڈاکٹرز نے فہیم کے کامیاب آپریشن کی اطلاع دی اور کچھ ہی دیر بعد صفی نچلی منزل پھلانگتا اوپر آیا۔

"ماہین آپی مبارک ہو، سونو ٹھیک ہے، ڈاکٹر اسے تھیٹر سے باہر لارہے ہیں۔" سب نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ ان دونوں کے کمروں میں شفٹ ہونے کے بعد یہ لوگ ایک ایک کرکے گھر واپس آگئے۔ خواجہ فواد کی فیملی کو ثمو کے منع کرنے پر اطلاع نہیں دی تھی۔

غالباً" علشبہ کی طبیعت کی بنا پر ایک بٹی تو تباہی کے دہانے کھڑی ہے، کہیں دوسری کا بھی کچھ نقصان نہ ہوجائے، مگر اب سب خیریت تھی تو اطلاع بھی دے دی۔ وہ لوگ ان سب کے جانے کے بعد ہی پہنچے تھے۔ آمنا سامنا نہ ہوا۔ چند دن تک فیملی میں اتنی ٹینشن رہی تو حسام بھلا کیسے آسکتا تھا۔

☼ ☼ ☼
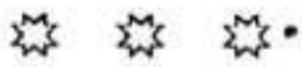
ٹھنڈی ٹھنڈی شام، ساری فضا کو اپنی بانہوں میں جھلا رہی تھی۔ زرمینہ اور پریزے لاؤنج کے صوفوں پر پاس پاس بیٹھیں راز و نیاز کررہی تھیں۔ زرمینہ کی آس، یاسیت میں بدل رہی تھی۔ اس نے گھٹنوں کے گرد لپٹے بازو کھولے اور صوفے سے اتر کر ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے اٹھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ لمحے گزرے ہی تھے اسے باہر سے مانوس آوازیں آنے لگیں۔ اس نے گلاس ونڈو سے پردہ سرکار کر دیکھا۔ حیرت، ناقابل یقین خواب سے اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ سامنے صوفے پر حسام نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے مبہم سا مسکرا رہا تھا۔ غالباً" خواجہ فواد اپنی ساری فیملی بمع مٹھائی و فروٹ کے ٹوکرے لیے تشریف لائے تھے۔ سامنے پریزے ہی تھی۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملی۔ انہیں بٹھانے کے بعد برجیس اور خواجہ نیاز کو بلانے چلی گئی وہ کچھ ہی پس و پیش کے بعد باہر آگئے۔ آپس میں وہ سب مروتاً" روٹھے پن سے ملے تھے۔ سیما بھی کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اپنی طبیعت کا بہانہ کرتی اٹھ گئی۔ وہ ایسی ہی تھی اپنے آپ میں مگن رہنے والی۔

کہنے کے لیے ان دونوں فیملیز کے پاس بہت کچھ تھا۔ بہت سا مشتعل اظہار خیال پیٹھ پیچھے کرتے بھی رہتے تھے مگر اب مروت نے زبانوں پر قفل ڈال رکھے تھے۔ جیسے کہنے کو کچھ رہا نہ ہو یا الفاظ سوچ رہے ہوں بات کریں تو کہاں سے شروع کریں۔ انہیں ایک دوسرے سے نظریں چرانے اور الفاظ سوچنے میں کم از کم اتنا وقت لگ گیا تھا کہ پریزے اچھی سے چائے

بنالائی تھی۔ خواجہ فواد نے چائے پکڑتے ہوئے پریزے سے پوچھا تھا۔

"تمہاری بیٹی نظر نہیں آرہی' کہاں ہے وہ بھئی۔؟"
وہ ذرا سا مسکرائی اور نگاہوں کا زاویہ حسام کی طرف موڑا۔

"وہ حسام سے ناراض ہے۔"
وہ نچلا ہونٹ دباتے ہوئے مبسم سا مسکرایا تھا۔ اس کی ذرا سی مسکراہٹ نے اسے اتنا حوصلہ دیا کہ وہ پردہ چھوڑ کر تیزی سے باہر آگئی اور فوراً" چچا جان سے لپٹ گئی۔

"سوری چچا۔ رئیلی ایم ویری سوری۔"
"اوہو بیٹا یہ کیا کر رہی ہو' بیٹیاں معافی تھوڑا مانگتی ہیں۔" انہوں نے اس کے سر پر بوسہ دیا۔
"مان ہوتی ہیں ماں باپ کا' اور ان ہی کے سر پر اگر نخرہ دکھائیں تو یہ غلطی تھوڑی ہے' جس کی یوں رو رو کر معافی مانگی جائے۔"
وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ "اور میں نے اس خبیث کے بھی کان کھینچے ہیں' بولنے سے پہلے دوسرے کی بات بھی سن لینی چاہیے۔" وہ اب فریحہ سے لپٹ کر سوری کرنے لگی۔ حسام چور نظروں سے جیت کے مزے لوٹ رہا تھا۔

"آئندہ ایسا نہیں ہو گا چچی' رئیلی سوری۔"
"ہاں یہ ٹھیک کہا۔" فریحہ نے بھی اس کے سر پر بوسہ دیا۔ خواجہ فواد کی نگاہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوتے صفی پر گئی تو زور دے کر کہا۔
"ہاں اگر بیٹے گستاخی کریں تو انہیں قطعا" معاف نہ کیا جائے جب تک وہ خود معافی نہ مانگیں۔" ان کی فہمائش اور نروٹھے پن پر برجیس اور خواجہ نیاز نے استہفامیہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ البتہ صفی سنتے ہی لپکا۔

"معافی مانگنے کے لیے صفی سر کے بل آنے کے تیار ہے' چچا جان۔" وہ فوراً" ان کے قدموں میں نچھاور ہو گیا۔

"چاہے تو جوتے لگالیں' چاہے جوتوں کا سہرا باندھ دیں' بندہ ناچیز حاضر ہے۔ مگر خدا کے واسطے رشتے سے انکار مت کریں۔" اس کے عاجزانہ انداز پر سب کو ہنسی آگئی۔ مگر برجیس اور خواجہ نیاز آگے بڑھے یقیناً" انہیں کچھ نہ کچھ سمجھ آگئی تھی۔

"جوتے تو تجھے ہم لگائیں گے۔ پہلے خود ہی اپنے اماں' ابا بن کر معاملات ہاتھ میں لیتے پھرتے ہو' پھر ہم برے۔ ایک وہ ہے جو کہہ رہی تھی مرجاؤں گی مگر اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی' اماں ابا کو برا بنوا دیا اور اب معصوم دبک کر "سوری سوری" شروع کردی' ایک تم ہو یالا ہی بالا لڑتے مرتے پھو۔"
ماحول پر تنی معمولی تکلف کی چادر گری تو پھر پہلے کی طرح ہو گئے اور خوب اپنی اپنی اولادوں کے لتے لیے۔

☼ ☼ ☼

کتنے دن سبک رفتاری سے گزر گئے تھے۔ گرم چلچلاتے سے دنوں پر مسحور کن ٹھنڈی دبیز چادر اتر رہی تھی۔ جہاں دن کا پھیلاؤ سمٹ رہا تھا وہاں اس کی باتیں' اس کی یادیں جڑ پکڑ لیتی۔ ویسے بھی زرمینہ کے چلے جانے کے بعد گھر میں خاصی خاموشی اتر آئی تھی۔ اب وہ حسام کے ساتھ رات کے وقت تھوڑی سی دیر کے لیے آتی تھی اور اگر بیٹھے زیادہ دیر ہو جاتی تو صفی کی پریشانی بھی بڑھ جاتی۔ وہ اشارے کنارے میں اسے کھسکنے کا عندیہ دیتا۔ اب اسے بھی آئے کئی دن ہو گئے تھے غالباً" وہاں علشبہ کے بیٹے نے مصروفیت بڑھا دی تھی۔ یہ بدلتے ایک سے صبح شام پریزے کی بوریت بڑھا رہے تھے۔ وہ سر شام چائے لے کر ٹیرس پر بیٹھ جاتی۔ لاشعوری طور پر اس کی نگاہوں کا مرکز مین گیٹ ہوتا تھا۔ حدید اکثر شام ڈھلے واپس آتا تھا اور اگر کبھی دیر ہو جاتی تو نگاہ بار بار گیٹ کا طواف کرتی۔ اس کی گاڑی داخل ہوتے ہی ایک سکون آور سانس اندر اتر آتی۔ اگر کھانے کا وقت ہوتا تو نیچے لاؤنج میں چلی جاتی ورنہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اب بھی جانے وہ کن سوچوں میں گم چائے پی رہی تھی جب حدید کی سفید ایم۔ بی ڈبلیو گیٹ سے اندر داخل

ہوئی۔ آج وہ وقت سے کچھ پہلے آیا تھا۔ اسے کچھ فکر بھی ہوئی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ تیزی سے نیچے لاؤنج میں جائے۔ اس سے پوچھے۔ "خیریت ہے ناں؟" یقیناً" وہ اسی ارادے سے کمرے سے نکلی ابھی زینے کے پہلے اسٹیپ پر پاؤں رکھا تھا جب زینے کے نیچے سے نکلتا حدید لابی میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کا اگلا اٹھا پاؤں وہاں ہی رہ گیا۔ اس نے ایک سرد آہ لی۔ "وہ تو اپنے کمرے میں آیا ہے۔" وہ واپس مڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ دروازے کی جانب پشت کیے خاصا غصے میں کہہ رہی تھی۔

"تم آخر سمجھتے کیوں نہیں، حدید ایسے کبھی میری جان نہیں چھوڑے گا۔" وہ لحہ بھر رکی تھی۔

"پھر وہی بات، میں نے پہلے بھی صرف تمہارے کہنے پر اتنا بڑا رسک لیا تھا، وہ تو شکر ہے سارا ملبہ آسانی سے پریزے پر گر گیا ورنہ وہ تو میری جان نکال لیتا۔ اور تم پھر سے مجھے ڈی۔ این۔ سی کے مشورے دے رہے ہو۔" وہ رک کر مزید غصے سے بولی۔

"نہیں اب میں تب ہی ایسا کروں گی، جب تم کراچی سے یہاں پہنچو گے۔" وہ کسی جواب میں چبا کر کہنے لگی۔

"ہاں تمہیں پھر دیر ہو جائے اور میرے گلے دوبارہ یہی ڈھول پڑ جائے۔ میری بات سنو۔ پہلے میری بات سنو تم آج شام کراچی سے چل رہے ہو اور میں صبح ہی کسی طرح اسپتال پہنچ جاؤں گی، ہاں! ہاں ڈاکٹر سے بات کر چکی ہوں، مگر پہلے تم یہاں پہنچو پھر۔" وہ کسی کو قائل کرنے میں اتنی محو تھی کہ دروازہ کھلنے اور بالکل اپنی پشت پر کسی کی موجودگی محسوس نہ کر سکی حدید نے اس کا سیل فون پیچھے سے ہی کھینچ کر اپنے کان پر لگا لیا۔

"ڈیئر تم جانتی تو ہو میں اگلے آٹھ دس دن بہت بزی ہوں، میرا امپورٹنٹ شوٹ ہے، ایسا کرو تم فارغ ہو کر کراچی مائی کی طرف آجاؤ، میں وہاں سے لے لوں گا، پھر کریں گے قانونی کارروائی۔"

"او یو شٹ اپ۔!" اس کی بات مکمل ہوتے ہی حدید آگ بگولا ہو گیا۔ وہ چلانے کے ساتھ ہونق بنی سیما کو شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس نے فون بہت زور سے دیوار پر مارا تھا جو کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اور پھر پیچھے سرکتی سیما پر کسی گھات لگائے شکاری کی طرح بڑھا۔ وہ پیچھے ہوتی ہوئی بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس نے دانت جماتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے اس کے منہ پر زور سے طمانچہ دے مارا تھا۔ شدت تکلیف سے اس کے اوسان خطا ہو جانے چاہیے تھے منہ تو یک لخت کھل گیا تھا مگر وہ پوری قوت سے سنبھلی اور اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

"تم نے مجھے تھپڑ مارا۔"

اس کی آنکھوں میں پانی تھا مگر آواز میں نفرت۔ اسے تو پہلے ہی یقین نہ آیا تھا کہ پریزے کیسے اتنا کچھ کر سکتی ہے، وہ ایسی نہیں تھی۔ یقیناً" سب امر بی تھا مگر سوتن کی جلن میں سیما نے اس پر الزام لگایا ہو گا۔ اور اسی پختہ یقین نے دل پریزے کی طرف سے تب ہی صاف کر دیا تھا لیکن اس بھیانک حقیقت پر وہ چلایا۔

"تھپڑ... ہونہہ، میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" اس نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کے اپنے دفاع میں چیخنے چلانے پر برجیس بھاگتی ہوئی آئی تھیں اور کمرے کا منظر دیکھ کر یک دھک رہ گئیں۔ انہوں نے بہت مشکل سے اسے حدید کے شکنجے سے چھڑایا تھا۔ اور سیما چیختے چلاتے ایک ہی تکرار کر رہی تھی کہ اسے اس وحشی کے ساتھ نہیں رہنا، اسے طلاق چاہیے۔ برجیس اسے کھینچتی اپنے کمرے میں لے آئی تھیں ساری بات جان لینے کے بعد انہوں نے تہہ کیا کہ اب معاملہ خواجہ رمیز کے سامنے رکھا جائے۔ برجیس نے فون پر انہیں ساری روداد سنائی تھی اور وہ جواباً" ظالمانہ انداز میں کہنے لگے۔

"حدید سے کہو اسے بھلے جان سے مار دے یا زندہ دفنا دے۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"کیوں۔ میرا بیٹا کیوں قاتل بنے؟ یہ کام خود کیوں

نہیں کیا، تم نے!" ان کے لہجے میں بھی کرختگی در آئی تھی۔ وہ تو آج تک حیران تھیں کہ صفی کے انکار پر رمیز نے ان کی شادی شدہ بیٹے کو اپنی بیٹی دے دی۔ لیکن حقیقت بے پردہ ہونے پر دلی دکھ ہوا کہ بیٹی کے کرتوتوں پر پردہ پوشی کے لیے ان کی ضرورت کو آڑ بنایا۔ احسان کرتے ہوئے انہی کے سر منڈھ دیئے۔ مگر اس مسئلے کا حل دنگا فساد یا قتل و غارت نہیں تھا۔ انہیں بہت سمجھ داری سے کام لینا تھا۔ برجیس کے بہت بہلانے پھسلانے پر وہ صرف اس بات پر راضی ہوئی تھی کہ وہ بچہ اسے دے دے گی' کبھی دوبارہ پوچھے گی بھی نہیں بشرطہ وہ فارغ ہوتے ہی طلاق دے دے۔ سارے گھر سے چوری ایک خاموش معاہدہ طے پا گیا تھا۔ جس کا سوائے ان تینوں کے اور کسی کو کان و کان علم نہ تھا۔ البتہ برجیس اس پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اس کا فون ٹوٹ جانے کے بعد حدید نے نہ ٹھیک کروایا نہ ہی نیا لے کر دیا بلکہ لینڈ لائن کنکشن بھی غیر محسوس طریقے سے ڈسٹرب کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر کی فضا پر اسرار سے پر اسرار ہوتی جا رہی تھی اک عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی۔ حدید بہت بہت دیر گھر نہ آتا تھا۔ جب آ جاتا تو خوامخواہ لاؤنج میں بیٹھا رہتا یا پھر لان میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہ دہری اذیت میں تھا۔ جس عورت سے اسے شدید نفرت' شدید کراہیت محسوس ہو رہی تھی نہ اسے چھوڑ سکتا تھا نہ مار سکتا تھا' نہ گھر سے نکال سکتا تھا حد تو یہ تھی کہ اس کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا کیونکہ اس کے پاس اس کی بہت بڑی امانت تھی۔ اور جس عورت سے اسے شدید محبت تھی چاہت تھی اس سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ گویا اس کے مقابل لا کھڑا کیا بھی تو کس کو۔؟ اس کی یہ حالت بھلا پریزے سے کیسے چھپ سکتی تھی۔ وہ اس کا سب سرا ڈھونڈنے میں ناکام تھی۔

پریزے نے جو بات واضح محسوس کی تھی وہ برجیس کا رویہ تھا۔ غالباً" ان کا رویہ پچھلے حادثے کے کچھ دن بعد بہتر تو ہو گیا تھا مگر پھر بھی پریزے کو کبھی کبھی بیگانگی کا احساس ہوتا لیکن اب چند دنوں میں ہی پرانا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ اسی طرح اس کے پاس بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کرتیں جیسے پہلے کرتی تھیں۔ اس شام وہ قریب ہی بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی تو یک لخت شائستگی سے کہا۔

"پریزے بیٹا' سیما کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے' تم اسے دودھ پتی بنا دو!" اسپیشل اس کے کمرے میں جانا اور کھانے پینے کی چیز خود دینا۔ وہ گریزاں تھی۔ مگر اب ان کے حکم پر وہ ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"میں صفورا سے کہتی ہوں۔" اسے اٹھتے دیکھ کر وہ قدرے انداز میں بولیں۔

"میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ گھر کی فرد ہے وہ' اس کے پاس بیٹھا اٹھا کرو' کوئی عقل کی بات سکھاؤ اسے بھی۔" اس کے سرعت سے دیکھنے پر وہ قدرے چونکی پھر لہجے میں مان بھری ڈپٹ پیدا کی۔

"اور یہ تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے' اوپر جا کر بیٹھ گئی ہو۔ حدید کا خیال رکھا کرو' دیکھا نہیں وہ کتنا پریشان رہنے لگا ہے' ضرورت ہے اسے تمہاری۔"

ایک وقت میں پیار بھرے دو' دو محاذ کھل جانا کتنی دیر تو وہ کچھ بول نہ سکی پھر اٹکا سا "جی" نکلا۔

"جی کیا ہوا' گھروں میں بات ہو ہی جاتی ہے' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بوریا بستر لپیٹو اور کونے میں چھپ جاؤ۔"

"آخر اتنے مہینے بعد میرا چھپ جانا نظر آ ہی گیا۔" وہ خاموشی سے سوچتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی پچھلے کئی دنوں سے اس کے اندر احساس ندامت کروٹ بدل رہا تھا غالباً" حدید نے تو پیش رفت کی تھی مگر کیوں اس کی نام نہاد انا اڑے آ گئی اس نے لچک کیوں نہ دکھائی۔ اب تو صرف اس کے ایک اشارے کی منتظر تھی' وہ لپک کر جاتی۔ اس نے اپنی بوجھل پلکیں انگلی سے جھاڑیں اور چائے لے کر اس کے کمرے میں آ گئی تھی۔ پل بھر کے لیے وہ سٹپٹا گئی تھی۔ یوں اچانک اس کے کمرے میں۔ اس نے کپ تھماتے ہوئے اس کی

طبیعت کا پوچھا تھا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔
"ٹھیک ہوں' مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔" اس کا استفہامیہ لہجہ بھی خاصا کھردرا تھا۔
"کیوں کہ مجھے تمہاری فکر ہے۔" اس نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔
"کیوں۔؟" اس کے پرخراش انداز پر بھی وہ نرمی سے اس کا لفظ دہراتے ہوئے وضاحت دینے لگی تھی۔
"کیوں۔ کیوں کہ تم اس گھر کی فرد ہو' کیوں کہ تم حدید کی بیوی ہو اور مجھے حدید سے وابستہ ہر رشتے کی فکر ہے۔"
"خواہ سوتن ہی ہو؟" سیما کے استہزائیہ انداز پر وہ پل بھر اسے دیکھتی رہی پھر سردسے کہا۔
"ہاں۔"
"بہت محبت ہے اس سے آپ کو۔"
"یقیناً' وہ میرا شوہر ہے' اور اس رشتے میں محبت تو خودبخود جگہ بنالیتی ہے۔"
"پھر تو اسے جس سے نفرت ہوگی' اس سے آپ کو بھی ہوگی۔" وہ بیڈ کی ٹیک چھوڑ کر خوامخواہ بات کو طول دے رہی تھی مگر پریزے اطمینان سے جواب دیتی رہی۔
"وہ بلاوجہ کسی سے نفرت نہیں کرتا۔"
"اچھا! اسے اچنبھا ہوا تھا پھر خود سے ہی موضوع بدلا۔
"آپ کو مجھ پر غصہ نہیں ہے۔؟ یا پھر جو کچھ میں نے کیا تھا' میٹھا بن کر بدلے کا پلان بنا رہی ہیں۔؟"
"نہیں" وہ اس کا انداز بالکل نظرانداز کرگئی۔ "میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت نہیں دیتی۔ بہرحال" وہ کہتے کے ساتھ اٹھی۔
"تم چائے پیو' اور باہر آکر بیٹھا کرو' لان میں ٹہل لیا کرو' طبیعت فریش ہوجائے گی۔" وہ اپنے پرسکون انداز پر اسے مشدر چھوڑ کر باہر آگئی۔ صرف اس دن کیا اب وہ اکثر اس کے پاس آکر بیٹھ جاتی۔ بے شک کہ وہ دل میں شرمندہ تھی مگر اظہار نہ کرتی تھی بلکہ پریزے کے ہلکے پھلکے موضوع پر اپنی سی رائے دے دیتی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر سے لنچ پر برجیس کا انتظار کررہی تھیں۔ غالباً" دوپہر میں یہ تینوں خواتین مل کر کھانا کھاتی تھیں جب کہ شام میں مرد آجاتے تو ڈنر اکھٹے ہی کرتے تھے۔ برجیس تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر زرمینہ کی طرف گئیں۔ پریزے نے انہیں فون کیا تو انہوں نے کچھ دیر اور وہاں ٹھہرنے کا عندیہ دیا اور ساتھ ساتھ ان سے کھانے کا استفسار بھی کیا تو پریزے نے کہہ دیا۔
"بس آپ کا انتظار کررہے تھے۔ اب کھالیتے ہیں۔"
"ہاں اور سیما سے بھی پوچھ لینا۔"
"جی اچھا۔" اس نے فون بند کردیا۔
وہ ناک دینے کے بعد کمرے میں آگئی تھی وہ سامنے صوفے پر نیم دراز تھی۔ شکل پر حددرجہ بے زاری جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کی طبیعت میں سستی و کاہلی کی وجہ سے قنوطیت بڑھتی جارہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ قدرے مشکل سے سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔
"بیٹھیں۔"
"نہیں میں بیٹھنے نہیں آئی' آؤ کھانا کھالو۔" اس نے کھڑے کھڑے کہا تھا۔
"میرا دل نہیں چاہ رہا۔"
"دل نہ بھی چاہے پھر بھی ذرا سا کھالینا چاہیے' ویسے بھی تمہیں خوراک کی ضرورت ہے۔" اس کا رسانیت بھرا لہجہ اسے پھر سے پشیمان کردیتا۔ اور بات زبان پر آتے' آتے رہ جاتی لیکن آج حوصلہ پاکر ہونٹ کاٹتے ہوئے چند پل اسے ملتجی نظروں دیکھتی رہی پھر رک رک کر بولی۔
"پریزے سوری۔"
"کوئی بات نہیں۔ چلو کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے بھی بات مزید کریدنا نہ چاہی۔
"مجھے۔ آپ کا سیل بھی چاہیے تھا۔" "خیریت

"تمہارا فون۔" سیما خاموش رہی۔

"کیا ہوا؟ چپ کیوں ہو گئی ہو' اگر خراب ہو گیا تھا تو حدید کو دیتیں وہ ٹھیک کروا دیتا یا نیا لا دیتا۔"

"خیر یہ لو" اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل اس کی جانب بڑھایا۔

"تم بات کر لو' اتنے میں کھانا لگواتی ہوں" اسے کھانا گرم کرنے اور لگوانے میں پندرہ سے بیس منٹ ہی لگے تھے اور کچھ پھیلاوا سمیٹ کر اس کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے باہر سے ہی آواز لگائی۔

"سیما اگر بات کر لی ہے تو آ جاؤ۔" مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دو منٹ رک کر اندر جھانکا۔ وہ دم سے سادھے کسی بت کی مانند بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا۔" وہ اندر آ گئی مگر اس کے پکارنے پر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غصے' نفرت' دکھ کے ملے جلے رنگ تھے۔ پریزے کو فکر ہوئی تو اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا بات ہے سیما' بولتی کیوں نہیں' کیا ہوا آخر' چچا' چچی ٹھیک ہیں؟" اس کے بہت سے سوالوں پر وہ چلا کر بولی۔

"کچھ نہیں ہوا' سب ٹھیک ہے۔ اب جاؤ تم یہاں سے' پلیز۔" وہ اپنی کن پٹیوں کو انگلیوں سے جکڑے زور زور سے ہلنے لگی۔

"تم ٹھیک نہیں ہو۔ پلیز کچھ تو بتاؤ۔" وہ اس کے قریب ہی بیٹھ کر پوچھ رہی تھی۔ سیما کچھ دیر گہرے سانس لیتی خود کو نارمل کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی پھر یک لخت پریزے سے لپٹ گئی اور زور و شور سے رونے لگی تھی۔ بہت سے آنسو بہا لینے کے بعد اس نے ہچکیوں اور سسکیوں میں سب بتا دیا۔ اپنے اور ارحم کی داستان محبت' پھر کس طرح حدید پر آشکار ہوئی اور کیا ان دونوں کے بیچ طے پایا تھا اور اب ارحم کی بے وفائی۔

"کہتا ہے [illegible] سے کہہ دیا کہ میں نے بھی تو شادی کر لی تھی [illegible] جانتا ہے پریزے یہ شادی میری مرضی سے نہیں ہوئی' ڈیڈی نے زبردستی کی تھی میرے ساتھ۔ پریزے وہ میرے ساتھ فلرٹ کر رہا تھا؟ اس کی وہ باتیں۔ اف۔ اور اب کہہ رہا ہے میں اسے ڈسٹرب نہ کروں' وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہنی مون پر ہے۔ اب اسے مجھ میں عیب نظر آ رہے ہیں کہ میں' پریزے میں شادی شدہ اور بچے کی ماں۔ او مائی گاڈ۔ اس نے میری کال کاٹ دی' میری ساری زندگی ڈسٹرب کر کے خود ہنی مون منا رہا ہے' اب اسے مجھ میں عیب نظر آ رہے ہیں' میں نے کتنا بڑا رسک لیا تھا اس کے لیے اور اب! اور اب میں کسی موڑ پر کھڑی ہوں' حدید مجھے چند ہفتوں بعد چھوڑ دے گا۔ اور وہ کہتا ہے میں اسے ڈسٹرب نہ کروں' میرے باپ نے مجھ پر دروازے بند کر دیے ہیں اور وہ۔ آہ۔ ابھی چند ہفتے پہلے تو مجھے معصوم کو قتل کرنے کے مشورے دے رہا تھا اور اب کہہ رہا ہے... پریزے مجھے اب اور نہیں جینا' اس نے مجھے کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں چھوڑا' میں مر جاؤں گی' میں زہر کھا لوں گی' مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔" وہ ہذیانی کیفیت میں روتے ہوئے چلا رہی تھی۔ اس کے بیش بہا آنسو اس کے اپنے منہ میں جا رہے تھے اور پریزے اسے اپنی بازوؤں میں دبوچے کسی روبوٹ کی طرح بے حس ہوئی ساری کہانی سن رہی تھی۔ اس کے سامنے حدید کی کیفیت' اس کا دکھ تھا۔ اور پھر سیما کی حالت۔ اس نے بہت ہمت مجتمع کر کے اس کی کمر کو سہلایا اور ناصحانہ انداز میں کہنے لگی۔

"خود کو سنبھالو سیما' اس طرح کر کے تو تم اپنا مزید نقصان کر رہی ہو۔"

"مجھے اپنا فائدہ نہیں چاہیے' مجھے مر جانے دو۔" مسلسل رونے اور چلانے سے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

"ایسی باتیں مت کرو' جو شخص تم سے فون پر بات کرنے سے ڈسٹرب ہو رہا ہے' تم اس کے لیے دنیا چھوڑ رہی ہو' اپنے بچوں کو ختم کر دو گی' دیکھو اگر وہ اچھا انسان ہوتا' اگر ذرا سی بھی انسانیت ہوتی تو کبھی بھی تمہیں قتل کے مشورے نہ دیتا اور ممکن ہے چچا' چچی

نے اس کے بارے میں معلوم کروایا ہو' تب ہی انہوں نے تمہاری بات نہیں مانی' ماں باپ دیکھتے بھالتے اپنی اولاد کو جہنم میں نہیں جھونکتے' تم شکر کرو اس کی اصلیت وقت سے پہلے پتا چل گئی۔ اگر کچھ اور ٹائم گزر جاتا اور تم اپنے ارادے کے مطابق...." آگے اس کے الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ کچھ لمحوں بعد بولی تھی۔

"سوچو تو ذرا پھر تم کیا کرتیں۔"

"اور اب بھی کیا بچا ہے میرے پاس شرمساری' خجالت' ندامت...." اس کی آواز بالکل بیٹھ گئی۔

"یہ تو تم سوچ رہی ہو نا۔" اس نے پیار سے اس کا منہ اپنی جانب کیا اور چہرہ آنسوؤں سے صاف کیا تھا۔

"میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے' آج جو بھی ہوا' جو بھی ارحم نے کہا' تم حدید کو مت بتانا' سمجھی' کبھی بھی مت بتانا۔" وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی تھی آج اسے حقیقی معنوں میں اس میں سوتن نہیں مہربان بہن نظر آئی تھی۔

"سیما اگر اسے پتا چل گیا تو تم ساری زندگی سر اٹھا کر نہیں چل سکوگی' ٹھکرائی ہوئی عورت بن جاؤگی اور پھر تمہاری اولاد کے لیے بھی طعنہ بن جائے گا' وہ کیسے خاندان میں سروائیو کریں گے' بلکہ کسی کو کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے' بس تم سے اک خطا ہوئی تھی سو ممتا اس پر غالب آگئی اور خطا کا کیا ہے وہ تو سب سے ہو جاتی ہے.... تم اپنے اندر پنپنے والی ممتا کو محسوس کرو' فیصلہ آسان ہو جائے گا۔" اسے باہر کسی آہٹ کا گمان ہوا تھا تو چپ ہوتے ہوتے ہوئے نظر کھلے دروازے پر گئی۔ وہ خالی تھا کچھ دیر آہٹ پر کان دھرے پھر اسے حوصلہ دے کر باہر لائی میں نکل آئی۔

اس کے پہلے کمرے کی لائٹس آن تھیں۔ اس کا کمرہ صفی نے نہیں لیا تھا بلکہ خالی پڑا دوسرا کمرا صفی کے استعمال میں تھا۔ پھر اس کے کمرے میں کون تھا؟ وہ سوچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور حدید باہر نکلا تھا۔ غالباً" وہ اب بھی سکون کے لیے اپنے پہلے کمرے میں تنہا بیٹھا رہتا تھا اور اب اسے سامنے دیکھ کر صرف ایک نگاہ اٹھائی تھی۔

"اور کتنا بلند کروگی' میرے سامنے خود کو یا مجھے کچلتے ہوئے وقار کی پہلی صف میں کھڑا ہونا چاہتی ہو۔" وہ پل پھر سوچ کر رہ گیا اور نگاہ گرالی۔

"چائے۔" اس نے بہت آہستگی سے پوچھا تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا لاؤنج کی طرف نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

آج رات سے اس کی طبیعت ڈھیلی تھی۔ اس کی پل پل بدلتی کیفیت پر بر جیس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور الصبح اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ خوشی' تشکر کے جگنو حدید کو اپنے اردگرد اترتے دکھائی دے رہے تھے۔ جب ڈاکٹر نے ننھی پری کی آمد کا بتایا خوب مبارک سلامت' نیک نصیب کا شور مچا سب ہی اکٹھے تھے اور ایک دوسرے سے مل رہے تھے بر جیس کی آنکھوں میں تو باقاعدہ خوشی سے آنسو تیرنے لگے جب پریزے نے کمبل میں لپٹی بے فکر نیند کے مزے لوٹتی گڑیا ان کی گود میں دی۔ انہوں نے پریزے کا ماتھا چومتے ہوئے گڑیا پکڑلی تھی۔ پریزے کے دل میں جو بھی ملال تھا' مگر اس نے خوش دلی سے سب کو مبارک باد دی تھی۔ حدید سب کی مبارک وصول کرتا رہا۔ وہ سیما کے پاس بھی کچھ دیر کھڑا رہا۔ جذبات سے عاری انداز میں اس کی طبیعت پوچھی' شکریہ کیا اور پھر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ غالباً" اسے دیکھتے ہی پرانی ساری باتیں دماغ میں گونجنے لگتیں۔ رش کچھ کم ہوا تو پریزے نے حدید کے پاس جا کر دھیمے سے کہا۔ "مبارک ہو" اس نے جواب میں بھنوئیں اچکائیں اور اسی گہرے انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں بھی' بہت بہت مبارک ہو۔"

شام اچھی خاصی اتر آئی تھی خوشی میں وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ سیما اور بچی دونوں بالکل ٹھیک تھیں۔ رات تک ڈاکٹر نے انہیں ڈسچارج کر دیا۔ بچی تو بالشت بھر کی تھی' مگر سارے گھر میں ایسے رونق اتر آئی تھی جیسے ڈھیر مہمان اکٹھے ہو گئے ہوں۔ کتنی ہی دیر سب لوگ سیما کے کمرے میں جمع رہے پھر ایک ایک کر کے جانے لگے تھے۔ پریزے بھی اوپر اپنے کمرے میں چلی

گئی تھی۔ اس وقت کمرے میں صرف حدید اور سیما تھے۔ دو خاموش ان چاہے بت۔ ان کی خاموشی کو چیخ مار کر جاگتی پری نے توڑا تھا۔ حدید نے اسے اٹھایا اور ٹہل ٹہل کر بہلانے لگا۔

"اسے فیڈ کرواؤ۔" اس نے بچی سیما کو پکڑائی۔ گرم ہاتھوں کی پشت اس کی نازک ہتھیلیوں سے ملی تھی تو سیما کے آنسو چھلک پڑے۔ غالباً" ممتا کا الوہی احساس پہلے ہی ہلچل مچا رہا تھا۔ اوپر سے حدید سمیت سب لوگوں کے رویے اس کی تمام لغزشیں آنکھوں کے رستے باہر آگئیں۔ وہ کچھ نہیں بولا صرف گہری نگاہ سے اسے دیکھتا رہا۔

"حدید مجھے معاف کردو۔" بہت مشکل سے جملہ ادا ہوا "بے شک میں نے بہت غلط کیا' مگر مجھے خود سے' اس گھر سے الگ مت کرنا' میں اس گھر کے کسی کونے میں بھی زندگی گزار لوں گی۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔

"معافی مجھ سے نہیں اللہ سے مانگو' اس معصوم روح سے مانگو جس کی تم نے سانسیں چھین لیں۔۔۔ آہ! اور یہ کیا کہا' کسی کونے میں' کونے میں کیوں یہ گھر تمہارا ابھی ہے' تم کل بھی یہاں کی عزت تھیں۔ آئندہ بھی رہو گی۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

"میں امی کو بھجواتا ہوں۔" غالباً" بچی کے رونے میں تیزی آگئی تھی اور وہ اسے سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ وہ کہہ کر مڑا ہی تھا جب سیما نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔"

"ہوں۔" اس نے گردن موڑ کر استفہامیہ ابرو چڑھائیں۔

"حدید یہ مجھ سے نہیں سنبھلے گی۔" وہ روتی بچی کو دیکھ رہی تھی' اس کی بھی بھنوئیں ناسمجھی میں سمٹ گئیں۔

"ویسے بھی یہ بچی ہے اور میں اس کی پرورش کرنا نہیں چاہتی۔"

"کک۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ حیرت سے قدرے قریب ہوا تھا۔

"میں اسے پریزے آپی کی طرح دیکھنا چاہتی ہوں' مضبوط' باحوصلہ' باکردار۔۔۔ آپ اسے انہیں دے دیں' ورنہ میں تو اسے اپنے جیسی جذباتی اور نافرمان ہی بنادوں گی۔" اس نے لمبی سانس کھینچی اور پائنتی پر بیٹھ گیا۔

"سوچ لو تم' یہ بہت بڑی بات کہہ رہی ہو' میں اب پریزے کو مزید دکھ نہیں دے سکتا اور رہ لو گی اس کے بغیر۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ فوراً" بولی۔ "ہم ایک ہی گھر میں تو رہتے ہیں۔"

✲ ✲ ✲

برفانی ہواؤں کی بے رحمی کا شکار ہوئی ننگی شاخوں کو نرم پروائی نے چھوا تو نئی کونپلیں پھوٹ کر کھلنے لگی تھیں۔ جھڑے زرد پتوں کی جگہ نئے نئے کچے پتے نکل آئے تھے۔ بہار رت بھی عجیب ہوتی ہے سردیوں کے پھیلائے سناٹے کو سمٹ کر ہر چیز میں نئی روح بھر دیتی ہے' رونق بے دار کردیتی ہے۔ درخت بھی اسی رت کے مزے لوٹتے شرمائی دلہنوں کی طرح بہت ہی خوب صورت لگ رہے تھے۔ وہ کتنی دیر ٹیرس پر بیٹھی رہی تھی۔ سوچوں کا اک ہجوم تھا جو ایک کے بعد ایک ڈیرا لگالیتا۔

"اے اللہ! جب میں نے تیری مخلوق میں جدائی نہیں ڈالی تو میرے حصے جدائی تنہائی کیوں آئی۔" وہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھی۔

"سب اپنی اپنی زندگی میں مطمئن اور خوش ہیں' حدید کو سیما کے سبب اتنی بڑی خوشی مل گئی' وقت اس کی لغزش پر پردہ ڈال دے گا اور زندگی اپنی ڈگر پر آجائے گی' امی خوش ہیں' ابا خوش ہیں پھر۔۔۔ پھر میں کیوں اداس ہوں' کیا کھو گیا میرا' آہ میرا تھا ہی کیا جو کھو گیا' میری حیثیت تو حدید کی زندگی میں ردی کے کاغذ یا پرانے فرنیچر جیسی رہ گئی یہاں' وہاں کہیں بھی پڑا رہے۔" سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بھاری

ہو گئیں۔ "تم تو مجھے منانے آئے تھے' پھر انا نے میرے قدم کیوں روکے؟ کاش کاش!" آنسو لڑھک کر گالوں پر پھسلنے لگے۔ "حدید صرف ایک بار' صرف ایک بار یہ زینہ پار کروادو' مجھے نیچے آنے کا کہہ دو۔" وہ جائے نماز لپیٹتے ہوئے اٹھی تھی۔ اس ٹھنڈی بھینی بھینی رات میں اس کا بدن جل رہا تھا اسے اپنا آپ سلگتا محسوس ہو رہا تھا۔ دروازہ یک لخت ہی بغیر دستک کے کھل گیا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح پراعتماد انداز میں چلتا کمرے کے بیچ و بیچ آ کر اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس کی گود میں ننھی پری سوئی ہوئی تھی اور ہاتھ میں گلابی پھولوں کا بڑا سا بوکے' وہ چند پل ایک دوجے کو دیکھتے رہے تھے۔

"پریزے! پھول اور بچے بہت پاک معصوم فرشتوں کی طرح ہوتے ہیں اور میں ان دونوں کو سفارشی بنا کر اپنی تمام تر کوتاہیوں کی معافی مانگنے آیا ہوں' پلیز... مجھے معاف کر دو۔" وہ لجہ بھر رکا۔

"میں نے تمہاری اجازت کے بجائے دوسری شادی پر صرف مطلع کیا تھا' میں پشیمان تھا' پشیمان ہوں' لیکن پلیز خاموشی کی اور سزا مت دو۔" وہ دونوں اتنے قریب تھے کہ ایک دوسرے کے بدن سے نکلتی حرارت اپنے اندر محسوس کر رہے تھے۔ حدید نے بوکے اسے تھما کر بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلایا وہ بازو کے سہارے مزید قریب ہو گئی اور کندھے کے جا لگی۔

"پریزے میں بہت تھک گیا ہوں' پلیز مجھے تمہاری ہیلپ چاہیے' تمہارا ساتھ چاہیے۔" اس نے اپنی سسکاری روکتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔ بیش بہا آنسو گال سے لڑھک کر حدید کی آستین میں جذب ہو گئے۔

"تم رو رہی ہو۔" اس نے اپنا چہرہ خاصی حد تک اس پر جھکا لیا۔ "میری پریزے تو بہت باہمت ہے' پھر آج آنکھیں دسترس سے باہر کیسے ہو گئیں؟"

"حدید ہمت تو سب کو دکھانے کے لیے چہرے پر سجائی جاتی ہے۔" اس نے ناک کا سیال چڑھانے کی کوشش کی۔ "لیکن آنسو' آنسو تو صرف اس ایک کے لیے بہتے ہیں جس کے بغیر سانس بھی دشوار ہو۔" اس نے اپنا چہرہ اس کے کندھے میں چھپا لیا۔

"آئی ایم سوری حدید' بس میں غصے میں اوپر آ گئی تھی۔" ابھی تو جانے کتنے مچلتے ڈائیلاگ اور اظہار محبت ہونا تھا کہ گڑیا بے چین ہو گئی اور پھر بے قرار صفی جانے کہاں سے جست لگا کر انٹر ہوا۔

"او بھائی پلیز! اگر راضی نامہ ہو گیا ہے تو میرا بھی مسئلہ حل کر دو۔" اس کی بے ہودہ جسارت پر وہ یک لخت بوکھلا کر پیچھے ہٹے بلکہ دبے دبے غصے اور شرمندگی سے گھورنے لگے۔

"پلیز بھابھی۔" وہ ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔

"یہ اوپر کا پورشن خالی کر کے' میرے ہاتھ پیلے کر دیں' غالباً" پڑوس سے زری اور حسام کی حسب سابق جھڑپوں کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں' یہ نہ ہو کہ سارا زلزلہ ہم پر گرے اور بیچ بچ جوتوں کا سہرا لٹکا کر جانا پڑے' کیوں کہ میں تو پھر..." لفظ روک کر اس نے جس انداز میں قہقہہ لگایا اس میں ننھی کی "روں روں" کے ساتھ حدید اور پریزے کی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی۔

رابعہ افتخار

میز پر چائے کے ساتھ بسکٹ، کباب اور نمکو کی پلیٹیں بھی سجی تھیں، نبیلہ نے تنقیدی نظروں سے میز کا جائزہ لیا۔۔۔ یوں تو ہر شے سلیقے سے رکھی تھی مگر پھر بھی اسے سسرال والوں کے سامنے کچھ زیادہ ہی خوف محسوس ہو رہا تھا، آج وہ اپنے ہی میکے اپنے سسرال والوں کے ساتھ رشتہ لے کر آئی تھی، اپنے دیور جی کا رشتہ، اپنی بہن کے لیے۔ وہ چاہتی تھی کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے اور پہلی ہی بیٹھک میں رشتہ طے ہو جائے مگر معاملہ کچھ اتنا سیدھا بھی نہیں تھا، دونوں طرف سے کچھ مسائل تھے۔ اس کے دیور اظفر کی پہلی دو بیویاں اسے چھوڑ چکی تھیں، اظفر کی پہلی شادی اس کی خالہ زاد کے ساتھ ہوئی تھی۔ شادی کے دو مہینے بعد ہی وہ اظفر کو کنجوس، غصے والا اور گنوار کہہ کر بھاگ گئی اظفر نے بھی ایک ہی مطالبے پر طلاق دے دی۔

"جو عورت خود گھر بسانا نہیں چاہتی، طلاق مانگ رہی ہے میں اسے زبردستی کیسے روک لوں اپنی زندگی میں؟"

پھر دوسری شادی رشتہ کروانے والی ماسی نے کروائی، مگر وہاں بھی بات نہ بنی، اظفر کی دوسری بیوی بھی اظفر کو ماں کا غلام اور کنجوس جیسے القابات سے نواز کر چلی گئی۔۔۔ اس نے شادی سے ہی توبہ کر لی، سب نے چپ سادھ لی مگر اب اچانک ماں کی بیماری نے سب کو ہلا دیا، وہ صحت یاب ہو کر گھر آئیں تو ایک بار پھر ضد پکڑ لی، اظفر کی شادی کی۔۔۔ ماں کے آنسو دیکھ کر اسے ایک بار پھر چپ کرنا پڑا۔

"مگر اب لڑکی دے گا کون؟ کون بیاہے گا اپنی بیٹی مجھ جیسے آدمی کے ساتھ جس کی دو بیویاں چھوڑ گئیں اسے۔"

"اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں۔" نبیلہ نے ماں بیٹے کی بات سن کر موقع مناسب سمجھا۔

"بولو بہو۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"وہ میری بہن امینہ۔۔۔ آپ جانتی ہیں ناں کہ اس کی بچپن کی منگنی تایا زاد نے ختم کر دی۔۔۔ امینہ پر عجیب عجیب الزام لگائے تو اگر آپ لوگوں کو ناگوار نہ گزرے تو میں بات کروں؟" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا کیونکہ جب نبیلہ کے تایا زاد اشعر نے منگنی ختم کی تھی تو امینہ کے کردار کے حوالے سے بہت غلط باتیں کی تھیں، وہ تو بات بعد میں کھلی کہ وہ خود لالچ میں آ کر اپنی کسی کولیگ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور امینہ کا پتا صاف کرنے کے لیے اسے یہی ترکیب سوجھی تھی۔

"ارے، بہو نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔ تم آج ہی اپنی امی سے بات کر لو، وہ جیسے ہی اجازت دیں کوئی مناسب دن دیکھ کر ہم باقاعدہ رشتہ لے جاتے ہیں۔۔۔ ہمارے اظفر کے دکھ بھی ان کے سامنے ہیں۔۔۔" وہ منت کرنے لگیں، نبیلہ نے اثبات میں سر ہلا دیا، وہ ہر صورت اشعر سے پہلے امینہ کی شادی کروانا چاہتی تھی اور سچ تو یہ بھی تھا کہ اظفر میں سوائے ان دو خامیوں کے کہ وہ

اپنی ماں کا نہایت فرماں بردار بیٹا تھا اور ضرورت سے زیادہ کفایت شعار تھا' کوئی برائی نہیں تھی۔
آج اسی سلسلے میں وہ لوگ نبیلہ کے میکے آئے ہوئے تھے۔
"دیکھیں بہن آپ کی بڑی بیٹی بھی سات سال سے ہمارے گھر میں ہے' اونچ نیچ تو ہر جگہ ہوتی ہے' مگر آپ اس سے پوچھیں' اس کا میاں اطہر ہر طرح کی آسائش دینے کی کوشش کرتا ہے' ہر ضرورت پوری کرتا ہے' بچوں کو اچھے اسکول میں داخل کروایا ہے.... اپنی حیثیت کے مطابق اظفر بھی مایوس نہیں کرے گا.... اور مجھے یقین ہے کہ نبیلہ کی طرح امینہ بھی سمجھ داری سے اپنا گھر بسالے گی" اس کی ساس نے قائل کرنے کی پوری کوشش کی' نبیلہ نے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا' وہ گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔
"بہن ہمیں سوچنے کے لیے تھوڑی مہلت دے دیں۔"
"آپ کا حق ہے' اچھی طرح سوچ بچار کرکے' مشورہ کرکے جواب دیں۔" اس کی ساس نے نرمی سے جواب دیا' گھر واپس پہنچے تو انہوں نے اپنا خدشہ ظاہر کردیا۔
"مجھے لگتا ہے کہ تمہاری والدہ کو بھی اظفر کی دو شادیوں والی بات کھٹک رہی ہے...." وہ دوائی کھا کر آرام کرنے چلی گئیں۔ نبیلہ نے رات کے کھانے کی تیاری کی اور میکے کا نمبر ملادیا۔
"دیکھیں امی' اظفر کی اچھی خاصی تنخواہ ہے' خوش شکل ہے' کوئی بری عادت نہیں اور جہاں تک اس کی دو شادیوں کی ناکامی کی بات ہے تو امی اس میں بھی اظفر کا حصہ بیس فی صد ہی ہے.... اس کی قسمت میں دو جذباتی فضول خرچ اور کم عقل عورتیں آئیں' گھر بسانا میدان کارزار میں جنگ لڑنے سے زیادہ مشکل کام ہے امی' صبر' ہمت اور خاموشی ایسے ہتھیار ہیں جن کے بل بوتے پر عورت یہ جنگ جیت جاتی ہے.... بس شروع کا کچھ عرصہ خود کو مٹانا پڑتا ہے' اپنی ذات کی نفی کرنی پڑتی ہے.... امی پلیز.... انکار مت کیجیے گا اشعر کے پہلے

امینہ کی شادی ہوجائے تو خاندان والوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔"
"مگر نبیلہ بیٹا' اظفر کی دو شادیاں.... بیٹی اتنی بھاری نہیں ہے مجھ پر...."
"کوئی گناہ تو نہیں ہے امی.... آپ کی مرضی.... سوچ لیں اور سب سے بڑھ کر امینہ سے پوچھ لیں۔"
اس نے اپنے تئیں سمجھا کہ فون بند کردیا۔ نبیلہ کی ساس کی طبیعت اوپر نیچے رہنے لگی' وہ ہر پل اظفر کی فکر کرنے لگیں وہ ان سے نظریں چرائی گھر کے کاموں میں مصروف رہتی' اس کا دماغ سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا.... اظفر کی سوچ.... امینہ کی سوچ.... ماں کو لاحق وسوسے.... ابھی وہ انہی سوچوں میں تھی کہ وہاں سے فون آگیا.... انہیں یہ رشتہ منظور تھا' امی نے اس کی ساس سے بات کی اور جلد از جلد شادی کے لیے کہا۔

"تم بالکل صحیح تھیں نبیلہ..... میں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ ہاں کروں یا نہیں کہ تمہاری بوا آگئیں' انہوں نے بتایا کہ تمہاری تائی کو بڑا گھمنڈ ہے کہ ان کے لڑکے کی شادی تو فوراً" ہو جائے گی 'امینہ ساری زندگی ماں کی چوکھٹ پر بیٹھی رہے گی.... بس ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا میں نے 'ایک مہینے کے بعد شادی ہے اشعر کی' تم اپنی ساس سے کہہ کر جلدی کرواؤ.... میری بچی کے لیے بھی رشتوں کی کمی نہیں۔"

امی وہ بات سمجھ گئیں جو وہ سمجھانا چاہ رہی تھی' وہ امینہ کے دامن پر لگے داغ کو دھونا چاہتی تھی اور اسے اس وقت اظفر سے بہتر کوئی نہیں لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اظفر اور امینہ کی شادی کو دو ماہ ہو گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھے' امینہ نے گھر کے کاموں میں بھی نبیلہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا' دونوں بہوؤں کے سکھ سے ساس بھی اب پہلے سے بہت بہتر تھیں.... اظفر بھی پہلے سے کافی بدلا بدلا دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ اس کی کفایت شعاری' کنجوسی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا' شادی کے ان دو مہینوں میں وہ نہ تو امینہ کو کہیں باہر لے کر گیا تھا اور نہ ہی کوئی تحفہ وغیرہ لایا تھا' مگر دونوں ساتھ میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے' چائے پیتے اور چھت پر چہل قدمی کرنے چلے جاتے تو نبیلہ مطمئن ہو جاتی.... امی بھی بے حد مطمئن تھیں' اشعر شادی کے بعد سسرال شفٹ ہو گیا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے بیت رہا تھا' امینہ گھر کے کاموں اور دونوں بھانجوں کے ساتھ مصروف رہتی.... نبیلہ محسوس کر رہی تھی کہ شادی کے کپڑے گرمی کے موسم میں اسے پریشان کرتے۔

"امینہ تم اظفر سے کہہ کر گرمیوں کے کچھ کپڑے بنوا لو۔" شام کی چائے لے کر وہ صحن میں آ بیٹھی' جہاں دونوں بچے ہوم ورک کر رہے تھے' بچوں کی دادی اپنے کمرے میں چائے پی رہی تھیں اور ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ان کا گھر بہت مکمل اور پرسکون تھا۔

"کہا تھا آپا' مگر ان کو غصہ آگیا' کہنے لگے میرے پاس ان فضول خرچیوں کے لیے پیسے نہیں ہیں' میں نے کہا یہ فضول خرچی نہیں میری ضرورت ہے تو اور بھی غصہ آگیا' کہنے لگے کیوں ہم دہکتے سورج کے نیچے پتھر کوٹتی ہو جو گرمی لگتی ہے....! پھر میں خاموش ہو گئی۔"

"ایسا کہا اظفر نے...." نبیلہ سوچ میں پڑ گئی' اظفر کی یہی عادت پہلے بھی دو مرتبہ اس کا سکون برباد کر چکی تھی۔

"کوئی بات نہیں آپا۔ اب میں ان سے لڑائی تو نہیں کر سکتی ناں بس ایک سوال تھا ذہن میں کہ وہ اپنی تنخواہ کہاں خرچ کرتے ہیں' گھر میں تو سودا سلف کے لیے آدھی آدھی رقم دونوں بھائی دیتے ہیں' بل وغیرہ بھی دونوں مل کر بھرتے ہیں تو اظفر اپنی بچت کہاں کرتے ہیں....؟"

"چلو چھوڑو تم دل چھوٹا نہ کرو۔ دیکھو امینہ اظفر نے تم سے شادی کی' اشعر نے تم پر جو الزام لگایا وہ دھل گیا' تم اشعر سے پہلے اپنے گھر بار کی ہو گئی اب تمہارا کام ہے کہ تم اظفر کے کردار پر لگے داغ کو چھپا دو.... لوگ ایسے' جو بھی کہیں کنجوس' غصیلا.... مگر تم ہمیشہ اس کی تعریف ہی کرنا.... اس کی عزت بنانا.... اگر وہ تمہاری عزت کرتا ہے تو...."

"وہ بہت اچھے ہیں آپا.... سچ میں ان کی سب ہی عادتیں بہت اچھی ہیں.... بس یہی ایک...."

"اس کا بھی حل ہے تم... اظفر سے بوریت کا یا فارغ رہنے کا بہانہ بنا کر سلائی وغیرہ کی اجازت لے لو.... اپنا کام کرو گی تو اپنی ذات پر خرچ کرو گی.... کوئی مسئلہ نہیں ہو گا.... بس چند سال.... اس کا سچا ساتھی بن کر دکھاؤ' اسے بھی احساس ہو گا کہ تم دوسروں کی طرح گھبرا کر بھاگی نہیں بلکہ اپنا گھر بسانے کے لیے اس کے ساتھ رہیں.... اسے احساس ہو گا کہ تم اس پر بوجھ نہیں بنی.... اس کا پیسہ برباد کرنے کی بجائے اسے پیسہ جوڑ کر دکھاؤ.... تمہاری خاموشی اور سلیقہ ایک دن اس

کا دل جیت لے گا۔" نبیلہ نے رسان سے سمجھایا' امینہ سمجھ دار تھی اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

امینہ کی بات پر پہلے تو اظفر خوب بھڑکا۔

"تو اب تم لوگوں کو بتانا چاہتی ہو کہ تمہارا شوہر تمہاری ضروریات پوری نہیں کرتا' چند سو روپوں کی خاطر پیسہ کمانے کی خاطر' مجھے بدنام کرو گی۔"

"نہیں اظفر... ایسا نہیں ہے اگر میرا مقصد پیسے کمانا ہوتا تو میں شادی سے پہلے بھی کام کر سکتی تھی مگر سچ تو یہ ہے کہ وہاں فرصت ہی نہیں ملتی تھی' آپا کی شادی کے بعد گھر کے کاموں کی ساری ذمہ داری مجھ پر تھی... یہاں تو مجھے نبیلہ آپا کی بہت سپورٹ ہے۔ پھر آپ کی امی بھی اتنی اچھی اور ہمدرد ہیں' بستر پر بیٹھے بیٹھے اتنے کام کر دیتی ہیں' سبزی بنا دیتی ہیں' دال وغیرہ صاف کر دیتی ہیں... بھئی سچ بتاؤں تو اتنا فارغ وقت ہوتا ہے یہاں اس لیے سوچا کہ آپ اجازت دیں تو تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لوں... مجھے کون سا ضرورت ہے' میں تو بس وقت گزاری کے لیے کہہ رہی تھی... اگر آپ کو نہیں پسند تو رہنے دیں... اور ویسے بھی وہ کپڑوں والی بات بھی آپ نے بالکل ٹھیک کی تھی... سارا دن پنکھے کے نیچے رہتی ہوں لائٹ چلی جائے تو یو پی ایس آن ہو جاتا ہے۔ شادی کے اتنے کپڑے ہیں... ابھی تو ایک دو سال وہی چلیں گے آرام سے۔" اس نے بڑے طریقے سے مسکراتے ہوئے اظفر کو درست قرار دیتے ہوئے اور اپنی نفی کرتے ہوئے ایک شوہر کو یہ احساس دلایا کہ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ ٹھیک ہے' مگر مقابل کھڑے شخص کو احساس ہوا کہ ہر بار وہ ٹھیک نہیں ہوتا۔

"ٹھیک ہے کر لو جو کرنا چاہو' مگر ایک بات کان کھول کر سن لو تم اپنی کمائی سے اپنی پسند کی جو چیز چاہے خریدو مگر کسی کے سامنے میں تمہیں ضرورتوں کا رونا روتے نہ سنوں۔"

"آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی کمی ہو سکتی ہے بھلا' بتائیں؟" وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی' اس لمحے پہلی مرتبہ اظفر کو احساس ہوا کہ عورت بیوی بن کر بھی نرم خو اور صابر رہ سکتی ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے سر پر چپت لگاتا باہر نکل گیا۔

امینہ کا کام دنوں میں ہی چل نکلا' اس نے دن میں دو گھنٹے کام کے لیے مختص کر دیے' ہاتھ کی صفائی اور نفاست کی وجہ سے محلے بھر کے لوگ کپڑے دینے لگے' چند ہی دنوں میں اس کے اپنے پاس کئی ہزار روپے جمع ہو گئے' وہ نبیلہ کے ساتھ بازار جا کر اظفر کے لیے' اپنے لیے اور ساس کے لیے کپڑے لے کر آئی' نبیلہ کو یقین تھا کہ ایک دن اظفر امینہ کو اپنا سچا ساتھی مانتے ہوئے اس کے لیے اپنے دل کے ساتھ ساتھ جیب کے دروازے بھی کھول دے گا۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے؟" اظفر نے سفید رنگ کے نئے سلائی شدہ کرتے شلوار کو دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"آپ نے ہی کہا تھا ناں کہ اپنی کمائی سے اپنی پسند کی چیزیں لے لینا' اپنی پسند سے اپنے پیارے میاں جی کے لیے چھوٹا سا تحفہ لائی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تحفے نہیں دیتا؟" وہی غصہ۔

"آپ خود میرے لیے دنیا کا سب سے بڑا تحفہ ہیں اظفر... مجھے بھلا اور کسی تحفے کی کیا ضرورت... ہاں میں اس قابل نہیں کہ آپ مجھے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ کہہ سکیں... اسی لیے۔" اس کی بات پر وہ مسکرانے لگا۔

"تم امی کے لیے بھی سوٹ لائی تھیں؟"

"جی انہیں بہت پسند آیا' کل سلائی کر کے دوں گی انہیں۔"

"اگلی مرتبہ بھابھی اور بچوں کے لیے بھی کچھ لے

آتا۔" وہ نرمی سے کہتا وہی کرتا شلوار لیے واش روم میں گھس گیا۔

"سنو۔۔۔ تم نے اپنے لیے کیا لیا؟" وہ غسل خانے سے بال رگڑتا باہر نکلا تو امینہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ سیاہ اور سرخ پرنٹڈ لان کے سوٹ میں ملبوس وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔۔۔ بے چاری اتنی گرمی میں ریشمی کپڑے کیسے پہنتی تھی؟ پہلی بار اظفر کو احساس ہوا کہ وہ ان کپڑوں میں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔۔۔ اس کی کنجوسی کو لے کر پہلی دو بیویوں سے بہت تلخ یادیں تھیں' وہ امینہ کو بتانا چاہتا تھا مگر ان دونوں کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ ماضی کی کوئی بات نہیں کریں گے۔

"اتنی اچھی لڑکی پر الزام لگا! کیسے اس گدھے نے ۔۔۔ میری قسمت کہ یہ ہیرا مجھے مل گیا۔" وہ دل ہی دل میں نازاں ہوتا اس کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

"بہت حسین لگ رہی ہو" اس نے دل سے کہا' امینہ خوشی اور حیرت کے مارے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"آپ مجھے امی کی طرف چھوڑ آئیں' کئی دن ہوئے ان سے ملے۔"

"ہوں۔۔۔ چلو" اس نے موٹر سائیکل کی چابی اٹھالی۔ امی سے مل کر گھر آئی تو نبیلہ کو ساری بات کہہ سنائی' اس نے شاباش دی۔

"دیکھ لینا تم بہت جلد اظفر کا دل جیت لوگی اور ایک دن آئے گا کہ تم اس کی لاڈلی بیوی بن کر رہو گی جیسے میں تمہارے اطہر بھائی کی۔" نبیلہ نے صدق دل سے دعا دی۔

امینہ اس روز کچن کا کام کر کے فارغ ہوئی کہ فون کی بیل بجنے لگی' نبیلہ ساس امی کو لے کر ڈاکٹر کی طرف گئی تھی۔ اس نے فون سنا۔

"ہیلو۔"

"جی کون بول رہا ہے؟"

"میں مسز اظفر بات کر رہی ہوں آپ کون؟" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"میں بھی کبھی مسز اظفر تھی' کہاں پھنس گئیں تم؟ وہ شخص تو ترسا ترسا کر مار دے گا۔۔۔ ایک ایک روپے کو ترسو گی' چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے اندر ہی اندر کڑھتی رہو گی۔۔۔ چھوڑ دو اسے۔۔۔ ورنہ زندگی برباد کرلو گی۔"

"دیکھیں آپ جو کوئی بھی ہیں۔۔۔ میرے شوہر کے خلاف ایک لفظ بھی بولنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ وہ جیسے بھی ہیں میرے شوہر ہیں' میری خواہشیں وہ بن کہے پوری کردیتے ہیں مجھے ترسنا نہیں پڑتا" اس نے فون بند کردیا دوسری جانب اظفر کی کولیگ نے ریسیور رکھ کر اظفر کی سمت دیکھا' اس نے تشکر کے احساس سے بھیگی آنکھوں سے آسمان کی سمت دیکھا۔

"لکی ہو اظفر۔ بہت اچھی بیوی ملی ہے۔ تمہیں۔۔۔ قدر کرو اس کی۔" اظفر کی کولیگ نادیہ نے مسکراتے ہوئے کہا' اسی نے اظفر کے کہنے پر امینہ کو آزمانے کے لیے گھر کے نمبر پر کال کی تھی۔

"ہوں۔۔۔ دو مرتبہ قسمت نے ایسا کھیل کھیلا کہ اب یقین کرنا مشکل تھا۔۔۔ وہ واقعی بہت اچھی ہے۔"

✲ ✲ ✲

اظفر کو دو مہینے کی تنخواہ نہ ملی' وجہ کمپنی کا کوئی فنانس پرابلم تھا۔ وہ بے حد پریشان تھا' اس کی پریشانی دیکھ کر امینہ نے پوچھ ہی لیا۔

"اظفر۔۔۔ آپ کے پاس کوئی بچت وغیرہ۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ وہ جس مقصد کے لیے رکھی ہے' وہ زیادہ ضروری ہے۔۔۔ سب لوگ مجھے کنجوس کہتے ہیں۔۔۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔۔۔ دراصل امینہ۔۔۔ میں امی کو اپنے پیسوں سے حج پر بھیجنا چاہتا تھا' امی بیمار رہنے لگیں تو ان کا اکیلے جانا مشکل ہوگیا سوچا کہ اپنے لیے بھی رقم جوڑوں گا اور اگلے سال اپنی ماں کو خود حج کرواؤں گا' اسی سلسلے میں اتنی کنجوسی کر رہا تھا' اتنے سالوں کی بچت کے بعد اب میں نے اپنا اور امی کا حج کا سارا روپیہ جمع کرلیا ہے تو یہ۔۔۔ مسئلہ؟" اور عقدہ کھل گیا' امینہ مسکرانے لگی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اظفر... اب ہم دنیا کے آٹے دال کی خاطر حج کی رقم خرچ تو نہیں کر سکتے ناں ... آپ اپنی امی کی امانت میں خیانت نہیں کریں گے ... اگلے سال ان شاء اللہ آپ دونوں حج پر ضرور جائیں گے' کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی رہا سوال گھر کے خرچ کا تو ایک منٹ..." وہ بات ادھوری چھوڑ کر اپنی الماری کی طرف بڑھ گئی' اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"یہ پندرہ ہزار روپے ہیں' تقریباً" اتنی ہی رقم ابھی آنی ہے دراصل میں نے محلے میں سے بری کا کام لیا تھا' انہیں میرا کام پسند تھا' بہت اصرار کر رہی تھیں تو لینا پڑا... ایک دو دن میں بقایا رقم بھی آجائے گی۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا مبادا اسے غصہ آجائے۔ اظفر نے اسے تشکر بھری نظروں سے دیکھا۔

"کوئی اور ہوتی تو ماں کے لیے اتنا پیار دیکھ کر طعنے دیتی' غصہ کرتی' اپنا حق جتاتی مگر تم نے تو اپنی جمع پونجی بھی مجھے لاسونپی۔"

"تو آپ کس کے ہیں؟ میرے... تو پھر میرا سب کچھ آپ کا ہے اور آپ کا میرا... آپ کی خوشی میری اور آپ کی پریشانی بھی' مجھے آپ کی خوشی بھی عزیز ہے اور پریشانی بھی نہیں دیکھی جاتی۔"

"تم واقعی میرا سچا ساتھی ہو امینہ... میں بہت خوش قسمت ہوں' ایک بار اس پریشانی سے نکل آؤں پھر تم دیکھنا تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا... تم ہر آزمائش میں پوری اتری ہو... تم بہت اچھی ہو بیوی اور میں بہت برا... کم از کم تمہیں گرمیوں کے کپڑے تو دلوانے چاہیے تھے مجھے" اس نے کان پکڑے تو امینہ ہنس دی۔

"آپ نے لیے میں نے لیے ایک ہی بات ہے' ہم الگ تھوڑی ہیں زندگی بھر کے ساتھی ہیں' سچے ساتھی۔" امینہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

ٹھیک ایک سال کے بعد وہ اپنی ماں کو فریضہ حج کے بعد واپس گھر لے کر آیا تو دوہری خوشی ملی... ابھی حج کی خوشی کا سرور تھا' ایئرپورٹ پر اکیلے اطہر کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔

"تمہیں پریشان کرنے کی وجہ سے نہیں بتایا یار... ہم تجھے فون پر غلط ڈیٹ بتا رہے تھے تاکہ تو آرام سے فرض سے فارغ ہو جائے... کل امینہ کا آپریشن تھا' خدا نے تجھے چاند سا بیٹا دیا ہے... بالکل تیرے جیسا" اطہر نے اسے گلے لگالیا' امی کی ضد پر وہ لوگ سیدھے ہاسپٹل گئے۔

بچے کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے وہ امینہ کی طرف جھکا۔

"تحفے دینے کا ٹھیکہ تم نے ہی اٹھالیا ہے کیا' میں بھی پیار کرتا ہوں میری بھی کچھ ذمہ داری ہے' مانگو کیا چاہیے... سونے کا سیٹ یا ڈھیر ساری شاپنگ؟" وہ مہربان ہو رہا تھا۔

"دونوں..." اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا وہ قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

"پکا وعدہ... سب ملے گا... اب تمہاری باری ہے۔" وہ بہت خوش تھا۔ عقب میں کھڑی نبیلہ نے شکر ادا کیا' اس کی حکمت عملی سے دونوں کا گھر بھی بس گیا تھا اور امینہ کی سمجھ داری سے وہ ساری خوشیاں اسے مل رہی تھیں جسے پہلی دو بے وقوف عورتیں اپنی جلد بازی اور تلخ گوئی کی وجہ سے کھو چکی تھیں۔

اشعر کی بیوی اسے اولاد نہ دے سکی' اور اظفر کی پہلی دونوں بیویاں میکے والوں پر بوجھ بنیں نوکری کر رہی تھیں' کوئی ڈھنگ کا رشتہ طلاق یافتہ عورتوں کے لیے مل ہی نہ رہا تھا۔ پھر نبیلہ نے اور سارے زمانے نے یہ بھی دیکھا کہ جب ننھا اسد سوا مہینے کا ہوا تو اظفر نے امینہ کو سونے کا سیٹ اور ڈھیروں تحائف دیے... اسد کا عقیقہ ہوا... اظفر کے ماتھے پر لگا کنجوس کا لیبل اتر گیا۔ عقلمندی' صبر' ہمت اور خاموشی نے امینہ کے لیے اظفر کے دل اور جیب دونوں کے دروازے کھول دیے' وہ ایک دوسرے کا سچا ساتھ تھے زندگی بھر کے لیے...

☼ ☼

نایاب جیلانی

بیک گراؤنڈ میں میوزک تیز آواز میں بج رہا تھا۔ بجتے میوزک کے ساتھ اس کی تھرکتی انگلیاں آئی پیڈ پر مسلسل حرکت میں تھیں۔ کانوں میں ہیڈ فون لگا تھا اور وہ اپنی بیسٹ فرینڈ ماہم سے باتوں میں مصروف تھی۔ جو پچھلے بہت سارے دنوں سے غائب تھی اور ابراڈ منگنیاں اٹینڈ کرتی پھر رہی تھی۔ فیشن شوز انجوائے کرتی فی الحال واپس نہ آنے کا پتا کرا سے شدید بوریت اور جھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ ماہم سے لمبی بات کے دوران بار بار اس کا سیل بلنک کر رہا تھا۔

وہ اچٹتی سی نگاہ موبائل اسکرین پہ ڈالتی اور پھر مزے سے ماہم کو کوئی اور قصہ سنانے لگتی۔

قریب آٹھویں بیل پہ اس نے شدید جھلا کر ماہم سے رابطہ منقطع کیا تھا اور پھر اپنا بجتا سیل اٹھالیا۔ اسکرین پہ "فریحہ کالنگ" لکھا آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پہ سوچ کی لکیر ابھری۔

فریحہ اس کی کلاس فیلو تھی۔ گو کہ فریحہ اور اس کے مزاج میں زمین آسمان جتنا فرق تھا۔ اور یہی فرق اسٹیٹس میں بھی تھا۔ پھر بھی ان کی دوستی ابھی تک چل رہی تھی۔

یونی ورسٹی میں بھی فریحہ ہمیشہ اس پر انحصار کرتی تھی۔ اپنی ہر پرابلم اس کے پاس اٹھا کرلے آتی۔ اور وہ چٹکی بجاتے اس کی پرابلمز سولو کر دیا کرتی تھی۔

یونی ورسٹی کے بعد بھی فریحہ کو جب جب اس کی ضرورت پڑتی۔ وہ اسے ضرور کال کرتی۔ اور اس میں لاکھ نخرہ سہی' پراوڈی' موڈی سہی لیکن ایک بات طے تھی کہ اس میں "مروت" کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ انکار تو کر ہی نہیں سکتی تھی کچھ بھی ہو جاتا۔ موڈ ہوتا نہ ہوتا۔ ٹائم ہوتا نہ ہوتا۔ وہ مروت ضرور نبھادیتی تھی۔ اور اب بھی فریحہ کو اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ جس کی تفصیل بتا رہی تھی۔

"ہما' سمیرا' سعدیہ کو کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ اور میں نے بھی جاب کی ٹریٹ دینی تھی۔ وہ کہتی ہیں ٹریٹ نہ دو۔ ایک ایک سوٹ لے دو۔ ذرا بازار تک جانا تھا۔ تم تو جانتی ہو گھر سے خاص پرمیشن نہیں ملتی۔ اور مل بھی جائے تو کنوینس پرابلم اپنی جگہ موجود ہے۔ گاڑیاں دو تو ہیں لیکن وہ باقی لوگوں کے تصرف میں ہیں۔ تم اگر پک کرلو تو۔۔۔ میں کالج میں ہوں۔" فریحہ نے اس قدر لجاجت سے کہا تھا کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اقرار کرنا پڑا تھا۔ گو کہ فریحہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ کہاں چھوٹے چھوٹے بازاروں میں دھکے کھاتا۔ خوار ہوتا۔ اور گرمی بھی ایسی قیامت کے حد نہیں۔

لیکن وہی اس کی ازلی مروت۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی شاندار سوک میں فریحہ وغیرہ کو پک کر رہی تھی۔ اور جب جگہ جگہ دھکے کھا کے وہ لوگ رحمان پلازہ پہنچیں تب اسے شدت سے خیال گزرا تھا کہ زندگی میں پہلے کیوں نہیں وہ اس جگہ پہ آسکی۔ اس دن کے بعد کئی لوگوں نے اسے رحمان پلازہ کے آس پاس دیکھا تھا۔ اور وہ چشم دید گواہ بھی تھے۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک خوب صورت سہ پہر کا منظر تھا۔

سفید بادلوں کے ننھے گولے گول گول چکر لگا رہے تھے۔ درختوں کی اونچی شاخوں سے کچھ اوپر ابابیلوں کا پورا غول پھدکتا اور اڑاڑ کر کرتب دکھا رہا تھا۔

ایک قطار میں رکھے سرخ گملوں میں گیندے کے پیلے پھول اتنے حسین لگ رہے تھے کہ دل چاہتا سارے توڑ کر جھولی میں بھر لے۔

لیکن فریحہ کی امی سے خائف وہ پھولوں کو نگاہ بھر کے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

یہ ایک نگاہوں کو تراوٹ دیتا انتہائی دلنشین منظر تھا۔ اور اس گھر میں پورے استحقاق سے چلنا پھرنا ایک خوب صورت اور خواب آگیں سپنے کا آدھا حصہ۔

یوں لگتا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی سہانے سپنوں کی مالا ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ پلکوں کو پورا کھولتی ہی نہیں تھی۔

کیا یہ خواب تھا؟ خیال تھا؟ یا گمان تھا؟

اسے یقین نہیں آتا تھا۔ اور اسے یقین آتا ہی
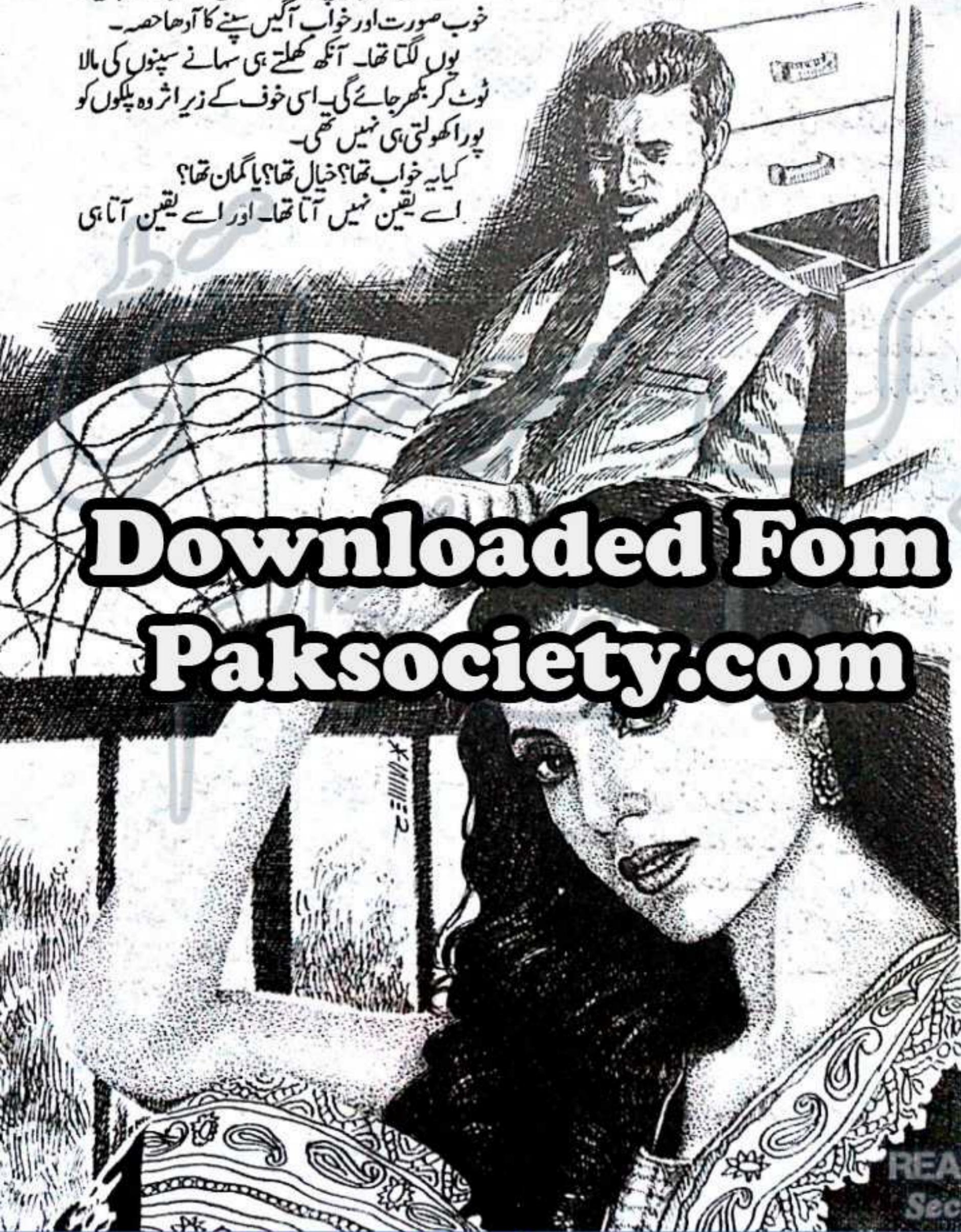
نہیں تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے تک وہ ایک خواب کے سفر میں رہی تھی۔ ایک لمبا حسین اور پر لطف خواب کا سفر۔

ایک تازہ پھولوں سے بھرا بھرا سجا سجا راستہ اور من پسند ہم سفر۔ جی چاہتا آنکھیں بند کر کے چلتی رہے۔ چلتی رہے۔ کہیں رکے نہیں۔

لیکن ہوا کیا؟ خواب کا وہ لمبا سفر اک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

گیندے کے پھولوں کی مالا ایسی بکھری کے ریزہ ریزہ ہوتی چلی گئی۔

بہت اچھا' بہت حسین سفر کا گمان کرنے والی کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ پیروں تلے پھولوں کی پتیاں نہیں نوکیلے کانچ کے ٹکڑوں کی روا بچھی ہے۔ وہ تو جانتی ہی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

فون کب کا بند ہو چکا تھا۔ اسے بند ہونا ہی تھا۔ اور جس تواتر سے فون آرہے تھے۔ کوئی چونکتا یا نہ چونکتا وہ خود چوکنا ہو گئی تھی۔

پہلے تو اس رفتار سے کبھی اس نے کالز نہیں کی تھیں۔ نہ وہ ایسی گہری محبت میں مبتلا تھی جو دن میں کئی کئی بار کال کر کے اس کا احوال پوچھتی۔

اور اس کا غائبانہ سا انداز وہ کہتی کچھ تھی۔ اور جواب کوئی اور سمجھتی۔

وہ اتنی غائب دماغ کبھی بھی نہیں تھی۔ کبھی بھی نہیں۔

اور آج کی کال میں اس نے ایک بڑی حیران کن بات کی تھی۔ اتنی حیران کن کہ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے اعصاب مفلوج ہو گئے تھے۔ پھر اس کا اصرار۔ ضد' اور آخر میں التجائیں۔

''پلیز مان جاؤ نا۔ مجھے نیا موبائل لینا ہے تم ساتھ ہو گی۔ تو اچھا تاثر رہے گا۔ مجھے بھی تسلی ہو گی۔ پلیز مان جاؤ فریحہ!'' اس کی منتوں میں ایسی عاجزی تو کبھی نہیں رہی تھی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ اور فریحہ کا دماغ تو سلگ سلگ کر سن ہو رہا تھا۔ سوچ سوچ کر تھک رہا تھا۔

''تم وہاں سے موبائل لینا چاہتی ہو؟ کیوں؟ پہلے تو تمہاری شاپنگ وہیں سے ہوتی ہے۔ تم نے تو یہاں کی کبھی لپ اسٹک استعمال نہیں کی۔ کجا کہ موبائل۔'' فریحہ کو نجانے اور بھی کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ اور اس نے بے ساختہ بیچ میں اس کا فقرہ کاٹ دیا۔

''مجھے وہیں سے لینا ہے پلیز! تمہارے تایا کی شاپ ہے۔ تم ساتھ چلو گی' بس ڈن ہوا۔ میرے لیے اتنا سا کام نہیں کر سکتیں؟'' اب وہ جذباتی حربوں سے اسے زیر کر رہی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا' اس نے جانے کس دل سے حامی بھری تھی۔ اسے حامی بھرنی ہی تھی۔ کیونکہ تقدیر یہی چاہتی تھی۔ جو اچانک آسمان سے اترتے اور نصیب کے فاصلوں کا سبب بن جاتے۔ اس نے فون رکھا اور بے دم ہو گئی۔ جو اس کا دل اشارے دے رہا تھا۔ جن وسوسوں کو اس کی سانسیں محسوس کر رہی تھیں۔ کیا وہ سب درست تھا؟

اس نے دل کی آواز پہ کان لگائے اور ساکت ہو گئی۔ اس کا کوئی بھی خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

فائیو اسٹار ہوٹل کا اندرونی ماحول خاصا سحر انگیز اور پرسکون تھا۔ بیک گراؤنڈ میں کہیں۔ دھیما میوزک اس سحر طرازی میں اضافہ کر رہا تھا۔

ہوٹل کے اندر باہر کی نسبت خاصی چہل پہل تھی۔

اس وقت یقیناً ''رحمان پلازہ میں انتہا کا رش تھا۔

اس کے باوجود ماہ رو کی فرینڈز بھری دوپہر میں اسے گھسیٹ کر رحمان پلازہ کی طرف لے جانا چاہتی تھیں۔ اور وہ جو انہیں اپنی ذاتی کار میں برج اور جنریشن زون لے کر آئی تھی۔ اس وقت سخت پچھتا رہی تھی۔

کیونکہ برج میں فکس ریٹس اور ایک ہی دام واحد کلام کی صورت حال نے اس کی تمام فرینڈز کو سانپ سونگھا دیا تھا۔ وہ کچھری بازار اور اچھرے سے شاپنگ

کرنے والیاں کہاں "برج" کی چمک دمک کو جھیل سکی تھیں۔ ان چاروں کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اور چہرے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ اور جیسے ہی وہ ایئر کنڈیشنڈ ہال سے باہر نکلیں ماہ رو ان سب پر برس پڑی تھی۔

"کوئی ایسے بھی شرمندہ کرواتا ہے؟ ایک ایک چیز کو چھو کر، ٹیک دیکھ کر، چھان پھٹک کے خالی ہاتھ واپس چلے آنا۔" ماہ رو کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ تب اس کی دوست فریحہ نے دبے دبے الفاظ میں سمجھایا۔

"یار! ان سب کی جیب اتنی لمبی چوڑی قیمتوں تک رسائی نہیں کر سکتی۔" فریحہ نے اسے کول ڈاون کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ ڈیزائنر گلاسز آنکھوں پہ چڑھاتی آگے بڑھ گئی تھی۔ اور اسے اب کی دفعہ فائیو اسٹار کی بلڈنگ کے قریب جاتے دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔

پھر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہیں ماہ رو کے پیچھے آنا ہی پڑا۔ گو کہ وہ سب پہلی مرتبہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آئی تھیں تاہم خواہ مخواہ کنفیوز ہو کر ماہ رو کا غصہ بڑھانا نہیں چاہتی تھیں۔

اور دوسری جانب ماہ رو دل ہی دل میں خوب پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"ان بونگی پینڈوؤں کے ساتھ آنے کی ضرورت کیا تھی؟ سارا امیج خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک تو اتنی بڑی بڑی چادروں کی بکل مار رکھی ہے۔ اوپر سے شکل بھی یتیموں جیسی۔" ماہ رو دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہتی مینو کارڈ اٹھا کر آرڈر سوچ رہی تھی۔ جبکہ مودب سا ویٹر گاہے بگاہے چور نگاہوں سے ماہ رو کے حسین دلنشین چہرے کو ضرور دیکھ لیتا تھا۔ اور یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ ماہ رو کے ساتھ جب جب اور جہاں جہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں کم و بیش ایسی ہی صورت حال دکھائی دی تھی۔

جہاں ماہ رو ہوتی تھی وہاں کوئی بھی دوسرا پس منظر میں چلا جاتا تھا۔

فریحہ کو ماہ رو کے ساتھ قریب دس سال ہو چکے تھے۔

انہوں نے ایک اسکول اور ایک کالج میں پڑھا تھا۔ یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری لے کر ماہ رو تو کچھ عرصہ ابراڈ بھی رہ آئی تھی تاہم فریحہ نے ایک مقامی پرائیویٹ کالج میں جاب کر لی۔

یہ اس مہینے کی پہلی تاریخ تھی اور فریحہ کو پہلی پہلی تنخواہ مل رہی تھی۔ سو وہ اپنی یونیورسٹی فیلوز کو ٹریٹ کے بہانے باہر لے آئی۔ ارادہ تھا کہ سب کو ان کا ایک ایک سوٹ لے دے گی۔ اور باقی سعدیہ، ہما اور سمیرا نے گھر کی شاپنگ بھی کرنی تھی۔

چونکہ ماہ رو کا فریحہ سے یونیورسٹی کے بعد زیادہ رابطہ رہا تھا سو جب بھی موقع ملتا وہ خود فریحہ سے ملنے آ جاتی تھی۔ فریحہ کے علاوہ ان کی ایک اور دوست ماہم بھی تھی۔ ماہم بھی ماہ رو کی طرح اپر کلاس سے تھی لیکن ماہم کو یونی فیلوز سے میل جول پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی آج کل وہ دبئی کی فیشن شو کی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ ماہم کے بعد ماہ رو پہ بوریت سوار ہوئی تو اسے فریحہ سے ملنے کا خیال آ گیا تھا۔ گو کہ فریحہ اور ماہ رو کا مزاج قطعاً "میل" نہیں کھاتا تھا پھر بھی یہ دوستی کی گاڑی چل ہی رہی تھی۔ اس میں کچھ کمال ماہ رو کا بھی تھا۔ اپنے ہزار نخرے، حسن اور دولت پہ ناز ہونے کے باوجود ماہم کے ہزار مرتبہ کہنے، سمجھانے اور ضد کرنے پر بھی فریحہ سے تعلق نہیں توڑ سکتی تھی۔

شاید اس لیے بھی کہ فریحہ کے ساتھ چلنے میں ماہ رو کے کسی جذبے کی تسکین ہوتی تھی اور اس وقت ویٹر کی نگاہوں میں ایک ستائش بڑھتی دیکھ کر فریحہ کو اسے ٹہوکا دینا ہی پڑا تھا۔ اور وہ جو دل ہی دل میں ماہم کو یاد کر رہی تھی۔ لحہ بھر کے لیے چونک گئی۔

"ماہ رو! جلدی کرو۔ ہمیں گھر بھی جانا ہے۔" فریحہ نے باقی تینوں کے دل کی آواز بھی اس کے کانوں تک پہنچائی تھی۔ ماہ رو کو سنبھلنا ہی پڑا۔ پھر اس نے کڑی نگاہ سے ویٹر کو گھور کر آرڈر دیا تو سب کی جان میں جیسے جان آ گئی تھی۔ اور ادھر فریحہ کو ایسے ہی ہول نہیں پڑ رہے تھے۔

فائیو اسٹار کی پچھلی جانب مشہور معروف رحمان پلازہ اس کے تایا اور ابا کی ذاتی ملکیت میں تھا۔ وہ خود تو ابا کی اکلوتی اولاد تھی تاہم تایا کے چھ کڑیل جوان بیٹے اسے ابا سے زیادہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس طرح تن تنہا ان کے خاندان کی کسی لڑکی کو بازار جانے کی اجازت تک نہیں تھی کجا کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھ کر لنچ کرنا۔ فریحہ کو ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں پسینے آرہے تھے اور وہ دعا کر رہی تھی کہ کسی تایا زاد کی نگاہ کے "گھیر" میں نہ آجائے۔ کیونکہ کبھی کبھار گھر سے لنچ منگوانے کی بجائے وہ لوگ اسی ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھالیا کرتے تھے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجانے کا خطرہ تھا۔

ویسے بھی فریحہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ورنہ تو باقی سب ڈگری کالج برائے خواتین سے ہی پڑھ لکھ کر شادی شدہ ہو جاتیں۔ سوائے فریحہ کے کوئی جاب بھی نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ تایا اور ابا کو پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی گھر میں خوش حالی تھی۔ تایا اور ابا کا کلاتھ ڈپو تھا۔ گارمنٹس کی دکان تھی۔ ہوزری کا ہول سیل کا کاروبار تھا۔ کاسمیٹکس، الیکٹرونکس اور کراکری میں ہر قسم کی ورائٹی رحمان پلازہ میں موجود تھی۔

سارا کاروبار تایا، ابا اور تایا کے چھ بیٹے سنبھال رہے تھے۔ عورتیں گھروں تک محدود تھیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ بظاہر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ پھر بھی فریحہ کو اپنی حدود و قیود کا بڑا خیال رہتا تھا۔

اور وہ جانتی تھی کہ کون سی بات اس کے خاندان میں مردوں کو بری لگتی ہے۔ اس کا دل بھی سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ جبکہ فریحہ کے خوف سے انجان اس کی باقی دوستیں کھانے پہ اس طرح سے ٹوٹ رہی تھیں۔ جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ اچھا کھانا دیکھنا نصیب ہوا تھا۔

اور شاید ماہ رو کے تاثرات بھی کچھ ایسے تھے۔ اسی لیے ماہ رو نے کھانے سے جلدی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ پھر اپنی باقی دوستوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"کھانے کے بعد ایک چکر رحمان پلازہ کا لگالیں گے۔ دیکھو، بار بار بازار آنا ممکن نہیں۔ پھر ماہ رو بھی کبھی کبھار ملتی ہے۔ آج تو ماہ رو کی کار میں سامان رکھ کر با آسانی گھر چلے جائیں گے پھر تو رکشوں میں خوار ہونا پڑے گا۔" سمیرا نے اپنے تئیں بڑی فائدہ مند بات کی تھی۔ باقیوں نے بھی اتفاق کر لیا تھا۔ ماہ رو گو کہ شکل سے اب بے زار لگ رہی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ مروت دکھا دیتی تھی۔ پھر فریحہ تو چاہتی تھی کہ ماہ رو آج تو مروت نہ ہی دکھائے۔ اور انہیں اٹھا کر کار میں ٹھونس دے۔ کیونکہ وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ رہا گفٹس کا سوال تو فریحہ ابا سے کہتی تو وہ اعلا سے اعلا کپڑا گھر میں اٹھا کر لے آتے۔ بازار آنے کی ضرورت کبھی نہ پڑتی۔ لیکن یہ ماہ رو بھی نا۔ اگر وہ زبردستی فریحہ کو نہ گھسیٹتی تو فریحہ ان باقیوں کو آرام سے انکار کر سکتی تھی۔ اور اب ماہ رو کے ساتھ آکر فریحہ سخت پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ ماہ رو نے سمیرا اور ہما کی بات نہ صرف مان لی تھی بلکہ بل بے کر کے اٹھ بھی گئی۔ لیکن اٹھتے ہوئے اس نے وارننگ ضرور دی تھی۔

"اب زیادہ دیر کی تو سر پھاڑ دوں گی۔ بارگیننگ مجھے سخت بری لگتی ہے۔ اس لیے تو میں ایسی عام دکانوں پہ جاتی نہیں۔ تم لوگوں کی خاطر اس بھری دوپہر میں دکان داروں اور کسٹمرز کی بک بک سننا پڑے گی۔" اس نے احسان جتاتے ہوئے اپنا قیمتی پرس ہاتھ میں پکڑا اور برائے نام دوپٹے کو گلے میں برابر کرتی اٹھ گئی تھی۔ اس کے خوب صورت دودھیا بازو آنکھوں میں روشنی سے بھر رہے تھے۔ آستینیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یوں شرٹ کے نیچے ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ اور اپنے کھلے حسین لمبے بالوں کو اونچی پونی میں سمیٹ کر وہ رحمان پلازہ میں جانے کے لیے تیار تھی۔

رحمان پلازہ میں ماہ رو جیسی الٹرا ماڈ قسم کی مخلوق کا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور اگر ابا، تایا نے دیکھ لیا۔ دیکھ تو انہوں نے لینا ہی تھا۔ فریحہ کو جیسے پھر سے ہول پڑنے لگے تھے۔

وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ چل رہی تھی۔ ایسے

ہی ہوٹل سے نکلتے ہوئے فریحہ کو لگا تھا کہ کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ دیکھنے کی چیز تو ماہ رو تھی۔ اور لوگ مڑ مڑ کر ماہ رو کو دیکھ بھی رہے تھے۔ پھر یہ چبھتی چبھتی سی آنکھیں کسی کی تھیں؟ کون تھا جو غصے بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا؟ اس کا دل گھبرا گیا وہ دل میں اور بھی خوف بھرے ماہ رو کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

سعدیہ' ہما اور سمیرا تو مناسب قیمتوں پہ کمپرومائز کر کے ایک ایک بیگ' پرس' بچوں کی جوتیاں' اسٹیشنزی وغیرہ خرید چکی تھیں۔

اب انہیں اس حصے کی طرف جانا تھا جہاں کلاتھ ڈپو کی پورے شہر سے زیادہ اچھی اور سستی ورائٹی ملتی تھی۔ وہاں کاؤنٹر پہ ہی تایا دکھائی دے گئے تھے۔ شاید ابھی ابھی نماز ظہر ادا کی تھی۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ یقیناً" کاروبار میں خیروبرکت کی دعا اور کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر ابا بھی گاہکوں سے نبٹ رہے تھے۔

کلاتھ ڈپو کی طرف تایا زاد کم کم ہی آتے تھے۔ فی الحال تو کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ زیادہ تر اوپر ہوتے۔ جہاں پہ الیکٹرونکس کا انتہائی اعلا سامان' موبائل ایجنسی' اور لیپ ٹاپ کمپیوٹر وغیرہ ملتے تھے۔ فریحہ نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ اور ایک چور نگاہ ماہ رو پہ ڈالی تھی۔ وہ انتہائی بے زار کھڑی تھی۔ اور سمیرا' ہما کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی جو سیل بوائز سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔

معاً" ابا اور تایا' نے چہرہ چھپائے کھڑی فریحہ کو دیکھ لیا۔ دونوں پہلے تو بہت حیران ہوئے تھے پھر پہچانتے ہوئے قریب آگئے۔ دونوں کے چہروں کا استعجاب فریحہ کو سخت شرمندہ کر رہا تھا۔

"فریحہ بیٹا! تم یہاں؟ خیریت تو ہے؟ کیوں آئی ہو؟ کچھ چاہیے تھا تو فون کر دیتیں۔" تایا نے ہی گفتگو میں پہل کی تھی۔ ان کا انداز نرم تھا۔ فریحہ کو ڈھارس سی پہنچی تھی۔ دل میں سکون سا اترا تھا۔ تایا اور ابا کے تاثرات نرم تھے۔ اور ابھی وہ اپنے آنے کی تفصیل بتانا چاہتی تھی کہ اچانک سے مردانہ آواز ابھری تھی۔

فریحہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ سینے میں یوں دھماکا ہوا جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔ خوف کے مارے اسے جھرجھری آگئی تھی۔ اس کے پیچھے عباس کھڑا تھا۔ عون عباس۔ فریحہ کا حلق تک سوکھ گیا تھا۔

"فون پہ بتا دیتی تو ہوٹلنگ کا لطف کیسے لیا جاتا۔؟"

اس کا انداز بہت سخت اور آواز بے انتہا مدہم تھی۔ یوں کہ تایا اور ابا نے تو سن لیا تاہم فاصلے پر موجود ماہ رو کچھ محروم رہ گئی تھی۔ لیکن اتنا تو وہ جان رہی تھی کہ آنے والے اس نوجوان نے فریحہ پر غصہ کیا ہے۔ اس نے کیا کہا تھا۔ یہ ماہ رو نہیں سن سکتی تھی۔ کیونکہ آنے والے جوان کی پرسنالٹی اور وجاہت دیکھ کر اس کی حسین آنکھوں میں تحیر در آیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک اور اس نوجوان سے ملتے نقوش والا جوان بھی پہنچ گیا۔ جس نے فریحہ کی وکالت کی تھی۔ اور اسے ڈانٹ سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ماہ رو کا تو سانس رک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ الجھن بھی بھری۔ یہ چہرہ کچھ دیکھا بھالا لگتا تھا۔

"کیا دکان دار اتنے خوب صورت ہوتے ہیں؟" ماہ رو کے لب بے آواز پھڑپھڑائے تھے۔ وہ ساکت آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی سماعتیں جیسے بہری ہو رہی تھیں۔ حالانکہ آوازیں اب نسبتاً" بلند تھیں۔ اور فریحہ خفا خفا انداز میں وضاحت دے رہی تھی۔

"میری دوستوں کو ڈسکاؤنٹ پہ کپڑا چاہیے تھا۔ اس لیے ساتھ آئی ہوں۔ مجھے یہاں آنے کا کچھ شوق نہیں تھا۔" فریحہ کی وضاحت پہ تایا اور ابا نے عباس نامی جوان کو ڈپٹ کر چپ کروا دیا تھا۔ جو کہ فریحہ کو کچھ اور سخت سست سنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ باپ اور چچا کے کچھ بولنے پر وہ خاموش ہو کر پلٹ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی جیسے سارے منظر پھیکے پڑ گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک ہال میں بھانت بھانت کا شور تھا جو عون عباس کے آتے ہی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ یوں لگا' جیسے وقت کی نبض تھم گئی تھی۔ اس کی رنگت غیر معمولی

حد تک سرخ ہو چکی تھی۔ نرم دودھیا رخسار گیلے اور نم تھے۔ قطرہ قطرہ پسینہ جیسے پھسل رہا تھا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے ہی فریحہ نے تایا اور ابا کو متوجہ کیا گویا وہ اس کا تعارف کروا رہی تھی۔ معاً وہ کچھ چونک سی گئی۔ ابا اور تایا نے آگے بڑھ کر ماہ رو کو خود سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تھا۔ جبکہ ماہ رو کسی چینی کے بے سانس مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اتنی ساکت کے تایا اور ابا کے پیار کرنے پر بھی چونکی نہیں تھی۔

فریحہ کو اس کا انداز بڑا غیر معمولی اور عجیب لگا تھا۔ جبکہ ابا اور تایا کچھ متفکر ہو گئے تھے۔

"فریحہ بیٹا! تمہاری دوست کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" ان کی پریشانی اور تفکر کو دیکھ کر شاید ماہ رو بھی کچھ سنبھل گئی تھی۔ پھر فریحہ اور سمیرا بھی متوجہ ہو گئی تھیں۔ ماہ رو کی طرف دیکھا اور آرام سے بولیں۔

"انکل! ماہ رو بڑی نازک مزاج ہے۔ اتنی گرمی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ تو ہمارے لیے خوار ہو رہی ہے۔ ورنہ اب تک جا چکی ہوتی۔"

"ارے یہ تو ہے۔" ابا اور تایا نے ایسے سہلایا گویا واقعی جانتے تھے کہ ماہ رو گرمی کی شدت برداشت نہیں کر پا رہی۔ اور یہ جو اتنا ہجوم تھا؟ عورتیں' بچے' خواتین' لڑکیاں' بوڑھیاں یہ بھی تو۔؟ لیکن یہ سب ماہ رو جیسی تو نہیں تھیں نا۔ ماہ رو تو ان سب میں الگ اور ممتاز نظر آ رہی تھی۔ بہت مختلف اور بہت منفرد۔ نہایت دلنشین' خوب صورت اور نازک اندام۔ جو گرمی جیسی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اور ماہ رو کی کیفیات یکسر الگ تھیں۔ وہ اختیار رکھتی تو عمر بھر یہیں کھڑی رہتی۔ کبھی پلٹتی نا۔ عمر بھر کے لیے اسی موڑ پر کھڑی رہتی۔

ادھر فریحہ کے تایا اور ابا ان کے لیے جوس وغیرہ منگوا رہے تھے۔ اور ماہ رو کی خرابی طبیعت کو دیکھ کر چاہ رہے تھے کہ وہ اوپر آفس میں چلی جائیں۔ وہاں اے سی لگا ہوا تھا۔ اور آرام سے وہاں بیٹھ کر جوس پی لیں۔

لیکن یہاں سعدیہ اور ہما نے ٹانگ اڑا لی تھی۔ انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ چونکہ بارعایت شاپنگ تمام ہو چکی تھی۔ سو انہیں گھر میں موجود اپنے بچوں کا خیال ستا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ رو کو ان سب کی پیروی کرنا پڑی تھی۔

پھر پورا راستہ وہ ایسے ہی گم صم اور خاموش رہی۔ گو کہ وہ اپنے دل کے خالی پن کو اور اپنی اندرونی طور پر ہونے والی تمام تبدیلیوں کو سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی دل پہ ہونے والی یہ اچانک واردات ایسی معمولی نہیں تھی جو وہ اپنے تاثرات باقی سب سے چھپا سکتی۔

سعدیہ' ہما وغیرہ کو ان کے اسٹاپ اور گھروں کے قریب ڈراپ کرنے کے بعد جب فریحہ کی باری آئی تو فریحہ نے خود ہی شائستگی سے ماہ رو کو مخاطب کر لیا۔

"مجھے بھی اسٹاپ پر اتار دو۔ میرا گھر قریب ہے۔ پیدل چلی جاؤں گی۔" فریحہ کے الفاظ پہ ماہ رو ذرا چونک گئی تھی۔ پھر اس نے جیسے خود کو سنبھال کر نرمی سے کہا۔

"میں تمہیں گھر تک ڈراپ کروں گی۔ اس اسٹاپ تک تو تمہیں کئی مرتبہ چھوڑ چکی ہوں۔ ویسے اتنی پرانی دوستی کے باوجود ہم لوگ کبھی ایک دوسرے کے گھر نہیں آئی ہیں۔ کتنی حیران کن بات ہے۔ تم نے بھی مجھے کبھی بلایا نہیں۔" ماہ رو نے بلا ارادہ ہی شکوہ کر دیا تھا۔ اس کے شکوے پہ فریحہ چونک گئی تھی۔ پھر جیسے جتلا کر بولی۔

"کیوں نہیں بلایا۔ میں نے قاسم اور عاصم بھائی کی شادی پہ بھی تمہیں انوائٹ کیا تھا۔ کائنات کی سالگرہ پہ بھی۔ عاصم بھائی کے بیٹے کا عقیقہ کیا تب بھی تمہیں انوائٹ کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تم اسٹاپ تک اکثر ڈراپ کر دیتی تھیں مگر گھر پہ کبھی نہیں آئیں۔" فریحہ کے صاف الفاظ میں جتلانے پہ ماہ رو کچھ جز بز ضرور ہو گئی تھی۔ اسے واقعی وہ تمام مواقع یاد آ چکے تھے جب فریحہ نے اسے اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی تھی۔ تاہم ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ماہ رو دوسرے سے غائب ہو جاتی تھی۔ کیونکہ بقول ماہم کے وہ ایسے بے

کار اور پینڈو فنکشن میں شریک ہو کر اپنا وقت ضائع نہ ہی کرے تو بہتر تھا۔ اور آج ماہ رو کو وہ سارے اچھے مواقع کھودینے پہ دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔ ماہ رو کے اندر ڈھیر سارا زیاں اتر آیا تھا۔ رہ رہ کر وہی دلنشین منظر نگاہوں کے پار اتر جاتا۔

وہی خوب صورت آواز اور مغرور نقوش والا شاندار ساعون عباس۔ ایک معمولی ساہو کار' دکان دار' جس کی ایک جھلک نے ماہ رو کو زمان و مکان بھلا دیئے تھے۔ اور آج وہ زبردستی فریحہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے جارہی تھی۔ اور شاید فریحہ اس کی تمام اندرونی کیفیات سے یکسرانجان تھی۔ تب ہی وہ ماہ رو کو گھر لے جانے پہ بے ساختہ خوش ہو گئی۔

"دیکھنا کائنات ثنا اور مریم بھابھی تمہیں دیکھ کر مسحور ہو جائیں گی۔ تمہارے حسن کی میں نے بہت تعریفیں کررکھی ہیں۔" فریحہ کے سادگی بھرے الفاظ نے ماہ رو کو ہفت اقلیم جیسی دولت سے نواز دیا تھا۔ تو گویا فریحہ کے گھر میں اس کا غائبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہاں ماہ رو اجنبی یا انجان خود کو نہیں سمجھے گی۔ اور فریحہ کے سفید ماربل سے سجے بڑے سے گھر کی بے انتہا راہداریوں میں چلتے ہوئے ماہ رو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فریحہ نے جو کہا تھا بالکل درست کہا تھا۔

ماہ رو کا وہاں غائبانہ ذکر ایک ہزار مرتبہ ہو چکا تھا۔ فریحہ کی بھابھیاں اور کائنات (تایا کی اکلوتی بیٹی) تو ماہ رو سے ایسے چپک کر بیٹھ گئی تھی جیسے عمر بھر ساتھ ہی رہنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ وہ ماہ رو کو چھو چھو کر دیکھتی اور حیران ہوتی۔

"اللہ' ماہ رو آپی آپ کس قدر حسین ہیں۔ فریحہ آپی بالکل جھوٹ نہیں کہتی تھیں۔ آپ اپنی تصویروں سے زیادہ حسین ہیں۔" کائنات کے یہ الفاظ ماہ رو کو ہواؤں میں اڑا رہے تھے۔ وہ کسی شہزادی کی طرح ان سب کے درمیان بیٹھی تھی۔ فریحہ کی امی اور تائی بھی بہت مہربان خواتین تھیں۔ انہوں نے بھی ماہ رو کو ملکاؤں جیسا پروٹوکول دیا تھا۔ اور جاتے سمے فریحہ کی تائی نے اسے بہت نفیس جوڑا دیا۔ یہ جوڑا ماہ رو کو کسی ڈیزائنر کے جوڑے سے بھی زیادہ قیمتی اور نفیس لگا تھا۔ پھر ان سب کے پیار نے ماہ رو کے اندر گڑی تنہائی اور اکیلے پن کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ وہ اپنا دل تو فریحہ کی تائی کے لخت جگر کو دے آئی تھی۔ اپنی روح بھی "رحمان منزل" کی راہداریوں میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی۔ کیونکہ ماہ رو سرفراز کو ایک معمولی دکان دار کے بیٹے سے محبت ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

فریحہ کا تعلق گو کہ ایک خوش حال گھرانے سے تھا۔ جہاں تنگی یا رزق کی کمی کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ تایا رحمان اور اس کے ابا کا اکٹھا کاروبار تھا۔ جو اب تایا کے بیٹوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ابا اور تایا بھی برابر ان کا ساتھ دیتے تھے۔

رحمان پلازہ میں ان کی چلتی دکان داری سے کبھی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ پھر ان کا خاندان مشترکہ نظام کے تحت چل رہا تھا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت وہ بخوشی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کررہے تھے۔ یہ ایسا گھرانہ تھا جہاں روایات' اقدار اور جذبات کی قدر کرنے والے بہت تھے۔ سو اسی پیمانے پر ان سب کی تربیت کی گئی تھی۔

تایا رحمان کے چھ بیٹے تھے۔ عاصم' قاسم کی دو سال پہلے شادیاں ہو چکی تھیں۔ خوش قسمتی سے دونوں کی بیویاں بھی بہت اچھی تھیں۔ سو گھر کا ماحول ہمیشہ سازگار رہتا تھا۔

عاصم اور قاسم کے بعد عون اور عاشر تھے۔ پھر عامر اور یاسر تھے۔ جو کالج میں زیر تعلیم تھے۔ کائنات سب سے چھوٹی تھی اور حال ہی میں اس کا بھی سپریئر کالج میں داخلہ ہوا تھا۔

فریحہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور بچپن سے ہی تایا رحمان نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ چونکہ ابا کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے فریحہ کو ہمیشہ اس گھر میں رہنا تھا۔ سو' فریحہ کے والدین اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے لیے قطعاً" پریشان نہیں تھے۔

ایک ماہ پہلے اس نے گھر میں اپنی جاب کا شوشا چھوڑا تب کوئی بھی اس کی نوکری کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن تایا اس کی خواہش جان کر محض اس شرط پہ راضی ہوئے تھے کہ شادی سے پہلے وہ اپنا شوق پورا کر سکتی ہے۔ کیونکہ دو تین مہینے کے اندر اندر فریحہ کی شادی بھی متوقع تھی۔

اس کی جاب پہ سب سے زیادہ مخالفت عون عباس نے کی تھی۔ بلکہ وہ تو پورا ہفتہ اس بات پہ ناراض بھی رہا تھا۔ اپنے تمام تر اکھڑ مزاج' رویے اور غصہ ور ہونے کے باوجود اس گھر میں اگر فریحہ کی کسی کے ساتھ دوستی تھی تو وہ صرف اور صرف عون عباس ہی تھا۔ دوستانہ بے تکلفی کے باوجود فریحہ عون سے کچھ کچھ ڈرتی بھی تھی۔ جیسے ہی وہ کسی بات پہ اڑ جاتا فریحہ خود بخود ہتھیار پھینک دیتی تھی۔

گھر میں فریحہ پہ سب سے زیادہ روک ٹوک بھی عون ہی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماہ رو سے بہت پرانی دوستی کے باوجود فریحہ کبھی اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ ایک تو ماہ رو کا اسٹیٹس میچ نہیں کرتا تھا پھر وہ آزاد ماحول کی باسی تھی۔ شاید کوئی بھی فریحہ کو ماہ رو کے گھر جانے کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن ایسی نوبت آئی بھی کبھی نہیں تھی۔ ماہ رو نے کبھی بھی فریحہ کو اپنے گھر انوائٹ نہیں کیا تھا نہ کسی سالگرہ پہ نہ کسی فنکشن میں۔

ماہم کے توسط سے فریحہ تک ماہ رو کی ہر پارٹی کی اطلاع تو ضرور پہنچ جاتی تھی۔ اور وہ جانتی بھی تھی کہ ماہ رو اسے جان بوجھ کر نہیں بلاتی۔ لیکن فریحہ نے کبھی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اسے ماہ رو کے گھر جانے کی کبھی اجازت نہ ملتی۔

اس دن اتوار تھا۔ کالج اور اسکولز کے ساتھ 'ابا تایا دکانیں بھی بند کرتے تھے۔ اتوار کے اتوار حساب بھی کرنا ہوتا تھا اور نیا مال بھی خریدنا ہوتا۔ اس لیے اتوار کو چھٹی ہوتی تھی اور خواتین کی مصروفیت بھی بڑھ جاتی تھی۔ سب مرد اتوار کو گھر پر ہوتے تھے۔ سارا دن کچن میں ہی گزر جاتا تھا۔ اور آج فریحہ 'ابا اور عون کی پسند کا کھانا بنا رہی تھی۔ اچاری بریانی کے ساتھ بالٹی گنا نہاری جیسی محنت طلب ڈشز بناتے ہوئے فریحہ کو دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ چونکہ موسم بھی گرم تھا اس لیے آج کچھ زیادہ ہی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ اچاری بریانی کو دم دے ہی رہی تھی جب کائنات نے اونچی آواز میں اسے اطلاع دی تھی۔

"فری آپی! آپ کی فرینڈ کا فون ہے۔"

"کس کا فون ہے کائنات؟" فریحہ کا انداز مصروف سا تھا۔ کیونکہ عموماً" اس کی فرینڈز گھر میں کالز وغیرہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ اندازہ لگاتی ہوئی کچن سے باہر آئی تھی۔ "کس کا فون ہو سکتا ہے؟ ہما' سعدیہ 'سمیرا!۔"

"ماہ رو آپی کا۔ جو اس دن آپ کو چھوڑنے ہمارے گھر آئی تھیں۔" اپنی حیرت کا گلا دبا کر اس نے فون اٹھالیا۔ دوسری طرف واقعی ہی ماہ رو کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ ماہ رو نے اسے کال کی تھی۔ از خود؟ فریحہ کو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اتنی لمبی دوستی میں ماہ رو نے دوسری یا تیسری مرتبہ بغیر کسی کام کے کال کی تھی ورنہ جب یونی ورسٹی میں تھیں تب اکثر نوٹس وغیرہ کے لیے وہ گھر میں کال کرلیا کرتی تھی۔ کبھی "دوستانے" کی خاطر اس نے کال نہیں کی تھی۔

"فریحہ! کیسی ہو تم؟" ماہ رو سے بات نہ بن پڑی تو بے تکا سا سوال کردیا۔ فریحہ جو پہلے سے ماہ رو کے فون پہ حیران تھی کچھ اور بھی حیران رہ گئی۔

"ایک رات میں کیسی ہو سکتی ہوں؟ ابھی کل تو ہماری دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔" فریحہ نے اسے یاد دلانا چاہا تھا جب وہ ہفتے میں تیسری مرتبہ اس کے کالج ملنے چلی آئی تھی۔ اور یہ ملنا بے سبب ہی تھا۔ ماہ رو دس پندرہ منٹ کے لیے آئی اور چلی بھی گئی تھی۔ فریحہ کو وہ خاصی مضطرب لگی تھی نجانے کیا معاملہ تھا۔ ماہ رو کا چہرہ پہلے سا فریش بھی نہیں تھا۔ بجھا بجھا سا اداس تھا۔ جیسے وہ کسی الجھن میں تھی۔ فریحہ تب پوچھتی رہ گئی تھی تاہم ماہ رو نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ماہ رو اب بھی کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ نجانے معاملہ کیا تھا؟ اس نے خود ہی کال بھی ڈسکنکٹ کردی تھی۔ فریحہ جیسے حیران رہ گئی۔ ابھی وہ اس حیرت سے سنبھلی نہیں تھی جب

لاؤنج میں چھڑے موضوع کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وہاں تو ایک اور ہی بحث کا سماں تھا۔ فریحہ کو فون بند کرتے دیکھ کر عامر اور یاسر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

"فریحہ آپی! آپ کی اتنی حسین دوست ہے۔ اور آپ کے بھائی کسی ایالو سے کم نہیں۔ ہمارا "چانس" بنوا دو۔ ماہ رو کو اپنی بھابھی بنا لو۔ میں آج ہی دولہا بننے کو تیار ہوں۔" یاسر نے اس قدر اتاؤلے پن سے کہا تھا کہ پاس بیٹھی تائی نے جوتا اتار کر اس کی کمر کا خوب نشانہ لیا۔

"ابھی سیکنڈ ایئر میں پاس ہو کر تو دکھا دو۔ پھر کسی کے سر تاج بھی بن جانا۔" یہ کھرکتا جواب عون کی طرف سے آیا تھا۔ یاسر ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

"پڑھی لکھی بیوی لاؤں گا تو خود پڑھا دے گی۔ ٹیوشن کی بچت کے ساتھ مفت میں فری اکیڈمی کا مزہ بھی لوں گے۔"

"اور وہ کما کر لائے گی تم آرام سے بیٹھ کر کھانا۔" عامر نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا تھا۔ یاسر کو اس کے لبوں سے نکلی بات دل کو لگی تھی۔

"میرا فیوچر میں یہی پلان ہے۔" اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

"مجھ سے بھائیوں کی طرح دکان داری نہیں ہوتی۔ اور نہ میں بھانت بھانت کی خرانٹ عورتوں کے ساتھ مغز ماری کر سکتا ہوں۔ میں اپنے خاندانی بزنس کو اپنے لیے قطعاً "غیر مناسب سمجھتا ہوں"۔" موضوع گفتگو کسی اور سمت کو جا نکلا تھا۔ عون حساب کرتے ہوئے بار بار ڈسٹرب ہو رہا تھا اس وقت بھائیوں کی "چونچالی" خاصی گڑبڑ مچا رہی تھی۔

اوپر سے کائنات کا ماہ رونامہ۔ وہ فریحہ کی اس ماڈرن' کسی حد تک بے باک دوست سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو چکی تھی۔ وہی ماہ رو' جسے فریحہ کے ساتھ دیکھ کر عون کو خاصا اچنبھا ہوا تھا۔ کہاں فریحہ اور کہاں ماہ رو۔ فریحہ ڈھکی چھپی کم گو' سنجیدہ اور باوقار سی لڑکی۔ ماہ رو انتہائی لبرل' ماڈ' بے باک اور شوخ طبیعت کی۔ عون نے ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ اور اس نگاہ میں وہ ماہ رو کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔ وہ کسی بھی لحاظ سے فریحہ کی دوست کے پیمانے پہ پوری نہیں اتر سکتی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ فریحہ کو اس لڑکی سے میل ملاپ رکھنے' دوستی بڑھانے سے منع کر دے گا۔ کیونکہ اس لڑکی کا اسٹیٹس' رہن سہن' انداز و اطوار ان کے گھرانے کے کسی لڑکی کو متاثر کرنے کے قابل نہیں تھے۔

پہلی نگاہ میں ہی عون کو وہ ناپسندیدہ لگی تھی۔ تب وہ فریحہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ مگر جب اگلے ہی دن پھر ماہ رو کی عین ناشتے کے وقت کال آگئی۔ اور یہ بھی ایک انوکھا سا واقعہ تھا۔ فریحہ ایک مرتبہ پھر شاکڈ رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس ہفتے میں ماہ رو کی یہ کوئی اٹھارویں کال تھی۔ وہ شاید اگلے پچھلے ریکارڈ توڑنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ کال پہلی کالز کی طرح بے مقصد نہیں تھی۔ اس دفعہ ماہ رو نے فریحہ کو اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔ بقول ماہ رو کے چھوٹی سی برتھ ڈے پارٹی ارینج کر رہی تھی۔ سو فریحہ کو پہلا دعوت نامہ مل گیا تھا۔ اور فریحہ فون رکھ کر بھی اتنی حیران تھی کہ کچھ دیر تک بول نہیں پائی تھی۔ کیا ماہ رو کی برتھ ڈے سال میں دو دو مرتبہ منائی جاتی تھی۔؟ اور شاید امیر لوگ اپنی سالگرہ سال میں کسی بھی وقت منا سکتے تھے۔

فون بند ہوا۔ تو سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ عامر' یاسر اور کائنات اس کے سر ہو چکے تھے۔

"ماہ رو آپی کیا کہہ رہی تھیں!" کائنات دستر خوان سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھی۔ عامر اور یاسر کے کان بھی کھڑے تھے۔ وہ بھی ناشتا بھول گئے۔ تائی اور امی بھی فریحہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اس کی برتھ ڈے ہے امی! سب کو انوائٹ کر رہی تھی۔" فریحہ کا انداز کچھ مدھم تھا۔ پھر بھی تایا' ابا اور عون نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"سب کو۔۔۔" کائنات کا دل مچل اٹھا۔ "ہم سب کو کیا؟ اف مائی گاڈ۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ ہمارے گھر تو سالگرہ کا کوئی رواج نہیں ہے۔ ایک اچھی سی پارٹی اٹینڈ کرنے کا میرا دیرینہ شوق ہے۔" کائنات نے فرط

اشتیاق میں اتنی بلند آواز میں سب کو ڈھول پیٹ کر بتادیا تھا۔ یوں کہ ابا اور تایا بھی چونک گئے تھے۔ عون نے بھی چائے کا کپ ساسر میں رکھ دیا تھا۔ پھر وہ دسترخوان سے اٹھ گیا۔ شاید وہ ماہ رو نامے سے چڑ گیا تھا۔

امی اور تائی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ گو کہ فریحہ کی دوست انہیں دل سے پسند آئی تھی۔ پھر بھی اس کے گھر جانے میں وہ تذبذب کا شکار تھیں۔ تایا اور ابا یقیناً" رکاوٹ نہ ڈالتے۔ لیکن دونوں خواتین ازخود ساری حدود و قیود کی پاسداری کیا کرتی تھیں۔

"فریحہ آپی! آپ ماہ رو آپی کو بتادیتی نا۔ ہم آج شام کو ان کے گھر جائیں گے۔ آخر وہ آپ کی اتنی پرانی فرینڈ ہیں۔" کائنات نے ایک مرتبہ پھر مچل کر کہا تھا۔ فریحہ امی اور تائی کی طرف دیکھنے لگی تھی جیسے جاننا چاہتی تھی کہ ان کی رائے کیا ہے؟ لیکن ان دونوں سے پہلے ہی عون بولتا ہوا دوبارہ اندر آگیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ تم معذرت کرلو، اس کی پارٹیاں بھی اس کی طرح ہوں گی۔" اس نے بمشکل "اوور" اور "بے ہودہ" کہنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ کائنات کا منہ اتر گیا تھا۔ فریحہ تاہم کچھ مطمئن ہوگئی تھی۔ جیسے عون نے اس کے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

"وہ اتنے پیار سے بلا رہی ہیں۔ اتنی پیاری تو ہیں ماہ رو آپی۔" کائنات منمناتی رہ گئی تھی۔

"ہم نے اس کے "پیار" کا اچار ڈالنا ہے۔" وہ کائنات کا سر سہلاتا ذرا مسکرا کر باہر نکل گیا تھا۔ دوسرے معنوں میں سب کو باور کروادیا تھا کہ ماہ رو کی دعوت پر آرام سے معذرت کرلیں۔ یوں ماہ رو کے انوی ٹیشن پر فریحہ سمیت کوئی بھی نہیں جاسکا تھا لیکن ہوا کچھ یوں کہ ماہ رو خود ہی اتنا بڑا شکوے کا دفتر اٹھا کر دوسرے ہی دن رحمان منزل ایک مرتبہ پھر اس انداز میں آئی کہ فریحہ کو اپنے اندر کچھ کھٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ کھٹکتا ہوا احساس بھلا کیا تھا؟ ایک چٹکیاں بھرتا ہوا خیال، جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ کوئی بچھڑنے والا تھا۔ اگلے بہت سارے دنوں میں فریحہ پہ یکے بعد دیگرے کچھ انکشاف ہوئے تھے۔ اور ان انکشافات نے اسے دم بخود کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

لش گرین گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہلتی وہ پچھلے کئی دنوں سے مضطرب تھی۔ اس اضطراب کا کوئی انت نہیں تھا۔ وہ ایسی تکلیف سے گزر رہی تھی جسکی لذت سے اسے پہلی مرتبہ آشنائی ہوئی تھی۔ یہ درد جولا دوا تھا اور جس کا کوئی علاج بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ کیا چند لمحوں میں دل کی دنیا تہ و بالا ہوجاتی ہے؟ وہ سرفراز احمد جیسے معروف بزنس مین کی لاڈلی بیٹی نہ سہی اکلوتی ضرور تھی۔ اس کی پرورش ہائی سوسائٹی کے سارے اصولوں کے مطابق شاہانہ انداز میں ہوئی تھی۔ وہ ایک سال کی تھی جب ڈیڈی اور ممی میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ پھر ممی نے اور شادی کرلی تھی ڈیڈی بھی اور بیوی لے آئے۔ شازمہ ڈیڈی کی من پسند بیوی ضرور تھی، مگر ماہ رو کی کبھی ماں نہیں بن سکی تھی۔ ماہ رو مختلف آیاؤں کی گود میں پلتی ہوئی بچپن اور لڑکپن تک پہنچی تھی۔ اس دوران ماہ رو کے شعور نے پختگی حاصل کی تھی یا نہیں کی تھی تاہم وہ شازمہ کے ساتھ اپنے رشتے کی "نوعیت" خوب سمجھ گئی تھی۔

گو کہ ان کے تعلقات کبھی روایتی نہیں رہے تھے تاہم شازمہ نے کبھی اسے ایک ماں کا پیار یا توجہ نہیں دی تھی۔ شازمہ کا ایک بیٹا سنی تھا۔ جو شروع سے ہی ابراڈ رہا۔ سو ماہ رو کی اپنے بھائی سے بات چیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ڈیڈی بھی اپر کلاس کے ڈیڈیوں جیسے باپ تھے۔ کبھی ہفتوں بعد انہیں بیٹی کا خیال آتا تھا۔ البتہ روپے پیسے کی ماہ رو کو کبھی کمی نہیں رہی تھی۔ ڈیڈی یہ نہیں جانتے تھے کہ روپیہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ والدین کی محبت، توجہ، خیال ایک نارمل بچے کی بنیاد بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، لیکن جہاں دونوں ہی رشتے مفقود ہوں وہاں تربیت، احساس،

خیال‘ توجہ یا محبت کہاں سے آتی؟ ماہ رو ایک ایسے تنہا پودے کی طرح پروان چڑھی تھی جس کی بروقت کانٹ چھانٹ کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا سو اس پودے میں کئی طرح سے جھاڑیاں کانٹے اور ابھی شاخیں نکل آئی تھیں۔ ایکچوئلی ماہ رو کی پوری شخصیت اسی پودے سے امیجن کرتی تھی جس میں کئی طرح سے نوک دار‘ بے وضع شاخیں اور کانٹے اگ آئے تھے۔

وہ باپ کی بے توجہی‘ عدم تحفظ اور لاپرواہی کے باعث بہت اکیلی‘ تنہا اور اداس تو تھی ہی‘ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بے رنگ‘ ایب نارمل زندگی کی وجہ سے بہت خود سر‘ نڈر‘ ضدی اور نک چڑھی بھی ہوتی گئی تھی جیسے جیسے عمر رواں کے سال آگے بڑھتے گئے وہ اپنے باپ اور ماں سے مزید دور ہوتی گئی تھی۔

اس نے روایتی اسٹیپ مدرز کی طرح کبھی ماہ رو پہ بے جا تشدد نہیں کیا تھا تاہم وہ بڑے مہذب طریقے اسے نفسیاتی طور پہ ٹارچر کیا کرتی تھی۔

چونکہ شازمہ اس کی اسٹیپ مدر تھی سو جلد ہی ماہ رو نے اس کے مبہم برے رویوں کو نظرانداز کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ ڈیڈی کی لاپرواہی پہ کڑھنا بھی چھوڑ چکی تھی۔ شازمہ جو بھی کرتی ماہ رو کی بلا سے۔ کیونکہ جیسے ہی وہ بڑی ہوتی گئی تھی اس نے گھر سے باہر اپنے لیے ایکٹیوٹیز ڈھونڈلی تھیں۔ وہ کلب جاتی تھی‘ ہوٹلنگ کرتی‘ شاپنگ کرتی جب دل چاہتا دبئی‘ کینیڈا یا یو کے چلی جاتی۔ ڈیڈی کی طرف سے اس پہ کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اسے کھلا جیب خرچ دیتے تھے اور مڑ کر کبھی حساب بھی نہیں لیتے تھے۔ پڑھائی میں بھی وہ خود بخود اچھی ہوگئی تھی۔ پھر ماہ رو نے اپنے سوشل سرکل کو بھی خاصا وسیع کرلیا تھا۔ پہلے پہل اس کی ایک ہی فرینڈ تھی۔ فریحہ‘ جو تھی تو مڈل کلاس سے تاہم اس کے پیرنٹس اسے اچھے اسکولز میں پڑھا رہے تھے۔ فریحہ اور ماہ رو ایک ساتھ کالج اور یونی ورسٹی تک بھی گئی تھیں۔ فریحہ کی خاطر ماہ رو نے اپنا کالج اور پھر یونی ورسٹی بھی چینج کرلی تھی۔

ان دونوں نے ایک ساتھ طویل دس سال گزارے تھے۔ اس کے باوجود دونوں میں بہت اعلا پائے کی دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ اسٹیٹس ان دونوں کے درمیان ایک خلیج کی طرح حائل رہا تھا۔ شاید یہ دوستی بہت آگے تک نہ جاتی‘ لیکن اس کو کہیں نہ کہیں سے ماہ رو نے خود برقرار رکھا ہوا تھا۔ چونکہ فریحہ بہت ہی کم رو قسم کی سادہ مزاج لڑکی تھی اس لیے بھی ماہ رو کو اس کے ساتھ رہنا پسند تھا کیونکہ جہاں ماہ رو ہوتی تھی وہاں فریحہ پس منظر میں چلی جاتی تھی۔ اسی طرح فریحہ کو بھی ہمیشہ ماہ رو کی موجودگی میں بہت فائدے رہے تھے۔ پوری یونی ورسٹی میں ماہ رو کا طوطی بولتا تھا۔ کوئی اس کے حسن سے متاثر تھا‘ کوئی دولت سے۔ ماہ رو کی وجہ سے اکثر یونی ورسٹی فیلوز فریحہ کو بھی بہت خاص پروٹوکول دینے لگتی تھیں۔

ماہ رو میں بہت سی فطری اور بشری کمزوریاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور کچھ حالات نے اسے ذرا خود غرض بنادیا تھا۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب ماہ رو نے یونی ورسٹی کو خیرباد کیا تھا۔ اور یہ بہت پرانا قصہ بھی نہیں تھا شاید سات یا آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ گوکہ ماہ رو کے دھڑا دھڑ پرپوزل آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی پرپوزلز کا ایک لمبا سلسلہ کالج لائف میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ ہر کلاس سے رشتہ آتا تھا۔ ایلیٹ‘ اپر‘ مڈل‘ یوں تو ایک مرتبہ ڈیڈی تک دکھلائے گئے تھے کیونکہ انہوں ماہ رو کے لیے شادی وغیرہ کے جھنجٹ کو نہیں سوچا تھا۔ سو تمام پرپوزلز ریجیکٹ کردیے گئے تھے۔ ڈیڈی نے سب سے مہذب انداز میں معذرت کرلی تھی‘ لیکن وقاص کا رشتہ ایسا تھا جس پہ پہلی مرتبہ گھر میں سرد جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔

ڈیڈی کسی بھی صورت میں وقاص کے پرپوزل کو ریجیکٹ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وقاص بہت لائق فائق تھا۔ اس نے بائیو ٹیکنالوجی میں امریکا سے پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اس کی پوری فیملی گوکہ ڈیڈی کے ٹکر کی

نہیں تھی پھر بھی ذہانت، علم اور وضع داری میں ان کے گھرانے سے اچھا شاید ہی کوئی گھرانہ ہو۔ اور ماہ رو کو یہ بھی بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ شازمہ کی بہن بذات خود اپنی بہن کو پسند نہیں کرتیں۔ شاید اس لیے کہ بہت سال پہلے ماہ رو کے ڈیڈی کی معمولی سیکریٹری سے "بیوی" تک کا عہدہ پانے میں شازمہ نے کبھی اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے خوابوں اور ارمانوں کا خون کیا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کی علیحدگی کا سبب بھی شازمہ سرفراز ہی تھی

شازمہ کے بھانجے کا سن کر ماہ رو نے خود ہی دو ٹوک انکار کر دیا تھا۔ وہ شازمہ سے نفرت تو نہیں کرتی تھی تاہم اس سے اور اس کی فیملی سے بے زار ضرور تھی۔ یہ اور بات تھی کہ ماہ رو کا انکار شازمہ کے لیے بڑا شادمانی کا سبب بنا تھا۔ ماہ رو جو سمجھ رہی تھی اس کے انکار کو شازمہ اپنی توہین سمجھ کر سیخ پا ہو جائے گی اسے مطمئن دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ کیونکہ شازمہ نے بخوشی ماہ رو کا انکار اپنی بہن تک پہنچا دیا تھا۔ اور ڈیڈی جو وقاص کو دل و جان سے پسند کر چکے تھے۔ اس کی ذہانت، خوش مزاجی، شرافت، نجابت اور شاندار اکیڈمک ریکارڈ سے متاثر ہو چکے تھے۔ ان کے لیے یہ انکار دھچکے سے کم نہیں تھا۔ ڈیڈی نے پہلی مرتبہ ماہ رو پہ غصے ہونے کی بجائے شازمہ کو آڑھے ہاتھوں لیا تھا۔

"مجھ سے مشورہ کیے بغیر اپنی بہن تک انکار پہنچا دیا۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔" ان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ شازمہ چونکہ ڈنکے کی چوٹ پہ جھگڑے کرتی آئی تھی۔ اور ڈیڈی کبھی اس کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے وہ ایک مرتبہ پھر ڈیڈی پہ چڑھائی کرنے میں لگ گئی تھی۔

"تمہاری بیٹی نے خود انکار کیا ہے۔ وہ میرے رشتہ داروں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ تم بیٹی کے ساتھ زبردستی کرو گے؟ میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو آپی تک جواب پہنچا دیا۔" شازمہ نے ہار کہاں مانی تھی اور وہ خود پہ آنچ بھی نہیں آنے دے رہی تھی۔

"اگر تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تم تب بھی یہی کرتیں؟ اسے بھانے یا رام کرنے کی بجائے متوقع سسرالیوں

تک اس کے "عیب" پہنچا تیں؟ مجھے تو اب پتا چلا ہے۔ تم چاہتی ہی نہیں تھیں کہ وقاص جیسے قابل لڑکے سے ماہ رو کی شادی ہو۔" ڈیڈی کے اگلے الفاظ نے شازمہ کو شرمندہ کردیا۔ وہ ماہ رو کے لیے شازمہ سے اس لہجے میں کلام کررہے تھے؟ سو کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس کا لہجہ رواں اور نارمل ہوگیا تھا۔

"ماہ رو کے لیے یہ کوئی آخری پرپوزل نہیں تھا۔ ابھی دنیا بھری پڑی ہے ویسے بھی تمہیں ماہ رو کے لیے اپنے سرکل تک محدود رہنا چاہیے۔ اپنی کلاس میں پرپوزل دیکھو....." شازمہ نے بڑی حد تک اپنے ابلتے غصے پہ بندھ باندھنے کے بعد ذرا دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"میری کلاس میں کم از کم وقاص جیسے رشتے نہیں ملتے۔" ڈیڈی کا ملال کسی طور کم نہیں ہورہا تھا۔ ان کا لہجہ اور انداز بھی بجھ گئے تھے۔

"تم کیا چاہتی ہو کسی چین ڈرنکر، لوز کریکٹر کے ہاتھ ماہ رو کو تھمادوں؟"

"ہر کوئی برا بھی نہیں ہوتا۔" شازمہ بھی جز بز سی ہوئی۔

"تو پھر کوئی بہت اچھا وقاص جیسا تم ہی دکھادو۔" ڈیڈی کا لہجہ اور بھی ویران ہوگیا۔ رہ رہ کے شازمہ کی بہن کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ انہوں نے بہت شائستگی کے ساتھ معذرت کرلی تھی۔ کیونکہ وہ یہ رشتہ اس لیے جوڑنا چاہتی تھیں کہ تعلقات بہتر ہوں جب شازمہ کی خواہش ہی نہیں تھی تو وہ کیوں معاملات کو بگاڑتیں۔ انہوں نے باقی باتیں چھپالی تھیں۔

"اوکے، تم ریلیکس فیل کرو۔ میں ماہ رو کے لیے وقاص سے بہتر لڑکا ڈھونڈوں گی۔ یو ڈونٹ وری، مجھے اس پر افسوس ہے۔ ویسے بھی وقاص پہ دنیا ختم نہیں ہوتی۔ ماہ رو کی خواہش بھی نہیں تھی۔ ہم اپنی بیٹی کے ساتھ زبردستی بھی تو نہیں کرسکتے۔ میں نے تو ماہ رو کے لیے بہتر سوچا۔ ماہ رو کا انٹرسٹڈ ہونا میٹر کرتا تھا جب وہ راضی نہیں تھی تو تم بھلا کیا کرلیتے؟ میں نے ماہ رو کے لیے کبھی برا نہیں سوچا۔ شازمہ نے لمحوں میں چکنی باتوں سے ایک مرتبہ پھر ڈیڈی کو اس فیز سے نکال لیا تھا۔

جب ڈیڈی بہت دن تک اسی صدمے کے زیر اثر رہے تب ماہ رو نے پہلی مرتبہ گہرائی میں جاکر سوچا۔

"وقاص میں کچھ تو ایسا تھا جو ڈیڈی اس کے لیے اتنا ڈنچی ہورہے تھے۔" وہ چاہ کر بھی اس خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ پھر یہ خیال اس وقت ملال میں بدلا تھا جب ماہ رو نے وقاص کو ایک نجی پارٹی میں دیکھ لیا۔

☆ ☆ ☆

وہ شام بھی خاص سہانی اور ستاروں سے سجی تھی۔ شازمہ کے عزیزوں میں شادی کا فنکشن تھا۔ اور یاہ رو تو بہت کم شازمہ کے فیملی فنکشنز کا حصہ بنتی تھی۔ اس کی اپنی مصروفیات ہی لاتعداد تھیں، لیکن اس شام نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ رو کو شازمہ کے ساتھ آنا پڑا تھا کیونکہ ڈیڈی نے پہلی مرتبہ اسے بہت فورس کیا تھا کہ وہ سوشل پارٹیز کی بجائے زیادہ سے زیادہ فیملی پارٹیز اٹینڈ کیا کرے۔ اس کے بے انتہا لبرل، ماڈ اور انتہائی سوشل ڈیڈی کی اس نکتے پہ سوچ بہت مڈل کلاس قسم کی تھی۔ وہ چاہتے تھے ماہ رو کی شادی امیر خاندان میں نہیں بلکہ وضع دار، شریف اور خوش حال فیملی ہو۔ جو نہ صرف ایجوکیٹڈ ہوں بلکہ رکھ رکھاؤ والے، شریف اور عزت دار لوگ ہوں۔ خاص طور پہ لڑکے کا شریف، باکردار ہونا بہت ضروری تھی۔ ڈیڈی کے یہ خیال ماہ رو کے لیے انتہائی حیران کن تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے پہلی مرتبہ ایک باپ بن کر سوچ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے "سرکل" سے ہٹ کر ماہ رو کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ہر ایک کے لیے انتہائی تعجب کی بات تھی۔ ڈیڈی کی ڈیمانڈ میں کہیں بھی ایلیٹ کلاس کا داماد نہیں تھا۔ حتیٰ کہ شازمہ تک چیخ پڑی تھی۔

"تم نے اپنی ناک کٹوانی ہے۔ لوگ تو شادیوں کے نام پہ بزنس بڑھاتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں اور تم نے بیک گیئر لگا رکھا ہے۔"

"میں نے بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ بیوپار نہیں۔" ڈیڈی کے دو ٹوک الفاظ کو سن کر شازمہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے ڈیڈی کی تلاش میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی۔ اور اس کے امیر کبیر باپ کو جس کے لیے بزنس کے داؤ پیچ میں اپنے حریف کو پچھاڑ دینا لمحوں کا کام تھا۔ اپنی ہی بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کرنا مسئلہ فلسطین بن گیا تھا۔

آج اس ستاروں بھری شام میں وقاص کو دیکھ کر اسے اپنے ڈیڈی کی ملال پر سچ کا گمان ہوا تھا۔

صدا کی بولڈ' بے باک' حاضر جواب ماہ رو وقاص کے مقابل آتے ہی سارے الفاظ بھول سے گئے تھے۔ بھلا اسے کیا تعارف کرواتی؟ کیا یہی کہ تمہارا پروزل میرے لیے آیا تھا؟ یا پھر میں نے شازمہ کی چڑ میں بغیر سوچے سمجھے انکار کر دیا تھا۔ اور اب ڈیڈی کی خاطر وہ کچھ پچھتا بھی رہی تھی۔ یہ سارے الفاظ اس کے ذہن میں گڈمڈ ضرور ہو رہے تھے' لیکن کہنے کے لیے کچھ مزید انرجی کی ضرورت تھی۔ پھر نہ جانے کیسے اس نے چند الفاظ میں معذرت کے لیے ایک پیرا گراف ترتیب دے لیا۔ جس میں اس نے اپنی انا کو ہر صورت سربلند رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وقاص جیسے سمجھ گیا تھا۔ وہ واقعی بہت ذہین اور ڈیسنٹ انسان تھا۔ انتہائی خوش خلقی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اور یہ منظر شازمہ کو ایک مرتبہ پھر تیر کی طرح دل میں لگا تھا۔ وہ وقاص اور ماہ رو کو ایک ساتھ دیکھ کر شدید ناگواری محسوس کر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ان دونوں کو ایک جگہ کھڑا بھی نہ ہونے دے۔ بڑے طریقے سے وقاص تک اپنا مدعا پہنچا دینے کے بعد ماہ رو کو یقین نہیں تھا کہ اس کی امی دوبارہ اس کی طلب گار بن کر آجائیں گی۔ پھر بھی ڈیڈی کے لیے ایک کوشش کر لینے میں حرج کیا تھا؟ ستاروں بھری اس شام کے اختتام پہ ماہ رو کچھ خوش فہمی کا شکار ہو چکی تھی کہ شاید ڈیڈی کی خواہش پوری ہو جاتی۔ کیونکہ وقاص کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

لیکن اس کی یہ خوش فہمی اس وقت تمام ہو گئی تھی جس وقت وقاص کی امی ان کے گھر آئی ضرور تھیں مگر وقاص کی منگنی کا کارڈ لے کر۔ تب ماہ رو کو ایسی چبھن تو محسوس نہیں ہوئی تھی جس قدر شازمہ کے رویے نے اسے ہتک کا احساس دلایا تھا۔ وہ بلاوجہ ایک سے زیادہ کئی مرتبہ جتا چکی تھی۔

"وقاص کا رشتہ ہوئے تو ڈیڑھ ماہ ہو چکا۔ تم کس گمان میں تھیں۔ وہ تمہارے حسین سراپے کو دیکھ کر رشتہ توڑ دے گا۔" شازمہ کا استہزائیہ انداز ماہ رو کو پہلی مرتبہ ایک کمپلیکس کا شکار کر گیا تھا۔ وہ اسے محبت نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتی تھی تو کم از کم اپنی زبان سے تو محفوظ رکھتی۔ پہلی مرتبہ ماہ رو کو احساس ہوا تھا کہ ڈیڈی اس کے لیے کوئی درمیانہ گھر اور درمیانہ "بر" کیوں تلاش کر رہے تھے؟ اس لیے کہ ڈیڈی کو احساس ہو چکا تھا انہوں نے ماہ رو کو ایک "ایب نارمل" زندگی اور "ماحول" دے رکھا ہے۔ شاید وہ اس کی پچھلی زندگی میں در آنے والی محرومیوں کا ازالہ اسی طرح سے کرنا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ماہ رو ان ہی کی سوسائٹی کے کسی پروردہ شخص کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ سو ماہ رو سرفراز کا اپر کلاس کی ہر اچھائی برائی سے مرقع اور نمائندہ باپ ان دنوں کسی اپر مڈل کلاس فیملی میں ماہ رو کا رشتہ تلاش کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عون عباس کے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے کوئی زندگی کا مقصد حیات نہیں تھا' لیکن اب جیسے دل کی نگری بدلتے ہی اندر باہر کے موسموں میں رنگینی آگئی تھی۔ یوں لگتا تھا ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ ابھی تو اس یک طرفہ محبت نے ہر احساس کے رنگ کو تبدیل کر دیا تھا۔ اگر اسے یقین ہو تا کہ محبت دو طرفہ بھی ہے تو جانے ماہ رو سرفراز کہاں کہاں اور کس کس مقام پہ سرفراز ہو جاتی؟ لیکن محبت دو طرفہ کہاں تھی؟ کبھی ایک وقت تھا وہ فلسفوں کو کان جھاڑ کر گرا دیتی اور نخوت سے سر جھٹک کے آگے بڑھ جاتی تھی' لیکن اب ماہ رو سرفراز پہ کوئی اور ہی وقت آیا ہوا تھا۔ یوں

لگتا ہر کہانی، ہر لفظ، ہر حرف ہر فلسفہ اسی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اسی کے لیے لکھا گیا ہے۔ اسی کے لیے محفوظ کیا گیا ہے۔

اور کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مقصدیت انسان کو توانا کردیتی ہے۔ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھی بے دار کردیتی ہے۔ منزل چاہے ان دیکھی ہو، لیکن جب منزل کا تعین کرکے اس کی راہ پر گامزن ہوا جاتا ہے پھر زاد راہ کی بھی سمجھ آجاتی ہے اور رستوں کی رکاوٹ بھی خود بخود دور کرنا آجاتا ہے۔ مقصد کو پانے کے لیے بس خلوص کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور ماہ رو اس فلسفے کے لفظ لفظ سے طاقت اور توانائی حاصل کرتی تھی۔

اسے یقین تھا۔ راستوں کی رکاوٹیں خود بخود دور ہوجائیں گی۔ منزل قریب آجائے گی۔ کیونکہ اس کی اچانک سونامی کی طرح بپھری محبت میں جنون بھی تھا اور جذبہ بھی خلوص بھی تھا اور عشق بھی۔۔۔ پھر یہ عشق کی تپش کسی اور تک بھلا کیوں نہ پہنچتی؟

یہ آگ، یہ گرمی، یہ جلن، یہ تپش بہت حیران کن انداز میں سب سے پہلے فریحہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ فریحہ جو ماہ رو کے اچانک بدل جانے والے انداز، رویے اور مزاج پہ حیران تھی۔ صرف لمحوں کی دیر میں گم صم اور حواس باختہ ہوگئی تھی۔ ماہ رو کا وہ حسین چہرہ وہ دل نشین آنکھیں جن کے ہر رنگ میں عون عباس کے لیے محبت ڈھلتی اور پھیلتی تھی۔ وہ "چاہ" جو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یوں ہی ایک اجلی دوپہر فریحہ کی ماں اس کا بازو دبوچ کر کمرے میں لے آئی تھی۔ فریحہ کی طرح اس کی ماں بھی حواس باختہ تھی۔ ان کا چہرہ سپاٹ نہیں تھا، وہاں بے چینی تھی۔ اضطراب تھا اور وہ ٹٹول ٹٹول کر اپنی بیٹی کا عام سا بہت سادہ چہرہ بغور دیکھتیں۔ وہاں بھی الجھن تھی اور ایک بے نام سی بے چینی تھی۔ ایک چھلک پڑتا خوف تھا۔ کچھ کھودینے کی ویرانی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس کی اٹھارویں کال آئی تھی۔ وہ اسی طرح متواتر کال کررہی تھی۔ کبھی کسی بہانے کبھی کس بہانے سے، وہ ہر روز کال کرتی تھی۔

دن میں کئی کئی مرتبہ اور جب زیادہ بے چین ہوتی تو بہ نفس نفیس پہنچ جاتی۔ گو کہ گھر میں کائنات سمیت ہر ایک کو اس کی آمد بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ثنا اور مریم بھابھی تو بہت ہی والہانہ خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔ کیونکہ ماہ رو جب بھی آتی ان کے گھر میں ایک نیا کپڑوں کا اسٹائل اور فیشن متعارف کروا جاتی تھی۔ اس سہ پہر بھی وہ تین گھنٹے تک اپنے دلفریب وجود کی مہک بکھیر کر گئی تھی۔ اس کی خوش مزاجی نے گھر بھر کو اس کا گرویدہ کردیا تھا۔ کائنات اور ثنا کو تو خاص طور پہ ماہ رو کا انتظار رہا کرتا تھا۔ وہ دوپہر کو آئی تھی اور سہ پہر میں واپس گئی۔ کائنات، ثنا اور مریم بھابھی تو اسے جانے نہیں دے رہی تھیں، لیکن ظاہر سی بات تھی وہ رک نہیں سکتی تھی۔ جب ان تینوں نے اسے زیادہ مجبور کیا تو ماہ رو بہت دلربائی سے مسکرا کر بولی۔

"میرا تو اپنا دل چاہتا ہے میں ہمیشہ آپ لوگوں کے گھر میں رہوں۔" اس کے لہجے کی معنی خیزیت نے کسی اور پر اثر کیا تھا یا نہیں کیا تھا، لیکن فریحہ کو لمحوں میں فریز کردیا تھا۔ اس کا دل لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر چل پڑا۔ ماہ رو کی بات کا بھلا کیا مفہوم تھا؟ وہ اس کے گھر میں ہمیشہ کے لیے کیوں رہنا چاہتی تھی؟ کیا فریحہ کا گھر ماہ رو کے رہنے، قیام کرنے اور ٹھہرنے کے قابل تھا؟ اور پھر وہ اس گھر میں رہے گی کیوں؟ آخر کیوں؟ کس لیے؟ کس کی خاطر؟ کیا فریحہ کے لیے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔ تو پھر آخر کون تھا جس کے لیے ماہ رو فریحہ کے اس گھر میں رہنا چاہتی تھی۔ جہاں پرائیویسی نام کی نہیں تھی۔ ہر وقت شور اور ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ کھانے کے وقت جب گھر کے سب افراد دسترخوان پہ اکٹھے ہوتے تو میلے کا سا گمان ہوتا۔ یوں لگتا کسی کی بارات آئی ہے۔ جس گھر میں ایک وقت میں دیگ کے برابر کھانا پکتا تھا اور جس گھر کے افراد ایک دوسرے سے ریشوں کی مانند جڑے ہوئے تھے ماہ رو جیسی ہستی اس گھر میں قیام کرنا چاہتی تھی؟ کیوں آخر کیوں؟

فریحہ کا دل رکتا کیوں نا۔ اس کے اندر باہر وسوسوں کا مینہ برس رہا تھا۔ ماہ رو کی بات پہ ثنا نے بھرپور قہقہہ

لگا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

"ایسی حسین شہزادی کو اپنے گھر میں ہمیشہ کے لیے رکھنا ہمارے لیے ایک اعزاز ہو گا ماہ رو۔۔۔" ثنا نے بھی بڑے معنی خیز انداز میں جواب دیا تھا۔ پھر ماہ رو چلی گئی۔ اپنی خوشبوؤں کی مہکار چھوڑ کر اپنی موجودگی کا روح میں اتر جانے والا احساس چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کے چلے جانے کے بعد بھی دو تین گھنٹے تک ماہ رو پہ بحث کرنا ان کے گھر والوں کا معمول بنتا جا رہا تھا۔ وہ سب ماہ رو پہ تبصرے کر رہی تھیں سب کو وہ بہت لونگ' میریان لگتی تھی اور فریحہ ایسے تبصروں پہ شاکڈ رہ جاتی تھی۔ گو کہ وہ سب ٹھیک ہی تبصرے کرتی تھیں ظاہر ہے وہ لوگ جو دیکھ رہی تھیں اسی تناظر میں کمنٹس دیتیں۔ یہ تو فریحہ جانتی تھی وہ تو مرقع غرور ہوا کرتی تھی۔ یہ تبدیلی تو رحمان منزل میں آنے کے بعد دکھائی دی تھی۔ جو اس کی خوبیوں میں ادغام کر کے منظر عام پہ روشن ہو گئی۔ تو پھر یہ اتنی بڑی تبدیلی فریحہ کو کھٹکتی کیوں نا؟ آخر اس "بدلاؤ" کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور تھا؟ اور وہ سبب کیا تھا؟ فریحہ اس کھوج میں نہ پڑتی تو کیا کرتی؟ اور اس نے ثنا کے الفاظ کو ایک مرتبہ پھر ماہ رو کے چلے جانے کے بعد دہرایا بھی تھا۔

"ماہ رو کو تم دیورانی بنانا چاہتی ہو مگر کیسے؟" یہ سوال کرتے ہوئے اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ثنا کچھ حیران ہوئی تھی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"عون عباس کو تم نے پاؤنڈ کر رکھا ہے۔ عاشر تو ہے نا۔۔۔ عون سے ذرا کم، مگر بے حد ہجیلا' اتنا خوب صورت۔" ثنا نے ذرا بلند آواز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یوں کہ اندر آتا عون عباس لحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔ ایک تو پورے کمرے میں ڈنبل ڈائمنڈ کی خوشبو چکرا رہی تھی۔ انتہائی روح پرور' دل میں اتر جانے والی۔ حواسوں پہ چھا جانے والی۔ اتنی مہنگی اور دلفریب خوشبو۔ عون عباس نے اندر آتے ہوئے ثنا کے کچھ الفاظ سن لیے تھے۔ پھر ان ہی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ عاشر کو کیوں مسکہ لگایا جا رہا ہے؟"

"مسکہ تو سامنے لگاتے ہیں پیٹھ پیچھے نہیں' میں تو اپنی دیورانی کی سلیکشن کر رہی ہوں۔" ثنا نے ذرا اترا کر بتایا تھا۔ عون عباس بھی ذرا متاثر ہوا۔

"اچھا۔۔۔ تو میں بھی سنوں۔۔۔ عاشر کی قسمت کہاں پھوٹنے کا ارادہ رکھتی ہے؟" اس کا انداز ذرا شرارتی تھا۔

"کرنی تو ہم نے تمہاری تھی۔۔۔ لیکن چونکہ تم پالنے میں فریحہ بنو سے منسوب ہو چکے تھے۔ اس لیے ہم نے عاشر کے لیے ماہ رو کو منتخب کر لیا ہے۔" ثنا نے برجستہ کہا تھا۔ عون عباس بیٹھتے ہوئے اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے پہ حیرانگی ہی حیرانگی تھی۔

"ماہ رو؟ وہی۔۔۔؟" اس نے وہی کو اتنا لمبا کھینچا کہ ثنا کو اس کے کندھے پہ دھپ لگانی پڑی تھی۔

"کیا وہی ماہ رو؟ جو مل اونر کی بیٹی ہے۔ فریحہ کی بے ہودہ سہیلی۔۔۔ جینز پہ ٹاپ چڑھا کر فضول پھرتی ہے۔" عون کا موڈ خاصا بگڑ گیا تھا۔ ماہ رو کے بارے میں عون کے جذبات ملاحظہ کر کے اندر کہیں فریحہ کے من میں عجیب سا سکون اتر آیا تھا۔ گھر میں کوئی تو تھا جو ماہ رو کے متاثرین میں شامل نہیں تھا۔ اک گونا اطمینان نے فریحہ کی آنکھوں میں بسیرا کر لیا تھا۔

"چھوڑو بھی' اتنی تو حسین ہے۔۔۔ اور خوب صورت لوگوں کو سب کچھ پہننے کا حق ہے۔" مریم نے بے تکی سی بات کہی تھی۔ عون عباس کی آنکھوں میں استہزا سا پھیل گیا۔

"خوب صورتی کا مطلب کیا یہ ہے آپ حسن کی تشہیر کے لیے فضول لباس پہن کر آوارہ پھریں۔" اس نے انتہائی تلخ لہجے میں جواب دیا تھا پھر فریحہ سے مخاطب ہوا۔

"تم اس سے میل جول ذرا کم ہی رکھو۔" خاص طور پر فریحہ کو تنبیہہ کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا جبکہ بھابھیوں کے منہ اتر گئے تھے۔

"بڑا ہی زاہد خشک ہے۔ ورنہ ماہ رو کو دیکھ کر تو بچے میرڈ حضرات کا بھی ایمان ڈول جائے۔ رات کو قاسم

بھی ماہ رو کی تعریف کر رہے تھے۔" ثنا کو نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا اور فریحہ کے دل اور ذہن سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا۔ وہ تو یہ تک بھی بھول چکی تھی کہ ماہ رو کو کل صبح گیارہ بجے رحمان پلازہ جانا تھا اپنے لیے سوا لاکھ کا نیا موبائل لینے۔ بلاوجہ اور بے مقصد ہی۔

☆ ☆ ☆
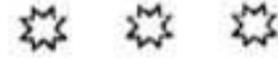
تایا نے اگلی صبح فریحہ سے بڑے پیار اور محبت سے ناشتا کرتے ہوئے کہا۔

"فریحہ! اب تم کالج مت جایا کرو۔ نوکری کا شوق تو پورا ہوا۔ ہم تمہاری شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔" فریحہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ تایا کا حکم نامہ سنا تھا اور پھر اندر جا کر چادر اور پرس اتار کر رکھ دیا اس کے خاندان میں بے ادبی یا نافرمانی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ایک دفعہ تایا نے اس کی بات مانی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے تایا کی بات مان لی۔ ویسے بھی گھر میں اس کی شادی کے تذکرے چل رہے تھے۔ تائی اور کائنات وغیرہ بہت پرجوش تھے۔ گھر میں پھر سے خوشی کے شادیانے بجنے والے تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور عون عباس بہت لاڈلا اور فرماں بردار بیٹا۔ دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے کرنے کا ارادہ تھا۔ ابا اور تایا بھی بہت خوش تھے۔ اور فریحہ کی امی تو جیسے شکر کر کے نہیں تھک رہی تھیں۔ اس رات امی نے ایک مرتبہ پھر اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"میں تو ڈر رہی تھی فریحہ! تمہاری تائی، کائنات اور بہوئیں اس ماہ رو پہ فریفتہ ہو چکی تھیں مجھے خوف تھا شاید وہ لوگ رشتہ ہی نہ توڑ دیں۔ آخر ماہ رو کی چمک دمک کے سامنے تم کہاں ٹھہر سکتی ہو۔ میرا دل تو مانو بڑا بے قابو تھا، لیکن صد شکر کے بھابھی وغیرہ کی نیت نہیں بدلی۔" امی نے اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ فریحہ نے سکون سے ان کے کندھے پہ سر رکھ لیا۔

"یہ ممکن تھا کیا امی! تایا اور تائی کی محبت اور نیت پہ کیوں شک کر رہی تھیں۔ وہ مجھ پہ کبھی کسی ماہ رو کو فوقیت نہیں دے سکتے۔ آپ فکر مت کریں۔ عون میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔" اس کی آواز مدہم ہو کر بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ دل میں سکون ہی سکون تھا۔ وہاں کوئی بھی خدشہ ڈگمگا نہیں رہا تھا۔

"تو اور کیا.... میں تو وہم میں پڑ گئی تھی۔ ماں ہوں نا کیا کروں؟ دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا تھا۔ تم نے دیکھا نہیں.... اس کے یہاں پھیرے اور چکر۔" امی کو اور بھی بہت کچھ یاد آگیا۔

"وہ ہمیشہ عون کی غیر موجودگی میں آتی تھی۔ اب بھلا کیا خاص بات ہوگی؟" جو بھی تھا۔ ان کا وہم بے جا نہیں رہا تھا۔

"وہ ڈپریسڈ تھی امی! یہاں اس کا ماحول چینج ہو جاتا تھا۔" فریحہ نے اپنے خدشات کا ذکر کر کے ماں کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔

"مگر مجھے عون پہ پورا اعتماد ہے۔" اس کے لہجے میں تفاخر بول رہا تھا۔

"ہاں ماشاء اللہ۔ ہمارا عون ایسے ویسے کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔" امی نے جیسے غائبانہ عون عباس کی بلائیں لی تھیں۔

"ویسے یہ ماہ رو.... اس کے انداز، مجھے کچھ کھٹک ضرور رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا یا اس کے دل میں کچھ چھپا تھا۔" امی کو پھر تھوڑی دیر بعد خیال آگیا۔

"آپ وہم میں نہ پڑیں۔" فریحہ نے لاپروائی دکھائی۔

"تم بھی باہر نکلنا بند کر دو اور ماہ رو سے رابطہ بھی۔" انہوں نے جیسے تنبیہہ کی تھی۔ فریحہ ذرا چونک گئی۔

"اتنا اچانک تو رابطہ ختم نہیں کر سکتی۔ ہاں شادی کے بعد نہیں رکھوں گی۔ امی! اچھا بھی تو نہیں لگتا۔ اتنے سالوں کا ساتھ ہے۔ پھر اس کی ثنا اور مریم سے بہت اٹیچ منٹ ہو چکی ہے۔ وہ لوگ بھی ماہ رو سے کانٹیکٹ میں ہیں۔" فریحہ نے اس نکتے کی طرف امی کی توجہ مبذول کروائی تھی۔

"چلو، اللہ بہتر کرے گا۔ تم پریشان مت ہو۔" انہوں نے فریحہ کی پیشانی چوم لی تھی۔

"آپ بھی عون کے حوالے سے پریشان مت

ہوں۔ وہ تایا کے لبوں سے نکلنے والے فرمان کو حکم کا درجہ سمجھتا ہے۔ تایا جو کہیں اس پہ آنکھ بند کرکے عمل کرتا ہے۔ کبھی اس نے تایا کے سامنے سر نہیں اٹھایا۔ وہ اسے کنویں میں کودنے کے لیے بھی کہیں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔" فریحہ نے اطمینان سے آنکھیں موندلی تھیں۔ اس کے لہجے میں یقین بول رہا تھا اور اس کا یقین باطل نہیں تھا۔ واقعی ہی عون تایا کے سامنے سر نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ اسے کنویں میں کودنے کے لیے کہتے اور وہ کود پڑتا۔ (کیونکہ عون عباس بہت شروع میں بہت سارے معاملات میں ہٹ دھرمیاں دکھانے کے اب اب سدھر چکا تھا) اور پھر وقت اسے اس انتہائی موڑ پر بھی لے آیا تھا جب فریحہ کا یقین باطل نہ ہوسکا اور عون عباس کو تایا کے کہنے پہ کنویں میں کود جانا پڑا۔ زہر سے بھرا جام لبوں سے لگانا پڑا۔

☼ ☼ ☼

یہ بڑی چمکیلی سی شام تھی۔ کچھ کچھ گلابی اور رنگین بھی۔ ماہ رو آج بڑی ترنگ کے عالم میں تیار ہوئی تھی۔ اس نے سلیولیس شرٹ کے ساتھ بلیک ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ لمبے حسین مشک بار بال کمر پہ جھول رہے تھے۔ میک اپ سے مبرا چہرہ دودھ سے دھلا اور گلاب سے تر تر لگتا تھا۔ اس کی بھیگی پلکیں اور لمبی گہری آنکھیں اس کے حسن کا مکمل سنگھار تھیں۔ سفید ملائم پیروں میں ہائی ہیل پھنسا کر جب وہ ایک خاص ترنگ میں نیچے آئی تو شازمہ نے اسے کچھ خاص ادا سے دیکھا تھا۔ آج شازمہ کو ماہ رو میں کچھ تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی خاص مقصد کے لیے جارہی تھی یا کسی خاص فرد سے ملنے کو جارہی تھی۔ ماہ رو اس کے قریب سے گزری تو شازمہ نے بے ساختہ اسے روک لیا تھا۔

"ماہ رو جان! کہاں کی تیاری ہے۔ آج کہیں خاص جارہی ہو؟"

"فریحہ کی طرف۔"

"اتنا رومانٹک تیار ہو کر؟" شازمہ کی معنی خیزیت میں دوستانہ قسم کا ایک دانہ سا تھا۔ جس کی ہڑک میں وہ چکنی ہوئی بڑی آسانی سے پھنس سکتی تھی۔ شازمہ کو اناڑی عاشق کو گھیر لینے کے بڑے داؤ پیچ آتے تھے۔ سو ذرا سا تردد کرنا پڑا تھا۔ ماہ رو خود بخود رام ہوگئی تھی۔ پھر سچ تو یہ تھا ڈیڈی تک اپنی خواہش پہنچانے کے لیے اسے شازمہ کا سہارا تو درکار تھا۔ شازمہ کے بغیر بات آگے بڑھنا ناممکن تھی۔ اسے شازمہ کو اعتماد میں لینا ہی تھا۔ پھر ابھی کیوں نہیں؟ حالانکہ وہ سوچ رہی تھی ایک مرتبہ عون سے بات کرلے گی پھر ڈیڈی اور شازمہ کو بتائے گی۔ اسے امید تھی ڈیڈی ہلکے پھلکے اعتراض کے بعد مان ضرور جائیں گے۔ انہیں صرف عون عباس کے "کاروبار" پہ اعتراض ہوسکتا تھا مگر عون پہ کبھی نہیں۔ اتنا یقین تو ماہ رو کو بھی تھا ہی۔ پھر تھوڑی سی پس و پیش کے بعد ماہ رو نے شازمہ کو عون عباس کی فیملی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ وہ فریحہ کا کزن ہے اور اس نے پہلی مرتبہ عون عباس کو رحمان پلازہ میں دیکھا تھا۔ شازمہ تو سن کر بڑی ایکسائٹڈ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"بائی گاڈ! تمہارے ڈیڈی کو ایسا ہی داماد چاہیے۔ جو اپر مڈل کلاس سے ہو۔ تم سے دب کر رہے۔ اور تمہاری عزت کرے۔ تم نے اچھا ہاتھ مارا ہے ماہ رو۔" شازمہ کے تعریف بھرے انداز بھی اپنے جیسے ہی تھے۔ گو کہ وہ سردھن رہی تھی اور ماہ رو کی پسند کو سراہ رہی تھی۔ پھر بھی ماہ رو کو بہت عجیب لگا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟ ڈیڈی مان جائیں گے۔" ماہ رو نے کچھ متفکر انداز میں پوچھا تھا۔ اسے ڈیڈی کی طرف سے خاصے خدشات تھے۔

تمہارے لیے من پسند رشتے کی تلاش میں سرفراز خاصا خوار ہوچکا ہے۔ آئی تھنک وہ مان جائے گا۔" شازمہ کے تسلی دینے والے انداز بھی جداگانہ قسم کے تھے۔ ماہ رو کی تسلی تو ہوگی۔ کیونکہ شازمہ جو کہہ دیتی تھی۔ ویسا ہو کر رہتا تھا۔

"تم عون عباس کی فکر کرو۔ اس سے کہو، اپنا

پرپوزل بھیجے۔ باقی کام میرے سپرد۔ دیکھنا' تمہارے ڈیڈی کو کیسے مناتی ہوں۔" شازمہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ گوکہ ان دونوں میں اچھے تعلقات کبھی نہیں رہے تھے پھر بھی ماہ رو کو اپنا رویہ کچھ اور بدل کے تعلقات بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ فیوچر قریب میں اسے شازمہ کی کافی خدمات حاصل کرنا تھیں۔ ماہ رو بہت اطمینان کے ساتھ سارا بوجھ سر سے اتار کر عون عباس سے ملنے جا رہی تھی۔ یہ ملنا موبائل خریدنے کے بہانے سے تھا۔ اسے امید تھی' اس ملاقات سے اگلی ملاقات تک وہ اپنا حال دل عون عباس تک پہنچا دے گی۔ اس کے بعد فریحہ کو اعتماد میں لے گی۔

اس کے ارادے بہت ٹھوس اور مستحکم تھے۔ اسے اپنی نیت اور محبت پر پورا اعتماد تھا۔ ماہ رو کو یقین تھا اس کی محبت کبھی ٹھکرائی نہیں جائے گی۔

ماہ رو کو با اعتماد قدموں سے باہر جاتا دیکھ کر شازیہ بڑی ادا سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جس کو سمجھنا ماہ رو جیسے اناڑیوں کا کام نہیں تھا۔

☆☆☆

رحمان پلازہ کی ٹھنڈی پلاسٹر آف پیرس کی چھت تلے چلنا بڑا دشوار قسم کا کام تھا۔ دل پہ عجیب گھبراہٹ سوار تھی۔ ہتھیلیوں میں بار بار نمی سی اتر آتی۔ چہرہ انتہائی گرم اور سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے آگ کی لپیٹیں اٹھ رہی تھیں۔

ماہ رو کا ایک دفعہ تو دل چاہا الٹے قدموں واپس پلٹ جائے لیکن پھر اس کا ازلی اعتماد عود آیا تھا۔ گوکہ اس نے فریحہ کو ساتھ لانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن فریحہ فون پہ مل کے نہیں دے رہی تھی۔ پھر یہ جانا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پھر کچھ سوچ کر خود ہی پل صراط تک آ گئی۔ جب چلنا خود تھا اور جلنا بھی خود تھا تو پھر کسی سہارے کو کیوں تلاش کرتی؟

آدھا گھنٹا بے مقصد اوپر نیچے گھومنے کے بعد بالآخر اس نے ایک سیل بوائے سے عون عباس کے بارے میں پوچھ ہی لیا تھا۔ اس لڑکے نے اسے سیکنڈ فلور کا بتایا۔ دل کڑا کر کے ماہ رو سیکنڈ فلور پر آ گئی تھی۔ یہ بھی جگمگاتا فلور تھا۔ ساری مشینری' الیکٹرونکس کے سامان سے بھرا ہوا۔ یہاں بھی بلا کا رش تھا۔ اور لوگ دھڑا دھڑ جہیز پیکیجز خرید رہے تھے۔ کیونکہ آج کل شادیوں کا سیزن تھا۔

ایک طرف کمپیوٹرز' لیپ ٹاپ' اور موبائل وغیرہ شو ریکس میں سجے تھے۔ وہیں کارنر پہ خوب صورت ریوالونگ چیئر پہ عون عباس بیٹھا دکھائی دے گیا تھا۔

اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔ نیلگوں روشنی کا عکس اس کے مغرور وجیہہ چہرے کو روشن کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں بے انتہا منہمک تھا۔ جیسے اسے اردگرد کی پروا نہیں تھی۔

ماہ رو جیسے لمحوں میں تھم گئی تھی۔ پھر بے خودی سی عون عباس کو دیکھے گئی۔

یہ محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ماہ رو جیسوں کو بے بس کر دیتی تھی۔ بھکاری بنا دیتی ہے۔ آخر یہ محبت کیا بلا ہے؟

اس قدر لاچار کر کے پبلک پلیس پہ ماہ رو جیسی پارہ صفت کو' نہ آگے بڑھنے دے' نہ پیچھے ہٹنے دے۔ یہ محبت آخر کیا ہے؟

یہ دل کی آواز تھی۔ جس نے یہاں سے وہاں تک کا سفر با آسانی کر لیا تھا۔ اور کسی کی آگ آگ نگاہوں کی گرمی آگ' حدت اور تپش نے عون عباس کو گردن گھما دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

کسی میکانکی کیفیت میں وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر تھم گیا۔ کیا اس کے دل پہ کوئی واردات ہوئی تھی؟ یا پھر ماہ رو کے عشق کی گرمی نے مقناطیس کی طرح عون عباس کے دل کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تھی؟ جو بھی تھا۔ عون عباس نے نادانستہ کسی اور ہی گیان و دھیان میں بلا ارادہ اپنے دل کے مقام پر لمحہ بھر کے لیے ہاتھ ضرور رکھا تھا۔

گویا وہ تھم گیا تھا۔ ایک طوفان تلے آنے سے بچ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے اچانک اتر آنے والے زلزلے کے آثار تک نہیں رہے تھے۔ وہ لمحوں میں سنبھل گیا تھا۔ وہ لمحوں میں بدل گیا تھا۔

کچھ دیر پہلے ماہ رو نے اس کی آنکھوں اور چہرے پہ الوہی رنگ اترتے دیکھے تھے۔ لیکن اس وقت وہ وجیہہ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ انتہائی سخت، روڈ، اجنبی اور بیگانہ۔ یوں جیسے پہچانتا ہی نہ ہو۔

ماہ رو کو چلتے چلتے اور کاؤنٹر تک جاتے جاتے چکر سے آ گئے تھے۔ وہ اسے دھیان سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے قطرہ قطرہ دل میں اتارنا چاہتی تھی۔

ماہ رو کو یاد تھا اور اسے آج بھی یاد تھا۔

اس وقت عون عباس نے بلیک ٹو پیس پہن رکھا تھا۔ اس کی شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا۔ اس نے بڑے اہتمام سے شیو بنا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر تازہ شیو کی نیلاہٹیں بہت واضح تھیں۔ اس کی رنگت انتہائی سرخ اور انتہائی سفید تھی۔ اور آنکھیں سیاہ آسمانوں جیسی۔ اتنی وسیع اور بہت گہری۔ ماہ رو کا دل ڈوبا اور پھر کبھی ابھر نہ سکا۔ عمر بھر کے لیے ڈوب گیا۔ رنگین سی آنکھوں کا اسیر ہو گیا۔ ماہ رو کو یاد تھا۔ آج بھی یاد تھا۔

وہ موبائل فون خریدنے کے لیے عون عباس کے قریب گئی تھی اور اپنا متاع دل بیچ آئی۔ اپنی انا، وقار اور عزت نفس بیچ آئی۔ وہ خود کو پورا پورا نیلام کر آئی۔

کو کہ اس نے موبائل فون خریدنے کے لیے ہی عون عباس سے کلام کیا تھا۔ وہ پورا گھنٹا موبائل فون کا بہانہ بنا کر عون عباس سے کلام کرنا چاہتی تھی۔ گفتگو کو طویل کرنا چاہتی تھی۔ اور اپنا مدعا بیان کرنا چاہتی تھی۔ اپنا حال دل سنانا چاہتی تھی۔

لیکن کچھ بھی نہ کر سکی۔ کھڑی کھڑی بس ساکت رہ گئی تھی۔ اور وہ اس کی انا اور غرور کو پیر تلے روند کر چلا گیا تھا۔ جاتے وقت اس نے اپنے بھائی عاشر سے محض اتنا کہا تھا۔

"میڈم کو ان کی پسند کا فون دکھا دو۔"

اس نے مزید کچھ بھی نہیں کہا۔ اس سے بیوپار تک کی بات بھی نہیں کی۔ کلام تک گوارا نہیں کیا۔ وہ اسے ایک کسٹمر جتنی اہمیت دیے بغیر ایسے گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔ وہ پون گھنٹہ کھڑی رہی۔ ڈیڑھ گھنٹا پورے پلازہ میں بے مقصد گھومتی رہی۔ دو گھنٹے گاڑی میں جلتی رہی۔ چار گھنٹے محض اندر کی آگ اور تپش کو بجھانے کی خاطر سڑکوں کو روندتی رہی۔ اور اگلے چوبیس گھنٹے لگاتار روتی رہی۔ روتی رہی۔ صرف اتنی سی بات پر کہ عون عباس نے اسے ایک کسٹمر جتنی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔

اس نے نیا خریدا ہوا موبائل پرزے پرزے کر کے ہواؤں کے سپرد کیا اور اسٹیرنگ وہیل پر سر رکھے رات بھر دیوانوں کی طرح روتی رہی۔ روتی رہی۔ عالم جنون میں روتی رہی۔



ہم سے کیسے درد کے قصے
ہم سے کیسے رنج کی بات
ہم پر بیتے کیا کیا موسم
تنہا دل لاکھوں آفات

کسی نے کہا اور سچ ہی کہا تھا۔ صرف ماہ رو سرفراز کے لیے کہا تھا۔

"محبت جنہیں یاد کرتی ہے، انہیں سدا سفر میں دوڑاتے پھرتی ہے، محبت صرف جوگ ہے۔" اور واقعی محبت صرف جوگ تھی۔ اور محبت صرف روگ تھی۔ وہ جان گئی تھی۔ اس پر برسات کے موسم اتر رہے تھے۔ دل ٹوٹ کے ہارا تھا۔ دل درد کا مارا تھا۔

کہیں چین نہیں تھا۔ کہیں امان نہیں تھی۔ آگ تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے دنوں میں سودائی ہو، پرائی ہو۔ وہ تو اکلوتی سہیلی فریحہ کے اندر اترتے موسموں سے بھی انجان اور بیگانہ تھی۔ دل نے بھیس کیا بدلا وہ ساری دنیا سے خفا اور ناراض ہو گئی۔

دوسری طرف فریحہ کو بھی چین کہیں نہیں تھا۔ گھر بھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف

ہنگامے اور رونقیں تھیں لیکن فریحہ کے من سے چین کا پنچھی نجانے اڑ کر کہاں چلا گیا تھا؟ اتنی دور گیا کہ لوٹا ہی نا۔ وہ سارا دن بولائی بولائی غمگین پھرا کرتی تھی۔

"تائی' امی اور بھابھیاں ان دنوں جہیز اور بری جمع کر رہی تھیں۔ وہ گھر میں کم کم ہی دکھائی دیتیں۔ اس دن بھی فریحہ اکیلی تھی۔ اور بہت ہی اکیلی تھی۔

بوگن ویلیا کے پھولوں کو چنتی جانے کیوں وہ ماہ رو کو ان دنوں اتنا تسلسل سے یاد کر رہی تھی۔ وہ ماہ رو جس کی بہت دن سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ نہ اس نے خود چکر لگایا تھا۔ جانے ماہ رو کس حال میں تھی؟ فریحہ کا دل جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے بجھتا جا رہا تھا۔

وہ اس وقت بھی بے چینی سے ماہ رو کو سوچ رہی تھی۔ وہ اتنی اچانک ہی آئی تھی اور اتنی اچانک ہی چلی جاتی تھی۔ شاید واپس ابراڈ چلی گئی تھی۔ بنا بتائے۔ بغیر اطلاع کے۔ اور فریحہ نے بھی تو ماہ رو کو شادی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ جانے کیوں امی نے اسے منع کر دیا تھا۔ ان کے وہی پرانے وہم اور وسوسے۔

وہ سر جھکائے پتی پتی اٹھا رہی تھی جب اچانک قدموں کی چاپ پہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ سامنے عون عباس کھڑا تھا۔ ویسا ہی مکمل' شاندار اور دلوں کو دھڑ دھڑ دھڑکانے والا۔ کافی کلر کے سوٹ میں آج بھی اتنا ہی تابناک اور عالی شان تھا۔

فریحہ کا دل بھر بھر آیا۔

اس گھر میں فریحہ کی عون سے بہت دوستی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک۔ وہ دونوں اپنی بہت سی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔

وہ اپنی یونی ورسٹی کے قصے اسے سناتا تھا۔ فریحہ دن بھر کی گوسپ اس کے گوش گزار کرتی تھی۔ جب وہ بڑے ہوئے تو پسندیدگی کچھ اور قربتوں میں ڈھل گئی۔ چونکہ والدین کی خواہش تھی سو دونوں نے کوئی بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایک رشتہ جڑا اور بندھ گیا۔

نہ تو عون عباس کا کوئی آئیڈیل تھا۔ نہ اس نے ایسی نگاہ سے کسی لڑکی کو دیکھنا چاہا تھا۔ گو کہ یونی ورسٹی میں بہت سی لڑکیاں محبت کا ہاتھ بڑھا کر ناکام لوٹی تھیں۔ وہ ہمیشہ محبت کے معاملے میں کورا ہی رہا تھا۔ بس جو والدین نے پسند کیا اس کو پسند کر لیا۔ اس پہ شکر کیا۔

کبھی نہ اپنی مرضی چلائی نہ پسند کے نام پہ والدین کو شرمندہ کیا۔ زندگی کے کلی اختیار والدین کو تھما کر مطمئن ہو گیا تھا۔ (کم از کم لڑکی پسند کرنے کے معاملے میں اس نے اپنے باپ سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا)

فریحہ عام سی تھی۔ سادہ تھی' خوب صورت نہیں تھی۔ جو بھی تھا۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں سب سے بڑی بات اس کے والدین کی پسند ضرور تھی۔ سو اس کی بھی پسند بن گئی۔

فریحہ کی سادگی' شرافت' وقار اور سیرت نے عون عباس کے لیے پسندیدگی اور چاہت کے سارے در خود بخود وا کر دیے تھے۔ پھر پیچھے رہ کیا جاتا تھا؟ محبت؟ جو شادی کے بعد خود بخود دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اور اس وقت بھی فریحہ کے انتہائی سادہ اور زرد چہرے کو دیکھ کر وہ شوخ ہونے کی بجائے کچھ متفکر ہو گیا تھا۔ فریحہ بھی اسے دیکھ کر کچھ گھبرا گئی تھی۔ آج کافی دنوں بعد سامنا ہوا تھا۔

"یہ تم نے بھوک ہڑتال کیوں کر رکھی ہے؟" اس نے متفکر انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ فریحہ کچھ اور گھبرا گئی تھی۔

"نہیں تو۔"

"پھر اتنا زرد کیوں ہوتی جا رہی ہو؟ کیا تمہیں شادی کے بعد کوہ قاف جانا ہے؟ بس ایک کمرہ بدلنا ہے۔" اس نے اب کی دفعہ ذرا مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

"میں نے کچھ غلط کہا؟"

"نہیں تو۔" فریحہ نے سابقہ الفاظ ہی دوہرا دیے۔

"پھر کھاتی پیتی کیوں نہیں؟ اتنی اپ سیٹ کیوں ہو؟" وہ نرمی سے استفسار کر رہا تھا۔ فریحہ کے دل کو ڈھارس سی پہنچی تھی۔ اس نے تھوک نگل کر بتایا۔

"کھاتی تو ہوں۔ ایسے ہی دل گھبراتا ہے۔" اپنے

دھیان میں اس نے دھیمی آواز میں کہہ دیا تھا۔ عون کے ہونٹوں پر تبسم سا بکھر گیا۔

''اوہ۔۔۔ اچھا' تو معاملہ دل کا ہے۔ میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔'' اس نے شرارتی انداز میں کہا۔

''تم کیا سمجھ رہے تھے۔؟'' وہ ذرا گھبرا گئی تھی۔

''کچھ نہیں۔ میں تو معدے کا معاملہ سمجھ رہا تھا۔ کھانا پینا جو چھوڑ رکھا ہے۔ سوچا تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دوں۔'' اس کی شرارت ہنوز برقرار تھی۔

''ایسی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ماہ رو کو سوچ رہی تھی۔'' بلا ارادہ ہی ایک فضول بات اس کے منہ سے اچانک پھسل گئی۔ بھلا یہاں ماہ رو کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ امی ہوتیں تو اسے اچھی طرح بتاتیں۔ کیا فریحہ سا بے وقوف اور احمق بھی کوئی اور تھا؟

''ماہ رو۔۔۔؟'' عون کی پیشانی پہ نامعلوم سی سلوٹ ابھر آئی تھی۔ وہ اس کے پلازہ میں آئی تھی۔ موبائل لینے' اور اس کے انداز' اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں۔ اف' ابھی تک اس کا اپنا دل کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ ایک مرد ہو کر اس کی ایسی کیفیت تھی۔

وہ آنکھیں۔ ان آنکھوں کے رنگ' حکایتیں' کہانیاں۔ افسانے' کچھ پیغام دیتے نئے راز۔ عون عباس کو لگا اگر وہ دوسری بھی غیر ارادی نگاہ ڈال گیا تو سرتاپا پگھل جائے گا۔ ان آنکھوں کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔ بہہ جائے گا۔ کبھی ابھر نہ سکے گا۔ کیسی افسانوی آنکھیں تھیں۔؟ اور کیسے رومانوی تاثر تھے۔

تب اس نے آنکھوں کے رخ موڑ لیے تھے۔ وہ ڈوبنا نہیں چاہتا تھا۔

اور وہ ان قاتل آنکھوں کے ''سم'' سے بچ بچا کر باحفاظت فریحہ کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

اور اس وقت فریحہ اسی سہیلی کا ذکر چھیڑ رہی تھی جس پہ ایک نگاہ نے اس کے زمان و مکان گھما ڈالے تھے۔ صرف ایک ہی غیر ارادی اچٹتی سی نگاہ کا اتنا سا کمال تھا۔ اور یہ ''کمال'' کیا کم تھا؟ اور کیا واقعی ہی کم تھا؟

''وہ موبائل لینے آئی تھی۔'' عون عباس کو بتانا ہی پڑا۔ فریحہ ٹھٹک گئی تھی۔ تو کیا واقعی ہی ماہ رو وہاں تک پہنچ گئی۔؟ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ وہ ٹٹولتی نگاہوں سے عین سامنے کھڑے عون کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ جیسے کسی انہونی کا راز پانا چاہتی ہو۔ لیکن اسے عون کے چہرے سے کچھ نہیں ملا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

''تم نے ماہ رو کو کیسا پایا؟'' فریحہ کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔ اسے گمان نہیں یقین تھا کہ عون عباس دو ٹوک الفاظ میں بس اتنی سی تشریح کرے گا۔ ''انتہائی فضول۔'' وہ ہمیشہ یہی کہتا آرہا تھا۔

عون اس کے سوال پر لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ وہ فریحہ کو کیا جواب دے؟ اس نے ماہ رو کو کیسے' کس طرح سے پایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی عکس لہرا گیا۔

عون عباس بھلا فریحہ کو کیا بتاتا؟ اس نے ماہ رو کو اب کی دفعہ کتنا عجیب اور مختلف پایا تھا۔ ادھر فریحہ جیسے جواب کی غرض سے الرٹ کھڑی تھی۔ جواب لیتے ہی اطمینان کی بانسری بجاتی اندر چلی جاتی۔ عون لمحہ بھر کے لیے سوچتا رہا۔ پھر باہر کی طرف نکلتے ہوئے محض اتنا سا بولا۔

''سرپھری۔''

☆ ☆ ☆
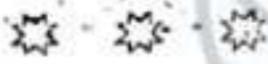
وہ تین دن بخار میں پھنکتی رہی۔ تین دن اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ تین دن اس نے عون عباس کی اتنی معمولی سی ''بے اعتنائی'' کا سوگ منایا تھا۔ اور اگر کبھی وہ سچ مچ جان بوجھ کر بے اعتنائی برتتا تو وہ ماہ رو کا حال کیا ہوتا؟ وہ مرجاتی کیا؟ اس کی سانسیں بند ہوجاتیں۔

پچھلے تین دن سے وہ کمرے میں بند پڑی تھی۔ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ اور پچھلے تین دن میں ہی ایسے اور اک ہوا تھا۔ وہ اپنے ڈیڈی کے لیے کس قدر قیمتی تھی۔ کس قدر انمول تھی۔ اور اس کے ڈیڈی

کسی اذیت میں مبتلا تھے۔ اسے تکلیف میں تڑپتا دیکھ کر کتنے بے چین تھے۔
اور شازمہ بھی خاصی متفکر دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ہی ڈیڈی بیڈ روم سے نکلے وہ لپک کر اس کے قریب آگئی تھی۔ پھر بہانے بہانے سے وہ عون کے بارے میں کریدتی رہی۔ جس ذکر سے ماہ رو بچنا چاہتی تھی وہی باربار ساعتوں میں اتر رہا تھا۔ عون عباس کے نام پر اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ شازمہ جیسے خود بخود سمجھ گئی تھی۔ مزید اس نے کریدا نہیں تھا۔ لیکن اتنا ضرور کہا۔
"اتنی آسانی سے ہار ماننے والے بزدل ہوتے ہیں۔ محبت اور جنگ میں سب جائز مانا جاتا ہے۔" اس نے جیسے ماہ رو کو ایک نئی راہ دکھانی چاہی تھی۔
اور ماہ رو ہر اس راہ کی طرف لپک سکتی تھی جو اسے عون عباس تک پہنچانے کا رستہ دکھاتی۔ اسے منزل تک لے جاتی۔
شازمہ نے اسے اکسایا تھا وہ بستر پہ بزدلوں کی طرح مت پڑے بلکہ ہمت اور بہادری کی نئی مثال قائم کرتے ہوئے عون عباس کی زندگی کے رخ موڑ دے۔ جو بھی تھا شازمہ کی باتوں نے ماہ رو کے اندر ایک نئی زندگی کی لہر دوڑادی تھی۔
وہ پہلے ہی مقام پہ دل ہار کے بستر پر پڑ چکی تھی۔ اسے اٹھنا ہی تھا۔ اور اپنے حصے کی خوشیوں کو وصول کرنا ہی تھا۔
کیا تھا اگر وہ تھوڑی سی عزت نفس کو ایک طرف رکھ کر بذات خود عون سے بات کر لیتی۔ وہ اسے بتا دیتی۔ کیسے اور کس طرح سے ماہ رو پہلی نگاہ کی محبت سے گھائل ہوئی تھی۔ اور وہ کس طرح سے بے دھڑک اس کے دل کی سلطنت کا مالک مختار بن گیا تھا۔
ماہ رو' شازمہ کے مجبور کرنے پہ ایک مرتبہ پھر رحمان پلازہ کی وسیع وعریض بلڈنگ کے نیچے اور اوپر ہر فلور پر گھوم رہی تھی۔
اسے آج بھی عون کا سامنا کرنے پر دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عون کے سامنے کس طرح
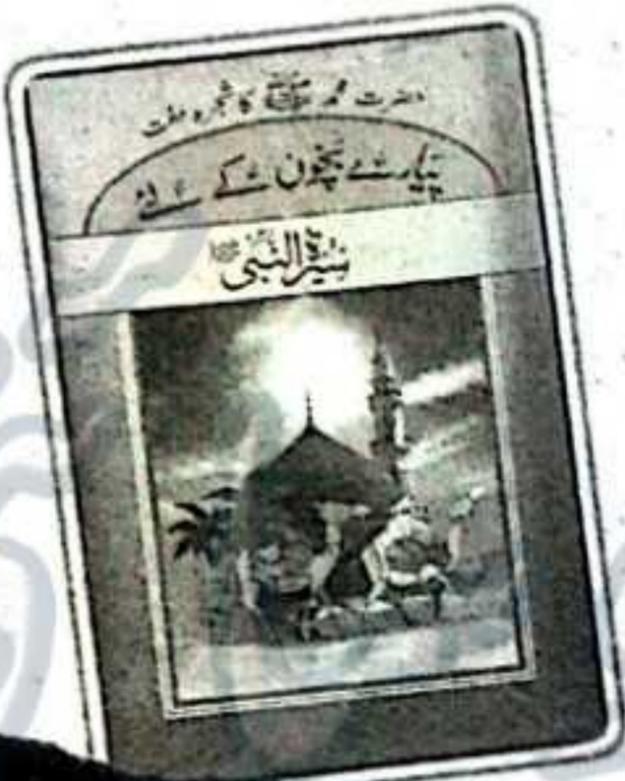
سے جائے گی؟ اور کس طرح سے اعتراف محبت کرے گی۔

گو کہ وہ بہت بولڈ تھی۔ بہت ماڈ تھی۔ بہت حاضر جواب تھی۔ لیکن مقابل بھی تو عون تھا۔ اسے سوچ و سمجھ کر اپنا اعتراف محبت اس کی سماعتوں میں اتارنا تھا۔

آج سیل بوائے اسے عون اور اس کے والد' چچا کے مشترکہ دفتر تک لے گیا تھا۔ اس کی خوش نصیبی کے سوا اور کیا تھا جو عون اسے دفتر میں اکیلا مل گیا۔ وہ کمپیوٹر پہ الیکٹرونکس مصنوعات کے نئے نئے ماڈل دیکھ رہا تھا۔

ڈبل ڈائمنڈ کے روح میں اتر جانے والے خوشنما جھونکے کو محسوس کر کے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور لحہ بھر کے لیے بھونچکارہ گیا تھا۔

سامنے فریحہ کی وہی سرپھری سہیلی کھڑی تھی۔ ویسی ہی دلفریب' معطر اور تروتازہ۔ لیکن وہ یہاں آئی کیوں تھی؟ اگر موبائل کی کوئی شکایت تھی تو موبائل کاؤنٹر پہ جاتی۔ وہیں مسئلہ لکھواتی۔ موبائل واپس کرتی۔ وہ یہاں اس دفتر میں کیوں آئی تھی؟

عون عباس کا میٹر جیسے لحہ بھر میں ہی گھوم گیا تھا۔

اس کی تیوریاں سی چڑھ گئیں۔ ماتھے پہ بل آگئے۔ غصے میں س کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی پھر بھی وہ خاصے تحمل اور ضبط کے ساتھ بولا تھا۔

"یہاں کیوں آئی ہیں؟ موبائل میں کوئی مسئلہ تھا تو باہر بتاتیں۔" اس نے محض فریحہ کی خاطر بہت تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ورنہ ایسی ویسی لسوڑا بنتی لڑکیوں کو تو منٹوں میں وہ سیدھا کر کے ان کی عقل ٹھکانے لگا دیتا تھا مگر اس وقت بڑے ضبط سے کھڑا تھا۔

"موبائل ٹھیک ہے۔" وہ بتا نہیں سکی تھی موبائل تو اسی روز ماہ رو نے پرزہ پرزہ کر دیا تھا۔

"تو پھر؟" عون نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

وہ جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑوانا چاہتا تھا۔

ماہ رو جیسے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ کیسے بات کرے؟ کس طرح سے کہے؟ لیکن اسے کہنا تو تھا۔ بولنا تو تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے آئی تھی اسے کیسے ادھورا چھوڑ کے جاتی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔" بالآخر ماہ رو نے اپنے ازلی اعتماد کا سہارا لیا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق اسے بے انتہا جھنجھلا ہوا۔

"کیا؟" وہ اس انداز میں کھڑا ہو گیا تھا جیسے بات سنتے ہی بھاگ کھڑا ہو گا۔ کم از کم اس کے انداز سے یہی لگ رہا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے عباس! آئی رئیلی لو یو۔ میں تم سے سچا پیار کرتی ہوں۔" ماہ رو نے اتنے آرام سے یہ الفاظ کہے تھے جیسے کہہ رہی تھی۔ "مجھے نزلہ ہو گیا ہے۔ جس کی دوائی چاہیے۔"

سامنے کھڑا عون عباس تو بھونچکارہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہی نہیں پورا وجود پتھرا گیا تھا۔ اسے گویا اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا سرد پن ابھر کر سامنے آیا جسے دیکھ کر لحہ بھر کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنا اٹھی تھی۔ وہ پہلے برف کی طرح سرد ہوا تھا پھر آگ کی طرح جیسے بھڑک اٹھا۔

لیکن ماہ رو اپنے ہی دھیان میں شان بے نیازی سے بولتی جارہی تھی۔ جیسے یونی ورسٹی میں بے تکان بولتی تھی۔ جیسے ڈیڈی کے سامنے بولتی تھی۔ اس کا انداز وہی تھا۔ شاہانہ' کچھ مغرورانہ۔ شان بے نیازانہ۔ وہ بڑی ترنگ اور موڈ میں اعتراف محبت کر رہی تھی۔ اسے اپنی وہ تمام فیلنگز بتا رہی تھی جو ماہ رو نے محسوس کی تھیں۔ وہ آنسو بھی جو اس کی بے اعتنائی پہ بہتے تھے۔

ماہ رو تین منٹ کے اندر اندر بہت جذب کے عالم میں بڑی دلیری کے ساتھ اپنی حکایت دل سنا چکی تھی۔ پھر جب وہ خاموش ہوئی تو عون کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنا تعجب' غصہ اور زہر تھا ماہ رو جیسے لحہ بھر کے لیے سن ہو گئی تھی۔

اس کے خاموش ہوتے ہی وہ گہرے کاٹ دار زہریلے لہجے میں دھیمی آواز کے ساتھ پھنکارا تھا۔

"کچھ رہ گیا ہے یا اور.....؟" اس کے لہجے اور آواز میں آگ کی حدت سے بڑھ کر گرماہٹ تھی۔ پہلی مرتبہ اتنا روانی سے بولنے کے بعد ماہ رو کچھ گڑبڑائی تھی۔ اسے عون کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ گیا تھا۔

عون دو قدم چل کر آبنوسی دروازے تک پہنچا تھا پھر اس نے ہینڈل گھما کر ڈور کھول دیا تھا۔ پھر اس نے زہر خند لہجے میں غضبناک تیور کے ساتھ کہا۔

"دفع۔" اس کا لہجہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ عون غصے میں تھا۔ اور عون بے انتہا غصے میں تھا۔ ماہ رو کو یوں لگا اگر وہ ایک منٹ بھی وہاں رکتی تو زندہ حالت میں کبھی اپنے گھر نہ لوٹتی۔ اس کے لیے عون کا رویہ سمجھنا بہت دشوار تھا۔ وہ اتنی حسین، عالی شان ماہ رو کے منہ سے اظہار محبت سن کر بجائے خوش ہونے کے آگ بگولا کیوں ہو گیا تھا۔

اگر وہ کسی عام شخص کی سماعتوں میں یہ سب انڈیلتی تو شاید اس کا مارے خوشی سے ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ لیکن عون عباس کا رویہ بہت حیران کن تھا۔ بہت تکلیف دہ تھا۔ بہت توہین آمیز تھا۔ ماہ رو جیسے سمجھ کر رو پڑی تھی۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھے روتی رہی۔ روتی رہی۔ ایک مرتبہ پھر وہ رحمان پلازہ سے روتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے عون عباس کا پھنکارتا نفرت سے بھرا عکس بھی ساتھ آرہا تھا۔ آج ایک مرتبہ پھر اس کو ٹھوکر لگی تھی اور بڑی زور کی ٹھوکر لگی تھی۔ اس کی محبت کو عون عباس کے ایک لفظ "دفع" نے دھتکار دیا تھا۔ ٹھکرا دیا تھا۔

وہ شازمہ کے کہنے پر اپنی عزت نفس کو مجروح کر کے زخم زخم سی جا رہی تھی۔ اس حال میں کہ اس کے بال بکھر رہے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

یہ تو عون عباس تھا۔ جس کی نفرت اور زہر کو شان سے وصول کر کے وہ شکستہ دل، بکھرے حواسوں اور ٹوٹ پڑتی رنجیدگی کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔

دل پر چوٹ پڑی تو اسے اذیت کے ہر رنگ سے آشنائی بھی ہو گئی تھی۔ اسے پارکنگ کی طرف جانا تھا۔ لیکن وہ فٹ پاتھ پہ چل رہی تھی۔ ویسے ہی دیوانوں کی طرح۔ اس کے لمبے ریشم جیسے بال اڑ اڑ کر اس کے منہ پر پڑ رہے تھے۔ اسے چلتے چلتے کئی مرتبہ ٹھوکر لگی تھی۔ کئی مرتبہ وہ زمین پر گرتے گرتے بچی تھی۔ اسے عون کا رویہ بھولتا ہی نہیں تھا۔ اس کا غصے سے بھرا چہرہ، زہریلے تاثرات۔ لہجے میں پھنکارتا ہوا "دفع"۔

کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟ کوئی محبت کی اس قدر توہین کرتا ہے؟ وہ محبت، جو چل کر اس کے قریب آئی تھی۔ اس کے قدموں میں گری تھی۔ اپنا آپ حقیر کیا تھا۔ اس قدر ارزاں کیا تھا۔ اور اس نے بدلے میں کیا کیا؟ ایک ہی ٹھوکر میں دھتکار دیا۔ ٹھکرا دیا۔ اسے چلتے چلتے پھر سے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بمشکل بچی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی آواز دے رہا تھا۔ کوئی بھاگ کر آرہا تھا۔ "ماہ رو، ماہ رو" پکار رہا تھا۔ اور ماہ رو پیچھے مڑ کر آنے والے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

کیا وہ آواز عون عباس کی تھی؟ یا ایک الوژن؟ وہ آتی جاتی کربناک ہواؤں سے پوچھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

## بشریٰ سیال

"واٹ!" ان کی بات سن کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ وہ ناقابل یقین نگاہوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ اور حیرت کے سائے ہلکورے لے رہے تھے۔

"آپ لوگ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔" بمشکل جذبات کو کنٹرول کرتے ہوئے، آواز کو حتی المقدور نارمل رکھنے کی سعی میں وہ ضبط کی انتہاؤں پر تھا۔

"ایسا پہلی دفعہ نہیں ہو رہا جو تم اتنا واویلا مچا رہے ہو۔ یہ تو اس خاندان کی روایت ہے۔ صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔" انہیں اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ خوبرو جوان بیٹے سے نظریں چرا کر اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے بولیں۔

"روایت، مائی فٹ!" وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھوں میں سے نکالا تھا۔ کمرے میں اس وقت موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"میں خود بابا سے بات کرتا ہوں۔" وہ کسی انتہائی فیصلے پر پہنچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"نہیں یشب۔" وہ خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ایسا کچھ بھی مت کرنا جس سے حویلی کے مکین میری تربیت پر انگلیاں اٹھائیں۔" وہ منت بھرے انداز میں بولیں۔ خفگی سے بھرپور نظر ان پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ وہ ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہ گئیں۔

✡ ✡ ✡

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ فضا میں تاریکی کے ساتھ خنکی کا احساس بھی بڑھ رہا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ بوسیدہ حال دیواروں کو دیکھ رہی تھی جن کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ در و دیوار سے خستہ حالی ٹپک رہی تھی۔ پورے گھر پر خاموشی کی دبیز تہ پڑی ہوئی تھی۔ جیپ کے ٹائروں کی بھاری آواز نے اس خاموشی میں ارتعاش پیدا کیا تھا۔ دروازے پر جو دستک شروع ہوئی تو ایک تواتر سے ہوتی چلی گئی۔

"کون ہے بھئی، آتا ہوں۔" اندر سے ابا نے کھانستے ہوئے ہانک لگائی۔ جو کوئی بھی تھا شاید بہت جلدی میں تھا۔ "لگتا ہے آج بارش ہوگی۔" دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے نگاہ آسمان کی طرف اٹھا کر ابا خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے۔ آسمان پر بادل روئی کے گولوں کی شکل میں ادھر سے ادھر چکراتے پھر رہے تھے۔

"چھوٹے صاحب آپ!" دروازہ کھولتے ہی ابا کی گھبرائی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"چاچا کرم دین مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" ابا اسے ساتھ لے کر اندر چلے گئے تھے۔

"پری کی ماں، پری کی ماں۔۔۔" وہ آوازیں دیتے ہوئے ہانپنے لگے۔ "اپنے چھوٹے صاحب آئے ہیں، رنگین پھولوں والی چادر لا کر چارپائی پر بچھاؤ۔" فرط مسرت اور کچھ گھبراہٹ میں ان کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا۔

"اس سب کی ضرورت نہیں ہے میں صرف آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔" وہ دونوں میاں بیوی اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔

"آپ حکم کریں چھوٹے صاحب۔" وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی پریشان کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ اسے ایک ایک پل صدیوں کے برابر لگنے لگا تھا۔ اس کا پورا جسم اس وقت عضو سماعت بن گیا تھا۔

"میں آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا، بہتر یہ ہوگا کہ آپ حویلی والوں کو انکار کر دیں۔" بدقت تمام اس نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔

"اس کا اختیار ہمیں نہیں ہے صاحب، بہتر یہی ہے کہ آپ خود یہ بات حویلی میں کریں۔" کریم دین بولا۔

"اوکے فائن!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اگر یہ شادی ہو بھی گئی تو اس کے بدترین نتائج کے آپ سب ذمہ دار ہوں گے۔" اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں ادھر ادھر دیکھے بغیر دہلیز عبور کر گیا چھن سے کچھ اس کے اندر ٹوٹا تھا۔ احساس ذلت سے اس کی خوب صورت سبز

آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"جوان اولاد کے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہیے' اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔" کمال صاحب ابھی کمرے میں آئے تھے۔ وہ ان کے پاس بیٹھ کر آہستہ آواز میں بولیں۔

"بیٹے کی وکالت کرنے آئی ہیں؟" چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے ایک گہری نظر صالحہ بیگم پر ڈالی۔

"میرا اکلوتا بیٹا ہے' میرے بھی کچھ ارمان ہیں اس کے حوالے سے۔" وہ اپنے موقف کا دفاع کرتے ہوئے بولیں۔

"آپ اپنے سب ارمان پورے کریں' کسی نے روکا ہے؟" پل بھر کے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

"آپ کا بیٹا انگلینڈ سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ اتنا ذہین ہے میرا بیٹا۔" رفتہ رفتہ ان کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔ "خوب صورتی میں خاندان کا کوئی لڑکا اس کے برابر کا نہیں' یہ شادی بالکل بے جوڑ ہے' وہ دونوں ہی ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔" ان کے لہجے میں دبا' دبا سا احتجاج تھا۔

"بس بہت ہو گیا صالحہ بیگم۔ صاحبزادے کو اس لیے اعلا تعلیم نہیں دلوائی تھی کہ ہمیں ہی آنکھیں دکھانے لگے۔ باہر سے پڑھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اپنے خاندان اور خون کو حقیر سمجھا جائے۔ وہ بچی کوئی غیر نہیں ہے۔ پھر تم نے شاید ریہان کو دیکھا نہیں ہے وہ کس طرح بھی یشب سے کم نہیں ہے۔ چاند سورج کی جوڑی لگے گی دونوں کی۔" وہ اطمینان سے بولے۔

"خون اور خاندان کی بات کو تو آپ رہنے ہی دیں' کیا میں نہیں جانتی کہ یہ شادی کس مقصد کے تحت ہو رہی ہے۔" ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

"صالحہ بیگم میں آغا جان کے سامنے مجبور ہوں۔"

ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"آپ آغا جان کے سامنے' میں آپ کے اور میرا بیٹا خاندانی روایات کے سامنے مجبور ہے۔ رشتے دل سے اور پیار و محبت سے بنائے جاتے ہیں مجبوریوں سے نہیں۔ جن رشتوں کی بنیاد مجبوریوں پر رکھی جائے وہ کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔" وہ وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ دوبارہ دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آجاؤ!" اس کے دستک دیتے ہی اندر سے آغا جان کی بارعب آواز آئی تھی۔ اس کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔ ساری دلیلیں' سب باتیں ذہن سے محو ہو گئی تھیں۔

"السلام علیکم!" اس نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔

"بیٹھو۔" وہ پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے جس کی آنکھوں اور چہرے پر بغاوت کا عکس انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ حالات کو اپنے حق میں کرنے کے لیے انہیں بہت ہوشیاری اور سمجھ داری سے کام لینا تھا۔

"کیسی چل رہی ہے تمہاری فیکٹری؟" ان کے بیٹھتے ہی وہ بھی ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا انداز بہت چوکنا تھا۔

"جی' ٹھیک۔" وہ اپنے جوتے سے کارپٹ پر ہولے سے ضرب لگا رہا تھا۔ یہ حرکت اس کی اندرونی کیفیت اور دماغی الجھن کی غماز تھی۔

"آپ کو یاد ہو گا اس فیکٹری کو لگانے میں ہم نے اس وقت آپ کا بھرپور ساتھ دیا۔ جب کمال آپ کی شدید مخالفت کر رہا تھا۔" وہ پل بھر کو رکے اور سگار سلگانے لگے۔

"آپ پڑھنے کے لیے باہر جانا چاہتے تھے تب بھی کمال کی مخالفت کے باوجود ہم نے آپ کو باہر بھجوایا۔" وہ آہستہ آہستہ اصل موضوع پر آرہے تھے۔ سگار کا لمبا کش لگاتے ہوئے انہوں نے دھواں

فضا کے سپرد کیا۔

"صرف یہی نہیں، ہم نے ہمیشہ آپ کو سب بچوں سے بڑھ کر چاہا ہے، پیار دیا ہے، آپ ہمارے منظور نظر، ہمارے دل کا چین ہو۔ آپ کی خواہشات کا ہمیشہ احترام کیا، پھر ایسا کیوں ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہم نے آپ سے کچھ مانگا اور آپ انکاری ہیں۔" آغا جان نے ایسا جال پھینکا تھا کہ وہ اس میں پھنستا چلا گیا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر آغا جان آپ خود سوچیں جس لڑکی سے میری سرے سے کوئی انڈراسٹینڈنگ نہیں، ذہنی ہم آہنگی نہیں، اس کے ساتھ میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔" وہ استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اصل انڈراسٹینڈنگ شادی کے بعد ہوتی ہے برخوردار۔" ان پر اس کی دلیل نے کوئی اثر نہ کیا تھا۔

"وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹی ہے، ابھی پورے اٹھارہ کی بھی نہیں ہوئی جبکہ میں اٹھائیس کا ہوں۔ اتنا زیادہ عمر میں فرق ہمیں کبھی بھی بے تکلف نہیں ہونے دے گا۔" اس نے ہار نہ مانی۔

"نکاح کے بولوں میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ دونوں فریقوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے موافقت پیدا ہو جاتی ہے۔" وہ اطمینان سے بولے۔

"آغا جان وہ ٹوٹلی ان پڑھ اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی اس نے۔"

"پڑھے لکھے ہونے کے لیے ڈگریوں کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ بچی بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار ہے۔ ہمیں یقین ہے وہ آپ کو بہت خوش رکھے گی۔ پھر بھی اگر آپ کو ہمارا فیصلہ قبول نہیں ہے تو ہم آپ کو مجبور نہیں کرتے۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

وہ بھی احتراماً کھڑا ہو گیا۔

"شاید آپ بہت بڑے ہو گئے ہیں، آپ کی نظر میں ہمارے فیصلوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔" آغا جان یک دم بہت کمزور اور بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

"ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ بس ہمارا مان توڑا ہے آپ نے اس کا دکھ مرتے دم تک رہے گا۔" وہ آبدیدہ ہو گئے۔

"آغا جان!" وہ بے چین ہوا تھا۔ "میرا ایسا مطلب نہ تھا۔" ان سے بے حد پیار کرتا تھا۔ ان کو ناراض کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ "مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے۔" اپنی آواز سے پاتال میں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پری۔" وہ سیڑھیوں پر سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھی۔ ان کی آواز پر بھی اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی تھی۔ "جا کر سو جاؤ۔" انہیں اس کی کیفیت کا اندازہ تھا۔

"نیند نہیں آئی اماں۔" اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ انہوں نے اندھیرے میں چمکتے اس کے چاند چہرے کو دیکھا تھا۔

"پری ایک وعدہ کرو مجھ سے۔" اماں اس کے اور قریب آ گئی تھیں۔ اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ان کی سمت دیکھا تھا۔ "اپنے شوہر کا دل جیتنے کی کوشش کرو گی، کبھی ماں، باپ کی تربیت پر حرف نہ آنے دو گی۔" اماں اندر چلی گئی تھیں تمام رات وہ اور بوڑھا آسمان مل کر روئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں کھڑا وہ باہر دور تک پھیلی تاریکی کو دیکھ رہا تھا۔ بارش کا شور ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس کا دماغ اس کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔ دماغ ماؤف ہو رہا تھا، دل کا بوجھ حد سے سوا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اس کی محویت ٹوٹی، شکستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ کمرے کے دروازے تک آیا۔

"ماں جان آپ۔" انہیں اس وقت اپنے سامنے دیکھ کر وہ پریشان ہوا تھا۔ اس کی نظریں بے اختیار ہی وال کلاک کی جانب اٹھ گئی تھیں جو رات کے ڈیڑھ بجا رہا تھا۔ "اندر آ جائیں۔" اس نے ایک طرف ہو کر انہیں رستہ دیا۔

"مجھے معاف کر دینا یشب شاہ، میں آپ کے لیے

کچھ نہ کر سکی۔" ان کے لہجے کی افسردگی و شرمندگی نے اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔

"یقین کریں یہاں بہت اچھی۔۔۔"

"پلیز ماں جان۔۔۔" اس نام کو سنتے ہی اس کے اندر تلخی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ اس کا احساس زیاں اور زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا۔

"آپ سب ایک دن سر پکڑ کر روئیں گے۔" اس کی بات سے وہ اندر تک لرز گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یشب احمد شاہ ولد کمال احمد شاہ باعوض سکہ رائج الوقت دو لاکھ حق مہر آپ کو نکاح میں قبول ہے۔"

نکاح خواں کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اسے اپنا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آتا محسوس ہوا۔ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا تھا وہ غائب دماغی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

یشب احمد شاہ جو کل بہت زعم سے اس شادی سے انکار کر کے گیا تھا آج وہیں آیا بیٹھا تھا۔ حویلی میں سے بہت کم لوگ آئے تھے۔ البتہ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔

"کرم دین اب ہمیں اجازت دو۔" نکاح کے فوراً بعد آغا جان اٹھ کھڑے ہوئے تو باقی تمام افراد بھی باہر نکل آئے۔ صحن میں سے گزرتے ہوئے اس کی غیر ارادی نظر برآمدے کی طرف اٹھی تھی۔ جہاں چادر میں لپٹا وجود کرم دین کی بیوی کے گلے لگا سسک رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر کپکپی طاری تھی۔ پاس کھڑی لڑکی شاید اس کی سہیلی تھی، وہ رو رہی تھی اور کرم دین اسے چپ کروا رہا تھا۔ اسے کرم دین اور اس کی بیوی پر ترس آیا تھا۔ وہ ایک رقیق القلب انسان تھا۔ سر جھٹک کر وہ باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

حویلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ وہ خاموش تماشائی بنا سب دیکھ رہا تھا۔ سب لوگ ان کی جوڑی کو سراہ رہے تھے، کسی کی آنکھوں میں حسد تھا تو کسی کے رشک۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز اور لاتعلق نظر آ رہا تھا۔ اس نے پریشان پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔ رات دیر تک رسموں کا سلسلہ جاری رہا اس کی برداشت جواب دینے لگی تھی۔

"ماں جان یہ تھک گئی ہوں گی، انہیں روم میں پہنچا دیں۔" اس بات پر سب کزنز نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا، مگر ان سب کو نظر انداز کرتا ہوا وہ اپنی اسٹڈی میں آ گیا۔

"زندگی یہ کس مقام پر لے آئی ہے مجھے۔" وہ ایک کے بعد دوسری سگریٹ سلگا رہا تھا۔ دروازے پر کھٹکا ہوا اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔

"رات بہت ہو گئی ہے، اب اپنے روم میں جاؤ بیٹا۔" ماں جان اس کے قریب آ کر نرمی سے بولیں۔ وہ بیٹے کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔

"میں نے جتنا کیا یہ بھی میری ہمت اور برداشت سے بہت زیادہ ہے۔ مجھ سے مزید کوئی امید مت رکھیے گا۔" وہ ان کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑا تھا۔

"میں جانتی ہوں میرا بیٹا رشتوں کی اہمیت، ادب و احترام سے اچھی طرح واقف ہے۔ آپ کی ناراضی تو ہم سے ہے، اس لڑکی کا تو اس پورے واقعے میں سرے سے کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ اسے رسانیت سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ "اسے بہت تیز بخار ہے، تھکی ہوئی بھی ہے، جاؤ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

"ماں جان میں اس وقت تنہائی چاہتا ہوں۔" ان کی بات سے اسے اپنے دل کا بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"یہ رونمائی کا تحفہ ہے، اسے دے دینا۔" انہوں نے مخملی کیس اس کے آگے کیا جیسے اس نے مکمل طور پر نظر انداز کیا تھا۔ کیس اس کے سامنے رکھ کر وہ باہر چلی گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

رات بھر سردی میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھنے کی وجہ سے اسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ تھکاوٹ سے بدن

چور تھا۔ کمرے میں ہیٹر آن تھا۔ بہت دیر سے سر جھکا کر بیٹھنے کی وجہ سے سر اور کندھے درد کر رہے تھے 'کمر اکڑ چکی تھی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر نیند بھگانے کی کوشش میں وہ بے حال تھی۔

دروازہ آہستہ سے ناک کر کے وہ اندر آگیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے کوٹ کو اس نے لاپروائی سے صوفے پر اچھال دیا۔ بلا ارادہ ہی اس کی نظریں بیڈ کی جانب اٹھی تھیں اور پلٹنا بھول گئی تھیں۔

اس کی بے انتہا سفید رنگت میں گلابی پن نمایاں تھا۔ خوب صورت ستواں ناک 'گلابی ہونٹ۔۔۔ اس کا انتظار کرتے کرتے وہ سو گئی تھی۔ اس کی لمبی گھنی پلکیں رخساروں کو چوم رہی تھیں۔ وہ کسی نوخیز کلی کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی نظروں کا ارتکاز تھا یا کیا کہ وہ ایک دم گھبرا کر اٹھی تھی۔ کچی نیند سے جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں سے اس نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔

اس نے ایک لمبی سانس فضا کے سپرد کی اور وارڈ روب کھول کر بلا مقصد ادھر سے ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ نکال کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا۔

"کیا کہوں اسے۔" وہ اس کے اندر کسی بھی طرح کا کوئی احساس جگانے میں ناکام رہی تھی۔ ایک نادانستہ نظر کے بعد اس نے اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کے سامنے آکر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ کمرے میں گہرا سناٹا تھا جب الفاظ گم ہو جائیں تو خاموشی کو بھی زبان مل جاتی ہے۔ ان کے درمیان بھی اس وقت خاموشی محو گفتگو تھی۔ خاموشی کی اس زبان کو پریہان بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

"یہ ماں جان نے دیا ہے آپ کے لیے۔" بہت دقتوں سے اس نے خود کو بولنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ مخملی کیس اس نے احتیاط سے اس کی گود میں رکھا تھا۔ "میں تھک گیا ہوں' آپ کو بھی شاید بخار ہے' آرام کریں آپ۔" وہ حکم پاتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دو دن سے اس نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اس پر مستزاد اتنا تیز بخار اور ساتھ تھکاوٹ' اس پر نقاہت طاری تھی۔ دو قدم چلنے کے بعد اس کو زور کا چکر آیا تھا۔ یشب شاہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے یشب کا بازو نادانستگی میں پکڑ لیا تھا۔

یشب شاہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ آگ کو چھو گیا ہو۔ بخار کی حدت سے اس کا جسم تندور کی مانند جل رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کروایا تھا۔ وہ بمشکل سنبھل پائی تھی۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر وہ نا سمجھی کے عالم میں ادھر سے ادھر دیکھنے لگی۔

"یہ سامنے ڈریسنگ روم ہے۔" یشب شاہ نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"پری کی ماں' اری او پری کی ماں۔" کرم دین آوازیں دیتا ہوا گھر میں داخل ہوا اس نے جلدی سے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"دو جھلی ہے تو جو روتی ہے بیٹی اتنے بڑے گھر میں بہو بن کر گئی ہے تجھے تو مالک کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور لکڑیاں توڑ توڑ کر چولہے میں ڈالنے لگا۔

"اسی بات سے تو ڈر رہی ہوں پری کے ابا' کہاں ہم غریب اور کہاں وہ بڑے لوگ' پھر کیوں انہوں نے ہم سے رشتہ جوڑا۔" وہ اماں تھیں' ان کے دل میں ہزاروں وسوسے جنم لے رہے تھے۔

"اپنی پری جیسی ایک بھی لڑکی نہیں ہے ان کے پورے خاندان میں' پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ انہیں اس زیادتی کا احساس ہو گیا ہو جو۔۔۔"

"مگر میرے دل کو چین نہیں آرہا۔" ان کی تشفی نہیں ہو رہی تھی۔

"صبح جا کر مل لینا' تسلی ہو جائے گی تمہاری۔" وہ اٹھ کر صحن میں لگے نلکے سے ہاتھ منہ دھونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼
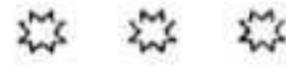
وہ چینج کر کے آئی تو یشب احمد شاہ کو کسی گہری سوچ میں مستغرق پایا۔ وہ بیڈ پر چت لیٹا چھت سے لٹکتے فانوس کو گھور رہا تھا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی بیڈ کے پاس کھڑی رہی بالآخر خود ہی بیٹھ گئی۔

"میں آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔" اس کے کان میں کسی نے سرگوشی کی تھی۔ وہ اس کی جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ کل شام کے واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے۔ سگریٹ کی بو کے ساتھ اس کے بدن سے اٹھتی دلفریب کلون کی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اندر زبردست جنگ چھڑی ہوئی تھی اچانک وہ کسی فیصلے پر پہنچ کر اٹھا تھا۔

"میں آغا جان اور بابا کو بتادوں گا کہ میں نے اس شادی کو دل سے قبول نہیں کیا۔" وہ تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔ اس کے وجود سے قطعی لاتعلق اور یکسر انجان بنا وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے چابی اٹھانے کے لیے جھکا تھا۔ وہ کنکھیوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سائیڈ پوز بہت اچھا لگ رہا تھا۔ خوب صورت ناک ایک شان اور غرور سے کھڑی تھی۔ وہ باہر نکل گیا۔

"یشب آپ ہوش میں تو ہیں۔" باہر سے دبی دبی سرگوشی کی آواز آئی تھی۔ "اس وقت شہر جائیں گے' وقت دیکھا ہے۔"

"میرے اندر طوفان آیا ہوا ہے' جھکڑ چل رہے ہیں' سب کچھ تباہ ہو رہا ہے' آپ مجھے وقت مت بتائیں۔" اس کی آواز اس کی دلی کیفیت کی غماز تھی۔

"وہ لڑکی جو اندر بیٹھی ہے تمہاری بیوی ہے' کیا سوچے گی؟" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

"ماں جان آپ جانتی ہیں نا کہ میں ہر کام فیئر طریقے سے کرنے کا عادی ہوں' آپ سب نے مجھے بلیک میل کر کے یہ شادی تو کروالی' مگر ضروری نہیں ہے جسے اپنے بیڈ روم میں جگہ دی ہے اسے دل میں بھی جگہ دی جائے' ذات کا حصہ بنایا جائے یہ دلوں کے سودے ہوتے ہیں' زبردستی سے طے نہیں ہوتے۔"

ان کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔ حویلی کا گیٹ کھلا تھا اور زن سے جیپ اڑا لے گیا تھا۔ کئی متجسس نگاہیں گیٹ کی طرف اور پھر اس کے بیڈ روم کی جانب اٹھی تھیں۔

اس نے بیڈ روم کو اندر سے لاک کیا اور پھر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ جو اپنے مکین کی نفاست اور اعلا ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس نے وارڈ روب کھولی تھی اس کے کپڑے' جوتے' ایک ایک چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پرفیومز اور کئی قسم کی دوسری کریمیں موجود تھیں۔ جلد ہی اسے جائے نماز مل گئی تھی۔

"یااللہ! میری کیا غلطی ہے' کون سا گناہ سرزد ہوا ہے مجھ سے جس کی یہ سزا ملی ہے۔" آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ "اتنی ذلت' اس قدر توہین..... میں نے کب چاہا تھا کہ میری شادی اس شخص یا اس حویلی میں ہو۔" بہت زیادہ رونے سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا۔ روتے روتے جائے نماز پر ہی اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا میں اندر آسکتی ہوں۔" وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کو بغور دیکھ رہی تھی جب آواز سن کر اسے متوجہ ہونا پڑا۔

"آجائیں۔" وہ بدقت تمام مسکرائی۔ وہ لڑکی چلتی ہوئی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"میرا نام انبساط ہے' میں یشب کے چچا کی بیٹی ہوں۔" وہ دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"پریسان۔" وہ بمشکل بول پائی۔

"بہت خوب صورت ہے تمہارا نام' بالکل تمہاری طرح۔" اس نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔

"کیا میں تم سے کچھ بات کر سکتی ہوں؟" اس نے محتاط نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے رازداری سے پوچھا۔

"جی' بالکل۔" پریشان اسے سمجھ نہیں پارہی تھی۔

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ یشب رات تمہیں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ اسے..."

"دراصل انہیں ایک ضروری کام سے اچانک جانا پڑا۔ ورنہ..." بات ادھوری چھوڑ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہا..." اس نے ایک سرد آہ بھری اور مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں کیا تھا ترحم' استہزا یا کچھ اور' وہ سمجھ نہ پائی۔ "کاش ایسا ہی ہوتا' مگر افسوس یہ وجہ نہ تھی اس کے جانے کی۔ وہ مغرور شخص اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں' ایسے ہی اس نے میری محبت کو اور مجھے ٹھکرایا تھا۔ میرے سچے اور خالص جذبوں کو اپنے قدموں تلے روند کر چلا گیا تھا۔" وہ دم سادھے بیٹھی تھی۔

"بہت روئی تھی تب میں' مگر وہ بہت ظالم اور خود پسند ہے' اسے ذرا رحم نہ آیا مجھ پر۔ پھر مجھے پتا چلا کہ وہ اپنی کلاس فیلو نورا کو پسند کرتا ہے۔ مجھے اس لڑکی سے شدید نفرت ہے۔ آغا جان نے اس کا رشتہ تمہارے ساتھ طے کیا تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی کہ اگر وہ مجھے نہیں ملا تو اس چڑیل کو بھی نہ مل سکے گا' مگر تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔" وہ دم بخود بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کبھی بھی اس سے محبت کرنے کی غلطی مت کرنا' سر پکڑ کر روؤگی۔" اسے عذابوں میں مبتلا کر کے وہ جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا تم مذاق کر رہے ہو؟" وہ اس وقت آفس میں بیٹھا تھا' اس کا بیسٹ فرینڈ عمار اس کے سامنے تھا۔ یشب احمد شاہ پیپر ویٹ کو گھماتا سامنے دیوار پر لگے کلینڈر کو گھور رہا تھا۔

"میں سو فیصد سنجیدہ ہوں یار' آغا جان نے میری شادی کروا دی ہے پرسوں۔"

"یوں' اس طرح' اچانک۔" وہ ابھی تک بے یقینی کے گہرے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔

"تم نہیں جانتے یار۔" اس نے ایک تھکی ہوئی سانس فضا کے سپرد کی۔ "اچانک آغا جان' بابا اور ماں جان کو جانے کیا سوجھی کہ ایک بالکل انجان اور ان پڑھ لڑکی کو میری بیوی بنا دیا۔"

"ارے نہیں!" اس کی بات سے عمار کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ "تیرے جیسا بندہ جو پرفیوم' ٹائی اور موزے خریدتے ہوئے ہزار نقص نکال کر' سو نخرے کر کے مشکل سے کوئی ایک چیز خریدتا ہے' کیسے کسی ناپسندیدہ لڑکی کو اپنی بیوی بنا سکتا ہے۔"

"اسی بات کا تو دکھ ہے' مجھ سے اتنی محبت کرنے والے' میری رائے کو اہمیت دینے والے آغا جان نے زندگی کے سب سے اہم معاملے میں تمام اختیارات مجھ سے چھین لیے۔" عمار نے اس کی خوب صورت لائٹ براؤن آنکھوں میں جھانکا تھا جو کئی دنوں کے رت جگے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"یار تمہیں انکار کر دینا چاہیے تھا۔" عمار تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تمہیں لگتا ہے' میں نے انکار نہیں کیا ہو گا۔" وہ اٹھ کر آفس کی گلاس وال کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا اور باہر سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔

"کیسی ہے وہ لڑکی؟" وہ پوچھ بیٹھا۔

"گاؤں میں رہنے والی ایک ان پڑھ سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی کیسی ہو سکتی ہے؟" اس نے پلٹ کر سوال کر ڈالا۔

"سترہ' اٹھارہ..." عمار کو لگا شاید وہ اس سے مذاق کر رہا ہو۔ اسے اپنے عزیز ترین دوست کی اس ٹوٹی پھوٹی حالت پر دکھ ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اماں۔" وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔

"کیسی ہو پری؟" اسے لپٹاتے ہوئے پیشانی چوم کر بولیں۔

"میں ٹھیک ہوں اماں' ابا کیسے ہیں۔"

"وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔"

"میں ملنے آؤں گی ابا سے۔" ان کے شانے پر سر رکھے وہ محبت سے چور لہجے میں بولی۔

"چھوٹے صاحب اتنی جلدی شہر کیوں چلے گئے تھے؟ وہ تیرے ساتھ ٹھیک تو ہیں نا۔" ان کا خدشہ زبان کی نوک پر آہی گیا تھا۔ وہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اماں وہ بہت اچھے ہیں' بس اچانک کسی ضروری کام سے شہر جانا پڑ گیا' وہ تو مجھ سے معافی بھی مانگ رہے تھے کہ شادی سے ایک دن پہلے تمہارے گھر آکر انکار کیا تھا۔ دراصل وہ کچھ ناراض تھے۔" وہ اپنے بوڑھے ماں' باپ کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی باتوں سے ان کے چہرے پر طمانیت کا احساس ابھرا تھا۔

"یہ دیکھیں مجھے یہ سیٹ دیا ہے انہوں نے اور یہ کنگن ان کی امی نے۔" وہ ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔

"السلام علیکم خالہ!" اسی وقت انبساط وہاں آئی تھی۔ "آپ کو آغا جان نے یاد فرمایا ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"تم نے اپنی امی کو تو کچھ نہیں بتایا؟" ان کے باہر نکلتے ہی وہ اس کے پاس آئی۔

"نہیں میں انہیں دکھ نہیں دینا چاہتی۔"

"ویری گڈ' تم بہت سمجھ دار ہو۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اس نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔ وہ عمر میں یشب کے برابر تھی۔ بہت جلد اس نے پریسان سے دوستی کرلی تھی۔

☼ ☼ ☼

اذیت کے بے شمار دن اور بے چینی کی کئی راتیں گزر گئیں۔

اسے کہہ دو کہ اک بار آکر
اذیت مختصر کردے

وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتی تھی۔ یشب جو گیا تو پلٹ کر حویلی کی خبر نہ لی۔ اسے انبساط سے ہی معلوم ہوا تھا کہ حویلی میں بھی وہ اپنی ماں کے علاوہ کسی سے فون پر بھی بات نہیں کرتا۔

"ہیرو بنا پھرتا ہے' ہونہہ۔" وہ غصے سے بولی۔

"ہیرو تو ہے۔" اس کے دل نے سرگوشی کی۔ نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی منتظر رہنے لگی تھی۔ انبساط کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ ان راہوں پر چل نکلی تھی۔ جن پر خاردار کانٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسے شہر گئے ہوئے دو ماہ ہوچکے تھے۔ اس نے پلٹ کر پریسان کی خبر لی نہ حویلی میں قدم رکھا تھا۔ ماں جان کی ہر فون کال کے جواب میں وہ مصروفیت کا بہانہ کردیتا۔

"صاحب' آغا جان آئے ہیں۔" وہ ابھی کچھ دیر پہلے آفس سے لوٹا تھا۔ فریش ہو کر ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا جب فضل نے آکر اطلاع دی۔

"ارے!" برش کو ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک کر وہ عجلت میں کمرے سے نکلا تھا۔

"السلام علیکم آغا جان!" اس نے سعادت مندی سے سر جھکا کر سلام کیا تھا۔ اتنے دنوں کی بوجھل طبیعت انہیں اچانک سامنے دیکھ کر فریش ہوگئی تھی' مگر یہ خوشی بھی چند لمحوں کی تھی۔ آغا جان سے بغل گیر ہوتے ہوئے اس کی نظر ان کے عقب میں کچھ گھبرائی ہوئی پریسان پر پڑی۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔

"آپ تو ہمیں بھول بیٹھے تھے' مجبوراً ہمیں خود آنا پڑا۔" اس سے الگ ہو کر انہوں نے پریسان کو اشارہ کیا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے کچھ ڈرتے اور جھجکتے ہوئے سلام کیا۔ یشب نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ دونوں بیٹھے تو پریسان بھی تکلف سے صوفے کے کنارے پر ٹک گئی۔

"کمزور ہوگئے ہو' خیال نہیں رکھتے اپنا؟" وہ اس کے موڈ کو بدلتے دیکھ چکے تھے ان کو دیکھ کر جو بشاشت

اس کے چہرے پر آئی تھی وہ پریسان کو دیکھ کر فوراً" غائب ہو گئی تھی۔
"اس کا ٹائم نہیں ملتا۔"
"تمہارا خیال رکھنے کے لیے یہ اپنی بیٹی میں آپ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ بہت سمجھ دار اور سگھڑ ہے' جاؤ پری بیٹا منہ ہاتھ دھو کر آجاؤ پھر چائے پیتے ہیں۔" یثرب کے سامنے سمجھ دار اور سگھڑ کہلائے جانے پر وہ جھینپتے ہوئے وہاں سے اٹھی تھی۔
"آغا جان یہ زیادتی ہے۔" پریسان کے وہاں سے اٹھتے ہی اس نے دبا دبا احتجاج کیا تھا۔
"بیوی ہے وہ تمہاری' دو ماہ سے حویلی میں بیٹھی آپ کی راہ تک رہی ہے' اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ بھی زیادتی کر رہے ہیں آپ۔" وہ رسانیت سے سمجھانے لگے۔
"آغا جان مجھے اس سے کوئی اٹیچ منٹ محسوس نہیں ہوتی۔" وہ جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔
"ساتھ رہو گے تو اٹیچ منٹ بھی ہو جائے گی اور محبت بھی۔"
"میں نے یہاں کسی کو نہیں بتایا کہ میری شادی ہو گئی ہے۔ اپنے فرینڈز اور آفس کے ورکرز کو کیا بتاؤں گا یہ کون ہے۔" وہ ابھی بھی الجھن کا شکار تھا۔
"ایک پارٹی میں سب کو مدعو کرو اور بتا دو کہ میری شادی ہو گئی ہے۔"
وہ منہ ہاتھ دھو کر آ گئی تھی۔ اس کی بات سن کر اندر آنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔
"میری لاج رکھ لو اور اگر ایک سال گزرنے کے بعد بھی اس کے لیے کوئی جذبہ دل میں محسوس نہ ہو تو اسے طلاق دے کر بھلے دوسری شادی کر لینا۔ میں خود آپ کا ساتھ دوں گا۔" وہ سانس روکے باہر کھڑی تھی۔ اس پر گویا ساتوں آسمان گر پڑے تھے۔
"طلاق!" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے لاؤنج کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھا تھا۔
آغا جان کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ تقریباً" آدھ گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ تو اس نے اسے اسی حالت میں وہیں بیٹھے پایا۔ اس کے انداز نشست میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا۔
"اگر آپ کا مراقبہ ختم ہو گیا ہو تو اندر تشریف لے جائیں۔" اس کی آواز پر اس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔
"میں یہیں ٹھیک ہوں۔"
"کیا مطلب ہے یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر اس کا سوٹ کیس اٹھالیا تھا۔ "چلیں اندر۔" وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔
"میں نے کہا نا کہ آپ مجھے یہیں رہنے دیں۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔
"حویلی سے یہاں میرے گھر تک آ گئی ہو تو پھر میرے بیڈ روم میں جاتے ہوئے کیسا نخرہ۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں چھپے طنز کی گہری کاٹ کو محسوس کرتے ہوئے وہ بلبلا اٹھی۔ اس کی روح تک تڑپ اٹھی۔
"میں یہاں اپنے شوق اور خوشی سے نہیں آئی۔ مجھے آغا جان لے کر آئے ہیں۔" شدید توہین کے احساس سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
"شوق سے بیٹھو یہاں' جب سردی محسوس ہو گی تو خود اندر آؤ گی میں بلانے نہیں آؤں گا اب۔" اس پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے وہ بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔
"میں نے آپ سے کب کہا کہ آپ مجھے بار' بار بلانے آئیں۔" بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے اس کی آواز نے یثرب شاہ کا تعاقب کیا تھا۔ اس نے مڑ کر خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا تھا۔
سوتے میں اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا کہ ابھی تک وہ روم میں نہیں آئی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے اپنی رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھا رات کے سوا دو بجے کا وقت تھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلا تھا۔
"مائی گاڈ!" وہ لاؤنج میں صوفے پر' سر کے نیچے

کشن رکھے، اپنی میرون شال اوپر پھیلائے پاؤں سمیٹ کر سو رہی تھی۔ "کیا مجھے اسے جگانا چاہیے۔" چند ثانیے کشش و پیچ میں مبتلا کھڑا رہا اور پھر اندر سے کمبل لا کر اس کے اوپر ڈال دیا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور سادگی تھی۔ واپس بیڈ روم میں آکر وہ دوبارہ سو گیا تھا۔

☆☆☆

"میں کچھ دنوں کے لیے یشب کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" ناشتے کی میز پر وہ شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

"میرا خیال ہے ہمیں کچھ دن انہیں تنہائی فراہم کرنی چاہیے، ممکن ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کو سمجھ جائیں یشب اسے قبول کر لے۔"

"آپ اور آغا جان کی ضد نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا ہے۔ بہت دور ہو گیا ہے وہ مجھ سے۔" وہ گلوگیر آواز میں بولیں۔

"وقتی ناراضی جلد ختم ہو جائے گی کیا ہمیں اس کی جدائی کا غم نہیں، ہم باپ ہیں محسوس کرتے ہیں اس کی کمی کو۔"

"کب ختم ہو گی اس کی ناراضی، دو ماہ ہونے کو آئے اس نے حویلی میں قدم نہیں رکھا فون پر بات کرو تو بھی انتہائی مختصر جواب دیتا ہے۔" وہ ان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا تھا۔ جو منتوں اور مرادوں سے شادی کے پانچ سال بعد ان کی گود میں آیا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت حساس تھیں۔

"ایسا زیادہ دیر نہیں رہے گا، وہ کب تک پری سے نظریں چرائے گا۔ جب اسے قبول کرے گا تو یہاں بھی آجائے گا۔" ان کی باتوں سے ماں کے بے چین دل کو قرار نہ آ رہا تھا۔ انہوں نے چپ سادھ لی۔

☆☆☆
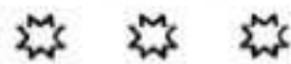
دور کہیں سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ چند لمحے آنکھیں کھولے وہ نا سمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتی رہی، مگر جب آہستہ آہستہ تمام حسیات بے دار ہونے لگیں تو وہ سمجھ گئی کہ اس وقت کہاں ہے۔

اسے اپنا خستہ حال چھوٹا سا گھر یاد آیا جہاں اس وقت بہت پیارا سماں ہوا کرتا تھا۔ جیسے ہی گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو وہ اور اماں اٹھ جاتیں۔ وہ جاگنے کے باوجود سوتی بنی رہتی جب تک کہ اماں اسے آواز دے کر نہ جگائیں۔

"کسی دن اگر میں گھر میں نہ ہوئی تو تم تو نماز کے لیے نہیں اٹھو گی۔" اماں نے پیار بھری خفگی سے اسے گھورا۔

"تو مجھے ابا جگا دیں گے۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔

"اٹھ کر وضو کرو، نماز کا ٹائم نکل رہا ہے۔" اماں نے پیار سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ قرآن پاک پڑھتی، پھر کتابیں لے کر بیٹھ جاتی۔

"دیکھ لیں اماں آج آپ نے نماز کے لیے نہیں جگایا، مگر جس کے لیے نماز پڑھنی تھی اس نے خود مجھے جگا دیا۔" خوب صورت ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے اس کے لبوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔ وہ سر جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔

"یہ کمبل۔" اپنے اوپر کمبل دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئی تھی، مگر اگلے ہی لمحے دل کی سرزمین کو ایک لطیف جھونکا چھو کر گزر گیا تھا۔ وہ وضو کرنے واش روم چلی گئی تھی۔

☆☆☆

"بی بی صاحبہ آپ رہنے دیں، میں اپنے صاحب کے سب کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔" وہ کچن میں آکر ناشتا بنانے لگی جب چاچا فضل اس سے مخاطب ہوا۔

"آپ کرتے ہوں گے سب کام، مگر اب میں آگئی ہوں نا تو اب سے سب کام میں ہی کیا کروں گی۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"دیکھ لیں بی بی، صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔" وہ ڈر رہا تھا۔

"ارے!" وہ ہنس دی۔ "نہیں ہوتے خفا، آپ فکر

مت کریں۔"

"صاحب سات بجے بیڈ ٹی لیتے ہیں اور آٹھ بجے ناشتا' ناشتے میں جوس اور۔۔۔"

"آپ پریشان مت ہوں' میں جو کچھ بناؤں گی صاحب کو پسند آئے گا۔" فضل چاچا باہر چلے گئے تھے۔

"فضل چاچا میری بیڈ ٹی۔۔۔" وہ بولتا ہوا کچن میں داخل ہوا تھا' اسے سامنے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ بڑی تندہی اور چستی سے کام کرنے میں مصروف تھی۔ ناشتے کی میز انواع واقسام کے لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔

"السلام علیکم!" اسے دیکھ کر پل بھر کو اس کے ہاتھ رکے تھے' مگر دوبارہ کام کرنے لگی تھی۔

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"ناشتا' آپ کے لیے۔"

"واٹ؟" اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ "یہ سب تو میں کبھی نہیں کھا سکتا۔" وہ روکھائی سے بولا۔ اسی وقت چاچا فضل اندر داخل ہوئے۔

"چاچا میری بیڈ ٹی نہیں لائے آپ۔" ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ وقت پر اس کے کمرے میں بیڈ ٹی نہ لائے ہوں۔ ورنہ ادھر سات بجتے ادھر چاچا بیڈ ٹی سمیت حاضر ہوتے۔

"وہ بی بی صاحبہ نے منع کردیا۔" وہ سر جھکا کر مودب ہو کر بولے۔

"ربش!" وہ اسے گھور کر رہ گیا۔ "ہٹاؤ یہ سب یہاں سے' میں اس قسم کی چیزیں نہیں کھاتا۔" اس نے قیمے کے پراٹھوں کی طرف اشارہ کیا۔ پریہان پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ چاچا فضل کے سامنے اسے شدید سبکی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا بس خاموشی سے اس کی سائڈ سے نکلتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے سارا دن کچھ نہیں کھایا' کیوں؟" شام کو وہ گھر آیا تو چاچا فضل نے بتایا کہ اس نے سارا دن کچھ نہیں کھایا اور کمرے سے باہر بھی نہیں نکلی۔

"میری مرضی" اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ہٹ دھرمی سے بولی۔ اس نے دوپٹا اچھی طرح سر پر لے لیا تھا۔ یشب شاہ نے بطور خاص اس کی اس حرکت کو نوٹ کیا تھا۔

"یہاں آپ کی فضول مرضی نہیں چلے گی' اگر فاقے کر کے جان دینی ہے تو حویلی میں جا کر یہ شوق پورا کرنا' یہاں میں ایسا کچھ بھی افورڈ نہیں کر سکتا۔" اس کے اترے ہوئے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"آپ بے فکر رہیں میرا ایسا کوئی ارادہ کبھی ہوا تو یہاں تو ہرگز جان نہیں دوں گی' کسی ایسی جگہ جا کر مروں گی جہاں آپ کو کوئی الزام نہ دے۔" اس کے اس قدر بے خوفی سے بولنے پر وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آغا جان مجھے معاف نہیں کریں گے۔" وہ شگفتگی سے بولا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ "میں شوارمہ اور آئس کریم لایا ہوں۔ آپ فریش ہو کے آجاؤ۔" وہ مصالحت آمیز لہجے میں بولا۔

"میں اس قسم کی چیزیں نہیں کھاتی۔" اس نے ادھار چکایا۔

"ہاہاہا" یشب کا جاندار قہقہہ اس کا دل جلا گیا۔

"بدلہ لینا کمزوری کی علامت ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"آپ سے کس نے کہا میں بہادر یا طاقتور ہوں۔" اس نے بیڈ سے اتر کر لباس کی شکنیں ہاتھ سے درست کرتے ہوئے کہا۔ اس نے یشب شاہ کے ساتھ بیٹھ کر شوارمہ کھایا تھا۔ اب وہ بالکل خاموش تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں کہتی ہوں اپنی پری کی کوئی خیر خبر نہیں' شہر جا کر معلوم تو کرو کس حال میں ہے۔" کرم دین گھر آیا تو وہ انہیں گھیر کر بیٹھ گئیں۔

"خیریت سے ہی ہوگی' شاید ہمارا وہاں جانا حویلی والوں کو اچھا نہ لگے۔" حقے کا کش لگا کر دھواں فضا کے

سپرد کرتے ہوئے بولے۔

"بیٹی ہے وہ ہماری ایسے کیسے اس سے لاتعلق رہیں، مجھے ہروقت اس کی یاد ستاتی ہے۔" ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ پری کے بغیر گھر انہیں بھی بہت سونا اور اداس لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
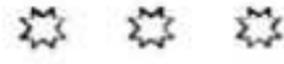
اتوار کا دن تھا' وہ معمول کے مطابق اٹھا' بیڈ ٹی لی اور پری کو تلاش کرتا ہوا اسٹڈی میں آگر گیا۔ وہ کتاب اسٹڈی ٹیبل پر رکھے نہایت انہماک سے پڑھ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح دوپٹا سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ وہ پڑھنے میں اس قدر محو تھی کہ اس کی آمد سے بے خبر رہی۔

"کیا آپ کے پاس ڈھنگ کا کوئی ڈریس ہے؟" اس نے ٹیبل پر جھکتے ہوئے اس کو متوجہ کیا۔ اتنی صبح اس طرح اچانک اسے اسٹڈی میں اپنے سامنے دیکھ کر وہ اچھل پڑی تھی۔

"جی! کیا مطلب' میں سمجھی نہیں۔" اس نے کتاب فوراً" بند کردی تھی۔ یشب شاہ اس کی اس اضطراری حرکت کو نوٹ کرچکا تھا۔

"میرے بیسٹ فرینڈ عمار نے ہم دونوں کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہے' کیا آپ کے پاس کوئی ایسا ڈریس ہے جو پہن کر جاسکیں؟ یا مارکیٹ سے جاکر لے آتے ہیں۔" اس کی نظریں مسلسل اس کی کتاب کی طرف تھیں' جسے شاید وہ اس سے چھپانا چاہتی تھی۔

"میرے سب ڈریسز تو ایسے سادہ ہی ہیں۔ آپ دیکھ لیں۔" وہ اس کی توجہ کتاب سے ہٹانا چاہتی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہی۔

"یہ سب تو بہت ہی سادہ ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کے لیے New ڈریس لینا ہوگا۔" ناشتے کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے کر مارکیٹ گیا تھا' کچھ پس وپیش کے بعد وہ ساتھ جانے پر رضامند ہوگئی تھی۔ یشب شاہ نے اسے ڈریسز کے ساتھ میچنگ شوز' جیولری اور میک اپ کا بھی اچھا خاصا سامان لے دیا تھا۔

"اور کچھ چاہیے؟" شاپنگ بیگز کو ہاتھ میں پکڑے وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"نہیں بس اب گھر چلیں۔" وہ گھبراہٹ محسوس کررہی تھی اتنی تفصیلی شاپنگ سے۔

☼ ☼ ☼

وہ گھیروالی فراک اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ بڑا سا دوپٹے سر پر اوڑھے وہ تیار تھی۔ اس شہد رنگ بالوں کی کچھ لٹیں اسے پریشان کررہی تھیں۔ وہ کافی زیادہ نروس تھی۔ سوٹ کی ہم رنگ چوڑیاں دوسرے ہاتھ میں کنگن جوماں جان نے دیے تھے' رونمائی کا تحفہ جو یشب شاہ نے دیا تھا خوب صورت سونے کا سیٹ جس میں ڈائمنڈ لگے تھے اس نے وہ پہن رکھا تھا۔

"دوپٹا اس طرح مت لو۔" اس کو دیکھتے ہی یشب شاہ نے آگے بڑھ کر دوپٹا اس کے سر سے اتار دیا تھا۔

"نہیں پلیز۔" اس نے بے اختیار دوپٹا سر پر ڈال لیا تھا۔ "میں آپ کی ہربات نہیں مان سکتی۔"

"اس طرح اچھا نہیں لگ رہا' ڈریس کی ساری گریس (Grace) خراب ہورہی ہے پھر وہاں کون ہوگا جس سے آپ پردہ کررہی ہیں۔"

"آپ کا دوست تو ہوگا ناں۔"

"اوکے فائن۔" وہ گاڑی کی چابی اور اپنا والٹ اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ وہ یہاں آتے ہوئے جس قدر نروس تھی عمار اور اس کی مسز سے ملنے کے بعد اس کی جھجک ختم ہوگئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی اسے فل پروٹوکول دے رہے تھے۔ ایک ایک چیز اسے پیش کررہے تھے۔

"ویسے آپ کا نام بہت خوب صورت ہے ریحان! کیا مطلب ہے آپ کے نام کا۔" عمار نے ایک دم سوال کیا تھا۔

"پریوں جیسی۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"ویری نائس۔" اس نے جھینپتے ہوئے یشب شاہ کو

دیکھا وہ زیرلب مسکرا رہا تھا۔
"واقعی نام بھی پیارا ہے اور مطلب بھی، بالکل تمہاری طرح۔" عمار کی مسز نے بھی کھلے دل سے تعریف کر ڈالی۔ وہ بہت جلد اس سے فرینک ہو گئی تھی مگر پری زیادہ وقت خاموش ہی رہی۔ "آؤ پریہان ہم کچن میں چلتے ہیں، چائے بناتے ہیں، ان دونوں کی بورنگ باتیں شروع ہو گئیں۔" ان دونوں نے بزنس کے متعلق باتیں شروع کیں تو فریحہ بور ہونے لگی۔ پریہان خاموشی سے اس کے ساتھ کچن میں آ گئی۔
"ویسے بہت خاموشی سے شادی کروائی یشب نے، چلو شکر ہے اسے بھی کوئی لڑکی پسند تو آئی۔ عمار کو تو یہی کہتا ہے کہ ارینج میرج ہے میری، لیکن تم سے ملنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔" وہ شرارت آمیز انداز سے بولا۔ "ویسے جھوٹ بولتا نہیں ہے وہ۔" اس نے چولہا جلاتے ہوئے کہا۔
"وہ سچ کہتے ہیں، ہماری ارینج میرج ہے۔" اسے یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ یشب شاہ کو کوئی جھوٹا سمجھے۔
"ویسے میں مذاق کر رہی تھی۔ مجھے اس کی نیچر کا پتا ہے۔ یونیورسٹی میں ہم تینوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہماری ایک کلاس فیلو ہوا کرتی تھی نورا۔" اس نام پر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔
"بہت کوشش کی تھی اس نے یشب کو اپنے دام الفت میں پھنسانے کی، مگر اس نے اسے کبھی لفٹ نہیں کروائی تھی۔"
"اب کہاں ہوتی ہے وہ؟" نا چاہتے ہوئے بھی وہ پوچھ بیٹھی۔
"بے فکر رہو۔ اس کی شادی ہو گئی ہے تین سال پہلے، اب تو بیٹا بھی ہے اس کا۔" پریہان نے سکون کا سانس لیا۔ پہاڑ جیسا بوجھ اس کے اعصاب سے اتر گیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اس کا موڈ بہت اچھا تھا یہ بات یشب نے بطور خاص محسوس کی تھی۔
"او کے یار، اب اجازت۔" چائے پیتے ہی یشب شاہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"کچھ دیر تو اور رکو۔" ان دونوں میاں بیوی نے روکنا چاہا۔
"ٹائم بہت ہو گیا، ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔" اس نے پریہان کو اشارہ کیا تھا۔ وہ فریحہ کو گلے مل کر عمار کو سلام کر کے پورچ میں آ گئی تھی۔ فریحہ نے اسے بہت پیارا سوٹ دیا تھا۔
"عمار بھائی اس کی ضرورت نہیں۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے عمار نے سبز رنگ کے کئی نوٹ اسے تھمائے۔
"بھائی کہا ہے تو اب انکار نہیں چلے گا۔" وہ شفقت سے بولا۔ ان کی بے لوث محبت اور خلوص نے اس کا دل جیت لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اوائل فروری کی شامیں بے حد اداس گزر رہی تھیں۔ یشب شاہ کے جانے کے بعد وہ اسٹڈی میں آ جاتی اور اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ اس نے یہ بات یشب شاہ سے چھپائی تھی کہ وہ پرائیویٹ امیدوار کے طور پر گریجویشن کا امتحان دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔
"یہ نمبر کس کا ہے؟" اس نے فون کال میز پر اس کے سامنے پھینکا تھا۔ پری کی تو مانو جان ہی نکل گئی۔
"معلوم نہیں۔" اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"اس گھر میں میرے اور آپ کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہیں ہے، میں تو اس نمبر کو جانتا تک نہیں، کال کرنا تو دور کی بات۔ تو مطلب یہی ہوا کہ آپ کال کرتی رہی ہیں۔" وہ حتی المقدور لہجے کو نارمل رکھنے کی سعی کر رہا تھا۔
"میری سہیلی شگفتہ کا نمبر ہے۔ گاؤں میں میرے گھر کے ساتھ ہی اس کا گھر ہے۔ میں اس کے نمبر پر اماں کو کال کرتی تھی۔" اس نے جلد ہی اعتراف جرم کر لیا تھا۔
"مائی گڈنیس!" اس نے دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ پر مارا۔ پری کو اپنا دل اچھل کر حلق میں آتا محسوس ہوا۔ "آپ کو اپنی سہیلی سے بات کرنا تھی یا

اماں سے مجھے کہا ہوتا' جانتی ہیں کتنا زیادہ بل آیا ہے۔ صرف آپ کی اس حماقت کی وجہ سے جو آپ نے لینڈ لائن نمبر سے موبائل فون پر کال کرکے کی۔"
"سوری آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ سر جھکائے مجرم بنی بیٹھی تھی۔
"پہلے دن سے آج تک آپ نے میرے لیے پرابلمز کری ایٹ کی ہیں' آپ کو کچھ سمجھ نہیں آتی۔" اس نے ایک غصے بھری نظر اس کے خوف سے پیلے پڑتے چہرے پر ڈالی تھی۔
"آپ کو کچھ بھی سمجھانا فضول ہے۔" اس کا انداز نہایت ہتک آمیز تھا۔ وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہ سب نیم وا کیے دکھ اور حیرت کے ملے جلے جذبات کا شکار' ساکت بیٹھی رہی۔ اس کے الفاظ تیر کی طرح اس کے پہلو میں پیوست ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یعنی حد ہوگئی حماقت کی' لینڈ لائن نمبر سے موبائل فون پر کال کرتی رہی ہے وہ بھی دو گھنٹے تو کبھی تین گھنٹے روزانہ۔" وہ شدید غصے میں تھا۔
"دل کو اتنا چھوٹا مت کرو یار' بیوی ہے وہ تمہاری' کیا ہوگیا اگر بل زیادہ آگیا۔ اگر تمہارا پیسہ تمہاری بیوی خرچ نہیں کرسکتی تو کیا فائدہ اتنی دولت کمانے کا۔" عمار کو اس کی بات بہت بری محسوس ہوئی تھی۔
"جانتا تھا تم اس کی فیور کروگے۔" وہ جل کر بولا۔
"فیور کی نہیں اصول کی بات ہے۔ بیوی ہے تمہاری رائٹ بنتا ہے اس کا۔" عمار اس سے ناراض ہونے لگا تھا۔ پریسان کو وہ اپنی بہنوں کی طرح چاہنے لگا تھا۔ ایسی چھوٹی سی' پیاری سی لڑکی سے اسے پوری ہمدردی تھی۔ "کہاں ہے اس وقت۔"
"سو رہی ہے۔ تم میری ٹینشن کو نہیں سمجھ سکتے۔ آغا جان اور بابا کے فیصلے نے مجھے سولی پر لٹکا رکھا ہے' کس اذیت سے گزر رہا ہوں کوئی نہیں جانتا۔" الفاظ تھے یا برچھیاں' پریسان کے سینے میں پیوست ہوگئی تھیں۔ سسکیاں اس کے اندر دم توڑ رہی تھیں۔

"گڈ نائٹ' میں سوتا ہوں صبح آفس جانا ہے۔ تم سے....." الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ وہ صوفے سے اٹھا تو لاؤنج کے دروازے کے پاس وہ کھڑی نظر آئی۔ ایک دم وہ سناٹے میں آگیا تھا۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اچانک مڑی اور اندر بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

"پریسان۔" اسے پیاس لگی تھی۔ پانی پی کر پلٹا تو بیڈ پر اس کی جگہ خالی تھی۔ وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے واش روم تک گیا' وہ وہاں نہیں تھی' تیزی سے بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج' کچن' اسٹڈی اس کے بعد تمام رومز اور پھر پورا گھر چھان مارا مگر وہ کہیں نہ تھی۔
"مائی گاڈ!" وہ چکرا کر رہ گیا۔ "کہاں چلی گئی۔"
سردی کے باوجود اسے پسینہ آگیا وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ سرد ہوا کا جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا تو اس نے جھرجھری لی۔ دور تک پھیلی ہوئی روش کے دونوں اطراف میں موجود وسیع و عریض لان کا کونا کونا چھان مارا مگر وہ کہیں نہ تھی۔
"یا اللہ کدھر چلی گئی' کہاں ڈھونڈوں اسے۔"
آخری راتوں کا گھٹتا ہوا چاند آسمان پر محو سفر تھا۔ ہر سو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ سر تھام کر لان کے سنگی بینچ پر بیٹھ گیا۔
اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اٹھا اور گھر کے عقبی حصے میں آگیا۔
"پریسان!" وہ تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے جانے کب سے رو رہی تھی۔ اس کی دبی دبی سسکیاں ماحول کو وحشت ناک بنا رہی تھیں۔ "اندر چلو' یہاں سردی ہے۔" وہ پنجوں کے بل اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔ اس نے شانے سے پکڑ کر ہلایا تھا۔
"آپ مجھے میری اوقات میں رہنے دیں' جائیں یہاں سے۔" اس کے رونے میں تیزی آگئی تھی۔

"رونے کا شوق اندر جا کر پورا کرلیں۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ "اگر آپ نہیں اٹھیں گی تو مجبوراً" مجھے آپ کو اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔" اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وہ فوراً" اٹھی اور اس سے بھی پہلے اندر چلی گئی۔

"کیا آپ نے مجھے پریشان کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے؟" وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ یشب شاہ نے دیکھا تھا شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ پپوٹے سوج گئے تھے' بالوں کی کچھ آوارہ لٹیں چہرے پر چپک گئی تھیں۔ ناک سرخ ہوگئی تھی۔ اس کے خوب صورت گلابی لب ہوے ہوئے کپکپا رہے تھے۔

کب سے وہاں بیٹھی تھی؟ اگر طبیعت خراب ہوجاتی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اس نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ شاید انہیں گرمی پہنچانا چاہ رہا تھا۔

"چھوڑ دیں میرے ہاتھ۔" اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ "مجھے آپ کی ان ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی مضبوط گرفت سے آزاد کروایا تھا۔

"پھر کس چیز کی ضرورت ہے آپ کو۔" وہ بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اب واقعی آپ سے کچھ بھی نہیں چاہیے' جو شخص مجھے عزت نہیں دے سکتا مجھے اس سے اور کسی بھی چیز کی خواہش نہیں ہے۔" وہ اٹھ کر بیڈ پر جا بیٹھی تھی۔

"واٹ!!" وہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور اس کے عین سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ "میں نے کب توہین کی ہے آپ کی؟۔ کب کچھ کہا؟ بولیں۔" اس نے ہولے سے اسے ہلایا تھا۔

"مجھے اگر زندگی میں محبت اور عزت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو میں عزت کو منتخب کروں گی۔ کیونکہ محبت کے بغیر انسان جی سکتا ہے عزت کے بغیر زندگی کا ہر لمحہ موت سے بدتر ہوتا ہے اور آپ نے۔۔۔" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ "آپ نے میری زندگی کو موت سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھ سے اس قدر بدگمان ہو۔ جن حالات میں ہماری شادی ہوئی' میں مانتا ہوں کہ ذہنی طور پر پریشان ہونے کی وجہ سے میں کچھ روڈ ضرور ہوا ہوں۔ لیکن میں قسم کھاتا ہوں میں دانستہ کبھی آپ کی توہین نہیں کی۔" وہ وضاحت کرنے لگا۔

"اونہہ 'صرف روڈ!" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"میں رشتوں کو پوری ایمانداری سے نبھانے کا عادی ہوں۔ میں مجبوری کا کوئی ایک لمحہ بھی تمہاری جھولی میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا' جو تمہیں خیرات محسوس ہو۔ میں اپنے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ تمہیں اپنانا چاہتا تھا' تاکہ میری قربت تمہیں مجبوری کا سودا اور بوجھ نہ لگے' میرے ساتھ بتائے لمحوں پر تم اپنی نظروں میں سرخرو ہوسکو۔"

"جن حالات میں آپ کی شادی ہوئی' میری شادی ہوئی' میری شادی بھی ایسی حالات میں ہوئی۔ پھر آپ کو ہمیشہ ایسا کیوں لگا کہ نقصان صرف آپ کا ہوا' اس لیے ناں کہ آپ ایک فارن کوالیفائیڈ' ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک' فائننشلی اسٹرونگ انسان ہیں۔ آپ سے شادی کرکے مجھ جیسی کم پڑھی لکھی گاؤں میں رہنے والی لڑکی کی تو قسمت ہی کھل گئی۔" وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

"شادی کی پہلی رات ہی آپ اپنی انا کی تسکین کی خاطر' میرا مان' ذات کا فخر و غرور سب کچھ اپنے قدموں تلے روند کر حویلی سے شہر چلے آئے' دراصل آپ سب کو دکھانا چاہتے تھے کہ آپ نے مجھے تسلیم نہیں کیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ یشب شاہ کو کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ اسے کیا کہے۔

"آپ کہتے ہیں آپ رشتوں کو ایمان داری سے نبھاتے ہیں' میں کہتی ہوں آپ رشتوں کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ کاش اس رات آپ کمرے سے باہر نہ نکلتے' بھلے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے'

کسی کو یہ تو علم نہ ہوتا کہ میں ایک ان چاہی بیوی ہوں۔" اس کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئی تھیں۔
"ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ لاجواب ہوگیا تھا۔ وہ ایک دم بیڈ پر لیٹ گئی اور کمبل سر تک تان لیا۔
"پریہان بات سنو میری۔" اس نے کمبل ہٹانا چاہا۔
"سونے دیں مجھے۔"
"ایسے نہیں سونے دوں گا۔" اس کے اندر انجانی خواہشیں بے دار ہورہی تھیں۔ وہ نئے جذبوں سے آشنا ہوا تھا' لمحوں میں واردات ہوئی تھی اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ اس کا سب کچھ لوٹ کر وہ سوچکی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنی جگہ پر آگیا۔ اپنا پہلو اسے خالی محسوس ہوا تھا۔ نظریں پھیر کر اس نے کمبل میں لپٹے وجود کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مس مایا یہ فائل نہیں منگوائی۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے فائل میز پر پٹخی۔
"مگر سر آپ نے ہی تو کہا تھا کہ۔۔۔"
"مس مایا!" وہ درشتی سے اسے ٹوکتے ہوئے بولا "جائیں۔" وہ فائل اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اس نے ریوالونگ چیئر کو گھما کر اس کا رخ دیوار کی جانب کرلیا "لیس!" ڈور ناک ہوا تھا۔
"سر یہ آپ کی کافی" چپڑاسی نے مودب انداز سے کافی میز پر رکھی۔
"نہیں پینی' آپ لے جائیں۔"
"لیکن سر۔"
"آپ سے جیسا کہا گیا ہے ویسا ہی کریں۔" اس نے اٹھ کر فین آن کیا تھا۔ اس کے اندر آگ جل رہی تھی۔ عجیب سی شکست و ریخت کا عمل جاری تھا۔ اپنی کیفیت اسے خود سمجھ نہ آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ اداسی اس کے گرد بال پھیلائے سو رہی تھی۔ رات والے واقعے نے اسے اچھی طرح باور کروادیا تھا کہ اس کی کیا اہمیت و وقعت ہے اس گھر میں۔ یشب شاہ کے دل اور زندگی میں۔

محبت کھیل ہے قسمت کا
یوسف نہیں ملتا
زلیخا نام رکھنے سے

رات سے اب تک وہ بہت رو چکی تھی۔ "میں نے اپنے دل کی گہرائیوں اور شدتوں سے آپ کو چاہا ہے مگر میں آپ سے اپنی مزید توہین تو ہرگز نہیں کرواؤں گی۔" اس نے الماری کھولی اور اپنے تمام کپڑے جو وہ گاؤں سے ساتھ لائی تھی بیگ میں رکھنے لگی۔
"السلام علیکم!" دروازہ کھلا تھا۔ اس نے مڑے بغیر سلام کا جواب دیا جو یشب شاہ نے شاید سنا بھی نہ تھا۔
"کیا ہو رہا ہے؟" وہ عین اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا تھا اس طرح کہ اگر وہ مڑتی تو اس سے ٹکرا جاتی۔
"پیکنگ!" اس نے مختصر جواب دیا۔
"خیریت' کیا کہیں جا رہے ہیں ہم؟" اس نے الماری کے دونوں سائڈز پر ہاتھ رکھ دیے تھے۔
"ہم نہیں صرف میں۔" اس نے تصحیح کی تھی۔
اس نے رخ موڑا تو اس کا سر یشب شاہ کے سینے سے ٹکرا گیا وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔
"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" اس نے ایک نظر سائڈ پر رکھے بیگ پر ڈالی۔
"گاؤں!" اس نے گویا اس پر بم پھوڑا تھا۔ "رستہ چھوڑیں۔" اس نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کی قربت' بدن سے اٹھتی دلفریب کلون کی مہک' سب کچھ اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔
"کس سے پوچھ کر جا رہی ہیں آپ؟" اس کے ہاتھ ہٹاتے ہی وہ تیزی سے اس کے سامنے سے ہٹی تھی۔
"نہ میں یہاں کسی سے پوچھ کر آئی تھی اور نہ جانے کے لیے مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت ہے۔" اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ بے خوفی سے بولی تھی۔ کہنے کو تو کہہ گئی تھی مگر اپنے الفاظ پر وہ خود حیران تھی۔

"آپ یہاں آئی تو آغا جان کی مرضی سے ہیں، مگر آپ میری مرضی کے بغیر جا نہیں سکتیں۔" وہ اس کے کپڑے بیگ میں سے نکال کر الماری میں رکھنے لگا تھا۔

"آپ ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ آگے بڑھ کر اسے ایسا کرنے سے روکنے لگی۔

"میں کیا کچھ کرسکتا ہوں، اس کا آپ کو ابھی اندازہ نہیں ہے۔" اس کی بات نے اسے نظریں چرانے پر مجبور کردیا تھا۔

"مجھے اندازہ کرنا بھی نہیں۔" وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔ یشب شاہ نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا تھا۔

"تو اندازہ لگاؤ ناں یار، تمہارا شوہر تم سے کیا کہنا چاہتا ہے۔" وہ پیار سے اپنائیت بھرے لہجے میں بولا۔

"میں نہیں جاننا چاہتی کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، پلیز چھوڑدیں مجھے۔" وہ رودی۔

"یار، یار چھوڑنے کی بات مت کرو۔" وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

"اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے نہ جاؤں تو پلیز۔" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس کو چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس نے بمشکل اپنا سانس بحال کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا رویہ پریہان کے ساتھ بہت بدل گیا تھا۔ وہ اب آفس سے بھی جلدی آجاتا، پھر کسی نہ کسی بہانے اس کے ساتھ ہی رہتا۔ وہ خود بھی اس کا یا پلٹ پر حیران تھی مگر قصداً" نظرانداز کررہی تھی۔

"پریہان یہ تمہارے لیے لایا ہوں میں۔" وہ رات کے کھانے کے بعد بیڈ روم میں آئی تھی تو یشب شاہ فوراً" اس کے پیچھے آیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"سیل فون۔" یشب شاہ اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ڈبا اس کی گود میں رکھ دیا۔

"مجھے یہ نہیں چاہیے۔" وہ اٹھ کر بیڈ شیٹ کو درست کرنے لگی۔

"وہ کونسا طریقہ ہے جس سے تم خوش ہوگی، تمہاری خفگی دور ہوگی؟" وہ فوراً" اس کے پیچھے آیا تھا۔

"میں خفا نہیں ہوں، مگر اب واقعی مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ وضو کرنے کے لیے واش روم چلی گئی، یشب شاہ اس کی پشت کو گھور کر رہ گیا۔ وہ نماز پڑھنے لگی تو یشب شاہ میگزین لے کر بیٹھ گیا اور بے دھیانی سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

"اتنی لمبی نماز آہ۔" اس نے مصنوعی ٹھنڈی سانس فضا کے سپرد کی۔

"شوہر ناراض ہو تو اللہ تعالیٰ دعا قبول نہیں کرتے۔" وہ نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھی جب اس نے زیر لب سرگوشی کے انداز میں کہا۔ مگر اس کی آواز صاف اس تک آئی تھی۔

"اور اگر بیوی خفا ہو، تب اللہ تعالیٰ شوہر کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟" اس نے جائے نماز تہ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ دوپٹا سر پر لپیٹے نگاہیں جھکا کر بات کرتی ہوئی وہ یشب شاہ کو بہت اچھی لگی تھی۔

"ہوں، یہ سوچنے کی بات ہے۔ ویسے کس کی بیوی ناراض ہے؟" وہ شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

"معلوم نہیں۔ مجھے نیند آرہی ہے، میں سونے لگی ہوں۔" وہ تکیہ درست کرتے ہوئے بولی۔

"میرے سر میں درد ہورہا ہے، اگر برا نہ لگے تو پلیز دبادو۔" اسے یشب شاہ پر غصہ آیا تھا۔ چند ثانیے کشمکش و پیچ میں مبتلا رہنے کے بعد وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھی۔ وہ بہت نرمی سے اس کا سر دبا رہی تھی۔

"آپ آنکھیں بند کرلیں پلیز۔"

"ارے، وہ کیوں؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"ایسے میں نہیں دبا سکتی۔"

"ریئلی!" وہ حیران ہوا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ پریہان سر دبانے کے ساتھ نادانستگی میں اس کو دیکھے گئی۔ بلاشبہ وہ بہت خوب صورت، ڈیشنگ پرسنالٹی کا مالک ایک مکمل مرد تھا۔

"آنکھیں بند کروا کر چوری چوری ہمارا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے۔" اس نے اچانک آنکھیں کھولیں تو پریسان سٹپٹا گئی۔ اس کے زاویہ نظر بدلنے پر وہ لطف لیتے ہوئے ہنسنے لگا۔ "ادھر یونیورسٹی میں بھی ہزاروں لڑکیاں مجھ پر مرتی تھیں۔"

"خوش فہمی ہے آپ کی، میں ان لڑکیوں میں سے ہرگز نہیں ہوں۔" وہ برا مانتے ہوئے اٹھنے لگی۔

"تم ان لڑکیوں میں سب سے آگے ہو۔" اسے چڑانے میں اسے مزا آ رہا تھا اس کو اٹھتا دیکھ کر یشب شاہ نے سرعت سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"ہاتھ چھوڑیں شاہ جی۔" وہ خفگی سے بھرپور لہجے میں بولی۔ "آئندہ آپ کا کوئی کام نہیں کروں گی۔" وہ اپنی جگہ پر جا کر لیٹی تو یشب شاہ نے ایک تھکی ہوئی سانس فضا کے سپرد کی۔

"جو لوگ رشتوں کو ٹھکراتے ہیں، محبت کی پروا نہیں کرتے وہ ایک دن ایسے ہی خوار ہوتے ہیں۔ جیسے میں نے اسے ہرٹ کیا ہے تو اتنا تو اس کا حق بنتا ہے۔"

تمام رات ان ہی سوچوں میں گزری تھی۔

☆ ☆ ☆

کرم دین مجھے میری بیٹی کے پاس جانا ہے۔ کتنے مہینے ہو گئے اس کی شکل دیکھے فون پر بات کر لیتی تھی تو کچھ تسلی ہو جاتی تھی اب تو بہت دن ہوئے اس کا فون بھی نہیں آیا۔ کرم دین بستر پر لیٹا تو وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"آج آغا جان سے ملاقات ہوئی تھی میری کہہ رہے تھے ایک دو روز تک شہر جائیں گے تو اسے ساتھ لیتے آئیں گے۔"

"سچ کہہ رہے ہو کرم دین؟" اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ "بس اب بہت دن میں نے اسے یہاں سے جانے نہیں دینا۔ جب سے شادی ہوئی ہے وہ رہنے نہیں آئی۔" کرم دین خاموشی سے اس کے خوشی سے جگمگاتے چہرے کو دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"پریسان شام کو تیار رہنا، میں جلدی گھر آؤں گا شاپنگ پر چلیں گے اور ڈنر بھی باہر ہی کریں گے۔" اس نے ایک نرم مسکراہٹ اس کی سمت اچھالی۔

"ٹھیک ہے۔" یشب شاہ کے جانے کے بعد وہ اسٹڈی میں آ گئی تھی۔ ایگزامز بہت قریب تھے۔ وہ نہایت انہماک سے پڑھ رہی تھی، ابھی اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب فضل چاچا نے آغا جان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ اس نے کتاب بھی بند نہ کی اور پین کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر آ گئی۔

"السلام علیکم آغا جان!" وہ ایک شان اور تمکنت سے صوفے پر براجمان تھے۔ "آپ اپنے آنے کی اطلاع کر دیتے تو "وہ" آج آفس نہ جاتے۔" وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"میں اس سے نہیں تم سے ملنے آیا ہوں۔" وہ پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا بات ہے آغا جان؟ میں سمجھی نہیں۔" ان کا رویہ اس کے لیے ناقابل فہم تھا۔

"یہ۔ یہاں پر سائن کرو۔" انہوں نے ایک فائل اس کے سامنے میز پر پھینکی۔

"مگر..... یہ کیا ہے؟" وہ خوف سے کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اپنی اوقات میں رہو لڑکی۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر تنبیہہ کی۔ "خیر مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"آغا جان!" اس کے لب ہلے تھے۔ آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی تھی۔

"ایسا کیسے ممکن ہے؟" وہ بے یقین نگاہوں سے ان کے سرد اور سخت چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

"سائن کرو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ تحکم بھرے لہجے میں بولے۔ اس نے خاموشی سے سائن کر دیے۔

"تم تیار ہو جاؤ، تمہیں میرے ساتھ گاؤں جانا ہے۔" وہ فائل ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔

"میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گی، جب تک شاہ

جی نہیں آجاتے۔" وہ کسی خوف کے زیر اثر چلائی تھی۔

"تمہارے شاہ جی اب آئیں گے بھی نہیں، وہ اب کبھی تم سے بات بھی نہیں کرے گا' شکل نہیں دیکھے گا تمہاری۔" وہ سفاکی سے بولے۔

"میں نے آپ کی بات مان لی' سائن کر دیے اب میرے ساتھ ایسا مت کریں پلیز۔" وہ آنسو پیتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔

"سائن تو بہر حال تمہیں کرنے ہی تھے۔" وہ تکبر سے بولے۔

"آپ جو میرے ساتھ کر رہے ہیں' آپ کو اللہ سے ڈر نہیں لگ رہا۔؟" وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔

"میں یہاں تم سے وعظ سننے نہیں آیا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" وہ سفاکی سے بولے۔ وہ بیڈ روم میں آگئی اور موبائل سے یشب کو کال کرنے لگی۔

"نہیں شاہ جی آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔ "پلیز فون اٹینڈ کریں۔" وہ رودی۔ "میں کیا کروں میرے اللہ۔" وہ دوبارہ کال ملانے لگی۔ بزدل انسان۔ اتنی بھی ہمت نہیں کہ مجھے فیس تو کر لو اونہہ۔" اس نے بے دردی سے آنسو رگڑ ڈالے۔ اس نے کچھ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ سونے کا سیٹ جو یشب شاہ نے منہ دکھائی میں دیا تھا اور اس کی ماں کے دیے ہوئے کنگن اتار کر اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔

"آپ دھوکے باز نہیں ہیں۔" میرا دل نہیں مانتا۔ آپ ایسے نہیں ہیں۔" اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑی اس کی تصویر اٹھالی اور اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر تصویر پر گرنے لگے۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ اب یہاں کبھی نہ آئے گی۔

سب کچھ وہیں تھا اس نے صرف موبائل فون کو آف کر کے چادر کے نیچے چھپا لیا تھا۔ اس نے ایک الوداعی نظر کمرے پر ڈالی' اس کے دل کی حالت بری ہو رہی تھی' قدم من من بھر کے تھے' ایک قدم اٹھاتی تو دل پچاس قدم پیچھے ہٹتا۔

"تمہارے پوتے سے ملنے یا رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا' بہت جلد ہم اس کی شادی کرنے والے ہیں۔" گاڑی آگے بڑھ گئی وہ دیر تک کچی سڑک پر رکی دھول کو دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"پری۔" اماں اسے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ "اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہو؟ رنگ پیلا ہو رہا ہے۔ آئی بھی اکیلی ہو۔ یشب شاہ کدھر ہے۔" وہ وسوسوں میں مبتلا ہو رہی تھیں۔

"اماں میں ٹھیک ہوں۔ وہ آفس میں بہت مصروف ہیں آج کل اس لیے نہیں آئے۔" ان کے گلے لگ کر وہ رودی۔

"رو کیوں رہی ہو؟" وہ پریشان ہو اٹھیں۔

"کتنے مہینوں کے بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے اماں۔" اس نے فورا" آنسو پونچھے۔ ابا کدھر ہیں؟ اس کے اندر تلاطم برپا تھا مگر بظاہر پر سکون رہنے کی کوشش میں وہ بے حال تھی۔

"آتے ہی ہوں گے۔ تم کھاؤ گی کیا؟" اسے لے کر برآمدے میں آگئیں۔

"اماں ساگ کھاؤں گی۔" وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔

"میں بناتی ہوں' پہلے چائے پانی پی لو۔" اماں اٹھتے ہوئے بولیں۔

اماں کے جاتے ہی اس نے موبائل فون اٹھایا اور فورا" آن کر لیا۔ اسے انتظار تھا کہ یشب شاہ آفس سے واپس آکر اس سے بات کرے گا۔ ایک ایک پل صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت خوش گوار موڈ میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ سیدھا اپنے روم میں آیا۔ "پریہان۔" اس نے آواز دی۔ "شاید اسٹڈی میں ہو۔" وہ سیٹی پر شوخ دھن بجاتا ہوا اسٹڈی میں آیا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ البتہ اس کی کتابیں وہاں

پڑی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔

"پری بھئی کدھر ہو؟" وہ بولتا ہوا کچن میں آیا۔

"سلام صاحب!" وہ اس کے لیے چائے بنا رہے تھے۔

"فضل چاچا! پریہان کدھر ہے؟" وہ استفسار کرنے لگا۔

"وہ تو آغا جان آئے تھے' ان کے ساتھ چلی گئیں۔ بی بی شاید رو رہی تھیں۔" انہوں نے بتایا۔

"آغا جان آئے تھے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "یقیناً" پریہان ضد کر کے ان کے ساتھ گئی تھی۔" اسے غصہ آیا تھا۔ وہ اپنے روم میں آگیا تھا۔ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔

"صاحب چائے۔" فضل چاچا نوک کر کے اندر آئے تھے۔

"موڈ نہیں ہے چاچا۔" اس نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"تو تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔" شام سے رات ہو گئی' اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اپنے کمرے میں بیٹھا مسلسل سموکنگ کر رہا تھا۔ "کیا میری غلطی اتنی بڑی ہے کہ تم مجھے اس طرح سزا دو؟ بارہا معافی مانگ چکا ہوں۔ اپنے سابقہ رویے پر شرمندہ ہوں پھر تم کیوں ایسا کر رہی ہو میرے ساتھ۔"

"مجھے اب واقعی آپ سے کچھ نہیں چاہیے' جو شخص مجھے عزت نہیں دے سکتا مجھے اس سے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔" بھیگا بھیگا لہجہ اس کے آس پاس ابھرا تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ نہیں نہ تھی۔

"مجھے اگر زندگی میں محبت اور عزت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو میں عزت کو منتخب کروں گی' کیونکہ محبت کے بغیر انسان جی سکتا ہے' عزت کے بغیر نہیں کیونکہ عزت کے بغیر زندگی کا ہر لمحہ موت سے بدتر ہوتا ہے اور آپ نے میری زندگی کو موت سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔"

"پریہان!" وہ بے چین ہو کر اٹھا تھا۔ اس کے اندر بہت شور تھا۔ بے چینی و اضطراب اس قدر بڑھا کر وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اسے کسی پل چین نہ آرہا تھا۔ ایک خیال اس کے ذہن میں جاگا۔ اس نے وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر بیٹھ گیا۔

"اے اللہ تو تو اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے ناں' تو ان کے دل کا حال جانتا ہے۔ میں اس وقت کتنی تکلیف میں ہوں تیرے سوا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ مالک میں بہت گناہ گار آج تک کبھی تجھ سے کچھ مانگا ہی نہیں' تجھ سے رابطہ ہی نہ کیا۔ شاید بن مانگے سب مل رہا تھا' کبھی تیرا خیال ہی نہیں آیا۔

مگر آج سب کچھ ہونے کے باوجود اس ایک کے نہ ہونے سے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا اے اللہ پاک جس طرح تو نے میرے دل میں اس کے لیے محبت ڈالی ہے اس کے دل کو بھی میری طرف سے صاف کر دے۔ اس کی بدگمانیوں اور ناراضی کو ختم کر دے۔ اے شان کریمی مجھے مایوس نہ کرنا۔ تو جانتا ہے کہ میرے جذبے سچے ہیں' پھر اسے یقین کیوں نہیں آتا۔ اے اللہ اگر وہ مجھے واپس نہ ملی تو مجھے ہمیشہ تجھ سے شکایت رہے گی۔ مالک پریہان مجھے واپس لوٹا دے۔"

وہ اونچا' لمبا خوبرو مرد' لڑکیاں جس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں' آج خود ایک لڑکی کی محبت میں رو رہا تھا' تڑپ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

شام سے رات ہو گئی تھی یشب شاہ کی کال نہیں آئی تھی۔ اس کا دل ابھی تک بے یقین تھا۔

"آپ ایسے نہیں ہیں' آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے خود آپ کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا ہے۔" اماں' ابا کے سونے کے بعد وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ موبائل فون اٹھا لائی تھی۔

"یشب شاہ میرے ساتھ ایسا نہ کریں۔ میں جی

نہیں پاؤں گی، آپ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ صرف ایک بار اپنے منہ سے مجھے کہہ دیں کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے، میں کبھی آپ کو شکل نہیں دکھاؤں گی۔" وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔ اماں ابا کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

بتاتی بھی تو کیسے۔ وہ دونوں تو جیتے جی مر جاتے۔

☆ ☆ ☆
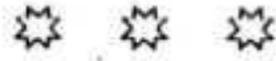
"سر یہ آپ کا موبائل کل کانفرنس روم سے ملا تھا۔" وہ آفس میں بیٹھا تھا جب اس کے ملازم نے آکر اسے موبائل تھمایا۔

"شکریہ۔" اس نے موبائل فون دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ پریسان کی بے شمار کالز آئی ہوئی تھیں۔ اس نے بے چین ہو کر فوراً" کال ملائی۔

"ہیلو۔" پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"شاہ جی!"

"پریسان۔" دونوں ایک ساتھ بولے اور ایک ساتھ چپ ہو گئے۔

"کہاں ہیں آپ؟ میں کل سے کالز کر رہی ہوں، اٹینڈ کیوں نہیں کرتے؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"کہاں ہو تم؟"

"گاؤں۔" آنسو چھلکنے کو بے تاب تھے۔

"کس سے پوچھ کر گئی تھیں۔" وہ خفگی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

"مجھے آغا جان....."

"اسٹاپ اٹ" وہ دھاڑا "آغا جان کے کندھے پر رکھ کر بندوق مت چلاؤ، آغا جان نے کہا تم یہاں آ گئی آغا جان نے کہا تو ان کے ساتھ گاؤں چلی گئی، تمہاری اپنی بھی کوئی مرضی ہے۔"

"آپ میری بات تو سنیں مجھے آغا جان....."

"مجھے کچھ نہیں سننا، تم جس طرح یہاں سے گئی ہو اسی طرح واپس آؤ گی میں تمہیں لینے ہرگز نہیں آؤں گا۔"

اس کا غصہ عروج پر تھا۔

"آپ تو ایسا مت کریں آپ تو سنیں میری بات کو....." وہ رو دی۔ "میری غلطی کیا ہے جس کی اتنی بڑی سزا دے رہے ہیں۔"

"بہت ہرٹ کیا ہے تم نے مجھے۔ خیر اینی ویز۔ میں تمہیں لینے تو اب ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"ایسا مت کہیں شاہ جی، مجھے سزا دے لیں، مگر اتنی بڑی نہیں کہ جی بھی نہ پاؤں پلیز۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یشب شاہ نے فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"نہ میرے شوہر کے گھر میں جگہ ہے میرے لیے اور نہ اماں ابا کے پاس۔ میرے بوڑھے ماں باپ طلاق کے بعد میری زندہ لاش کو کب تک کندھوں پر اٹھائیں گے؟ وہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کو دیکھ رہی تھی۔

ماں اور ابا کمرے میں سو رہے تھے۔ موسم بدل گیا تھا، فضا میں ہوائے مشکبار کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"یا اللہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں؟" اس نے نگاہ آسمان کی جانب اٹھائی۔ "میں کہاں جاؤں مالک؟" فیصلہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ مگر اس نے عمل درآمد کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔

وہ دبے پاؤں اٹھی اور بیرونی دروازے کھولنے لگی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، باہر نکلنے سے پہلے اس نے مڑ کر ایک نظر اپنے بوڑھے والدین پر ڈالی گھر کے در و دیوار اسے بہت ہولناک لگے۔

"اماں ابا مجھے معاف کر دیں۔ شاید قسمت میں یہی لکھا تھا۔" وہ دہلیز پار کر گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ پہاڑی وادی میں گھر اور خوبصورت گاؤں اس وقت کسی بھوت پریت کا مسکن معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے حوصلے ٹوٹنے لگے۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ "رک جاؤ، مت کرو ایسا۔" کوئی اس کے اندر سے پکارا مگر وہ بہری ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆
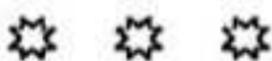
"پریسان!" وہ تیزی سے اٹھا تھا۔ اس نے بہت

ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا۔

"میں صبح گاؤں جاؤں گا اور اسے ساتھ لے کر آؤں گا۔ میں اسے بتادوں گا کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" اس خیال سے وہ کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کسلمندی سے بیڈ پر پڑا تھا۔ اس کا موبائل بپ دینے لگا۔ "ہیلو!"

"کیا؟" موبائل فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جاگرا تھا۔ "پریسان نے خودکشی کرلی۔" وہ بے یقینی سے سرہلا رہا تھا۔ "نہیں، نہیں۔ ایسا نہیں کرسکتی وہ۔" اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کے لب ہلے۔ "تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں۔" وہ زور سے چلایا مگر آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ اس نے ہمت مجتمع کر کے خود کو گھسیٹا، گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"اتنی جوان موت۔"

"بے چاری اتنی کم عمر لے کر آئی تھی۔"

"بوڑھے ماں باپ کا تو خیال کرلیتی۔"

"ہائے، ہائے، مری بھی تو کہاں۔ کنویں میں چھلانگ مار کر" بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ اس کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ حویلی کا وسیع و عریض صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔

"ذیشب شاہ آگیا۔" اسے دیکھ کر کئی آوازیں ابھری تھیں۔ آج سے کئی مہینے پہلے اس کی وجہ سے وہ حویلی چھوڑ کر گیا تھا اور آج اسی کے لیے دوبارہ یہاں قدم رکھا تھا۔

اس نے کسی کی طرف نہ دیکھا تھا۔ مجمع کو چیر کر وہ اس کی چارپائی تک آیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سو رہی تھی۔ لب آپس میں پیوست تھے۔ چہرے سے ابھی بھی ناراض لگ رہی تھی۔ اس کے اندر حشر برپا ہونے لگا تھا۔ وہ نیچے بیٹھ گیا اس کی کلائی پکڑ کر نبض تلاش کرنے لگا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا، میں کیسے جیوں گا تمہارے بغیر۔" وہ چند ثانیے بیٹھا اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے اندر حشر برپا ہو گیا تھا۔

"آپ بے فکر رہیں، اگر میرا ایسا کوئی ارادہ کبھی ہوا بھی تو آپ سے دور جا کر جان دوں گی، تاکہ کوئی آپ کو الزام نہ دے سکے۔" ناراض ناراض آواز اس کے کانوں میں گونجی تو دل پر گھونسا پڑا تھا۔ وہ اٹھا اور شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چاچا کرم دین اور اماں سے ملنے آیا تھا۔ "اصل نقصان تو ان کا ہوا ہے۔" وہ ان دونوں کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا۔ پریسان کی اماں کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اس نے طائرانہ نظر گھر پر ڈالی تھی جس کے درودیوار سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"میں اب چلتا ہوں چاچا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے کی چھت میں لگا ہوا پنکھا کسی بستر مرگ پر پڑے مریض کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کی طرح چل رہا تھا۔ خاموشی میں وقفے وقفے سے اس کی آواز ابھر رہی تھی۔

چاچا کرم دین نے بس ایک خاموش نظر اس پر ڈالی۔ وہ باہر نکل آیا تھا۔ "میرے خدا!" اسے یاد آیا تھا برآمدے میں یہی جگہ تھی جب وہ اپنی رخصتی کے وقت کھڑی سسک رہی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا تھا۔

"ذیشب بھائی!" وہ اردگرد سے بے نیاز آگے بڑھ رہا تھا جب آواز سن کر چونک کر رک پڑا۔ "میں شگفتہ ہوں، پری کی سہیلی۔" ذیشب بہت توجہ سے اس کو دیکھ رہا تھا وہ پریسان کی ہی ہم عمر لگ رہی تھی۔

"پری مجھے آپ کے لیے کچھ دے کر گئی ہے آپ رکیے میں لاتی ہوں۔" اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ مڑی اور گھر میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ ایک لفافہ تھا۔ "یہ بس۔" اس نے فوراً پکڑ لیا۔

"کب دیا تھا اس نے یہ آپ کو؟"

"جس دن اس نے خودکشی کی اس صبح۔ اسے بخار تھا' شاید وہ بہت روتی رہی تھی۔ میرے بہت پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا۔ حالانکہ ہم بچپن کی سہیلیاں ہیں کبھی کچھ نہیں چھپاتی تھی ایک دوسرے سے۔ مگر نا جانے کیا بات تھی کہ وہ مجھ سے بھی نہ کہہ سکی۔" وہ رونے لگی۔ یشب شاہ کے پاس الفاظ نہ تھے کہ اسے چپ کرواتا۔ وہ گاڑی میں جاکر بیٹھ گیا اور گاڑی آگے بڑھالی۔ ذرا سنسان جگہ پر جاکر اس نے گاڑی روک دی اور لفافہ چاک کیا۔

یشب احمد شاہ صاحب!

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ میری طلاق کے بعد میرے معصوم بوڑھے والدین جیتے جی مرجاتے۔ میرے اس اقدام سے آپ کو مجھ سے نجات اور میرے والدین کو روز کے رونے سے خلاصی ملے گی۔ میری موت پر جشن منایئے' اپنی جیت کا' مجھ سے آزادی کا' ایک لڑکی اپنے خواب اور خواہشوں سمیت منوں مٹی تلے جا سوئی' آپ کو اس سے کیا۔ آپ کی زمینیں بچ گئیں' روایات سلامت رہیں۔ جب سے آپ سے شادی ہوئی مجھے آپ کی طرف سے دکھ ملے' ایسا لگتا ہے کوئی میرے اندر بیٹھا مسلسل رو رہا ہے' ہروقت ناتمام آرزوؤں کے بین ہوتے ہیں میرے اندر۔ آپ کا التفات جسے آپ کی محبت سمجھ بیٹھی تھی اس کی حقیقت تو اب کھلی۔ دل ماننے سے انکاری؟ آپ تو بہت کامیاب اداکار ہیں۔ میں داد دیتی ہوں آپ کی اداکاری کی۔

مجھے لگا تھا آپ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں' مگر پتا ہے اصل بات کیا ہے؟ مرد کی فطرت کیسی ہوتی ہے؟ خود چاہے تو صدیوں عورت کو انتظار کی سولی پر لٹکائے رکھے اسے اگنور کرے' رلائے' تڑپائے' اس کی روح تک کو چھلنی کردے' مگر خود ایک لمحے کے لیے بھی اگنور کیا جانا برداشت نہیں کرتا۔ میں نے آپ کے اپنی طرف بڑھتے قدموں کی پذیرائی نہ کی تو اس بات نے آپ کے اندر کے انا پرست مرد کو مجھ سے بدلہ لینے پر اکسایا۔

ایک دفعہ آپ نے مجھے کہا تھا کہ بدلہ لینا کمزوری کی علامت ہے اور میں نے جواب دیا تھا کہ آپ سے کس نے کہا کہ میں بہادر ہوں۔ میں واقعی کمزور ہوں شاہ جی! مگر بدلہ نہیں لیتی۔ مجھے بدلہ لینا آتا ہی نہیں۔ آپ نے میرے جذبوں کی توہین کی' میری روح کو چھلنی کیا' میرے احساسات کو اپنے قدموں تلے روندا مجھے خون کے آنسو رلایا' مگر میں پھر بھی آپ سے نفرت نہ کرسکی' کیوں کہ وہ میری سرشت میں ہی نہیں ہے۔ میں اپنی موت کے بعد بھی آپ کی تکلیف کو محسوس کروں گی' میں آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی' آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی' آپ ضمیر پر بوجھ مت ڈالیے گا' میں آپ کو معاف کرتی ہوں۔ دل سے معاف کرتی ہوں۔

آپ نے اپنی ماں جان سے کہا تھا نا کہ ضروری نہیں جسے بیڈ روم میں جگہ دی ہے اسے دل میں بھی جگہ دی جائے' ذات کا حصہ بنایا جائے۔ آپ نے تو بیڈ روم میں دی گئی جگہ بھی چھین لی۔

آپ سب کے عزائم پورے ہوگئے' آپ سب جیت گئے' دولت جیت گئی' روایات جیت گئیں' مگر میں اور میرے ماں' باپ اپنا سب کچھ ہار گئے.... آپ کو معاف کیا.... معاف کیا۔ آگے الفاظ آنسوؤں سے مٹے ہوئے تھے۔

بدنصیب۔

پریشان یشب شاہ۔

☼ ☼ ☼

"میں اندر آجاؤں؟" وہ بیڈ پر نیم دراز گہری سوچوں میں مستغرق تھا۔ جب آواز سن کر چونکتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ سامنے انبساط کھڑی تھی۔

"آجاؤ۔" وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"وہ بہت اچھی تھی' بہت نرم مزاج' صاف دل کی

مالک۔" وہ اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ان کی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ "مجھ سے اس کی کافی دوستی ہوگئی تھی۔ مجھے اس سے کبھی بھی حسد محسوس نہیں ہوا۔" وہ خاموش رہا۔

"مگر آغا جان اور آپ کے بابا نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" توقف کے بعد دوبارہ بولی۔ یشب شاہ نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔

"آغا جان نے کیا کیا؟" وہ استفسار کرنے لگا۔

"آغا جان کے بھائی نے غیر خاندان کی عورت سے شادی کرلی تھی۔ اس عورت سے چاچا کرم دین پیدا ہوئے تھے' مگر آغا جان کے والد صاحب نے اس عورت اور اس کی اولاد کو قبول نہ کیا۔ آغا جان کے بھائی اور ان کی بیوی کار روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا' مرنے سے پہلے انہوں نے وکیل کو بلوا کر اپنی زمینوں میں سے چاچا کرم دین کا حصہ بھی لکھوایا جو انہیں بلوغ ہونے کے بعد ملنا۔ یہ بات ان کے والد کو برداشت نہ تھی کہ خاندانی جائیداد باہر جائے۔ انہوں نے آغا جان سے وعدہ لیا کہ وہ اس زمین کو چاچا کرم دین سے چھین لیں گے۔ چاچا کریم دین کی پرورش حویلی کے ملازموں کے ہاتھوں ہونے لگی۔ آغا جان نے اس وکیل کو خریدنے کی بہت کوشش کی' مگر ناکام رہے۔ زمین چاچا کرم دین اور ان کی بیٹی کے نام ہوگئی۔ اگر پریسان کی شادی غیر خاندان میں ہوتی تو زمین وہاں چلی جاتی۔ اپنی زمین تو چاچا نے خاموشی سے آغا جان کے حوالے کردی' مگر بیٹی کے حصے کا ڈیڑھ مربع انہوں نے ٹھیکے پر دے رکھا تھا جس سے وہ بیٹی کی تعلیم اور دیگر اخراجات پورے کرتے۔ آغا جان کے ڈر سے کوئی ان سے زمین ٹھیکے پر نہ لیتا اور اگر کوئی لیتا تو انتہائی کم پیسوں میں۔" یشب شاہ دم سادھے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

"آغا جان نے اپنے باپ سے کیا وعدہ نبھایا اور ساری کی ساری زمین واپس حاصل کرلی۔ کیوں کہ زمینوں کا بٹوارہ انہیں منظور نہ تھا۔"

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" اپنی آواز اسے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"ایسا ہی ہوا ہے۔ آغا جان نے اس سے زبردستی سائن کروائے تھے فائل پر اور زبردستی ہی اسے اس کے گھر چھوڑ کر آئے تھے۔" اس کے اندر دھماکے ہونے لگے۔

"جھوٹ ہے۔ آغا جان ایسا کیسے کرسکتے ہیں میرے ساتھ؟"

"تم نے آغا جان کا صرف ایک روپ دیکھا ہے۔ تمہیں میری باتوں کا یقین بھی تو نہیں آرہا' مگر بہت جلد آجائے گا۔" وہ اٹھ کر چلی گئی یشب شاہ خالی خالی نظروں سے اس کی پشت کو گھور کر رہ گیا۔

"تو کیا پریسان میری کزن تھی؟" اس کے اندر ہزاروں سوال اٹھ رہے تھے۔ وہ بے چینی سے ادھر سے ادھر پھرنے لگا۔ "آغا جان میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں کرسکتے' وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کی تو خواہش تھی کہ میں پریسان کو اپنالوں ہمیشہ کے لیے۔" کوئی سر ہاتھ نہ آرہا تھا۔ وہ مزید الجھتا گیا۔

☼ ☼ ☼

"آغا جان میں اپنے بیٹے کے ساتھ مزید زیادتی برداشت نہیں کروں گی۔" صالحہ بیگم خاموش نہ رہ سکیں۔

"بہو تم خاموش رہو۔" آغا جان اب کی بار پھر انہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینکنا چاہتے تھے۔ اندر سے آتی آوازوں کو سن کر وہ وہیں رک گیا اور اسی شش و پنج میں تھا کہ اندر جائے یا نہ جائے کہ آغا جان نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

"وہ لڑکی ہرگز اس قابل نہ تھی کہ میرے پوتے کی بیوی بن کر رہتی۔ دیکھا نہیں اس کی اس فضول سی حرکت نے اسے کتنا ڈسٹرب کردیا ہے' مگر شکر ہے کہ یشب شاہ ہمارے پاس واپس آگیا۔" وہ کسی قدر سفاکی سے بولے۔

"آپ کو زمین چاہیے تھی آغا جان' وہ مل گئی۔ ایک معصوم جان آپ کی ان روایات کی بھینٹ چڑھ

گئی' اس سارے قصے میں وہ تو بے قصور تھی اور پھر کوئی غیر نہ تھی آپ کا اپنا خون تھا۔" اس کے اردگرد کسی دھماکے ہوئے تھے۔

"نہیں ہے وہ ہمارا خون' ایک غیر عورت کی اولاد ہمارا خون نہیں ہو سکتا۔" اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ اس کے پیارے آغا جان بول رہے ہیں۔

"آغا جان میرا بیٹا ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔ وہ رشتوں کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کے لیے زمینیں' جائیدادیں اہم نہ تھیں۔ پھر آپ نے اس ظلم کے لیے میرے بیٹے کو کیوں منتخب کیا؟" ان کے آنسو تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

"وہ زمین بھی تو یشب شاہ کے حصے میں آئے گی نا۔"

"آغا جان میرے بیٹے کو ہوس نہیں ہے دولت کی۔" وہ رو رہی تھیں تڑپ رہی تھیں۔ "کاش میں یشب شاہ کو اس شادی کی حقیقت پہلے ہی بتا دیتی' میرا بیٹا اس طرح تو نہ ٹوٹتا۔ ایسے وہ کبھی چپ نہ ہوا تھا۔ غلطی میری بھی ہے' میں کیوں چپ رہی' ہم کیوں زبردستی اس کی شادی ہونے دی۔"

"خاموش صالحہ بیگم۔" کمال شاہ غصے سے دھاڑے۔ "اپنی خاندانی زمین واپس حاصل کرنے کے لیے آغا جان کو جو بہتر لگا انہوں نے کیا۔ یشب شاہ کا کوئی نقصان نہیں ہوا' اس کی ہم شادی کروادیں گے وہ بہت جلد سب بھول جائے گا۔"

"بابا..." وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ ان تینوں کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ لوگ ایسا بھی کر سکتے ہیں... مائی گاڈ!" وہ چلتا ہوا آغا جان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کا تو منظور نظر تھا نا آپ کے دل کا چین' پھر آپ نے میرا چین کیوں لوٹ لیا۔" آغا جان نے دیکھا اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی' لباس شکن آلود بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ان کے دل کو کچھ ہوا۔

"ہم آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" وہ گھبرا گئے۔

"نہیں کرتے۔" وہ چلایا "جن سے محبت کرتے ہیں ان کی خواہشات کا احترام کیا جاتا ہے۔ آپ نے مجھے خالی ہاتھ کر دیا۔"

"اور بابا آپ..." وہ ان کی طرف آیا تھا۔ "آپ کو لگتا ہے کہ آپ اس کی جگہ کسی دوسری لڑکی کو لے آئیں گے اور اب کی بار میں پھر خاموش رہوں گا۔ بابا رشتوں کا کوئی متبادل نہیں ہوتا۔ انسان کھلونے نہیں ہوتے کہ ایک ٹوٹ گیا تو دوسرا لے آئے۔" اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ "آپ لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ہے' کیا چھین لیا مجھ سے..."

"ماں جان!" وہ سسک اٹھا تھا۔ اس کے رونے میں بھی روانی آ گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ان کی آغوش میں منہ چھپا لیا تھا۔

"ماں جان میں ٹوٹ گیا' بکھر گیا ہوں' ماں جان مجھے سکون نہیں مل رہا' اسے واپس لے آئیں' پلیز اللہ میاں سے کہیں مجھے ایک موقع اور دے دے۔"

پریہان کی وفات سے آج تک ان دس دنوں میں اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا تھا' مگر اس وقت ماں کی آغوش میں منہ چھپائے ننھے بچے کی طرح وہ رو رہا تھا۔

"مت رو میری جان۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

"وہ واپس نہیں آئے گی کبھی بھی... صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں' میں بھی تمہاری مجرم ہوں' مجھے بھی تو کچھ کہو' مجھے معاف نہ کرنا' میرے ضمیر پر پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔" انہوں نے نرمی سے اسے اوپر اٹھایا اور اس کا چہرہ ہتھیلیوں میں لیتے ہوئے محبت سے بولیں۔

"آپ ماں ہیں۔ آپ کو کیسے کچھ کہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "مگر اب یہاں کبھی نہ آؤں گا' آپ کے علاوہ میرا اس حویلی میں کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے ماں جان' زمینوں اور جائیدادوں کو رشتوں پر فوقیت دینے والے۔ میرے کچھ بھی نہیں ہیں... پریہان سے زیادہ بد نصیب میں ہوں' جسے دکھ دینے والے اس

کو برباد کرنے والے اتنے اپنے اور قریبی ہیں۔"

"ذیشب بیٹا میری بات سنو۔" کمال شاہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا جسے اس نے اصرار کے ساتھ، مگر نرمی سے چھڑالیا۔

"میں سب کچھ کھو چکا ہوں بابا جان، میں اب کچھ بھی نہیں سن سکتا اگر میں نے کوئی گستاخی کی ہو، تو معاف کردیجیے گا۔" وہ باہر نکل گیا تھا۔ صالحہ بیگم بل کھا کر گر پڑی تھیں۔ کمال شاہ ان کی جانب بڑھے جبکہ آغا جان ابھی تک ساکت تھے۔

☼ ☼ ☼
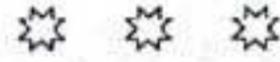
آج اس کی جرمنی کے لیے فلائٹ تھی۔ وہ یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جارہا تھا۔ یہاں ہر طرف اس کی یادیں اطراف سے پتھر برساتی تھیں۔ اپنے بیڈ روم میں اس وقت وہ پیکنگ کررہا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے تھے۔ کمرے میں اس کی بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ اس کے کپڑے، جوتے، بیگ، جیولری جو وہ کبھی پہنتی نہیں تھی۔ واش روم میں اس کا شیمپو.... اس کے دل کی حالت بہت بری ہورہی تھی۔ وہ بے دم ہو کر ایزی چیئر پر گرا اور لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے آنکھیں موندلیں۔

لو میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھتا ہوں
تم اچانک کہیں سے آجاؤ

"کاش صرف ایک بار تم وہ سب مجھے بتادیتی، پھر تم دیکھتی کہ میں کس طرح سب سے ٹکر لیتا تمہارے لیے، تمہیں اتنا پیار دیتا کہ تم اپنے ہونے پر فخر کرتیں۔" وہ اٹھ گیا تھا۔ اس نے پریسان کا جائے نماز اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لیا تھا۔ اسٹڈی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نظر اسٹڈی ٹیبل پر پڑی تو اس کے دل پر گھونسا پڑا۔ وہ اندر آگیا۔ اس کی کتاب ابھی بھی کھلی پڑی تھی جسے وہ پڑھتے پڑھتے کھلا ہی چھوڑ گئی اور ساتھ پین تھا جس پر شاید تیزی کے باعث کیپ بھی نہیں لگایا تھا۔

"پریسان!" اس نے کتاب کے صفحات پر ہاتھ

پھیرا جن پر ہلکی سی گرد کی تہ جم چکی تھی۔ اس کے اندر توڑ پھوڑ ہورہی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

ٹیکسی سبک رفتاری سے ایئرپورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔

"تمہارے ساتھ بہت برا ہوا، دکھ یہ ہے کہ میں بے خبر رہا۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہ تھا۔ اس کی وجہ میرا رویہ تھا۔ تم بے خبر ہی میرے جذبوں سے، ہم دونوں ہی گھٹتے رہے، مگر میں بے خبر رہا.... اپنے دل کو اس تغافل پر میں کبھی معاف نہ کرپاؤں گا۔" اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندلیں۔

اپنے لیے خود ساختہ جلاوطنی کی سزا اس نے خود ہی منتخب کی تھی۔ ڈرائیور نے کیسٹ پلیئر آن کردیا۔

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب
جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

☼ ☼

بنت سحر

وہ ایک برفیلے دسمبر کی سرد سرد سی آوارہ شام تھی ... اس شام میں فسوں خیزی عروج پر تھی... باغ میں آخری امید ٹوٹنے کے بعد والی اداسیوں کی کاہی رنگ کی اداس سی کتھا تھی... جس میں اداسیوں کا رنگ حاوی تھا... زرد زرد شاموں میں سرد سرد احساسات کی برفیلی تہ جم رہی تھی... سنگی بینچ پر ماریانا آج بھی معمول کی طرح بیٹھی تھی... اس کی آنکھوں میں نیلے رنگ کی اداسی تھی... میں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسپورٹس شوز سے گھاس کچلتا ہوا اس کے پاس جا بیٹھا تھا... وہ اس پل مجھے چرچ کی کسی بغاوتی راہبہ کی مانند دکھائی دی تھی... اس کے گہرے سانولے رنگ میں نمکین اشارے سے تھے... جو سحر طاری کر دینے والے تھے... ایسا سحر جو وجود کے گرد ہالہ باندھ لیتا ہے۔

"ہیلو... اچھی لڑکی کیا ہو رہا ہے؟" اس کے براؤن رنگ میں شہابیت کا عنصر بھی نمایاں تھا... وہ ہنسی تھی۔

"تم روز یہی سوال کرتے ہو... تھکتے نہیں ہو؟" میرے سوال کو گول کر کے اس نے بھی سوال کر دیا تھا ... یہ اس کی ایک عادت تھی... میں نے اس کے ہاتھوں میں دبی گولڈن کور والی ڈائری کو بغور دیکھا تھا... آج بھی وہ ڈائری ساتھ لائی تھی... شاید وہ اس کی ان اہم چیزوں میں سے تھی جنہیں انسان قیمتی سمجھتے ہیں۔ جن کے چوری ہونے کا ڈر ہوا کرتا ہے جانے اس بوسیدہ صفحات والی ڈائری میں ایسا کیا تھا۔

"انسان کی زندگی میں کچھ چیزیں ہمیشہ نئی ہی رہتی ہیں چاہے انہیں کتنا بھی دہرا لیا جائے۔" میری اس بات پر اس نے اپنی مڑی ہوئی غلافی پلکوں کو جھکایا تھا ... مجھے لگا، روز گارڈن میں سنہرا پن سا چھا گیا ہو.... آنکھیں چندھیائی جا رہی ہوں... اس نے مجھے دیکھا تھا۔

"واقعی پھر ہر بار تم میرے انتظار پر سوال کیوں اٹھاتے ہو... میں ہر روز انتظار کی ایک فلک بوس عمارت تعمیر کرتی ہوں مگر تم ایک جھٹکے میں اسے مسمار کر دیتے ہو... تم اچھا نہیں کرتے۔" دسمبر کی دودھیا سی دھند نے ہمارے وجود کا احاطہ سا کر لیا تھا... ٹیولپ کے پھول کی کلیاں چٹکنے پر آمادہ نظر آنے لگی تھیں... میں نے سرد سی سانس خارج کی تھی۔

"ماریا... بعض اوقات انتظار انسان کو توڑ دیتے ہیں۔ ہر دسمبر تم انتظار کی نئی چادر اوڑھے روز گارڈن میں جمال علی کی منتظر نظر آتی ہو۔ وہ اب کبھی بھی نہیں آئے گا۔" اس کے چہرے پر موم بتی کے دم توڑتے شعلے کا سا تاثر ابھرا تھا۔

"اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دسمبر میں آئے گا... اس کی آنکھوں میں محبت تھی میرے لیے... محبتوں کے انتظار تو تاعمر کیے جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں وہ ضرور آئے گا۔" وہ خبطی لڑکی جو میری دوست تھی مجھے اس پر بے تحاشا ترس آیا تھا... پام کے درخت کے پتوں میں ہوا کھیل رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے... مجھے اس کو سمجھانا ضروری ہو گیا تھا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو... وہ نہیں آئے گا۔ تعلیم مکمل کر کے وہ پاکستان چلا گیا۔ پانچ سال کم عرصہ نہیں ہوتا اسے واپس آنا ہوتا تو کب کا آ چکا ہوتا... وہ محبت

نہیں تھی... کچھ اور تھا..." گلابی پھول سنگی بنچ کے قریب اڑ اڑ کر آنے لگے تھے... وہ پاؤں اونچے کیے بیٹھی تھی... ڈائری پاس ہی رکھ لی تھی۔

"تم نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں احمد... وہاں کچھ اور نہیں محبت تھی... آنکھیں جھوٹ بولنے کے ہنر سے ناواقف ہوتی ہیں... وہ سنہری آنکھیں آج بھی دل کے آسمان پر "محبت" "محبت" کا راگ الاپتی نظر آتی ہیں... دماغ دلیلوں سے قائل ہو جاتے ہیں مگر دلوں کے سامنے دلیلیں ہار جاتی ہیں۔" مجھے وہ شہر محبت کی کوئی محبت زادی لگی تھی جو سانس کے نہیں محبت کے سہارے زندہ تھی... وہ اب گولڈن ڈائری سے مردہ شاہ بلوط کے پتے نکال رہی تھی... پتے سوکھ چکے تھے مگر ان پر لکھے نام اول روز کی طرح تازہ تھے... وہ ان ناموں پر ہاتھ پھیرے ماضی کے لمس کھوج رہی تھی... مجھے ایک پل کو اس عام سی لڑکی سے پہلی بار حسد محسوس ہوا تھا... دسمبر کی سرد ہوا جسم کو برف کیے

دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی ناک سرخ ہو چکی تھی... مگر وہ شاہ بلوط کے بوسیدہ پتے تھامے بیٹھی تھی۔

"احمد... بے شک محبت ہار جائے مگر دعائیں جیت جاتی ہیں... اگر میری محبت کم پڑنے لگی ناں تو دعا اس کمی کو پورا کر دے گی۔" محبت کا ست رنگی نور ماریانا کے چہرے پر قوس قزح بکھیر رہا تھا... میرا دل چاہا وہ ست رنگی نور نوچ لوں۔

"جن کو واپس آنا ہوتا ہے ناں وہ جلد آجاتے ہیں وہ ہر بار دسمبر کی سرد رتوں میں انتظار نہیں کرواتے... آج کا انتظار تمہارے لیے کل کا پچھتاوا بن جائے گا۔ تب تمہیں محبتوں کی لفاظی کے سارے مطالب سمجھ آئیں گے۔" وہ ہنسی تھی... سنہری تتلیوں کا رقص شروع ہوا تھا پربتوں کی چوٹیوں پر گلال اڑائے گئے تھے۔

"پتا ہے احمد... اس نے کہا تھا تم میرا مرتے دم تک انتظار کرنا... وہ دسمبر کی کسی سرد سنہری شام میں مجھے لینے آئے گا... پھر ہم پبلک لائبریری کے وسیع ہال میں کافی پیتے ہوئے جین آسٹن کے ناول پر بحث کریں گے... اور وہ بحث میں ہمیشہ ہی مجھ سے ہار جاتا ہے کہتا ہے مجھے اپنی جیت سے زیادہ تمہاری خوشی عزیز ہے... پھر ہم سڑک پر بھیگتے دسمبر کی سرد شاموں میں کارن فلیکس کھاتے ہوئے ہر ٹاپک پر بات کریں گے۔ محبت، دوستی، عزت، خودداری... مگر اس فہرست میں لفظ "انتظار" کبھی بھی نہیں ہو گا کیونکہ یہ لفظ اذیت دیتا ہے... اور پھر پتا ہے ہم کیا کریں گے؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی... سرد دسمبر میں بھی مجھے پسینہ آرہا تھا۔

"پھر کیا کرو گے تم دونوں؟" میں خود کو کٹی پتنگ کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ شہر محبت کی یاسی کی کتھا سننے کو درختوں کی شاخیں جھکی جا رہی تھیں... ابابیل خاموش گم صم سے تھے۔

"پھر ہم فٹ پاتھ پر رکھے کسی بنچ پر بیٹھ جائیں گے وہ میری گود میں سر رکھے لیٹا رہے گا اور میں اس کی سیاہ زلفوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ہر دسمبر کی اداس شام کے انتظار کی تفصیل سناؤں گی تاکہ اسے بھی پتا چلے کہ انتظار کی کیفیت کیسی ہوتی ہے... میری آنکھوں سے بہنے والا ہر آنسو وہ ٹشو پیپر سے صاف کرتا مجھے دلاسے دیتا رہے گا... جب ٹشو پیپر ختم ہوں گے میں تب ہی انتظار کہانی ختم کروں گی... پھر ہم کینڈل لائٹ ڈنر بھی کریں گے... مینو بھی میری پسند کا ہو گا... وہ اختلاف کرے گا تو میں روٹھ کر ہوٹل کی گلاس ونڈو سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ اور وہ میری آنکھوں پر ہاتھ رکھے ایک نظم سنائے گا... پتا ہے وہ کونسی نظم ہو گی؟ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اس مڑی ہوئی پلکوں والی ساحرہ کی آنکھوں میں محبت کے جگنو تھے جن کی روشنی نے مجھے پگھلا سا دیا تھا میں نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا تو وہ گولڈن ڈائری کے صفحات پر نظریں جھکائے نظم پڑھنے لگی تھی۔ ایسا لگا کسی قدیم ساحر زمانے کا ساز زندہ بھی حیرت سے منجمد بیٹھا ماریانا کو حیرت سے سن رہا تھا ابابیلیں ساکت ہو گئی تھیں... عربی ساز کی سی خوب صورت تھی اس کے لہجے میں، ماحول میں محبت دھمال ڈالنے لگی تھی۔

وہ نظم پڑھ کر اب مجھے دیکھ رہی تھی۔

"احمد جس شخص کی محبت اتنی پیاری ہو... اس کے لیے تو لاکھوں انتظار اور دعائیں کی جاسکتی ہیں... جب تم مجھے انتظار کرنے سے روکتے ہو ناں... تو میں انگاروں پہ چلنے کی سی اذیت کا سامنا کرتی ہوں..." ان آنکھوں میں التجا تھی... میں لاجواب ہوا بیٹھا تھا... میں چپ سا بیٹھا رہ گیا تھا... کچھ بولنے کو بچا ہی نہ تھا... خاموشی ہمارے درمیان چہل قدمی کرنے لگی تھی... خاموشی کے سحر کو پہلے اس نے ہی توڑا تھا۔

"وہ مجھے بارش میں بھیگنے سے بچاتا اور خود بھیگتا رہتا... فٹ پاتھ پر بکھری بکس میں سے میری فیورٹ بکس تلاش کرتا... میری بولنے کی عادت سے چڑ ہونے کے باوجود ٹکٹکی باندھ کر مجھے سنتا اور دیکھتا رہتا تھا... میں جانتی تھی کہ میں عام سی شکل و صورت کی

معمولی سے لڑکی تھی۔۔۔ مگر وہ میرے دل کی خوب سیرتی کا شیدائی تھا۔۔۔ کہتا تھا محبت تو چہروں سے نہیں دلوں سے کی جاتی ہے۔ ساری زندگی میں سوچتی رہی کہ دنیا کا سب سے بڑا غم سینئرز کا مذاق برداشت نہ کرنا، آئس کریم کا پگھل کر فرش پر گر جانا ہوتا ہے۔۔۔ مگر میں غلط تھی، بہت غلط تھی۔۔۔ تمہیں پتا ہے سب سے بڑا غم کیا ہوتا ہے۔۔۔؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔۔۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔۔۔ بنفشے کے پھول اڑتے ہوئے اس کی گود میں آن گرے تھے۔۔۔ محبتوں کی باسی اپنی داستان کے آخری سرے جوڑ رہی تھی۔

"ہم زندگی میں بہت بار غلط ہوتے ہیں۔۔۔ چیونٹی جتنا دکھ بھی ہمیں ایفل ٹاور کی طرح لگتا ہے۔ مگر ہمیں بہت وقت کے بعد یہ بات سمجھ آتی ہے کہ سب سے بڑا دکھ تو محبت کا "گم" ہو جانا ہوتا ہے۔۔۔" میرا دل چاہا اس کی بات کو کاٹ دوں اور کہوں۔

"ماریانا۔۔۔ اصل دکھ تو اپنی محبت کا اظہار نہ کرپانا ہوتا ہے۔۔۔" مگر میں لاکھ چاہنے کے باوجود بھی یہ بات اسے نہ کہہ سکا تھا۔۔۔ میں نے دیکھا وہ دور خلاؤں میں جانے کیا کھوج رہی تھی۔

"ماریانا۔۔۔ کیا جمال تمہارے لیے اپنی نیند کی قربانی دے سکتا تھا؟" نیند سب کو پیاری ہوتی ہے۔۔۔ میں بھی تو اس کی یادوں میں جاگتا رہتا تھا کیا جمال علی یہ کر سکتا تھا میں جاننا چاہتا تھا۔۔۔ اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا ایسا لگا بلکہ مصر قلوپطرہ بیٹھی ہو۔۔۔

"نیند نہیں احمد۔۔۔ محبتوں کے لیے جمع کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں۔۔۔ جب میں اس سے ناراض تھی تو وہ تین دن ہمارے ہوسٹل کے باہر کھڑا رہا تھا۔۔۔ یہ محبت نہیں تھی تو پھر کیا تھا؟ محبتوں کے قصے بھی عجیب ہوا کرتے ہیں۔۔۔" مجھے اپنی زندگی کے اس پل جمال علی سے بہت حسد ہوا تھا۔۔۔ اس کی ذات میرے لیے کسی طمانچے سے کم نہ تھی۔۔۔ سیلی سیلی ہوائیں ہمارے گرد گھیرا ڈالنے لگی تھیں۔۔۔ ہر چیز دھند میں لپٹتی جا رہی تھی۔

"اگر اتنی ہی محبت تھی تو چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔۔۔؟"

میں نے وہ سوال کر ہی لیا تھا جو حلق میں کانٹے کی طرح اٹک رہا تھا۔۔۔ وہ ڈائری کے کور پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔۔۔ میری اس سے دوستی تین سال پہلے ہوئی تھی۔۔۔ میں پینٹر تھا۔۔۔ روز گارڈن میں اداس سی ماریانا کی تصویر بنانے کی جب میں نے اس سے اجازت طلب کی تھی تو اس نے ایک شرط رکھی تھی۔۔۔ مجھے آج تک اس کا جواب یاد ہے اس نے کہا تھا۔۔۔

"اصل۔۔۔ مصورہ وہ ہوتا ہے جو چہرے نہیں احساسات پینٹ کرتا ہے۔۔۔ میری تصویر بنانے لگو تو میرے وجود سے زندہ میری آنکھوں میں بے انتظار کو رنگوں میں ضرور ڈھالنا۔۔۔"

میں ایک مسلم فیملی سے تھا۔۔۔ میرے دادا یہیں لندن میں مقیم تھے وہ بہت بڑے تاجر تھے۔ پاکستان کے حالات جان کر ولی ہی نہیں چاہا کہ واپسی اختیار کی جائے۔۔۔ ماریانا نے مجھے اپنے انتظار کی کہانی اسی وقت سنائی تھی جب ہم میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی مگر اس میں "کچھ" ایسا تھا جس کے سامنے لفظ خوب صورت بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔۔۔ جمال علی کو بھی اسی بات نے متاثر کیا تھا اور مجھے بھی۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"وہ بہت خود دار تھا احمد۔۔۔ وہ اپنے گھر والوں کی اجازت سے مجھے پانا چاہتا تھا۔۔۔ وہ امانت دار تھا۔۔۔ وہ اپنا سوچنے سے پہلے دوسروں کو سوچتا تھا۔۔۔ مجھے اس کی یہی بات پسند تھی۔۔۔ وہ محبت بعد میں کرتا تھا پہلے میری عزت کرتا تھا۔۔۔ اسے پتا تھا کہ میری ماں ایک بار میں گاتی تھی مگر اس حوالہ سے اس نے کبھی بات نہ کی تھی۔ جو لوگ عزت کرتے ہیں ناں۔۔۔ ان کی محبت بہت طاقتور ہوتی ہے۔ ہمارے وجود کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیتی ہے۔۔۔ اور یہی محبت آج بھی مجھے ویسے ہی جکڑے ہوئے ہے۔" آسمان پر بادل سفید روئی کے گالوں کی مانند اڑے جا رہے تھے مجھے بھی اک پل کو اپنا وجود انہی کی طرح لگا تھا۔۔۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھوں میں اداسی کے گہرے رنگوں کی

چھاپ تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔
"تم اگر کبھی پاکستان جانا تو صوبہ پنجاب کے ایک ضلع بھکر میں ضرور جانا... وہاں کے گورنمنٹ کالج سے جمال نے پڑھا تھا... سائنس بلاک ' انگلش ڈیپارٹمنٹ کے قصے وہاں بکھرے ہوں گے ان کو دھیان سے پڑھنا... اور ہاں کیفے ٹیریا کے احاطے میں ایک لمبے چھدرے پتوں والا درخت ہے۔ جو بارش میں بہت خوب صورت نظر آتا ہے... اس کے پتوں پر بارش کے قطرے ہیروں کی طرح جگمگاتے ہیں... کیفے ٹیریا کے ساتھ ہی واکنگ ٹریک ہے اس پر آہستہ آہستہ پیدل چلتے جانا... تمہیں بہت اچھا لگے گا۔ جب جانا وہاں تو کیفے ٹیریا والے درخت پر ایک پتا ڈھونڈنا جس پر میرا نام لکھا ہوگا... وہ پتا تم میرے لیے لے آنا... شاہ بلوط کے پتوں کی طرح اس کو بھی میں اپنی ڈائری میں کسی قیمتی یاد کی طرح محفوظ کرلوں گی... اس ڈائری میں میری یادیں ہیں... چیزوں کا چوری ہونا اتنا تکلیف نہیں دیتا جتنا کہ یادوں کے کھو جانے پر ہوتا ہے۔"
ایک پل کو لگا میں گورنمنٹ کالج بھکر میں ہوں اور کیفے ٹیریا کے احاطے میں کھڑا اس لمبے پتوں والے درختوں کی قطار میں اس درخت کو نمودار ہوتا دیکھوں... وہ میرا کاندھا ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کررہی تھی۔
"وہاں ایک دلکش سا باغ بھی ہے... جس کا نام دل کشا باغ ہے۔ وہاں تمہیں قدرت کی خوب صورتی نظر آئے گی... وہاں کوئلیں گیت گاتی ہیں' تتلیاں رقص کرتی ہیں... وہاں پتھر سے بنے ہرن بھی ہیں... تم انہیں غور سے دیکھنا ان کی آنکھوں میں تمہیں بے بسی اور انتظار نظر آئے گا... ویسا انتظار جو میری آنکھوں میں ہے۔" میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں انتظار تھا۔ میری نظریں اس کی نظروں سے ملی تھیں... پھر اس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کردیا تھا... شاید اسے میری آنکھوں میں وہ جذبہ نظر آہی گیا تھا جو میں تین سال سے چھپائے پھر رہا تھا۔ راز منکشف ہونے کو تھا میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا...
"ماریانا... کیا تمہاری زندگی میں جمال علی کے علاوہ بھی کسی کے لیے جگہ ہے...؟" میں نے پوچھا تھا... اس نے گہرا سانس لیا تھا۔
"لوگ کہتے ہیں محبت بار بار ہوتی ہے مگر میں ایسا نہیں سمجھتی... میری زندگی میں دوسری بار محبت ہونا پہلی محبت میں خیانت کے مترادف ہے... میں کسی کے وعدوں میں جکڑ کر بے بس ہوگئی ہوں... اور میں عہد سے پھرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" مجھے لگا اس نے مجھے رد کردیا ہو... اپنی ذات کے ریجیکٹ ہونے پر مجھے لگا تھا جیسے میری کوئی وقعت ہی نہ ہو... میں نے اسے کہنا چاہا تھا۔
"ماریانا... مگر میں۔" اس نے میری بات کاٹ دی تھی... اس کی آنکھوں میں سرد سا تاثر تھا۔
"یاد رکھنا احمد... دوستی اور محبت بہت تضاد والے رشتے ہیں... اگر ان میں کھوٹ آجائے تو ناسور بن جاتے ہیں۔ پھر انہیں کاٹنا پڑتا ہے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔" مجھے لگا میں پل صراط پر سفر کررہا ہوں میں نے بس خاموش رہنا ضروری سمجھا تھا میں انا پرست انسان تھا مجھے اپنی انا بہت عزیز تھی۔ گھر والے پاکستان جارہے تھے۔ رشتہ داروں سے ملاقات کرنے... ایک ماہ کا قیام تھا۔ میں سوچ رہا تھا میں بھی پاکستان سے ہو آؤں... وہ خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے دھیرے سے کہا تھا۔
"گھر والے اگلے ماہ پاکستان جارہے ہیں... سوچ رہا ہوں میں بھی ہو آؤں۔" وہ جھٹکے سے مڑی تھی اس کی گود میں رکھے کاسنی اور بنفشے کے پھول اس کے پاؤں میں گر پڑے تھے مجھے ان پھولوں سے زیادہ اس کے پاؤں خوب صورت لگے تھے۔
"واقعی... تم ضرور پاکستان جانا تمہیں تو ویزا بھی آسانی سے مل جائے گا۔ کاش میں بھی جاسکتی۔" ایک بے بس سا احساس اس کے وجود پر گہرا نشان ثبت کرگیا تھا۔ وہ لندن کی شہری تھی اس کے پاس وسائل بھی نہ تھے روز گارڈن میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی میں نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ دور کہیں وائلن بج

رہا تھا ماحول میں سحر طاری ہونے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼
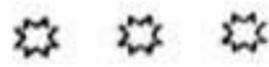
میں نے ماریانا سے کہا تھا۔

"پاکستان میں، میں جمال علی کو ڈھونڈ لوں گا.... تمہارا کوئی پیغام ہے تو بتا دو.... میں پہنچا دوں گا۔" اس کی نیلی آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگے تھے۔ مجھے لگا اس کی آنکھوں میں سے روشنیوں کا سیلاب پھوٹ پڑا ہو۔

"ہاں احمد پیغام تو ضرور دینا۔" میں نے اس کو دیکھا تھا وہ اب بنچ سے اٹھ کر سامنے لگے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ڈائری نیچے گر پڑی تھی۔ کاسنی پھولوں کا ایک گچھا ڈائری کے نیچے دب سا گیا تھا۔ میں نے کہا تھا۔

"مگر مجھے جمال کہاں ملے گا، تم اس کا پتا تو دے دو۔"

اس نے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ مجھے لگا وہ جیسے رو رہی تھی دسمبر کی دھندلی شام میں وہ کانپ رہی تھی میں نے اس کی بھیگی ہوئی آواز سنی تھی۔

"احمد، بھکر کے ہر قبرستان میں جانا ہر قبر کو بغور دیکھنا جس قبر پر بہت سے پھول پڑے ہوں سمجھ لینا وہی جمال علی ہے۔ اس کی قبر کی مٹی پر ہاتھ رکھنا اور کہنا آج بھی ایک لڑکی دسمبر کی سرد شاموں میں روز گارڈن میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی ہے۔ اسے کہنا جلدی آئے کہ اب حوصلوں میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں۔ اب دسمبر کی ہر شام ماریانا کے انتظار پر ہنستی ہے۔ ہوائیں ماریانا کو دیوانہ اور پاگل کہتی پھرتی ہیں۔" وہ سسک رہی تھی.... ہواؤں میں کراہٹ بکھرنے لگی۔ چاروں قطبین میں ماتم سا چھا گیا تھا.... مجھے لگا کوئی تیز رفتار ٹرین مجھے کچل گئی ہو.... وہ اداس لڑکی بلک بلک کر رو رہی تھی مجھے لگا میرا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔

"احمد.... ہر روز میں فاتحہ پڑھتی ہوں.... میں مسلم نہیں ہوں مگر میں نے جمال علی کے لیے فاتحہ یاد کی ہے کیا فاتحہ پڑھنے کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہوتا ہے؟"

اس کے سوال پر میرا دل کٹ کر رہ گیا.... میری گردن بلا ارادہ نفی میں ہلی تھی.... وہ اب ڈائری اٹھا رہی تھی.... میری طرف دیکھا تو آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"اسے یہ بھی کہنا کہ ماریانا نے اس کی محبت میں خیانت نہیں کی ہے.... ماریانا ہر دسمبر کی سرد شام کو اس کا انتظار کرتی ہے.... اور یہ بھی کہنا کہ ماریانا آج بھی گولڈن ڈائری سینے سے لگائے پھرتی ہے....۔" وہ واپس جا رہی تھی میرا دل چاہا اسے روک لوں۔ وہ میری طرف پلٹی۔

"واپس آتے وقت اس کی قبر کی مٹی ضرور لیتے آنا.... میں بھی تو اس مٹی کی خوشبو محسوس کروں۔ جس کے بارے میں وہ لمبی لمبی بحث کرتا رہتا تھا....۔" وہ جا رہی تھی۔ بنچ پر اب میں اکیلا بیٹھا تھا۔ دسمبر کی اس شام میں اس کا دوپٹا اڑتا جا رہا تھا.... مگر وہ ڈائری سینے سے لگائے چلتی جا رہی تھی.... چلتی جا رہی تھی۔

"دسمبر لوٹ جاؤ تم....
کہ اب یادیں پرانی ہیں، باتیں پرانی ہیں
مگر پھر بھی دیکھو تو....
اذیت پھر وہی ہے....
پھولوں کی صورت بھی بدل کر زرد ہو گئی ہے....
مگر غم ویسا ہی باقی ہے کہ جیسا پہلے تھا....
کہ اب حوصلے نہیں باقی.... بس سنو....
دسمبر لوٹ جاؤ تم...."

☼ ☼



## سرورق کی شخصیت

| | |
|---|---|
| ماڈل | علینہ |
| میک اپ | روز بیوٹی پارلر |
| فوٹو گرافی | موسیٰ رضا |

ناولٹ

فائزہ افتخار

## ساتویں قسط

ام ہانی حواس باختہ سی بھاگتی کمرے سے نکلی، مگر نیچے ہال میں سب منگنی کی خوشی میں اتنے مگن تھے کہ اس کی ہمت ہی نہ ہوئی کسی کو اپنا مسئلہ بتانے کی۔

ڈھولک... گیت... رقص... کیسے ان سب میں سے کسی کو بتاتی کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے اور کیوں جانا چاہتی ہے؟ ظاہر ہے کہ کیوں کا سوال بھی سامنے آتا۔ بلکہ بے شمار سوال... اور سب سے بڑھ کے اس وقت خوف اور گھبراہٹ سے اس کی جو حالت تھی اس کے بعد وہ ان سوالوں کے جواب نہ بھی دیتی تو سب جان جاتے اور وہ یہی تو نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی جانے... خاص طور پہ سعد... بھلا کیوں وہ اپنی تکلیف سب پہ آشکار کرکے ان کی خوشیوں کے رنگ مدھم کرتی۔

اس نے خاموش نظروں سے باری باری سب کے خوشی سے دمکتے چہرے دیکھے اور دبے پاؤں پلٹ گئی۔ اس ہنگامے اور شور شرابے میں کسی کو بھی اس کے آنے اور پھر جانے کی خبر نہ ہو سکی۔ اور کچھ ہی منٹ کے بعد وہ سیالار کے بھیجے ڈرائیور کے ساتھ واپسی کے راستے میں تھی اور بار بار بجتا فون۔

"میں آرہی ہوں سالار... راستے میں ہوں۔" اور بار بار اس کی وضاحتیں اور صفائیاں اور تسلیاں۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں سالار... میں آپ کے کہتے ہی وہاں سے نکل آئی تھی۔ اب تو آدھے راستے میں ہوں۔"

"جی جی... بس پہنچنے ہی والی ہوں۔"

☆ ☆ ☆

مجھے اس کی غیر موجودگی بری طرح کھل رہی تھی۔ نظریں بے ساختہ اسے تلاش کر رہی تھیں اور ثانیہ کی باتوں کا میں بے دھیانی سے ہاں ہوں میں جواب دے رہا تھا۔

"سعد... مہندی کا رنگ تو واقعی بہت گہرا ہو رہا ہے۔" میں نے اچٹتی سی نظر اس کی ہتھیلیوں پہ ڈالی۔ تقریب ختم ہو چکی تھی۔ باہر سے آنے والے مہمان بھی جا چکے تھے، مگر ابھی بھی وہی رونق وہی چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ بس نہیں تھی... تو... وہ۔

"میں ابھی ڈیڈ کو بھی اسکائپ پہ اپنی مہندی دکھاؤں گی۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔" ثانیہ کی بات پہ چم چم منہ میں رکھتے ہوئے پھوپھو نے بڑا لطیف سا طنز کیا۔

"اور ان سے کہنا۔ شادی سے پہلے آ ضرور جائیں... کہیں نکاح نامہ بھی اسکائپ پہ دیکھنے کی فرمائش نہ کریں۔"

"ہاں بھئی ہمارے رشتے دار ان کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" امی نے کہتے کہتے اچانک چونک کر وہ بات کہی جو میں کب سے کہنا چاہتا تھا۔

"ارے ہاں... پوچھ تو سب ام ہانی کا بھی رہے تھے۔ تقریب میں بس وہ گھڑی بھر کو نظر آئی اور پھر غائب۔" اور پھر پاس سے گزرتی ملازمہ کو روکا۔

"سنو... ذرا ہانی کو بلانا۔"

"طبیعت نہ خراب ہو اس کی۔" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"یا تھک گئی ہوگی۔ جلدی سونے چلی گئی ہوگی۔" یہ پھوپھو کا قیاس تھا۔

"بی بی جی کے جانے کا پتا نہیں آپ کو؟" ملازمہ کے حیرت سے پوچھنے پہ، ہم سب ہی چونک گئے۔

"کیا؟ کہاں گئی وہ؟"

"ان کے گھر سے موٹر آئی تھی۔ وہ چلی گئیں۔"

"کیا؟"

"کب؟" سب ہی حق دق رہ گئے۔

"گھنٹے سے اوپر ہو گیا جی۔ مجھے لگا... آپ سب کو پتا ہو گا۔ بتا کے ہی گئی ہوں گی۔"

☆ ☆ ☆

بھاگتے ہوئے اس نے کار سے گھر کے اندر تک کا راستہ طے کیا تھا، مگر پھر دہلیز سے اس کے قدم جکڑ لیے۔ ہاتھ میں بھرا ہوا گلاس لیے سالار سامنے ہی اس کا منتظر تھا۔ اگرچہ اس کا انداز پر سکون تھا، مگر یہ تو صرف ام ہانی ہی جانتی تھی کہ اس سکون میں کتنے طوفان چھپے ہوئے ہوں گے۔ اس نے دروازے کا

سہارا لے کر اپنی ہمت مجتمع کرنا چاہی۔۔۔ مگر ہمت۔۔۔ وہ تو سالار کو اپنی جانب قدم بڑھاتا دیکھ کے ہی جواب دے رہی تھی۔

"اتنی دیر؟" نزدیک آکے سالار نے دھیرے سے اس کا گال چھوا۔ وہ بدک کے پیچھے ہٹی' مگر اب سالار نے اس کا چہرا اپنے ہاتھ کی گرفت میں مضبوطی سے لے لیا تھا۔

"تمہیں پتا تھا ناں۔۔۔ میں تمہارے بغیر ایک پل کیسے گزارتا ہوں پھر کیوں گئی تھی تم؟"

"آپ نے ہی۔۔۔ ہی تو۔۔۔ کہا تھا جانے کا۔" اپنے چہرے کو اس کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش کرتی ام ہانی نے کہا تو سالار اس کے رخساروں میں اپنی انگوٹھے اور انگشت کا دباؤ مزید بڑھاتے ہوئے غرایا۔

"میں کہوں گا۔۔۔ ابھی مر جاؤ تو مر جاؤ گی کیا؟"

"آپ کا فون آتے ہی میں نکل آئی تھی راستے میں دیر۔۔۔"

"میرا فون آنے کے بعد؟ کیوں؟" وہ زور سے چلایا۔

"پہلے نہیں آسکتی تھی؟ میں دو دن اور فون نہ کرتا تو کیا دو دن نہ آتی؟ کبھی نہ بلاتا تو کیا کبھی نہ آتی؟ کچھ احساس ہے تمہیں؟ کہ یہ وقت میں نے کیسے گزارا؟ انگاروں پہ چل کے ام ہانی۔۔۔ انگاروں پہ چل کے۔۔۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے شیشے کی ان گنت کرچیاں میرے وجود میں کھب رہی ہوں اور تم۔۔۔ تم وہاں انجوائے کر رہی تھیں۔" اس کے چہرے کو جھٹکا دے کر سالار نے اسے پیچھے کی جانب دھکیل دیا۔ مارے خوف کے ام ہانی کا وجود یوں بھی بے جان سا ہو رہا تھا وہ بھر بھری مٹی کی طرح نیچے فرش پر جا رہی۔

"یہ ہوتی ہے محبت۔۔۔ اسے کہتے ہیں وفا۔ یوں بنتے ہیں شوہر کے دکھ' سکھ کا ساتھی؟ ایسے ادا کرتے ہیں مجازی خدا کے حقوق؟ بولو۔۔۔" وہ ہتھیلیوں کے بل فرش سے اٹھنے کی ناکام سی کوشش کر رہی تھی۔ چہرے پہ درد مگر آنکھیں اب بھی خشک و ویران۔

"حق تو تب ادا ہو گا ام ہانی کہ جن انگاروں پہ میں چلا ہوں تم بھی چلو۔۔۔ اپنی وفا کا ثبوت دینا ہے تو اتنی ہی کرچیاں اپنے وجود میں چبھو کے دکھاؤ جتنی تمہاری دوری سے مجھے چبھی ہیں۔" یہ کہتے ہی سالار نے ہاتھ میں تھما گلاس زور سے نیچے دے مارا۔ ایک چھناکے کی آواز ابھری اور فرش پہ ام ہانی کی نظروں کے سامنے کرچیاں ہی کرچیاں پھیل گئیں۔ ام ہانی نے خوف زدہ نظروں سے سالار کو دیکھا جو اب اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ کپکپاتے بدن کے ساتھ بمشکل وہ اٹھ کھڑی ہوئی ٹانگیں بوجھ اٹھانے سے انکاری تھیں۔ اور ایسے میں سالار نے اب آنکھوں ہی آنکھوں سے اسے ان کرچیوں پر چلنے کا اشارہ کیا اس کے چہرے پہ اس قدر رعونت اور سفاکی تھی کہ ام ہانی نے رحم کی اپیل کا ارادہ بھی موقوف کر دیا۔ کسی معمول کی طرح وہ آگے بڑھی۔۔۔ کانپتا ہوا پیر کرچیوں پر رکھا۔۔۔ تکلیف کی شدت سے اس کے لبوں سے سسکی نکلی جسے دبانے کے لیے اس نے ہونٹ زور سے دبالیے۔

سالار کے چہرے پہ رفتہ رفتہ سکون اور اطمینان نمودار ہو رہا تھا۔ جیسے یہ دبی دبی سسکیاں اس کی سماعتوں میں سر بکھیر رہی ہوں۔ جیسے جیسے ام ہانی کے پیروں سے خون رس رہا تھا۔ سالار کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

سب اپنی اپنی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ میرے کانوں میں سب کی آوازیں پڑ رہی تھیں' مگر میں الگ تھلگ بیٹھا کسی سوچ میں گم تھا۔

"آخر کچھ تو بتا کے گئی ہوگی' مجھے کسی نے خبر کیوں نہ دی۔" ابو جھنجلائے ہوئے تھے کیونکہ باوجود کوشش کے فون پہ بھی رابطہ نہ ہو رہا تھا۔

"بتا تو رہی ہوں' ہمیں خود خبر نہیں تھی ملازمہ سے پتا چلا۔" امی کے کہنے پہ پھوپھو نے بھی لقمہ دیا۔

"اسے خود اتنی توفیق نہ ہوئی کہ کسی کو اطلاع دے کر جاتی۔"

"مگر ملازمہ سے یہ تو پتا چلا ہے کہ ڈرائیور سالار نے

بھیجا تھا۔ خیریت ہی ہو ایسی کیا ایمرجنسی ہوئی ہو گی۔"
"فون نہیں ملا ابھی تک؟"
"نہیں پہلے کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ اب میاں بیوی دونوں کے فون بند مل رہے ہیں۔" ابو یہ بتا کے پھر سے نمبر ملانے لگے۔
"حیرت ہے۔"
"حیرت اس کے جانے پہ نہیں ہے بھابھی! اس کے آنے پہ زیادہ تھی وہ کہاں ہمیں اس قابل سمجھتی تھی کہ ہم سے کوئی رابطہ رکھتی یا تعلق... اور وہ اس کا شوہر کمشنر نہ ہوا... مہاراجہ ہو گیا کہیں کا... لاٹ صاحب... اتنا نہ ہوا کہ سسرال کی تقریب میں گھڑی دو گھڑی آجاتا۔"
"مہ پارہ... بند کرو یہ بے وقت کی راگنی۔" ابو چڑ گئے۔
"اوہو... آپ لوگ مان کیوں نہیں لیتے کہ وہ ہم سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی۔ سعد کے زبردستی کرنے پہ آگئی اس لیے منگنی کی رسم ہوتے ہی یہ جا... وہ جا۔ وہ بھی ملے بغیر۔"
"تم عورتیں تصویر کا صرف ایک رخ کیوں دیکھتی ہو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی ہو پتا تو کرنا چاہیے۔" آخر میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابو۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ میں دیکھ کے آتا ہوں۔" امی کو یہ بات خاصی ناپسند لگی تھی۔
"دن تو ٹھیک سے نکلنے دو۔ ابھی تو اذان ہوئی ہے فجر کی ایسی بھی کیا جلدی۔" مگر میں ان سنی کرتا نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

درد کی شدت سے اس کی رنگت زرد پڑ چکی تھی مگر آنکھیں اب بھی خشک... وہ کسی بت کی مانند بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور اس کا زخمی پیر سامنے بیٹھے سالار کی گود میں تھا' جو اب بہت محبت اور نرمی سے اس کے تلووں سے رستا خون صاف کرتا کہہ رہا تھا۔

"کتنا خون نکل آیا ضدی لڑکی... ہمیشہ خود کو نقصان پہنچانے والی حرکتیں کرتی ہو... میری بات مان لیا کرو تو یہ سب نہ ہو۔" اس کے سہلانے پہ ہانی کے لبوں سے ایک سسکی سی نکلی تو سالار کے چہرے پہ جیسے امید کی جوت جاگ گئی وہ پھر سے اس کے زخموں کا معائنہ کرنے لگا۔
"اوہ... لگتا ہے کوئی کرچی رہ گئی۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے ایڑھی کے پاس گوشت میں دھنسی وہ کرچی کھینچ کے نکالی۔ ام ہانی کراہ اٹھی۔ اور درد کی شدت کو دبانے کے لیے دونوں مٹھیوں میں کمبل کو دبوچ لیا۔ سالار محویت سے اسے دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی دلچسپ نظارہ ہو۔
"مجھے وہ پہلی ملاقات یاد آگئی... تب بھی تمہیں ایسے ہی چوٹ لگی تھی میں نے ایسے ہی تمہارے پیر کو ہاتھوں میں لے کر تمہارا زخم صاف کیا تھا تب بھی تمہیں ایسے ہی تکلیف ہو رہی تھی شاید اس سے کم... مگر تب تم رو رہی تھیں ام ہانی... بے تحاشا اور تمہارے آنسو میرے دل پہ گر رہے تھے... میرے دل کا وہ حصہ آج تک گیلا ہے۔ اس کے باوجود ایک تشنگی ہے اور ایک خواہش... مزید بھیگنے کی... مجھے لگا تم میری زندگی میں آؤ گی تو اپنے آنسوؤں سے میری ساری تشنگی دور کر دو گی مجھے جل تھل کر دو گی... مگر..." اچانک اس کے چہرے پہ پھر سے وہی درشتی عود کر آئی ایک جھٹکے سے اس نے ام ہانی کا پیر پرے کیا۔
"مگر تم... تم روتی ہی نہیں تم تو اتنی بنجر ہو گئی ہو جتنی میری زندگی... تم مجھے کیا سیراب کرو گی... کہاں گئے تمہارے وہ آنسو جن پہ میں فدا ہوا تھا... ورنہ... تم میں ایسا ہے کیا جو سالار اعظم تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرتا۔" اس انکشاف پہ ام ہانی کی آنکھیں دہشت کے مارے پھیل گئیں۔ سالار اس کے قریب سرکا۔
"رو ہانی... تھوڑا سا... کچھ تو رو لو۔" وہ باقاعدہ منت کرنے لگا۔

"کوئی نہیں ہے یہاں... میرے سوا... تمہارے آنسوؤں کو دیکھنے والا کوئی بھی نہیں۔" اس کے قریب آنے پہ وہ پیچھے کی جانب کھسکی، مگر وہ اور بھی آگے بڑھتا کہتا رہا۔

"میں نے سب ملازموں کو بھی بھیج دیا تھا۔ صرف میں ہوں اور میرے سامنے رونے میں کیسی شرم۔" اور اب... اب وہ گڑگڑانے ہی لگا۔

"کیوں ستاتی ہو مجھے اور خود کو بھی مشکل میں ڈالتی ہو۔ روتی کیوں نہیں تم... مجھے ہی کیوں رلاتی ہو... آخر... آخر اور کیا کروں میں تمہارے آنسو دیکھنے کے لیے۔" وہ اس کی گود میں سر رکھے سسک رہا تھا اور ام ہانی خوف سے پتھرائی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی جارہی تھی۔ اچانک اس نے روتے روتے اپنا سر اٹھایا کر ام ہانی کو زور کا طمانچہ دے مارا۔

"کب روؤگی تم... آخر کب؟" وہ زور سے چلایا تھا۔

"کس کے لیے سنبھال کے رکھے ہیں یہ آنسو؟ کیا میرے مرنے پر روؤگی؟" اور اسے بے تحاشا مارنے لگا۔

☆ ☆ ☆

گیٹ کے سامنے رکتے ہی مجھے کوے کی کرخت آواز سنائی دی، میں نے نظر اٹھا کے اوپر دیکھا تو گھر کے عین اوپر اڑتے کوؤں کے غول ماحول کی نحوست میں اضافہ کررہے تھے۔ مجھے گھبراہٹ سی ہوئی۔ سر جھٹک کے میں آگے بڑھا۔ اس روز کی نسبت آج کوئی ملازم نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک ویرانی کا سا عالم تھا۔ میری نظر سالار کی قد آور تصویر پہ جا ٹھہری۔ ماحول کی نحوست اب اپنے عروج پر تھی۔ ایک نفرت بھری نظر اس کے سفاک اور کریہہ خدوخال پر ڈال کے میں بلند آواز میں پکارنے لگا۔

"ہنی..." میری آواز سناٹے میں گونج کے رہ گئی، مگر کوئی رد عمل سامنے نہ آیا۔ حیران ہوتے ہوئے میں نے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھائے اور ہر قدم کے ساتھ اسے پکارتا گیا۔ ہر پکار کے ساتھ میری بے تابی اور وحشت بڑھ رہی تھی۔

"ہنی... کوئی ہے یہاں پہ، ہیلو۔" کسی کے نہ ہونے کا احساس بھی تھا اور یہیں کہیں اس کے ہونے کا احساس بھی... لمبی راہداری کے دونوں اطراف بہت سے بند دروازے تھے۔ میں شش و پنج میں تھا کہ پہلے کس دروازے پہ دستک دوں کہ داہنی جانب کے تیسرے دروازے کو تھوڑا سا کھلا پا کے میں نے پہلے اس کمرے میں جھانکنے کا قصد کیا۔ ابھی میرا ہاتھ دستک کے لیے اٹھا ہی تھا کہ اندر سے آتی ام ہانی کی سسکی کی آواز پہ میں بے تابانہ اندر داخل ہوگیا۔ وہ بیڈ پہ تھی۔ نڈھال... بدحال... ہونٹ سے رستا خون... رخساروں پہ طمانچوں کے نشان... بکھرے بال... بائیں آنکھ سوج کے نیلی پڑتی ہوئی۔

"ہنی... یہ... یہ کیا ہوا تمہیں؟" میرے روم روم... نس نس میں درد کی لہریں شدت سے ابھرنے لگیں۔

"کس نے کیا تمہارا یہ حال؟ بولو ہنی۔" تکلیف کی شدت سے اگر اس کا بدن لرز رہا تھا تو میری آواز بھی کپکپا رہی تھی۔

"بتاؤ کس نے؟ سالار نے؟" میں نے اس کے یخ بستہ ہاتھ تھام لیے۔ وہ خاموش تھی، مگر اس کی آنکھوں کی بے بسی نے میرے سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ میں بپھر اٹھا۔

"مگر کیوں؟ کس لیے؟ اور تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں؟ کیوں؟ ایک بار بتاتی تو سہی... بلاتی تو سہی... مجھے نہ سہی... کسی اور کو ہی سہی... کسی کو تو..."

"کیسے بتاتی۔" بہت وقت کے ساتھ وہ کہنے لگی۔

"اور کس کو بتاتی... انہیں؟ جن کے سامنے ڈٹ کے کھڑی ہوئی تھی سالار کے لیے... یہ شادی میری پسند سے ہوئی تھی سعد... کیا منہ لے کر جاتی میں ان کے سامنے؟"

"بکواس ہے سب... کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟ شادی پسند سے کرنا کوئی اتنا بڑا جرم نہیں کہ اس کی یہ

سزا بھگتو تم ۔۔۔ وہ بھی چپ چاپ ۔۔۔ اٹھو ۔۔۔ چلو میرے ساتھ ۔۔۔ میں تمہیں اب یہاں نہیں رہنے دوں گا۔" میں اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچنے لگا۔

"نہیں سعد ۔۔۔ ایسا مت کرو ۔۔۔ تم نہیں جانتے سالار کو ۔۔۔ تم بس جاؤ یہاں سے ۔۔۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے ۔۔۔" مگر میں اس کی مزاحمت کو یکسر خاطر میں نہ لایا۔

"نہیں ۔۔۔ میں تمہیں یہاں سے لیے بنا ہرگز نہیں جاؤں گا۔" میں نے زبردستی اسے کھینچ کے بیڈ سے اتارنے کی کوشش کی اور جیسے ہی ام ہانی کے پیر فرش پہ پڑے وہ درد سے کراہنے لگی اور دوبارہ گر سی گئی۔ میری نظر بے ساختہ اس کے پیروں پہ گئی جن کو تھامے اب وہ درد سے دوہری ہو رہی تھی۔ میں پیروں کے بل اس کے پاس زمین پہ بیٹھا اور اس کے پیروں کو جھک کے دیکھنے لگا۔ یا خدا ۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے جہنم دہک اٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے جھکے ہوئے چہرے پہ ڈالی اور فیصلہ کن لہجے میں کہہ اٹھا۔

"اب میں تمہیں ساتھ چلنے کا نہیں کہوں گا ۔۔۔ ساتھ لے کر جاؤں گا ۔۔۔ زبردستی ۔۔۔"

"نہیں سعد ۔۔۔ سالار کو پتا چلا تو ۔۔۔" مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی اور احتیاط سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کے باہر نکلنے لگا۔

"سعد ۔۔۔ ایسے مت کرو ۔۔۔ مت لے کر جاؤ مجھے۔"

"بس ۔۔۔ چپ ۔۔۔ ایک لفظ نہیں۔"

☆ ☆ ☆
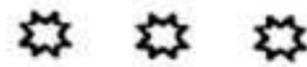
مہ پارہ پھوپھو جھنجلاتی ۔۔۔ بڑبڑاتی بڑے دادا کے کمرے سے نکلی تھیں۔

"روز ایک سے ایک نیا تماشا اس حویلی میں ۔۔۔ اب گھر ہے کہ مہمانوں سے بھرا پڑا ہے اور یہاں ۔۔۔" چلتے چلتے وہ رکیں۔ میں اسی طرح ام ہانی کو گود میں اٹھائے کار سے نکل کے یہاں تک لایا تھا اور اب پھوپھو کو دیکھ کے اسے صوفے پہ بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ حیرت سے ام ہانی کی حالت کو دیکھ رہی تھیں اور پھر جب میں نے ہنی کو صوفے پہ احتیاط سے بٹھا کے اس کے زخمی پیر اوپر کر کے رکھے۔ مبادا فرش سے چھونے پہ ان سے دوبارہ خون نہ رسنے لگے تو پھوپھو کی چیخ نکل گئی۔

"ام ہانی۔" وہ تیر کی طرح لپک کے اس کے پاس پہنچیں اور اسے ساتھ لپٹا کے واویلا کرنے لگیں۔

"بھابھی ۔۔۔ بھائی صاحب۔ یہ دیکھیں ہانی ۔۔۔ کس نے کی تمہاری یہ حالت ۔۔۔ سعد ۔۔۔ تم کچھ بتاتے کیوں نہیں؟" وہ بلک بلک کے روتے ہوئے ساتھ ساتھ ہانی کا چہرہ ٹٹول ٹٹول کے دیکھ رہی تھیں۔ ان کا ایسا شدید رد عمل میرے ساتھ ساتھ ہنی کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ وہ بھی گنگ سی انہیں بین کرتے دیکھ رہی تھی۔

"کیڑے پڑیں مردار کو ۔۔۔ کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہے ۔۔۔ کیا حال کر دیا ۔۔۔ بدذات ۔۔۔" وہ اب سالار کو کوسنے دے رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں حویلی بھر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب ہی ایک شاک کی کیفیت میں تھے۔ امی نے ام ہانی کا لباس تبدیل کروا دیا تھا۔ منہ ہاتھ بھی دھلوا چکی تھیں۔ ابو ڈاکٹر کو لا کے معائنہ کرا چکے تھے اور اس وقت وہ بیڈ پہ سب کے درمیان سکتے کے عالم میں تھی۔ پھوپھو اس کے پیروں پہ مرہم لگاتے مسلسل رو رہی تھیں۔

"دیکھیں ذرا بھابھی ۔۔۔ ہم یہاں رشک کرتے رہے ام ہانی کی قسمت پہ ۔۔۔ اور یہ ۔۔۔ چہ چہ ۔۔۔ یہ تو پڑھا لکھا جاہل نکلا۔"

"صرف جاہل؟" اب تک خاموش کھڑی تانیہ غصے سے کہہ اٹھی۔

"جنگلی بلکہ وحشی جانور ۔۔۔ سعد نہ پہنچتا تو پتا نہیں ہانی کا کیا حال ہوتا؟"

"اتنا ظلم ۔۔۔ میری پھول سی بچی پہ۔" ابو ٹوٹے ہوئے لگ رہے تھے۔

"سالار جیسے شخص سے میں اس کی بالکل توقع نہیں رکھتا تھا۔"

"سعد... تم سالار کی اجازت سے اسے لائے ہو؟"
امی نے بالکل ہی عجیب سا سوال کیا۔ مجھ سمیت سب ہی انہیں عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ام ہانی بھی...

"اجازت؟" میں بھپر اٹھا۔

"امی... ہنی اس کی پراپرٹی نہیں ہے ویسے بھی اتنا کچھ ہونے کے بعد میں اسے وہاں کیسے رہنے دیتا۔"

"وہ اثر ورسوخ والا انسان ہے سعد... اگر دشمنی پہ اتر آیا تو؟" امی کی تشویش پہ پھوپھو بھی الٹ پڑیں۔

"واہ بھابھی! تو ہم کیا کسی گرے پڑے خاندان سے ہیں جو وہ ہماری بچی کے ساتھ کچھ بھی کر جائے... یا خدانا خواستہ ہماری لڑکی میں کوئی عیب ہے جو ہم منہ سیے، آنکھیں پھوڑے اسے جہنم میں جلتا دیکھتے رہیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔" امی سب کی ناگواری بھانپ کے کچھ خجل سی ہو گئیں۔

"صرف اتنا کہہ رہی تھی کہ بہرحال وہ اس کا شوہر ہے اس سے پوچھ کے نہ سہی ٹکرلانے سے پہلے اس کے علم میں تو لے آتے۔"

"اور وہ نہ لانے دیتا تو پھر؟" ابو نے خفگی سے کہا۔

"حد کرتی ہو تم نائلہ... کیا سعد وہاں اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتا۔"

"آپ میں سے کوئی بات کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہا۔ ہم نہیں جانتے اصل معاملہ کیا تھا اور کیا ہوا ہے ان دونوں کے درمیان... تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

"کیا...؟" میں اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ امی کو بھی شاید احساس ہو گیا کہ وہ بے موقع بات کر بیٹھی ہیں۔

"میرا مطلب ہے میاں بیوی کا جھگڑا ہوا ہوگا۔"

"تو کیا جھگڑے میں اسے حق حاصل ہو گیا کہ وہ ام ہانی کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک کرے اور ہنی آپ کے سامنے پلی بڑھی ہے کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو سکتا ہے۔ جس پہ یہ اس سزا کی مستحق ہو۔" میرے تیور دیکھ کے امی نے بات کا رخ موڑنا چاہا۔

"کم از کم اب تو اسے اطلاع دے دو... کہ اس کی بیوی خیریت سے یہاں ہے۔ کہیں اسے گھر نہ پا کے وہ کچھ الٹا سیدھا نہ سوچ لے۔"

☼ ☼ ☼

وہ دو گھنٹے بعد ہی گھر لوٹ آیا۔ آفس میں اتنا بیٹھنا بھی اس کے لیے دوبھر ہو گیا تھا۔ بار بار یہ خیال آتا کہ اسے نہ پا کے وہ رو رہی ہو گی۔ ان آنسوؤں کی کشش اسے دوبارہ کھینچ لائی۔

"ام ہانی... میں آ گیا... میری زندگی۔" اس کے ہاتھ میں کچھ سامان بھی تھا اور ایک پھولوں کا گلدستہ بھی... سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ بڑی ترنگ میں پکارتا جا رہا تھا۔

"دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" مزاج کی مستی اور بہکے قدم اس کے نشے میں ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔

"بہت سے رنگ... آج عرصے بعد تم میری تصویر بناؤ گی... پھر سے۔" دروازہ کھولتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"سرپرائز۔" اور پھر کمرے کو خالی پا کے وہیں ساکت ہو گیا۔

"ام ہانی...؟"

☼ ☼ ☼

"سارا دن گزر گیا نہ سالار نے خبر لی... نہ آپ میں سے کسی نے اسے فون تک کرنا گوارا کیا... ایسا کب تک چلے گا۔" رات کو میں ہانی کے کمرے میں اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تو سب پھر سے اسے نرغے میں لیے بیٹھے تھے۔

"نائلہ... اگر بقول تمہارے ہانی اس کی بیوی اور ذمے داری ہے تو اسے خود فکر ہونی چاہیے کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے کیوں نہیں فون کیا۔" ابو صبح کی طرح اب بھی امی پہ ناراضی جتلا رہے تھے اور امی شاید دوبارہ تازہ دم ہو کے نئے دلائل کے ساتھ آئی تھیں۔

"وہ بھی یہی سوچ رہا ہو گا کہ آپ اسے اطلاع دیں

ایسی ضد اور انا میں بچی برباد ہو جائے گی۔"
"بربادی میں اب کون سی کسر رہ گئی ہے بھابھی؟"
پھوپھو کی تلخی پہ میں سلگ اٹھا۔
"کچھ نہیں ہوا ہنی کی زندگی کو۔۔۔ نہیں برباد ہوئی وہ۔ وہ شخص اتنا اہم نہیں کہ اس کی وجہ سے ہنی کی زندگی پہ اثر پڑے۔" امی کی پیشانی سلوٹوں سے اٹ گئی۔

"سعد۔۔۔ کچھ دن ملک سے باہر رہنے سے کیا تم اس ملک اور معاشرے کی روایات کو بھول گئے ہو؟" ماحول گرم ہوتے دیکھ کے تانیہ نے اپنے تئیں بات کو سمیٹنا چاہا۔۔۔ یہ کہہ کر۔۔۔
"اس طرح بحث کرنے سے کیا حاصل۔۔۔ آپ لوگوں نے ابھی تک پولیس میں رپورٹ کیوں نہیں کرائی۔" اپنی سادگی میں اس نے بحث کو سمیٹنا چاہا تھا' مگر نہیں جانتی تھی کہ ایک نیا پنڈورا بکس کھول رہی ہے۔
"پولیس؟" امی بدک گئیں۔
"جی۔۔۔ سیدھا سادا پولیس کیس ہے۔"
"حد ہے۔" امی نے ناگواری سے تانیہ کو گھورا۔
"اب خاندان کی عزت چوراہے پہ لے آئیں ہم۔ اخباروں کی زینت بنائیں۔۔۔ پہلے ہی لوگوں میں کیا کم تماشا لگا ہے۔"
"مگر یہ تو زیادتی ہے کہ صرف عزت کی خاطر آپ ایک لڑکی کی زندگی کو یوں۔۔۔"
"تانیہ۔" امی نے اب واضح درشتی سے اسے ٹوک دیا۔
"تم ابھی بچی ہو۔۔۔ ان معاملات میں دخل دینے کی تمہاری نہ عمر ہے نہ سمجھ۔۔۔ اور ہماری روایات کو بھی تم نہیں جانتیں۔" تانیہ خاموش تو ہو گئی' مگر پھر اسی خاموشی کے ساتھ کمرے سے بھی نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد امی نے مجھے تنبیہہ کی۔
"سعد سمجھاؤ اسے۔"
"امی۔۔۔ بات پولیس تک جائے گی یا نہیں۔۔۔ یہ فیصلہ کرنا ابو اور بڑے دادا کا کام ہے' مگر ایک فیصلہ میرا بھی ہے اور وہ یہ کہ ہنی اب وہاں نہیں جائے گی۔ میں اسے ایک ذہنی بیمار شخص کے ہتھے نہیں لگنے دوں گا۔" میرے مضبوط لہجے پہ جہاں ام ہانی کے وحشت زدہ چہرے پہ ایک سکون کی ہلکی سی رونق نظر آئی وہیں امی کے چہرے پہ گہری تشویش جھلکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

تانیہ آنگن میں رکھے بانس کے پیڑھے پہ اکیلی بیٹھی تھی۔۔۔ بنا پیچھے مڑ کے دیکھے ہی صرف مجھے آہٹ سے پہچان کے پوچھنے لگی۔
"ختم ہوئی ہانی سے انکوائری یا ابھی بھی سب اس کو گھیر کے بیٹھے ہیں؟"
"سب کی کوشش ہے اس پہ زبردستی اپنی اپنی سوچ ٹھونسنے کی۔" میں غصے میں کہتا اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔
"امی نے باری باری سب ہی رشتے داروں کو اسے سمجھانے کے لیے بھیجا ہے تاکہ دباؤ میں لا کے اسے سمجھوتے پہ مجبور کر سکیں اور یہ کہ ضد سے صرف اس کی زندگی خراب ہو گی۔ اسے سب کچھ بھلا دینا چاہیے صبر سے کام لینا چاہیے' محبت' نرمی اور وفا سے شوہر کا دل جیتنا چاہیے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ سمجھ نہیں آ رہا۔۔۔ کیا کروں؟"
"وہاں دیکھو سعد۔" تانیہ کی آسمان کی جانب اشارہ کیا۔
"کسی ٹوٹتے ستارے کا انتظار کرو۔ تاکہ وہ نظر آ جائے تو اس سے ہانی کی خوشیوں کے لیے دعا کر سکو۔ تم سب لوگ ایسے ہی ہو۔۔۔ معجزوں کا انتظار کرتے ہو۔ کسی غیبی امداد کا۔۔۔ مجھے تو ہانی پہ بھی حیرت ہے۔ جانتے ہو وہ کیا کہہ رہی تھی۔۔۔ کہ یہ سب کسی منت کی چوڑی کے ٹوٹنے کا بد اثر ہے۔"
"منت کی چوڑی؟" میں چونکا۔
"ہاں۔۔۔ بتا رہی تھی کہ سالار سے شادی کے لیے اس نے کوئی منت مانگی تھی' مگر پہنتے ہوئے ان میں سے ایک چوڑی ٹوٹ گئی۔" میں کھو سا گیا۔۔۔ تصور

میں اس کالی چوڑی کے ٹکڑے اس کی گوری اجلی ہتھیلی پہ رکھے نظر آئے۔۔۔ اور اس کی تاسف میں ڈوبی نگاہیں اور ملامت بھرا لہجہ۔۔۔

"توڑ دی نا۔۔۔ بدھو۔۔۔ منت کی تھی۔" اور میرا لاپروائی سے کہنا۔

"ایک ہی ٹوٹی ہے۔۔۔ دوسری تو پہنادی ہے یعنی منت پوری ہوگی مگر آدھی۔۔۔ کچھ ملے گا۔۔۔ اور کچھ نہیں ملے گا۔" اس نے مجھے گھورا تھا اور میں مزید ڈھٹائی سے ہنس کے اسے چڑانے لگا تھا۔

"میرے بغیر جو کام کرو گی وہ یا تو ادھورا ہوگا یا خراب۔"

"سعد۔۔۔" تانیہ نے میرا کاندھا جھنجوڑا تو میں ہڑبڑا کے حال میں واپس آیا۔

"ہاں۔۔۔ کیا کہہ رہی تھی تم؟"

"یہی کہ نائلہ آنٹی رضوان انکل سے کہہ رہی تھیں کہ وہ سالار کو بلائیں یا اس کے پاس جائیں بات کرنے۔۔۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو ٹوک دیا کہ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ ویسا نہیں ہوتا۔۔۔ کیا ہے یار سعد؟" میں ابھی تک ذہنی طور پہ حاضر نہیں ہو پارہا تھا۔ دماغ میں کہیں اس کالی چوڑی کی کوئی کرچی چبھ سی گئی تھی۔

"ہوں۔ دیکھتے ہیں۔۔۔ کیا ہوتا ہے۔" اسے میری غائب دماغی کا اندازہ نہ ہو اس لیے اس کی بات پوری طرح نہ سن پانے کے باوجود میں نے یونہی کہہ دیا اور وہ بجائے بہلنے کے ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"کیا دیکھتے ہیں سعد۔۔۔ میں نے کہا نا۔۔۔ تم لوگ آسمانی مدد کا انتظار کرتے ہو۔۔۔ کوئی آئے اور بس معجزہ دکھادے کم از کم ہانی کو تو اس انتظار سے نکلنے دو کہ کوئی دوسرا اسے اس تکلیف سے نکالے گا۔"

"کوئی دوسرا کیوں؟ کیا میں مر۔۔۔" غصے سے کہتے کہتے میں رکا۔ اور بات بدل دی۔

"تو کیا ہم سب مر گئے ہیں؟ ہم اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے؟"

"کب تک؟ جب تک وہ خود اپنے لیے کھڑی نہیں ہوگی سعد۔۔۔ اپنی جنگ خود نہیں لڑے گی۔۔۔ وہ جیت نہیں سکے گی۔"

"وہ بہت کمزور ہے تانیہ۔"

"وہ کتنی کمزور ہے اور کتنی مضبوط۔ یہ جاننے کے لیے تمہیں ایک بار اسے لڑنے کا موقع دینا ہوگا۔ یہ زندگی اس کی ہے اور اس کو بچانے کے لیے جتنی کوشش وہ خود کرسکتی ہے وہ تم یا کوئی نہیں کرسکتا۔ تم اسے سپورٹ کرو۔۔۔ سب کو کرنا چاہیے مگر اپنے حصے کی لڑائی اسے خود لڑنے دو۔ دوستی اپنے دوست کو مضبوط کرنے کا نام ہے۔ اسے کسی دوسرے پہ انحصار کرنا سکھانے کا نام نہیں ہے۔" وہ کہتی جارہی تھی۔۔۔ بہت جوش سے۔۔۔ بہت جذبات میں اور میں اسے دیکھتا جارہا تھا۔

"کیا گھور رہے ہو؟ میں کچھ کہہ رہی ہوں اور تم گم صم ٹکٹکی باندھے ہوئے ہو۔" وہ جھلا اٹھی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ لگتی نہیں ہو مگر ہو سمجھ دار۔" میرے ہلکا سا مسکرانے پہ اس کا تناؤ بھی کم ہوا۔

"تم بھی دیکھنے میں سمجھ دار لگتے ہو مگر ہو نہیں۔" وہ بھی مسکرادی تھی۔

☼ ☼ ☼

رضوان جتنے دکھی ام ہانی کے ساتھ ہونے والے سلوک پہ تھے اتنے ہی دل گرفتہ نائلہ کے رویے پہ تھے۔

"ام ہانی کو رخصت کرنے کے بعد مجھے لگا میں سلمان کی روح کے سامنے سرخرو ہوگیا ہوں' لیکن آج اسے اس حال میں دیکھنے کے بعد احساس ہورہا ہے کہ مجھ سے کتنی کوتاہی ہوگی۔"

"ایسا کیوں سوچ رہے ہیں آپ۔" نائلہ نے تسلی دی۔

"اس میں ہمارا کیا قصور۔۔۔ وہ تو ہانی نے خود ہی۔۔۔ خیر۔۔۔ اب جو ہونا تھا ہوگیا۔ آگے کا سوچیں۔۔۔ میں کب سے کہہ رہی ہوں کہ سالار سے رابطہ کریں۔۔۔ ایسے موقعوں پہ تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔ وقت پہ

بات سنبھال لینی چاہیے۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کسی طرح سالار کو بلا کے ام ہانی کا ہاتھ اسے تھما کے چلتا کردیں۔

"بات تو کریں اس سے۔"

"کیا بات کروں اس سے اور کیا کہوں؟ میں نہ اس کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں نہ آواز سننا چاہتا ہوں۔"

"سنیں گے نہیں تو اس کا موقف کیسے جان پائیں گے۔"

"آخر تم یہ ثابت کرنے پہ کیوں تلی ہو نائلہ کہ غلطی ام ہانی کی ہے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہی... مگر میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کبھی بھی یکطرفہ نہیں ہوتے۔" وہ اپنی صفائی دینے لگیں۔

"میری نیت پہ شک نہ کریں۔ ہانی کو دیکھ کے میرے کلیجے سے بھی ٹیس اٹھ رہی ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ ہم اس کا گھر توڑنے میں اتنی جلد بازی کریں۔ ایک بار کوشش تو کریں بگڑی کو بنانے کی۔"

"ٹھیک ہے۔ کرتا ہوں فون سالار کو۔"

بالآخر وہ راضی ہوئے تو نائلہ نے ایک سکون بھرا سانس لیا۔ مگر رضوان کا سالار سے بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا... اول تو اس نے فون ہی کئی بار نمبر ملاتے رہنے کے بعد اٹھانے کی زحمت کی۔ اس پہ اس کا اکھڑا ہوا لہجہ...

رضوان نے جب اسے ام ہانی کے حویلی ہونے کی اطلاع دی تو درشتی سے بولا۔

"جانتا ہوں... وہیں ہوگی اور کہاں جائے گی مگر یہ ٹھیک نہیں کیا اس نے۔"

اس پہ رضوان کا دل تو چاہا کہ اس سے بازپرس کرے کہ آخر اس نے کون سا ٹھیک کام کیا۔ مگر نائلہ کی ملتجیانہ نظروں پر تحمل سے اسے حویلی آنے اور معاملے کو سلجھانے کی دعوت دی۔

"کیا؟ میں آؤں؟ بات کرنے۔"

کیسی بات... میں نے نہیں بھیجا اسے... نہ وہ مجھ سے پوچھ کے گئی ہے۔ آنا آپ کو چاہیے اسے چھوڑنے کے لیے بھی... اور اس کی اس فضول حرکت پہ معذرت کرنے بھی۔"

یہ کہہ کر اس نے فوراً" فون بند کر دیا تھا۔

رضوان کے مایوس چہرے کو دیکھ کے نائلہ سب بھانپ گئیں اور بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے نکلیں۔ ام ہانی کے کمرے میں آئیں تو وہاں تانیہ بصد اصرار اسے کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"پلیز تھوڑا سا اور..."

"نہیں... میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"پلیز ہانی... اسٹرونگ نہیں، خود کو سنبھالیں... دنیا کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ دیں کہ آپ کو کسی سہارے کی ضرورت ہے۔"

"ناشتا کرلیا ام ہانی نے؟"

نائلہ کے پوچھنے پہ تانیہ نے انکار میں سرہلایا تو نائلہ اس کے ہاتھ سے دلیے کا پیالہ لے کر خود ہانی کے پاس بیٹھ گئیں۔

"میں کھلاتی ہوں۔ تم جاؤ... اور ہاں تانیہ تمہارے ڈیڈی کب آرہے ہیں۔"

"جی؟" وہ اس بے موقع سوال پہ کچھ ٹھٹکی۔

"بتایا تو تھا آپ کو... اگلے مہینے۔" بہرحال اس نے جواب دے دیا۔

"ان سے کہو... جتنا جلد آنا ممکن ہو... آجائیں سب لوگ واپس جا رہے تھے... مگر میں نے روک لیا کہ اب سعد کی شادی میں شرکت کر کے ہی جائیں تو بہتر ہوگا کہ ایک ہفتے یا زیادہ سے زیادہ دس دن کے اندر شادی ہو جائے۔ کوئی کب تک رکا رہے گا۔"

اتنی عجیب و غریب بات پہ تانیہ ہکا بکا انہیں دیکھتی رہی مگر کچھ کہے بنا واپس چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

سالار اماں کو سامنے پا کے حیران تو ضرور ہوا۔ مگر اسے اپنے جذبات و تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا... اس لیے بنا سلام دعا کے رخ پھیر کے میگزین کھولنے لگا۔

"ام ہانی کہاں ہے سالار؟"

انہوں نے بھی وقت ضائع کیے بنا وہ سوال کیا جس کے لیے اتنا لمبا سفر کر کے آئی تھیں۔ رضوان کا فون آتے ہی انہوں نے واپسی کا قصد کیا تھا۔ اور قسمت سے ٹکٹ بھی اگلی فلائٹ کی ہی مل گئی تھی۔

"اطلاع ملنے پہ ہی آپ اچانک واپس آئی ہیں پتا ہی ہو گا کہ کہاں ہے پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"اس لیے کہ میں اسے تمہارے حوالے کر کے گئی تھی۔"

"آپ کی ملکیت تھی کیا وہ؟"

"سالار اس کے گھر والوں نے اس مان کے ساتھ اسے مجھے سونپا تھا کہ میں اس کا خیال رکھوں گی۔ ایک ماں کی طرح ظاہر ہے انہوں نے مجھ سے ہی باز پرس کرنی تھی۔ کیا جواب دوں میں انہیں۔"

"آپ کو جواب دینے کی ضرورت نہیں اور ان کو سوال کرنے کا حق نہیں... میری بیوی ہے... میں جو چاہوں اس کے ساتھ کر سکتا ہوں۔"

وہاں رعونت کا وہی عالم تھا۔

"ایک جیتی جاگتی انسان ہے وہ سالار... درندے مت بنو۔" وہ ملامت پہ اتر آئیں تو سالار نے ایک سرد نظر ان پہ ڈالی اور اس سے بھی سرد لہجے میں کہنے لگا۔

"اماں... کیکر کے پیڑ پہ گلاب نہیں کھلتے۔" اماں کے اوپر جیسے کسی نے ٹھنڈا یخ پانی اچھال پھینکا... وہ وہیں برف بن کے جم گئیں۔

"طلاق دیتا ہوں میں تمہیں... طلاق' طلاق' طلاق... سو مرتبہ طلاق۔"

ایک آواز برف کی اس چٹان کو چھیدنے لگی۔

☆ ☆ ☆
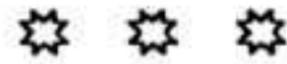
"کیا ہو رہا ہے؟" تانیہ کو لیپ ٹاپ پہ جھکے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"ڈیڈی تھے اسکائپ پہ... تمہارا پوچھ رہے تھے... میں نے انہیں کہہ دیا ہے جلد سے جلد آنے کا... شاید پرسوں یا اس سے اگلے ہی دن آ جائیں۔"

میں بوجھل سا اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں جانتی ہوں سعد... تمہیں اچھا نہیں لگ رہا ہو گا ان حالات میں شادی کے بارے میں سوچنا میں بھی نہیں چاہتی... مگر آنٹی نے پتا نہیں کیسے ڈیڈ کو کنوینس کر لیا ہے۔ انہیں بھی آئیڈیا اچھا لگا ہے جلدی شادی کرنے کا۔"

"ہوں۔" میری بے دلی کا وہی عالم تھا۔

"لیکن اگر تم اچھا فیل نہیں کر رہے تو میں انہیں کہہ دیتی ہوں کہ وہ انکل رضوان سے بات کریں۔"

اس کی بات پہ میں نے غور سے دیکھا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے تانیہ کہ میں اچھا محسوس نہیں کر رہا۔"

"ظاہر ہے... وہ تمہاری دوست ہے۔" تانیہ کے چہرے پہ' نگاہوں میں' لہجے میں بس سادگی ہی سادگی تھی۔

"کزن بھی ہے اس کے ساتھ اتنی بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے ایسے میں تمہارا دل کیسے چاہے گا کوئی خوشی منانے کو اب اتنا تو میں تمہیں جانتی ہوں ناں سعد۔"

"تم کچھ زیادہ ہی جاننے لگی ہو مجھے تانیہ۔" میرے ہونٹوں پہ ایک بجھی بجھی سی مسکراہٹ آئی۔

"کہیں اس سے زیادہ کچھ نہ جان لینا۔"

"پہلے تو میں یہ جاننا چاہوں گی کہ تم ہانی سے اتنا دور دور کیوں رہتے ہو؟" میں نے چونک کے اسے دیکھا تو وہ وضاحت دینے لگی۔

"میں نے نوٹ کیا ہے تم اس کے پاس جانے سے کتراتے ہو۔ اسے تمہاری ضرورت ہے سعد... اپنے سب سے اچھے دوست کی اپنے بچپن کے ساتھی کی ہم سب مل کے بھی اسے اس دکھ سے نہیں نکال سکتے جو کام تم اکیلے کر سکتے ہو؟"

"میں نہیں کر سکتا تانیہ۔" میں بے بسی سے ٹوٹنے والا ہو گیا۔

"بہت مشکل ہے میرے لیے اسے اس حال میں دیکھنا... میں اسے پھر سے ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لانے سے کہیں زیادہ ضروری اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو لانا ہیں... تم نے نوٹ کیا ہے سعد اتنا کچھ ہو گیا مگر وہ روئی نہیں ایک آنسو بھی نہیں آخر کیوں سعد؟ کیوں؟"
اس کی باتوں نے مجھے بھی سوچنے پہ مجبور کر دیا۔

☼ ☼ ☼

برف ابھی بھی نہیں پگھلی تھی۔ اور اماں یونہی منجمد سی سالار کے سامنے بیٹھی پلیٹ میں نکالے چاول کے چند دانوں کو چمچے سے یہاں سے وہاں کر رہی تھیں۔
رضوان کا فون آتے ہی وہ بڑے زعم میں فوراً" وہاں سے روانہ ہوئی تھیں۔ جیسے یہاں پہنچتے ہی سب ٹھیک کرلیں گی۔ مگر سالار کی صرف ایک بات نے ہی انہیں بے دست وپا کر کے رکھ دیا تھا۔
سالار بھی اسی خاموشی کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھا سوپ پی رہا تھا۔
مگر اس کی خاموشی میں ایک ٹھہرا ہوا سکون تھا۔ پھر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے انہیں مخاطب کیا۔
"اگر آپ کو اس کے نہ ہونے کا اتنا ہی دکھ ہے تو اسے جا کے لے آئیں۔"
وہ چونک کے اسے دیکھنے لگیں... جواب اسی اطمینان کے ساتھ دائیں جانب رکھی ڈش اٹھا رہا تھا۔
"جس کام کے لیے اتنی دور سے آئی ہیں وہ کریں اور جائیں۔" اماں بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

تانیہ کے احساس دلانے پہ میں ام ہانی کے سامنے تھا۔ اس کے مرہم لگے پیروں کو دکھ اور تاسف سے دیکھتا ہوا... وہ ویسی ہی گم صم سی بیٹھی تھی۔ خشک آنکھوں کے ساتھ۔
"بہت دکھتا ہے؟" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔
"تم تو چھوٹی سی تکلیف پہ رو دیا کرتی تھی ہنی... اتنی بہادر کیسے ہو گئی۔ کہ اب تمہیں درد محسوس نہیں ہوتا... پتھر بن گئی ہو کیا؟"
"پتھر نہیں... برف بن گئی ہوں۔" وہ بالآخر بول اٹھی۔
"میرے آنسوؤں کو سالار کی محبت نے جما دیا ہے۔ جانتے ہو سعد... وہ میرے آنسوؤں پہ فدا ہوا تھا۔ اسے ہنستی ہوئی ام ہانی سے نہیں... روتی ہوئی ام ہانی سے عشق تھا... وہ یہ سب مجھے رلانے کے لیے میرے آنسو دیکھنے کے لیے کرتا تھا، مگر میرے آنسو تو میرے اندر ہی کہیں جذب ہو گئے تھے۔"
"تو تم کیوں نہیں روتی تھی... اتنی اذیت پسند کیوں ہو گئی تھی تم۔"
میرا دل بھر آگیا... مگر میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی وہ غور سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"تمہیں بھی تو میری حالت پہ رونا آ رہا ہے۔ تم کیوں نہیں رو رہے سعد؟" میں نے تیزی سے پلکیں جھپک کے اپنے آنسو پیچھے دھکیلنے چاہے۔
"کیسے روؤں؟ تم نے ایک بار کہا تھا کہ میں بات بات پہ رو پڑتا ہوں، اتنا کمزور ہوں تو تمہیں کیسے سنبھالوں گا... ہنی میں اس دن سے نہیں رویا نہ کبھی روؤں گا میں نے وعدہ کیا تھا تم سے۔"
"سعد تم نے صرف وعدہ کیا نہیں تھا تم نے ایک وعدہ لیا بھی تھا۔ مجھ سے کبھی نہ رونے کا یاد کرو تم نے کہا تھا کہ میری آنکھ سے ایک آنسو بھی گرا تو تمہیں لگے گا میں نے تمہیں معاف نہیں کیا۔ تمہیں بد دعا دی ہے میں کیسے روتی سعد کیسے تمہیں بد دعا دیتی... کیسے تم سے کیا وعدہ توڑتی؟" میں دم بخود اسے دیکھتا رہ گیا۔
"تم نے ایک وعدے کے لیے اتنی اذیت...؟" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"ہنی یاد ہے میں ہنس دیتا تھا تو تم ناراضی اور اداسی میں بھی مسکرا دیتی تھی تم کہتی تھی تمہاری اور میری مسکراہٹ میں ایک رشتہ ہے۔ سانجھ کا رشتہ اور میں زندگی میں پہلی بار ٹوٹ کے تب رویا تھا جب تمہیں پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ ہمارے آنسوؤں نے بھی

ایک رشتہ باندھا تھا۔ آؤ ہنی۔۔۔ سالوں بعد ہم وہ رشتہ دوبارہ جوڑیں۔۔۔ رولو ہنی۔۔۔ ایک بار۔۔۔ ایک بار کھل کے رولو۔۔۔ میں بھی رونا چاہتا ہوں۔ تم مجھے اپنے وعدے سے آزاد کردو۔۔۔ میں تمہیں اپنے وعدے سے آزاد کرتا ہوں۔"

میرے آنسو بہہ رہے تھے۔۔۔ وہ بھی اپنے گھٹنوں پہ سر ٹکا کے سسک سسک کے رونے لگی۔

اس کے اور میرے آنسوؤں کے درمیان پھر سے وہی رشتہ بندھ رہا تھا۔

ہم دونوں کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تانیہ کے ڈیڈی آج رات کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔" نائلہ کے اطلاع دینے پہ رضوان اور مہ پارہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے۔

"نائلہ۔۔۔ آخر تم اپنی کر کے رہیں۔"

کوفت سے کہتے ہوئے رضوان نے کافی کا مگ ہاتھ سے رکھ دیا۔

"لو بھلا۔۔۔ اچھی بھلی تین ہفتے بعد ہونے والی شادی کو یوں افراتفری میں کرنے کی کیا تک ہے؟"

مہ پارہ نے بھی کھلے الفاظ میں ناگواری جتائی۔

"مہ پارہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے نائلہ۔۔۔ ابھی بھی سوچ لو۔۔۔ ام ہانی پہ کیا گزرے گی۔۔۔ وہ اس گھر کا۔۔۔ اسی خاندان کا ایک حصہ ہے۔ ہم کیسے خوشیاں منا سکتے ہیں اگر ہانی۔۔۔"

"میں بھی ام ہانی کی وجہ سے ہی یہ شادی جلد از جلد چاہتی ہوں۔" نائلہ کے کہنے پہ مہ پارہ نے تعجب سے انہیں گھورا تو وہ گڑبڑا کے بات سنبھالنے لگیں۔

"تاکہ اس کا دھیان بٹے۔۔۔ ورنہ ایسے ہی پریشان کن سوچوں میں الجھی رہے گی۔۔۔ شادی کی تیاریاں شروع ہوں گی تو گھر میں اداسی کا راج ختم ہوگا۔۔۔ جمود ٹوٹے گا۔ سعد بھی شادی کے ہنگاموں میں مصروف ہو جائے گا اور کیا اسے خوش دیکھ کے ہانی کو خوشی نہیں ہوگی؟"

رضوان نے کچھ کچھ متفق ہوتے ہوئے تائید میں گردن ہلائی۔ مگر مہ پارہ تنک کے بولی۔

"اور لوگ کیا کہیں گے۔۔۔ کہ بیٹی اجڑ رہی ہے اور یہ بیٹے کا گھر بسا رہے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے جو وہ اجڑے۔" نائلہ نے مہ پارہ کی جانب ایک سخت نظر اچھالی۔

"آپ سب لوگ بات بگاڑنے پہ ہی کیوں تلے بیٹھے ہیں۔ بجائے سنبھالنے کے اور ایسا ہی لوگوں کی باتوں کا ڈر ہے تو ہم شادی سادگی سے کریں گے۔"

"واہ۔۔۔ کل تک اکلوتے بیٹے کی شادی دھوم دھام سے کرنے کے ارمان تھے۔۔۔ اب سادگی؟ واہ بھئی ٹھیک ہے۔"

مہ پارہ بڑبڑانے لگیں اور نائلہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے رضوان کو بتا رہی تھیں۔

"سالار کی اماں پہنچ گئی ہیں۔ ان کا فون آیا تھا رات کو آج وہ آئیں گی۔ امید ہے معاملات درست ہو جائیں گے۔ آپ دل بھاری نہ کریں اللہ سے بہتری کی امید رکھیں۔"

☼ ☼ ☼

پتا نہیں کیوں میں جانتا تھا آج وہ یہاں ضرور آئے گی۔۔۔ حالانکہ ان پانچ دنوں میں وہ اپنے کمرے سے تو کیا باہر نکلتی۔۔۔ شاید بیڈ سے بھی نیچے قدم نہ دھرا ہوگا اس نے۔

پھر بھی۔۔۔

ایک قوی یقین کے ساتھ۔۔۔

میں صبح سے کھنڈر کے باہر کھڑا اس کی راہ تک رہا تھا۔ پھر وہ آگئی۔۔۔ زخمی پیروں میں ہلکی سی لنگڑاہٹ لیے۔۔۔ چہرے پہ نقاہت کے باوجود۔۔۔ ایک عزم کے آثار لیے۔ میں آگے بڑھا۔

"اب یہ مت پوچھنا کہ مجھے کیسا پتا چلا کہ تم یہاں آنے والی ہو۔"

"نہیں پوچھوں گی۔۔۔ کیونکہ میں تو یہاں آئی ہی اس لیے تھی کہ تمہارے یہاں ہونے کا یقین تھا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اندر بڑھنے لگا۔۔۔ پھر سیدھا لے کر اس دیوار کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جو اس کے اور میرے ناموں سے اٹی ہوئی تھی۔

اور درمیان میں چاک سے بنا سالار کا وہ خاکہ جو میرے بنانے پہ وہ مجھ سے روٹھ گئی تھی۔

ایک خوفناک شکل اور لمبے لمبے دانتوں والی شبیہہ۔

"یہ یاد ہے ہنی۔۔۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔ سالار کو پہلی نظر دیکھتے ہی مجھے اس کے اندر کا چہرہ نظر آگیا تھا اور میں نے یہ بناڈالا تھا۔" وہ اداسی سے دیکھنے لگی۔

میں نے نیچے جھک کے زمین پہ گرا کوئلے کا ایک ٹکڑا اٹھا کے اس کی جانب بڑھایا۔

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے پہلے کوئلہ تھامنے اور پھر دیوار پہ کچھ لکھنے کا کہا۔۔۔ وہ اب بھی نہ سمجھی تو اس کے ہاتھ میں کوئلہ تھماتے ہوئے میں کہنے لگا۔

"تمہارے اندر اب بھی بہت گھٹن ہے ہنی۔۔۔ جیسے تم نے رات کو سالوں سے رکے ہوئے آنسو نکالے تھے۔ آج کھل کے وہ سب نفرت بھی نکال دو جو سالار کے لیے تمہارے دل میں ہے۔" ام ہانی چند لمحے ہاتھ میں پکڑے کوئلے کو دیکھتی رہی۔۔۔ پھر اس کا ہاتھ دیوار کی جانب بڑھا۔ مگر جھجک کے رک گئی۔

"کم آن ہنی۔" میں نے حوصلہ بڑھایا۔

"مٹا دو اسے دیوار سے بھی، اپنے دل سے بھی اپنے ذہن اور اپنی زندگی سے بھی۔"

اچانک ہانی کے اندر ایک ہیجان سا پیدا ہوا۔۔۔ اور وہ پوری شدت پورے جنون کے ساتھ زور زور سے کوئلہ دیوار پہ بنی اس شبیہہ پہ پھیرنے لگی۔

اس کا ہیجان میرے اندر سکون بھر رہا تھا۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں اور میری معتدل ہوتی جا رہی تھیں۔

اس کی شال پھسل کے اس کے شانوں سے نیچے آ گری۔ مگر اسے خبر نہ ہو سکی۔۔۔ اس کا ہاتھ اس تیزی سے دیوار پہ چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ میرا بنایا سالار کا خاکہ مکمل طور پہ سیاہی میں چھپ گیا۔

"ہنی۔۔۔ بس ہو گیا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کے روکنا چاہا۔۔۔ اس سے کوئلہ لے کر دور پھینکا اور سرک کر نیچے گری شال اٹھا کے دوبارہ اسے اوڑھائی۔

"بس ہنی۔۔۔ اب تمہارا اندر خالی ہے۔۔۔ یہاں سالار کا کوئی بھیانک عکس نہیں ہے۔" وہ آنسوؤں کی دھند کے اس پار مسکرا اٹھی۔ بڑی شفاف سی مسکراہٹ نکھری نکھری۔

☼ ☼ ☼

اماں شرمندہ شرمندہ سی سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھی تھیں۔ اور رضوان گلہ کر رہے تھے۔

"آپ نے تو پلٹ کے خبر نہ لی۔۔۔ ہم بھی انجان رہے کہ ہماری بیٹی کس حال میں ہے" آپ پہ بھروسا ہی بہت تھا۔"

"میں شرمندہ ہوں۔ اپنی لاعلمی پہ بھی۔۔۔ اور سالار کے سلوک پہ بھی۔"

"صرف شرمندہ؟"

"اب بس بھی کیجیے رضوان۔" نائلہ نے مصالحت کی کوشش کرنا چاہی۔

"یہ بھی تو دیکھیں وہ کیسے آپ کے بتانے پہ فوراً" پاکستان چلی آئی ہیں آخر یہ ان کی چاہ ہی تو ہے۔"

"میں اسے لے جانے آئی ہوں۔" اماں کے کہنے پہ بھی رضوان نرم نہ پڑے۔

"سالار کو خود آنا چاہیے تھا۔۔۔ ہم بھی تو سنیں کہ اس کے پاس کیا وجہ ہے اپنے اس غیر انسانی سلوک کی۔۔۔ اپنی تسلی کیے بغیر ہم کیسے ام ہانی کو واپس بھیج دیں۔"

اماں کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ سامنے سے آتی ام ہانی کو دیکھ کے چپ کر گئیں۔

اور جیسے ہی انہیں سامنے پا کے ام ہانی بے ساختہ ان کی جانب بھاگتی آئی۔۔۔ وہ بھی دونوں بازو کھول کے رہ گئیں۔ اب وہ ان سے لپٹی سسک سسک کے رو

رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

گھر واپسی پہ اماں کو بپھرے ہوئے سالار کے سوالات اور جرح کا سامنا کرنا پڑا۔

"کیوں نہیں لائیں آپ اسے؟"

"کیونکہ میں نہیں لانا چاہتی تھی۔" جی کڑا کر کے انہوں نے کہہ دیا۔

"لیکن آپ کو میں نے اسی کام کے لیے بھیجا تھا۔"

"تب تک میں نے اس کی حالت نہیں دیکھی تھی سالار! اسے دیکھنے کے بعد مجھے لگا اس کا یہاں نہ آنا ہی بہتر ہے۔"

"اس کے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں... یہ طے کرنے کا حق صرف مجھے ہے آپ کو نہیں۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

"مجھے نہیں ہے تو تمہیں بھی نہیں ہے... تم بھی خدا نہیں ہو سالار جو اس کی قسمت لکھو گے۔"

"اسی خدا نے اس کی قسمت میں سالار اعظم لکھ دیا ہے۔ اب اپنی تقدیر سے بچ کر کہاں جائے گی وہ... اسے لے کر آئیں ابھی فوراً۔"

"نہیں جاؤں گی میں۔" اماں نے سالار کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

"نہ میں اسے مجبور کروں گی... مجھ سے اس کے آنسو نہیں دیکھے گئے سالار۔"

"آنسو..." سالار بری طرح چونکا تھا۔

"میرے دل پہ گرتے ہیں اس کے آنسو سالار نہ کرو اتنا ظلم... اس کے رونے سے عرش بھی ہل کے رہ گیا ہو گا۔ کیوں اس معصوم کی بددعائیں لیتے ہو۔" وہ بڑی دل گرفتگی سے اسے نصیحت کر رہی تھیں مگر سالار... اس کی سوئی تو محض ایک ہی لفظ پہ اٹک کے رہ گئی تھی۔

"وہ... وہ رو رہی تھی؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"ام ہانی رو رہی تھی؟" تصدیق چاہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کے اماں حیران رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

رات گئے ثانیہ کے ڈیڈی اسلم کی آمد ہوئی... سب حویلی سے باہر نکل کے ان کا استقبال کر رہے تھے۔

"ڈیڈی... اتنا لیٹ..." ثانیہ ان سے لپٹی ہوئی تھی۔

"بیٹا جی... میں خود اڑ سکتا تو زیادہ جلدی آجاتا... مگر جہاز کی رفتار اس سے زیادہ بڑھانا میرے بس میں نہیں تھا۔ وہ کافی خوش مزاج اور زندہ دل قسم کے انسان لگ رہے تھے۔ جلدی بے تکلف ہو جانے والے۔

رضوان نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ معانقہ کرنے لگے... اور نائلہ نے سلام جھاڑا تو فٹ ہاتھ آگے بڑھا دیا... بے چاری جھجک کے رہ گئیں۔

"اگر میں غلطی پہ نہیں ہوں تو آپ میری بیٹی کی ہونے والی ساس ہیں۔"

"ماما کہیں ڈیڈ... یہ ساس واس مجھے نہیں راس۔"

"اوہ... آئی سی... ثانیہ تم مجھے ہمیشہ اکساتی رہیں کہ میں تمہارے لیے ماما لے آؤں... میں قابو میں نہیں آیا تو تم نے خود اپنے لیے ڈھونڈلی... واؤ۔"

وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑے اور نائلہ خجالت مٹانے کے لیے رضوان کو کہنی مار کے متوجہ کرنے لگیں۔

"آپ اندر آئیں ناں..." رضوان کے کہنے پہ اسلم نے اندر قدم بڑھائے اور پھر مہ پارہ کو دیکھ کے ٹھٹکے۔

"ان کا تعارف نہیں کرایا آپ نے؟"

"یہ میری بہن ہے۔ مہ پارہ سعد کی پھوپھی۔"

مہ پارہ نے ان کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی فوراً اپنے بازو موڑے اور ہاتھ بغلوں میں دباتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

"السلام علیکم..."

"صبح آپ کے اعزاز میں ایک پرتکلف ناشتے کا

اہتمام کیا ہے ہم نے۔" رضوان انہیں اندر لے جاتے ہوئے بتارہے تھے۔

"وہاں میں نے اپنے سبھی رشتے داروں کو مدعو کیا ہے۔ تاکہ سب کا آپ سے تعارف ہو جائے۔"

"ارے واہ... ناشتا... یعنی برنچ۔" وہ بلاوجہ بے موقع قہقہے لگا رہے تھے۔ مہ پارہ پیچھے نائلہ کے پاس ہی رک گئی تھیں۔

"توبہ کیسا عجیب سا آدمی ہے۔ بھونڈا چھچھورا۔" انہوں نے برملا ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں ڈیڈی کیسے لگے؟" تانیہ وفور اشتیاق سے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"اگر کہوں کہ بالکل اچھے نہیں لگے تو کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟ انکار کر دو گی؟"

"کیوں نہیں کروں گی؟" وہ آنکھیں نکال کے مجھ پہ غرائی تھی۔

"پھر تو لازمی کروں گی... تاکہ اس گستاخی پہ تمہیں ساری زندگی سزا دیتی رہوں پورے حق کے ساتھ۔"

"اوہو..." میں نے مایوسی سے منہ لٹکایا۔

"پھر کیا فائدہ بلاوجہ سچ کہنے کا... تمہارا دل ہی رکھ لیتا ہوں یہ کہہ کر کہ بہت اچھے لگے۔" وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

اور مجھے ہنی کی کھلکھلاہٹ یاد آگئی۔ جو نجانے کہاں بچھڑ گئی تھی۔

"سنو تانیہ۔"

"ہوں۔"

"تم نے کہا تھا ناں... کہ ہانی کا ایک بار رونا بہت ضروری ہے میں نے اسے رلا دیا ہے۔"

"ہاں... جانتی ہوں۔ تبھی تو دھند چھٹتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔"

"اور دھند کے چھٹنے کے بعد دھنک کے رنگ پھیلنے بھی تو ضروری ہیں اور اس کے لیے میں اسے ایک بار مسکراتا ہوا بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو کرو ناں کوشش۔"

"یہ کام تمہیں کرنا ہوگا۔"

"میں... مگر تم کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ میں اس کے سب زخموں... تمام تکلیفوں سے واقف ہوں... جس کے سامنے انسان اپنے سارے درد کھول دیتا ہے اس کے سامنے مسکراتے ہوئے جھجکتا ہے، میں چاہتا ہوں تم اس کو اس خول سے نکالو۔ اسے زندگی کی جانب لاؤ۔"

☆ ☆ ☆

حویلی کے بڑے سے لان میں اس پر تکلف ناشتے کا اہتمام جو رضوان صاحب نے اپنے سمدھی اسلم صاحب کے اعزاز میں دیا تھا۔ کئی رشتے دار جو قریبی تھے جیسے نیاز کا کنبہ... خالہ وغیرہ... وہ لوگ تو پہلے سے موجود تھے ہی... انہوں نے چند اور عزیز و اقارب کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ ان سے تعارف کرانے کے لیے۔

اسلم صاحب کی برلہ سنجی اور طبیعت کا چونچال پن عروج پہ تھا جس سے مہ پارہ نہ جانے کیوں جزبز ہوتی جا رہی تھیں۔

"محترمہ... کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟" وہ پلیٹ تھامے اس کے پاس آئے۔

"جی فرمایئے۔" مہ پارہ نے ناگواری چھپانے کی اپنی سی کوشش کی۔

"آپ ہی کچھ بتایئے... کہاں سے شروع کروں؟"

"ناشتا۔"

"جی نہیں... بات۔" اس بار مہ پارہ نے ناگواری چھپانے کی قطعی ضرورت محسوس نہ کی اور تنک کے کہہ دیا۔

"مجھے ہر بات شروع کرنے کی نہیں، ختم کرنے کی عادت ہے اسلم صاحب۔"

"واہ واہ۔"

وہ بلاوجہ جھوم اٹھے اور باقاعدہ گنگنانے بھی لگے۔

"بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے...

اچھی پوئم ہے ناں؟"

"اسے پوئم نہیں غزل کہتے ہیں۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے رخ موڑ کے پراٹھا لینے لگیں۔

"اوہ... میں سمجھا اسے پراٹھا کہتے ہیں۔" اپنی بات پہ وہ خود ہی ہنس رہے تھے اور مہ پارہ منہ بنا رہی تھیں۔

"آپ کی باتوں سے کہیں نہیں لگتا کہ آپ ایک جوان بیٹی کے باپ ہیں۔"

"تعریف کا شکریہ۔" انہوں نے سر خم کیا۔

"آپ کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے میں اپنی عمر سے بہت کم نظر آتا ہوں... ویسے آپ کا بھی جواب نہیں... سعد کی پھوپھو نہیں۔ اس کی بڑی بہن لگتی ہیں آپ۔" اب کے انہوں نے وہ ہتھیار استعمال کیا... جس سے خواتین مزاحمت توڑ ہی دیا کرتی ہیں۔ مہ پارہ کے چہرے کا تناؤ بھی خود بخود کم ہو گیا۔

ایک مروت بھری مسکراہٹ بھی فوراً ہی ہونٹوں پہ آ گئی۔

"آپ یہ حلوہ ضرور چکھیے... یہاں کی خاص سوغات ہے۔"

☼ ☼ ☼

ام ہانی کے لاکھ نانا کرنے کے باوجود تانیہ اپنی سی کر کے رہی۔ اسے ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگانے کے بعد کچھ مطمئن ہوتے بولی۔

"ہوں... اب ٹھیک ہے۔"

"یہ کیا بنا دیا تم نے مجھے..." اتنے دنوں بعد خود کو ذرا ڈھنگ کے حلیے میں دیکھ کے ام ہانی بھی متوحش تھی... جیسے آئینے میں اس کا نہیں... کسی اور کا عکس ہو... اجلا اجلا... سنورا سنورا سا۔

"ایسا بھی کیا کیا میں نے... اتنے مہمان ہیں گھر میں... آپ کیا یوں ہی چلی جاتیں... اچھا اٹھیں نا... ڈیڈی آؤٹ آف کنٹرول ہو رہے ہوں گے... مجھے ان کو سنبھالنا ہو گا جا کر۔"

"کیا مطلب...؟"

"بھئی بہت سا کھانا... اور بہت سی خواتین... یہ دونوں چیزیں ڈیڈی کو ذرا اوور کر دیتی ہیں۔" ام ہانی مسکرا دی... تو تانیہ کے ہونٹوں پہ بھی کامیابی بھری مسکراہٹ آ گئی۔

"آئیڈیا... کیوں نہ بھاگتے ہوئے جائیں۔"

"کیا...؟" ام ہانی کی وہ مسکراہٹ بھک سے اڑ گئی۔

"ہاں نا... بہت مزہ آئے گا... دھواں دار انٹری..."

"کیا بچکانہ آئیڈیا ہے... اور ویسے بھی... میرے پیر... میں چل بھی لوں تو بہت ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا... اچھے بھلے ہیں اب آپ کے زخم... بہانے نہ کریں بہادر بنیں..."

"بہادر بننے اور احمق بننے میں بہت فرق ہے... بھاگ کے وہاں جانے کی کیا تک ہے بھلا۔"

"کبھی کبھی بے تکے کام بھی کر لینے چاہئیں... اور کون دیکھ رہا ہے ہمیں... سب تو وہاں ہیں... ہم دونوں یہاں سے بھاگتے ہوئے جاتے ہیں... ریس لگاتے ہیں... کہ کون پہلے پہنچتا ہے۔"

"تم بالکل بچی ہو تانیہ..."

"آپ بھی بن جائیں تھوڑی دیر کے لیے... اپنے اندر کے بچے کو ہمیشہ زندہ رکھنا چاہیے... بچے معصوم اور خالص ہوتے ہیں... بچپنا زندہ رکھنے کا مطلب ہے اپنی معصومیت اور خالص پن کو بھی زندہ رکھنا۔"

"تانیہ..." وہ اس کے اصرار پہ زچ ہو رہی تھی... اور وہ تھی کہ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی کرنے لگی۔

"یقین کریں... اس ذرا سے بچپنے سے آپ خود میں کتنی بڑی تبدیلی محسوس کریں گی... لگائیں ریس...؟"

"میں کتنا بھی تیز بھاگ لوں... تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی تانیہ..." وہ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اور اگر میں خود آپ کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ ساتھ بھگاؤں تو...؟"

"بھلا کوئی اپنے حریف کا ہاتھ بھی پکڑتا ہے؟" وہ اس کے بھولپن پہ ہنس دی۔

"بالکل پکڑتا ہے۔" وہ مصر تھی۔

"اگر دونوں کی منزل ایک ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ام ہانی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ "پہلے آپ پہنچیں۔۔۔ یا میں۔۔۔ بات ایک ہی ہے۔۔۔ کیونکہ منزل تو دونوں کی ایک ہی ہے۔" اور اس نے یہ کہتے ہی اچانک بھاگنا شروع کردیا۔۔۔ ام ہانی اس کے لیے تیار نہیں تھی۔۔۔ مگر چونکہ اس کا ہاتھ تانیہ کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھا اس لیے ناچار اسے بھی بھاگنا پڑا۔

"ارے تانیہ۔۔۔ رکو۔۔۔ میں گر جاؤں گی۔" اب وہ راہداری سے بھاگتے ہوئے گزر رہی تھیں۔

"نہیں گرنے دوں گی میں آپ کو۔۔۔" راہداری عبور کرتے ہوئے وہ دونوں ہال میں پہنچ چکی تھیں۔ جہاں اپنے کام نپٹاتی دونوں ملازمائیں آنچل کا کونہ دانتوں تلے داب کر یہ منظر حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

میں اسی کا منتظر تھا۔۔۔ وہ۔۔۔ جو کبھی میری منتظر نہ رہی تھی۔۔۔ مگر اس دل کا کیا کرتا۔ اسے آج بھی بنا کسی امید۔۔۔ بنا کسی آس۔۔۔ بنا کسی وجہ کے اس ہی تلاشتے رہنے کی عادت تھی۔

اور پھر دور سے وہ دونوں بھاگتی ہوئی اس جانب آتی نظر آئیں۔۔۔ میرے ساتھ ساتھ باقی سب کے لیے بھی یہ منظر حیران کن تھا۔۔۔ اتنی بہت سی حیران نظروں کو خود پہ دیکھ کے ام ہانی نے اپنی رفتار روک لی تھی اور زبردستی ہاتھ کھینچ کر تانیہ کو بھی روکنا چاہا تھا۔ تانیہ اس کے چہرے کی گھبراہٹ بھانپ کے رک گئی مگر پھر اس کا ہاتھ یوں ہی تھامے تھامے سیدھا اپنے ڈیڈی کے پاس لے گئی۔ جو دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"ڈیڈ۔۔۔ یہ ام ہانی۔۔۔" اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ بے اختیار اس کا سر شفقت سے تھپکنے لگے۔

"یہ چیٹنگ ہے ڈیڈی۔۔۔" وہ منہ بسورنے لگی۔

"آپ نے کبھی میرے سر پہ ہاتھ نہیں پھیرا۔"

"اس کا چہرہ ہی ایسا ہے۔۔۔ پکار پکار کے محبت مانگتا ہے۔ دل خود بخود اسے دعا دینے کو چاہتا ہے۔"

ام ہانی کے ہونٹوں پر ایک مسلسل مسکراہٹ تھی۔ جسے دیکھ دیکھ کے میں شانت ہو رہا تھا اور تانیہ کا ممنون بھی۔۔۔ کچھ دیر بعد اسے اکیلا پاکے میں اسے کہے بنا نہ رہ سکا۔ "تھینکس تانیہ۔۔۔"

"کس بات کا۔۔۔" وہ پراٹھے کا رول بنانے میں مصروف تھی۔

"ہنی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لانے کا۔۔۔ ایک سچی اور بے ساختہ مسکراہٹ۔۔۔ زبردستی یا مروت کی نہیں۔" میں نے سامنے مہ پارہ پھوپھو کے ساتھ کھڑی ہنی کو دیکھا جو بالکل نارمل انداز میں مسکرا مسکرا کے کوئی بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ 'کسی خوف' کسی گھبراہٹ کا اب شائبہ تک نہیں تھا۔

"وہ جب سے آئی ہے' میرا حوصلہ نہیں ہوا کہ اسے مسکرانے کا کہتا۔ تم نے یہ کام کتنی آسانی سے کر دیا۔"

"صرف اس کے نہیں۔۔۔ تمہارے بھی ہونٹوں پہ بہت دن بعد مسکراہٹ آئی ہے۔ تمہاری مسکراہٹ کا ہانی کی مسکراہٹ سے کوئی رشتہ ہے کیا؟" اس نے کتنی بے ساختگی سے وہ راز اگل دیا تھا جس کے بارے میں مجھے لگتا تھا' صرف میں ہی واقف ہوں اس راز سے۔۔۔

"تم بہت پہنچی ہوئی ہو تانیہ۔۔۔ کہیں اور نہ پہنچ جانا۔" میں نے ہنسی میں اڑانا چاہا اس کی بات کو بھی اور اپنے خوف کو بھی۔۔۔

"نہیں۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ مگر آدھا سچ۔۔۔" میں نے ہار مان لی۔

"صرف مسکراہٹ کا نہیں۔۔۔ آنسوؤں کا بھی۔۔۔"

"وہ کیسے۔۔۔" تانیہ تفصیل جاننا چاہ رہی تھی اور میں چونک گیا تھا۔ کیونکہ میں نے ام ہانی کے اس چہرے پہ۔۔۔ جس پہ کچھ دیر پہلے ایک الوہی مسکراہٹ تھی۔۔۔ وہاں وہی خوف اور دہشت پھر سے دیکھی۔۔۔

اس کی نظروں کے تعاقب میں گردن گھمائی، تو سالار کو اپنی کار سے نکل کے اس جانب آتے دیکھا۔
"یہ کون ہے۔" ثانیہ اپنا وہ سوال بھول کے اب کچھ اور پوچھ رہی تھی۔ اور ہانی سہم کے ابو کا بازو زور سے تھام کے ان سے لپٹ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

رضوان اسے اندر لا چکے تھے، تاکہ مہمانوں کے سامنے وہ کوئی تماشا کھڑا نہ کر سکے۔ اس کے تیور تو کچھ ایسے ہی تھے۔
"بیٹھ کے بات کرتے ہیں سالار۔" اگرچہ رضوان کا دل اس سے سخت مکدر تھا۔ مگر پھر بھی وہ اپنی حد تک وضع داری نبھا رہے تھے۔
"میں نہ بیٹھنے آیا ہوں۔ نہ بات کرنے۔ ام ہانی کو لینے آیا ہوں۔ بھیجیں اسے۔"
"مگر میں کچھ معاملات صاف کیے بغیر اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیج سکتا۔"
"مجھے اسے یہاں سے لے جانے کا حق ہے۔" وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔ مگر اس کے باوجود رضوان نے لحاظ کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔
"اور ہمیں تم سے بازپرس کا حق ہے۔"
"آپ کا مجھ کوئی حق نہیں۔"
"مگر ام ہانی پہ تو ہے۔"
"مجھ سے اس کا نکاح کرنے کے بعد آپ اس پہ سے حق کھو چکے ہیں۔" اس کی مسلسل بدتمیزی پہ وہ بڑی مشکل سے خود پر ضبط کر رہے تھے۔
"لیکن اس نے اپنی زندگی پہ سے اپنا حق نہیں کھویا ہے۔" بالآخر وہ بھی قطعیت سے فیصلہ سنا گئے۔
"مجھے نہ سہی۔ مگر تمہارے ساتھ جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرنے کا حق اسے ضرور ہے۔ وہی یہ طے کرے گی۔"

☼ ☼ ☼

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں نکلوں گی کمرے سے۔" وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ ابو اسے سالار سے بات کرنے کا کہہ رہے تھے۔
"بیٹا۔ تمہاری مرضی کے بغیر ہم اس کے ساتھ نہیں بھیجیں گے تمہیں۔ بس۔ تم یہ بات خود اسے جا کے کہہ دو۔"
"میں بات بھی نہیں کروں گی۔ کر ہی نہیں سکتی۔" وہ رو رہی تھی۔ اور میرا دل پگھل رہا تھا۔ مگر میں فی الحال چپ تھا۔ البتہ پھوپھو بول اٹھیں۔
"بس سن لیا آپ نے؟ جس کے ساتھ بات کرنے یا اس کا سامنا کرنے سے ہی اس بے چاری کی جان نکل رہی ہے۔ مرنے والی ہو گئی ہے ایک منٹ میں۔ وہ اس کے ساتھ رہے گی کیسے۔"
"مہ پارہ۔ تم اپنی مرضی اور سوچ زبردستی اس پہ مسلط نہ کرو۔" امی بے چین ہو رہی تھیں مگر مصلحتاً ام ہانی کی حمایت بھی کی۔
"میں ام ہانی کا خوف اور ناراضی سمجھ سکتی ہوں۔ کچھ کم نہیں کیا سالار نے۔" اور پھر فوراً ہی پٹڑی بدل لی۔
"لیکن یہ بھی تو سوچو۔ کبھی تو غصے اور ناراضی کی یہ کیفیت کم ہو گی۔ دماغ ٹھنڈا ہو گا۔ اور تب شاید وہ اپنے جلد بازی کے فیصلے پہ پچھتائے گی' اس لیے اتنے اہم فیصلوں کا اختیار بچوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے۔ ابھی ہم زندہ ہیں۔" اب میں چپ نہ رہ سکا۔
"زندہ تو ہیں۔ مگر جاگے ہوئے نہیں۔ ورنہ۔ کبھی تو پلٹ کے اس کی خبر لیتے۔ جو بات یہاں آنے کے دوسرے ہی دن میں جان گیا تھا' اس سے آپ اتنا عرصہ بے خبر کیسے رہے؟" امی تمکن مجھے گھور کے رہ گئیں۔ میری بات کا کوئی جواب نہ تھا ان کے پاس۔
"تم بولو ام ہانی۔ تم کیا چاہتی ہو؟" ابو نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔ "ڈرو مت۔ کوئی تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرے گا۔ جو تم چاہو گی۔ وہی ہو گا۔ تمہیں پورا حق ہے اس کا۔"
"نہیں۔ میں واپس نہیں جانا چاہتی۔" اس کی بات پہ میرے اندر اطمینان بھر گیا۔

"میں تھک گئی ہوں ایسی زندگی سے۔۔۔ مجھ میں اپنی تذلیل ہوتے دیکھنے کا اب مزید حوصلہ نہیں رہا۔۔۔ میں سر اٹھا کے جینا چاہتی ہوں۔۔۔ بنا کسی خوف کے۔"
پھوپھو نے اسے گلے لگالیا۔ جبکہ میں نے امی کی بے چینی کو بڑھتے دیکھا تھا۔ ابو نے سالار کو امہانی کا فیصلہ سنا دیا۔۔۔ مگر وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔
"میں نہیں مان سکتا۔ آپ لوگوں نے اسے دباؤ میں لیا ہے۔۔۔ میرے سامنے لائیں اسے۔۔۔ آخر چھپا کیوں رہے ہیں؟"
"وہ خود چھپ رہی ہے تم سے۔۔۔ نہیں سامنا کرنا چاہتی تم جیسے شخص کا۔۔۔" بالآخر میں نے اس کی طبیعت صاف کرنے کا ارادہ کر ہی لیا۔
"سعد۔۔۔ تم اندر جاؤ۔۔۔ میں بات کر رہا ہوں۔" ابو نے مجھے منظر سے غائب کرنا چاہا، مگر اب میں کہاں رکنے والا تھا۔
"کیسی بات ابو؟ کسی بات کی گنجائش نہیں ہے اب۔۔۔ آپ اسے عزت کے ساتھ واپس جانے کا کہیں۔۔۔ یا۔۔۔ یا پھر میں کہہ دیتا ہوں۔"
"میں اپنی بیوی کو ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔۔۔ تم میرے حق کو چیلنج کر رہے ہو۔"
"اور اگر وہ بیوی ہی نہ رہے تو؟" میں تن کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
"پھر کس رشتے اور حق سے ساتھ لے جانے کی بات کرو گے؟ مسٹر سالار اعظم۔۔۔ بھول جاؤ کہ تم اب کبھی اس کی گرد کو بھی پا سکو گے۔"
"سعد۔۔۔ بیٹا۔۔۔ تحمل سے۔۔۔ معاملے کو بگاڑو مت۔۔۔" ابو ابھی بھی مجھے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔ اپنی سی کوشش۔۔۔
"ابو۔۔۔ اس نے ایک لڑکی کی پوری زندگی بگاڑ دی ہے اور آپ کو معاملہ بگڑنے کی فکر ہے۔" ان کو تاسف سے دیکھنے کے بعد میں نے پھر سالار کی جانب توجہ کی۔
"میرے ہوتے ہوئے تو تم اسے کبھی یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔ اگر ہو سکے تو خود کو بچا کے ضرور لے جاؤ۔۔۔ ورنہ کہیں مجھے ہنی کو لگنے والے زخموں کا حساب لینا یاد نہ آجائے۔" میری دھمکی کو اس بے غیرت اور ڈھیٹ انسان نے بہت تحمل کے ساتھ سنا۔ اور جیسے پی ہی گیا۔ چند سیکنڈ مجھے سرد نظروں سے گھورنے کے بعد وہ پلٹا اور خاموشی سے واپس جانے لگا۔
"تم نے ٹھیک نہیں کیا سعد۔۔۔" ابو اس کی موجودگی پر اتنے پریشان نہیں تھے۔ جتنے اس طرح اس کے واپس جانے پر تشویش میں مبتلا ہو گئے۔
"سالار کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ اس کی خاموشی کو طوفان آنے سے پہلے والی خاموشی سمجھو۔"

✲ ✲ ✲

وہ دن ایک ہنگامے سے شروع ہوا تھا۔ ایک خاموشی پہ ختم ہو رہا تھا۔ ام ہانی کو یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی اسے سالار کے ساتھ اس جہنم میں دوبارہ نہیں بھیجے گا۔۔۔ مگر دل کو پھر بھی ایک کھٹکا سا لگا ہوا تھا۔
وہ رات کے اس پہر اکیلی آنگن میں بیٹھی ان اذیت ناک یادوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ جب اسلم صاحب کافی کا مگ لیے اس کے برابر آ بیٹھے۔
"کیا دیکھ رہی ہو آسمانوں میں؟" ام ہانی نے ان کے سوال پہ بھی آسمان سے نظر نہ ہٹائی۔
"دیکھنا چاہ رہی ہو کہ خدا تمہارے لیے کیا کر رہا ہے؟" "تمہیں پتا ہے وہ بھی اس وقت یہ دیکھنا چاہ رہا ہے کہ تم خود اپنے لیے کیا کرتی ہو۔۔۔ اللہ نے تمہیں یہ زندگی دی ہے اسے جینے کا موقع دیا ہے۔ ہمت دی ہے۔۔۔ اب تمہیں یہ دکھانا ہے کہ تم اس کا استعمال کیسے کرتی ہو۔
"میں نے بہت ہمت سے کام لے کر ہی وہاں واپس نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ مجھے نہیں پتا ہے کہ ایسا ہو بھی پائے گا۔۔۔ یا نہیں۔۔۔ پتا نہیں باقی سب کو یہ کیسا لگا ہو؟"

"اپنے ساتھ ٹھیک کیا ہے یا غلط؟ کیا لگتا ہے تمہیں بیٹا۔" وہ کچھ سوچتے جواب دینے لگی۔
"مجھے لگتا ہے اپنے ساتھ تو ٹھیک ہی کیا ہے۔ غلط تب کر رہی تھی جب اپنی تذلیل کروا رہی تھی۔"
"گریٹ۔ تو باقی سب کے ساتھ ٹھیک ہو۔ یا غلط۔ یہ تمہارے سوچنے کا کام نہیں۔ زندگی بڑی مختصر شے ہے اپنے لیے ہی جی لیں تو بڑی بات ہے۔ کسی اور کے لیے جینے کا وقت اور حوصلہ کیسے نکالیں۔" مہ پارہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ درست کرتے ہوئے باہر جھانکا تو اسلم صاحب کو امہانی کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کے چونکی۔
"تو۔ یہ خبطی شخص اب اپنی بے سروپا چھچھوری فضول باتوں سے بے چاری کو مزید پریشان کر رہا ہوگا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے نکلیں۔ ارادہ تھا کہ امہانی کو بروقت کمک پہنچا کے اس شخص کی باتوں سے بچا سکیں۔
"مگر انکل۔ ہم خود کو لوگوں سے کاٹ کے بھی تو نہیں جی سکتے۔" مہ پارہ کے خدشے کے برعکس امہانی سارے دن کی طویل خاموشی کو توڑ کے اپنے اندر کے سوالات کے جواب ان سے طلب کر رہی تھی۔
"جی سکتے ہیں۔ کیوں نہیں جی سکتے۔" انہوں نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔
"میں جیا ہوں۔ ابھی بھی جی رہا ہوں۔ تانیہ کی ماں سے جب میں نے شادی کی تو وہ کینسر کی آخری اسٹیج پہ تھی۔" مہ پارہ کے قدم وہیں تھم گئے۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پہ رک کر سننے لگیں۔
"صرف وہی کیا۔ کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ شادی ہو کیونکہ اس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ مگر میں نے یہ شادی کی۔ کیونکہ میں جینا چاہتا تھا۔ اس کی محبت میں۔ چاہے چند دن ہی سہی۔ وہ ماں نہیں بننا چاہتی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی اپنی اولاد کو پالنے کے لیے زندہ نہیں رہے گی۔ مگر میں پھر بھی تانیہ کو دنیا میں لاکے رہا۔ کیونکہ میں اس کے مرنے کے بعد بھی جینا چاہتا تھا۔ مجھے سہارا چاہیے تھا۔ وجہ چاہیے تھی جینے کی۔ اس کی آخری نشانی سے بڑھ کے اور کیا وجہ ہوتی۔"
وہ تو مسکرا مسکرا کے بتا رہے تھے۔ حسب عادت مگر امہانی مغموم سی ہو گئی۔ "تانیہ نے کبھی بتایا نہیں۔"
"کیونکہ وہ بھی جینا چاہتی ہے اور جیا تب جاتا ہے جب خود سے وابستہ ہر غم اور تکلیف کو جتنی دور ہو۔ جھٹک دیا جائے۔ تم بھی یہی کرو۔ مت سوچو۔ کہ کوئی کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا۔ اپنی خوشی تلاش کرو۔" تب ہی اسلم صاحب کی نظر مہ پارہ پہ گئی، جو آنکھوں میں ہلکی سی نمی لیے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ اسلم صاحب کی سنجیدگی ہوا ہونے اور شوخی عود کر آنے میں ایک ہی سیکنڈ لگا۔
"اور یہاں آنے کے بعد کچھ حسین چہرے دیکھنے کے بعد تو اب یہ حال ہے کہ۔" وہ گنگنانے لگے۔

آج پھر جینے کی تمنا ہے
آج پھر مرنے کا ارادہ ہے

اور پہلی بار مہ پارہ کو ان کی شوخی چھچھورپن نہیں لگی تھی۔ وہ دھیمے سے مسکرا دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اور اس آسمان کے نیچے۔ ان ہی ستاروں کی چھاؤں میں جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی اپنے جینے کی وجہ تلاش رہی تھی۔ اب میں وہیں کھڑا جینے کی وجہ اسی سے پوچھ رہا تھا۔ کہ۔
"سعد۔" اور میں پوچھ ہی نہ سکا۔ کیونکہ تانیہ مجھے پکارتی وہیں آگئی۔
"تم یہاں ہو۔ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔"
"میں بھی بہت دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔"
"مجھے۔" وہ کھل سی اٹھی۔
"نہیں۔ خود کو۔"
"اف۔ پھر سے۔ بہت دنوں بعد دورہ پڑا ہے تمہیں فلمی ڈائیلاگ جھاڑنے کا۔"
"چلو۔ آج تم بھی کچھ فلمی ہو جاؤ میرے

ساتھ۔۔۔"

"سوچ لو۔۔۔ پھر نہ کہنا۔۔۔ یہ حویلی ہے۔۔۔ یہاں یہ سب نہیں چلتا۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"ہمارے ساتھ کچھ بھی تو فلمی نہیں ہوا تانیہ۔۔۔ نہ کوئی ظالم سماج۔۔۔ نہ ولن۔۔۔ سوچو۔۔۔ اگر ہمارے درمیان کوئی آگیا تو۔۔۔؟"

"اب کیا آئے گا؟" وہ بے فکری سے بولی۔

"کچھ دن بعد تو ہماری شادی ہے۔"

"کچھ دن بعد ہے نا۔۔۔ ابھی بہت وقت ہے درمیان میں۔۔۔ کچھ ہونے کے لیے تو ایک پل بھی کافی ہوتا ہے۔"

"پلیز سعد۔۔۔" وہ گھبرا سی گئی۔

"مت کرو ایسی باتیں۔۔۔ مذاق میں بھی نہیں۔۔۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کس بات کا ڈر۔۔۔"

"تمہیں کھونے کا ڈر سعد۔"

"اتنا چاہتی ہو مجھے؟" یہ سوال کرتے ہوئے میں اداس سا ہو گیا۔ بالکل بجھ ہی گیا۔

"ہاں۔۔۔ تو اور کیا؟"

"میں نے منع بھی کیا تھا۔۔۔ تم باز نہیں آئی مجھ سے محبت کرنے سے۔۔۔" میں مایوس ہو گیا اور دل گرفتہ بھی۔۔۔ کیا تھا' جو تانیہ مجھ سے محبت نہ کرتی۔۔۔ کرتی بھی تو وہ اتنی اچھی نہ ہوتی کہ اس کی محبت کو دھوکا دیتے ہوئے مجھے خود سے شرم آئے۔

"تمہیں پتا تو ہے سعد۔۔۔ کہ میں کتنی خود سر ہوں۔"

"خود سر تو محبت ہوتی ہے تانیہ۔۔۔ من مانی کرنے کی عادی۔۔۔ اپنی کرنے پہ آئے تو یہ نہیں دیکھتی کہ اس کے سامنے کون ہے اور اس کے قدموں تلے کیا کیا مسل کے برباد ہو رہا ہے۔۔۔ تانیہ محبت کو معاف کر دینا' اس کے قصور بخش دینا' محبت اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے۔"

"سعد۔۔۔ تم۔۔۔ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟" اسے ہراساں دیکھ کے میں نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

"فلمی۔۔۔ فلمی باتیں۔۔۔ تمہیں پسند ہے نا اس لیے۔" وہ خفا خفا سی مجھے دیکھنے لگی ہمگر بہل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سالار بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ رت جگا اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ "آج بھی تم ساری رات نہیں سوئے۔" ماں نے اسے دیکھ کے افسوس سے کہا۔

"خود کو کب تک تکلیف دو گے۔۔۔ اور اسے بھی۔۔۔ بیٹا۔۔۔ زبردستی نہ گھر بستے ہیں۔۔۔ نہ دل۔۔۔"

"اگر آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں تو آپ نے وہ گھر زبردستی اتنے سال بسانے کی کوشش کیوں کی۔۔۔ جو گھر نہیں ایک اذیت کدہ تھا۔"

"جو تمہاری ماں کے ساتھ ہوا۔۔۔ وہ تم کیوں دہرانا چاہتے ہو۔۔۔ آزاد کر دو اسے سالار۔۔۔ جانے دو۔۔۔"

"آزاد کر دوں۔" وہ مشتعل ہو گیا۔

"کیسے آزاد کر دوں؟ میں چاہتا ہوں اسے۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو شامل نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔۔۔ آپ جانتی ہیں یہ بات۔۔۔ اس نے میری قسم توڑی۔۔۔ اب کیسے جانے دوں اسے اپنی زندگی سے۔۔۔"

"کیونکہ زبردستی تم اسے یہاں لے بھی آئے تو اس کے دل میں جگہ نہ پا سکو گے۔" ڈرتے ڈرتے انہوں نے اسے حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا۔

"ناراض ہے وہ۔۔۔ مان جائے گی جب اس کے اردگرد سے وہ لوگ دور ہوں گے۔۔۔ وہ اسے بہکا رہے ہیں۔۔۔ میرے خلاف ورغلا رہے ہیں۔۔۔ میرے پاس آئے گی تو اس کی ناراضی بھی ختم ہو جائے گی۔"

"ناراض نہیں ہے وہ سالار۔۔۔" وہ جھنجلا اٹھیں' اس کے گمان پہ۔۔۔

"اس کے مان جانے کی آس پہ مت رہو۔۔۔ ابھی اس کے تایا سے میری بات ہوئی ہے۔۔۔ وہ لوگ طلاق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

"کیا۔۔۔ طلاق۔۔۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرحین اظفر

سوہا اور رماہا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید' انس' عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ' انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس' سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کردیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے' مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کرلیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہوکر انس کے گھر آجاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید' عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ' شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے' جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہوجاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کرلیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور ماہا سے بھی کردیتی ہیں۔

حدید' انس کی خاطر نائلہ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہوجاتا ہے اور شادی کے بعد پوری سچائی سے نائلہ کو بیوی کا درجہ دینا چاہتا ہے' مگر نائلہ نے حدید کو مجبوری کے تحت اپنی زندگی میں قبول کیا اور اس کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا حدید

خاموش ہوگیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ نائلہ اس کو قبول کرلے گی مگر حدید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے نائلہ کے دماغ میں کچھ اور ہی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے جس پر نائلہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے عمل پیرا تھی کہ وہ انس کی نہ ہو سکی تو سوہا اور انس کو بھی جدا کردے گی۔

ماہا کی شادی حبیب سے بخیر و خوبی ہو جاتی ہے۔ ماہا حبیب کے ساتھ دبئی چلی جاتی ہے' ماہا حبیب سے شادی کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی سمجھنے لگتی ہے 'مگر اس کو پتا چلتا ہے کہ حبیب ایک بیٹے کا باپ ہے اور وہ فوراً" پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیتی ہے۔

سوہا امید سے ہوتی ہے 'مگر نائلہ بڑی عمدگی اور کامیابی سے سوہا کو اس خوشی سے محروم کردیتی ہے اور اس حادثے کے بعد انس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سوچ لیتا ہے کہ اب سوہا کو کوئی غم نہیں دے گا۔ نائلہ اسپتال میں شبیر حسین کو دیکھ کر چکرا جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ شبیر حسین نے اس کو نہیں دیکھا 'مگر شبیر حسین نائلہ کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور نائلہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر حسین کے جال میں گھر جاتی ہے۔

حبیب ماہا کو منا لیتا ہے اور پاکستان آجاتا ہے 'مگر ماہا پھر غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور حبیب کے ساتھ جانے سے منع کردیتی ہے۔ حبیب اکیلا ہی دبئی جانے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

عفت کا نکاح معراج کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس کا حدید کو پتا چلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

# تیرھویں قسط

مزنہ جلے پیر کی بلی کی طرح گھر کے کونے کونے میں منڈلا رہی تھیں۔ بچوں کو انہوں نے مقررہ وقت سے ذرا پہلے ہی اپنی ایک جاننے والی کے گھر بھجوا دیا تھا اور اب انہیں رات میں ہی وہاں سے واپس آنا تھا۔

صادق نے ہی مزنہ سے رات کے کھانے پر اہتمام کرکے ولید اور ڈنزی کو گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ ان دونوں کو قبل از وقت ماہا کی تنک مزاجی 'تلخی اور سخت زبان سے واقفیت کروا دیں۔ اور یہ بھی تفصیلاً" واضح کردیں کہ اگر انہیں اور خاص طور پر ڈنزی کو حبیب سے ملاقات کرکے ہی واپس جانا ہے تو 'یہ ملاقات ماہا کی غیر موجودگی میں ہی ممکن ہے۔ ورنہ ماہا سے کچھ بعید نہیں کہ موقع محل کی مناسبت کا خیال کیے بغیر ہسپتال میں غدر مچا دے۔

انہیں افسوس تھا کہ چند دن پہلے تک جو خیالات ان کے مزنہ کے بارے میں تھے کہ وہ جذباتیت کا شکار ہو کر بے مقصد کا شور مچا رہی ہیں۔ وہی خیالات اب ان کے ماہا کے بارے میں بھی تھے۔

حالانکہ دونوں کی عمروں میں واضح تفاوت تھا۔ لیکن ذہنی ناپختگی کو اگر دیکھا جاتا تو یہ فرق بالکل مٹ جاتا۔

فی الوقت تو وہ تیار ہو کر ان دونوں ماں بیٹے کو اس ہوٹل سے پک کرنے جا چکے تھے 'جہاں سے پاکستان آنے کے بعد انہوں نے فون کیا تھا۔ وہ دونوں اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ کچھ راستوں سے مکمل طور پر انجان تھے۔ اس لیے کہیں بھی آنے جانے کے لیے فی الحال انہیں صادق کی معاونت کی ضرورت بھی تھی۔

مقررہ وقت پر جب وہ گاڑی وسیع و عریض پارکنگ میں کھڑی کرکے ہوٹل کے ریسپشن تک پہنچے تو ان کے دونوں مہمان انہیں ریسپشن ڈیسک کے سامنے بنے ویٹنگ ایریا میں ہی مل گئے۔

صادق نے ان دونوں کی تصاویر نیٹ کے ذریعے سے حاصل کرلی تھیں۔ اس لیے انہیں 'ان کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

ڈزنی ایک بے حد سفید رنگ اور سنہرے بالوں والی دبلی پتلی درمیانے قد کی عورت تھی۔ اس کی اٹھی ہوئی ستواں ناک اور چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھوں کے ساتھ بوائے کٹ سے ذرا لمبے بال اسے مکمل طور پر بدیسی ثابت کرتے تھے۔ البتہ ولید اس کا قد صادق سے بھی چند انچ نکلتا ہوا تھا۔ سیاہ بال سیاہ آنکھیں گوری رنگت اور بھرا ہوا جسم۔

چہرے کے خدوخال مشرق و مغرب کے امتزاج کے ساتھ لڑکپن کی ایک خاص معصومیت لیے ہوئے تھے۔ اس نے جیسے ہی صادق کو دیکھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور سلام کرتے ہوئے کچھ اس قدر بے تابانہ انداز میں آگے ہوا کہ صادق نے بے اختیار اسے گلے سے لگالیا۔

اس کے چوڑے شانوں اور مضبوط کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ عجیب سی ناقابل بیان کیفیات کا شکار ہو چلے تھے۔

"میرا خیال ہے، ہمیں نکلنا چاہیے۔ میری وائف مزنہ اور آپ کی آنٹی ڈنر پر آپ لوگوں کا انتظار کررہی ہیں۔" جب اس نے ان کی بات پر سرہلا کر پاس رکھا بیگ اٹھایا اور پلٹ کر ڈزنی سے انگلش میں یہی بات کہی۔ اس کے بعد سیدھا ہو کر ان کے سامنے آیا تو لحہ بھر میں صادق صاحب کی تمام انجانی کیفیات ایک مبہم سے تفاخر میں بدلنے لگیں۔

"بلاشبہ اگر اس کی پیدائش کو لوگ تضحیک کے نشانے پر نہ رکھیں۔ تو ایسا بیٹا ہی ہر باپ کی خواہش ہوا کرتا ہے۔ جوان کے شانہ بشانہ چلے تو باپ کا سینہ اور کندھے اور چوڑے ہو جائیں۔"

صادق نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی تک پہنچتے ہوئے ایک۔ چھپلتی ہوئی سی چور نگاہ ایک بار اور اس پر ڈالی۔

جس وقت وہ لوگ گھر پہنچے، رات کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ راستہ بھر خاموشی رہی اور گھر آگیا۔ مزنہ بڑے رسمی انداز میں قدرے ہوائیاں اڑے چہرے کے ساتھ ملیں۔ یوں بھی ڈزنی جیسی خالصتاً"انگریزی شخصیت رکھنے والی عورت سے وہ زندگی میں پہلی بار ملی تھیں اور جس لڑکے کو حسیب کا بیٹا بتایا جارہا تھا۔ وہ جب پورے قد سے ان کے سامنے کھڑا ہوا تو ان کی آنکھیں ہی پھٹ گئیں۔

بمشکل اٹک اٹک کر اپنا تعارف کروایا اور ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر صادق صاحب کو اشارہ کرتی باہر نکل گئیں۔

"یہ... یہ لڑکا کون ہے۔" وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوئے تو مزنہ نے بے چین سی ان کے نزدیک آگئیں۔

"یہی ولید ہے۔ جس کے بارے میں حسیب نے ہم سب سے چھپایا اور جس کو ڈاکومنٹس میں اون کیا ہے اس نے۔ جس کا خرچہ، پڑھائی اور دوسرے اخراجات پورے کرتا ہے۔ ایک ذمہ دار باپ کی طرح۔"

انہیں ضرورت نہیں تھی اتنی وضاحت دینے کی۔ لیکن اس کا قد کاٹھ دیکھ کر شک میں پڑجانے والی مزنہ کو یقین دلانے کے لیے اتنی لمبی بات ضروری تھی۔

"اتنا بڑا... اتنی عمر کا لڑکا... جوان جہان۔" مزنہ کے دل و دماغ ماننے سے انکاری تھے۔ صادق صاحب اب کی بار بنا کچھ اس وقت تک جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ جب تک کہ مزنہ ڈھیلی ہو کر سرنہ جھکا گئیں۔

"تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ وہ کن حالات میں اس دنیا میں آیا اور کن حالات میں یہاں تک پہنچا ہے۔ تمہاری یہ بے جا تفتیش اور تشویش، فضول کی حیرانگیاں اسے پشیمان بھی کرسکتی ہیں۔ اور حسیب کی ناراضی کا سبب بھی بن سکتی ہیں۔ اس لیے آئندہ خیال رکھنا۔"

"جی۔۔۔ میں کھانا لگا دوں۔"
"پہلے دو چار گھڑی ان کے پاس بیٹھو۔ ان سے ان کے بارے میں مسیب کے بارے میں بات کرو تسلی دو کچھ۔ وہ یہاں کھانا کھانے نہیں آئے ہیں۔" صادق کا انداز ملامت آمیز تھا۔
"اور ہاں۔۔۔ ماہا کا ذکر مت کرنا۔ میں یہ ٹاپک کھانے کے بعد چھیڑوں گا ورنہ عین ممکن ہے وہ لوگ ٹھیک سے نہ بات کر سکیں نہ کھانا کھا سکیں۔" واپس ڈرائنگ روم تک جاتے جاتے مزید پوری طرح اپنے شوہر کی فراست کی قائل ہو چکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کافی سے زیادہ رات گزرنے کے بعد جب اس کی آنکھیں نیند سے بالکل بند ہونے کو تھیں تب بھی موبائل اسکرین خاموش پڑی تھی۔
اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسکرین کو گھورا اور آنکھیں موند لیں۔ دوسری جانب دو آنکھیں بے بسی سے اپنے سیل فون کو گھورتی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر چند لمحوں بعد وہ نظریں ایک بوڑھے وجود پر جم گئیں۔ بتول نے اپنا دوسرا پیر دبوانے کے لیے اسے بٹھایا تھا اور اب تک وہ پوری طرح نیند میں جا چکی تھیں لیکن جونہی معراج نے ہاتھ ہٹا کر پلنگ سے اترنا چاہا وہ فوراً ہوشیار ہو گئیں۔
"ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ ٹھیک سے دبا۔" انہیں جانے کیسے نیند میں پتا چل گیا۔ معراج جاتے جاتے ٹھہر گیا۔ آدھے گھنٹے میں لگاتار تیسری کوشش کے بعد اسے رہائی ملی لیکن تب تک دوسری طرف انتظار کی کیفیت نیند کی میٹھی آغوش میں سر رکھ چکی تھی اس نے گہری سانس لے کر فون رکھ دیا۔
مسلسل تین دن تک بتول کا معمول، معراج کی ناکام کوششیں اور عفت کا انتظار لاحاصل ہی رہا۔ چوتھے دن شاید بتول کو اس کی حالت پر رحم آ گیا انہوں نے جلدی چھوڑ دیا۔
معراج ان کے پاس سے اٹھا تو خیال تھا کہ عفت بھی اسی کی طرح بے تابی سے فون کے انتظار میں جاگ رہی ہو گی، لیکن دوسری طرف بیل جاتی رہی اور جب وہ بالکل مایوس ہو کر لائن کاٹنے والا تھا تب ریسیور سے عفت کی آدھی سوئی آدھی جاگی آواز ابھری۔
"ہیلو عفت! کیا ہوا سو گئی تھیں کیا۔"
"جی۔۔۔"
"کیوں۔" اسے تعجب ہوا اور اس کے تعجب پر عفت کو۔۔۔
"کیوں۔۔۔ کیا مطلب۔ کیا آج بھی خوار ہونے کے لیے جاگتی۔" معراج کے لب مسکرا اٹھے۔
"اس کا مطلب تم اتنے دن سے میرے فون کے انتظار میں تھیں۔"
"جی نہ صرف انتظار میں بلکہ بہت شدت سے انتظار میں۔۔۔" اس کی آواز میں محبت بھری شوخی نہیں بلکہ بے حد سنجیدگی تھی۔ معراج چند لمحے اس کا انداز بوجھتا ہوا رک سا گیا۔
"خیریت ہے۔"
"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ آپ کی بہنیں آئی تھیں امی سے رخصتی کی بات کرنے۔" عفت اسی سنجیدگی سے بات بڑھاتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس موضوع پر معراج سے کھل کر بات کرے گی۔
"میرے یہاں کوئی کماؤ پوت بھائی نہیں بیٹھے۔ نہ میرا اپنا کوئی خاص ذریعہ آمدنی ہے۔ ابا کی پنشن سے عزت سے گزارا ہو رہا ہے۔ یہی بہت ہے اور دوسری بات یہ کہ سب ہی والدین جہیز کے نام پر لڑکیوں کو کچھ نہ کچھ تو دیتے

ہی ہیں۔"
"تو پھر کس بات کی ٹینشن ہے۔ جو ہو سکے کر لینا۔" معراج کے لاپروا لہجے سے عفت کو دھچکا سا لگا۔
"یعنی۔۔۔ آپ کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔"
"میرے نزدیک ان فضول باتوں کی کوئی اہمیت نہیں جن کا کوئی سر پیر سرے سے ہو ہی نا!" عفت جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہی رہی اور جب یہ خاموشی طول پکڑنے لگی تو معراج اکتا گیا۔
"اب خاموش کیوں ہو گئیں تمہیں بری لگی ان کی بات۔ میں سوری کر لیتا ہوں بس۔"
"بری لگنے کی بات نہیں ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بات کرے۔
"تو پھر۔۔۔ کیا بات ہے کھل کے کہو نا!"
"میں نہیں چاہتی کوئی ہماری خاموشی کی وجہ سے لمبی چوڑی امیدیں باندھ لے کیوں کہ امیدیں ٹوٹتی ہیں تو رستے کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔"
"رشتے اعتبار اور اعتماد سے بنتے ہیں۔ امیدوں سے نہیں۔"
"پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اگر آپ کی امی اور بہنوں کو کسی لمبے چوڑے جہیز کی خوش فہمی ہے تو وہ دور کر لیں۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔ معراج خاموش سا ہو گیا۔
"دیکھو عفت۔۔۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا اور بھائی ہوں اور میری جو شادی پہلے ہوئی تھی اماں نے ان لوگوں کو سب سامان واپس بھجوا دیا ہے۔"
"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں کہ انہیں اس لیے مجھ سے ٹرک بھر کے سامان چاہیے۔"
"پاگل ہو گیا تم۔۔۔ میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ انہیں ان مادی اشیا کا لالچ نہیں ہے جب انہوں نے گھر میں رکھا ہوا سامان واپس بھجوا دیا حالانکہ اس کی ڈیتھ کے بعد سارا سامان میرا تھا میرا حق تھا' لیکن پھر بھی انہوں نے پروا نہیں کی تو اب کیوں کریں گی وہ ایسا۔" عفت خاموش ہو کر سوچ میں پڑ گئی۔ معراج یا تو واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا یا اس کی بات سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔
"بہر الحال۔۔۔ میں نے ان کی باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں اور میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ۔۔۔" وہ رک سی گئی۔
"میں نے ان کی باتوں سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔"
"تو پھر میری بھی ایک بات سن لو۔" معراج کو اس کی سنجیدگی اور اس کی بات دونوں ہی ناگوار گزریں۔
"اتنی جلدی' اتنی بدگمانی کو دل میں جگہ دینے سے بھی رشتوں پر فرق پڑتا ہے۔" فون عفت کان سے لگا رہ گیا لائن بے جان ہو گئی اور شاید وہ خود بھی۔۔۔

✡ ✡ ✡

مون سون گزرنے کے بعد بادلوں نے شہر کا رخ کیا تھا۔ دن بھر ابر آلود موسم میں چلتی ٹھنڈی ہوائیں دل و دماغ کو سرشار کیے رکھتی تھیں۔ اس روز بھی موسم ایسا ہی خوش گوار تھا۔ اسی لیے وہ وارڈ بوائز کی مدد سے حسیب کو ویل چیئر پر بٹھا کر باہر لان میں نکل آئی۔ اس کے زخم بے شک گہرے تھے' لیکن خدا کے فضل سے کوئی بھی ہڈی ٹوٹنے یا فریکچر سے محفوظ رہی تھی۔ اتنا کچھ ہو جانے اور سہ لینے کے بعد ایک شکر گزاری کی کیفیت اس کے روم روم میں بستی اسے پرسکون کیے رکھتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی وہ دور نصب ایک سنگی بنچ کے نزدیک لے گئی۔ پھر خود سامنے آکر بینچ پر بیٹھ گئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے کپڑوں کا ملگجا پن صاف نمایاں تھا ایسی ہی

نمایاں تھکن زدہ اس کی آنکھیں اور چہرہ تھا پھر بھی سامنے آتے ہی حسیب کتنی دیر تک اسے دیکھے گیا۔ یہاں تک کہ وہ نروس سی ہوگئی اور اس کا دھیان ہٹانے کو پوچھنے لگی۔

"کیسا لگ رہا ہے۔"

"خواب سا۔" حسیب کا لہجہ بھی کمزور تھا اور آواز بھی دھیمی

"میں نے موسم کا پوچھا ہے۔" اس نے ہنس کر آس پاس نگاہ ڈالی۔ حسیب بھی یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"سب کچھ خواب کے جیسا ہے۔ میرا بچ جانا۔ تمہاری موجودگی، توجہ محبت... تمہارا ساتھ اور یہ موسم سب کچھ۔"

"یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ آپ یقین کرلیں۔"

"یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" اس کا چہرہ پل بھر میں رنگ بدل کر اداس سا ہو گیا۔ وہ اب گود میں دھرے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔

"کیوں جی نہیں چاہتا۔"

"کیوں کہ بعض اوقات انسان کو حقیقت سے نظریں ملا کر شرمندگی کے سوا کچھ اور ملتا جو نہیں۔"

"شرمندگی... کیسی شرمندگی۔" ماہا الجھ سی گئی۔ البتہ اس کے ہونٹ اب بھی مسکرا رہے تھے۔

"وعدہ وفا نہ کرنے کی شرمندگی۔"

"پھر تو شرمندہ مجھے ہونا چاہیے۔ میں نے زندگی بھر آپ کا خیال رکھنے اور ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا تھا اور میں اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی۔" اس نے نظریں جھکالیں۔ وہ واقعتاً شرمندہ تھی۔

"تمہاری شرمندگی بجا ہے لیکن میں... میں صرف تم سے شرمندہ نہیں ہوں۔ کوئی اور بھی ہے میری زندگی میں جس کا واحد سہارا میں تھا اور... جس کا خیال رکھنے کا وعدہ کیا تھا میں نے زندگی بھر کے لیے۔" ماہا کا منہ کھل گیا۔ حسیب کس کی بات کررہا تھا اور کون سے وعدے وفا نہ کرنے کا کہہ رہا تھا۔ موسم کی ساری خوب صورتی جل کر راکھ ہو گئی۔

"جانے کسی نے اس کی خبر بھی لی یا نہیں۔ پتا نہیں اس کی حالت کیسی ہوگی۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں ہو گا کہ میں کتنے دن ہوش سے بیگانہ پڑا یہاں زندگی اور موت کی جنگ لڑتا رہا۔ کوئی تھا بھی تو نہیں جو اسے خبر کردیتا۔" ماہا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ حسیب پژمردگی سے جانے اور بھی کیا کیا کچھ کہتا رہا۔ ماہا کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"میرا خیال ہے ہمیں اب اندر چلنا چاہیے۔" وہ تھک کر خاموش ہوا تو اس کے پاس کہنے کو صرف یہی ایک بات رہ گئی۔

"ماہا... میرا ایک کام کرو پلیز۔" حسیب نے ملتجی انداز میں اسے کھڑے ہوتا دیکھ کر اس کی کلائی تھامی تھی۔ ماہا ایک عجیب سے امتحان میں پڑ گئی۔

✡ ✡ ✡

گرما گرم آلو کے پراٹھوں کی خوشبو فضاؤں میں پھیلی بھوک کی شدت میں اضافہ کررہی تھی۔ حسب معمول نائلہ کچن میں مستعدی سے کام نمٹا رہی تھی۔ اس نے صبح صبح آفس کے لیے نکلنے سے پہلے حدید کے لیے ناشتے کا مینو ترتیب دیا تھا جس میں ہمیشہ کی طرح انس نے آکر شامل ہو جانا تھا، لیکن انس کے تیار ہو کر نیچے آنے سے پہلے ہی سوہا چلی آئی۔

"پلیز ذرا تم ایک چولہا خالی کردو۔ مجھے انس کے لیے بھی ناشتا بنانا ہے۔" اس نے ایک لمحے ٹھٹک کر اس اہتمام کو دیکھا۔ پھر مصروف سے انداز میں بولتے ہوئے آگے آئی۔ مقصد صرف یہ جتانا تھا کہ اس ہنگامی صورت حال میں نائلہ کے اہتمام سے بنائے گئے ناشتے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔

"ان کے لیے الگ سے بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے بنایا ہے نا! تم انس کو بلالو نیچے۔۔۔ بلکہ تم خود بھی۔۔۔" مصروف سی بولتی ہوئی نائلہ کی بات سوہا نے سوکھے منہ سے کاٹ دی۔

"نائلہ پلیز۔۔۔ تم یہ مہربانیوں کا سلسلہ یہیں ختم کردو تو بہتر ہوگا۔" اس کا انداز اس قدر خشک تھا کہ توے پر جلتا پراٹھا چھوڑ کر نائلہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہارا اس طرح بڑھ بڑھ کے انس کے لیے کام کرنا نہ صرف مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں بلکہ اس طرح کی اوچھی حرکتوں سے میرے اور ان کے تعلقات بھی خراب ہوتے ہیں میں اب تمہاری وجہ سے اپنی زندگی میں مزید کوئی گڑبڑ نہیں چاہتی۔" کچن کی طرف آتے حدید کے کانوں میں بھی سوہا کے الفاظ پڑ چکے تھے۔ وہ دروازے کی دہلیز پر ہی ساکت ہوگیا۔

"آج ایک جگہ سے امید بندھی ہے۔ انٹرویو کے لیے جارہے ہیں۔ آپ دعا کیجئے گا حدید بھائی۔" لمحے بھر میں حدید کو دیکھتے ہی سوہا کا لہجہ اور انداز سب بدل گیا۔ نائلہ تو نائلہ خود وہ بھی اپنی اس کایا پلٹ پر حیران رہ گئی اور کچھ یہ تھا کہ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ' حدید ان کی باتوں کا کچھ حصہ سن چکا ہے۔ اس لیے جلدی سے پلٹ کر چائے کا پانی چڑھانے لگی۔

☼ ☼ ☼

کئی گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے صادق بھائی کو فون کرکے ساری بات بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی یہاں پاکستان آئے اور حسیب سے ملے۔" ماہا کا لہجہ بے حد حتمی تھا۔ صادق خود بھی چور سے بن گئے۔

"لیکن کیوں بیٹا!" ماہا ان کے لیے بیٹیوں جیسی ہی تھی۔

"اس عورت تک تو ٹھیک ہے کیوں کہ حسیب کا اور اس کا رشتہ دوستی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا' لیکن وہ بچہ۔۔۔" وہ دانستہ رک گئے۔

"جی کیا۔۔۔ بولیں میں سن رہی ہوں۔" اس کا چہرہ حدت پکڑنے لگا۔

"وہ بچہ تو حسیب کو ہی اپنا باپ کہتا اور مانتا ہے اور اب تک تو اس تک حسیب پر گزرنے والے حادثے کی خبر پہنچ بھی چکی ہے۔ اگر وہ آجائے گا تو ہم اسے روک نہیں سکتے بیٹا۔ وہ حسیب کی اولاد ہے اور حسیب نے اسے اون کیا ہے۔" ماہا چند لمحوں کے لیے چپ سی رہ گئی۔

"آپ میری بات مانو۔۔۔ اسے حسیب سے ملنے دو۔" کہنا کتنا آسان تھا۔ اس نے کرب و اذیت سے آنکھیں بند کرلیں۔

"آپ کے لیے یہ کہنا آسان ہے صادق بھائی' لیکن میں۔۔۔ میں اپنے دل کا کیا کروں۔ آپ اسے میری حسیب سے بے انتہا محبت سمجھ لیں کہ مجھے اس میں بٹوارہ منظور نہیں کسی بھی صورت۔۔۔"

"شوہر کا بٹوارہ تو دوسری بیوی کرتی ہے بیٹا۔ اس کی اولاد نہیں۔" ماہا کو لگا وہ ابھی بات کے اختتام پر ہلکے سے مسکرائے ہوں۔

"میرا دل نہیں مانتا۔" وہ جیسے بے بس سی ہوگئی۔

"دل نہیں مانتا تو دل کو سمجھاؤ۔ یاد رکھو۔ دل اور دماغ میں زندگی کے نوے فیصد حصے میں جنگ ہی چلتی ہے اور یہ جنگ جتنی زیادہ دماغ جیتے گا۔ تم اتنے ہی فائدے میں رہو گی۔ اپنے دل کو دماغ کا تابع بناؤ۔ دماغ کو دل کا تابع بنانے سے نقصان تم خود ہی اٹھاؤ گی۔" ماہا کے پورے وجود پر برف سی گرنے لگی۔ ایک سرد اور جامد کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لینا شروع کردیا۔

"اپنے ذہن سے پوچھو۔ یوں زور زبردستی سے تم کتنے دن ان دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر سکو گی۔ ان شاء اللہ ایک دن حبیب صحت یاب ہو گا تب کیا ہو گا۔ سب سے پہلے وہ اسی سے ملنے جائے گا نا! اس کا وہ پیارا اور عزیز سگا بیٹا جو اس سے دور ہے اب تک۔ تم تو اس سے مل لیں۔ اس کے پاس بھی آگئیں' لیکن وہ ولید۔ وہ تو ابھی تک باپ سے ملنے کو ترس رہا ہے اور بعد میں جب حبیب کو پتا چلے گا کہ ان دوریوں کا سبب تم تھیں تو سوچو اس کے دل میں تمہاری کتنی عزت رہ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر تم دل کو ذرا سا سمجھا بجھا کر اس بات کے لیے راضی کر لو تو یہ چیز حبیب کے دل میں تمہاری اہمیت میں اضافہ ہی کرے گی۔" صادق بولتے بولتے تھک سے گئے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ انہیں مزنہ کی طرح ماہا کو بھی ساری صورت حال اور اونچ نیچ نئے سرے سے سمجھانی پڑے گی۔ اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے ایک آخری پتا پھینکا۔

"اگر میری بات مانو تو آج رات گھر چلی جاؤ اور کل کا دن گھر پر رک کر آرام بھی کر لو اور اپنی امی اور بہن سے اس ٹاپک پر مشورہ بھی کر لو۔ تھکے ماندے ذہن سے انسان ویسے بھی کوئی ڈھنگ کا فیصلہ نہیں کر پاتا۔" ماہا نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔ اس وقت تو اس نے یونہی حامی بھرلی تھی' لیکن شام ہوتے ہوئے جب صادق بھائی سچ مچ اسے لے جانے کے لیے آگئے تو اپنے ٹوٹتے اعصاب کو ذرا آرام دینے کے لیے اس نے بھی رخصت سفر باندھ ہی لیا۔ اس بار صادق بھائی کے ساتھ ساتھ حبیب کی حمایت بھی شامل اصرار تھی۔

"میں پھر کل۔۔۔ کل شام تک آجاؤں گی۔" چلتے چلتے اس نے حبیب کا ہاتھ تھام لیا۔ کمرے میں اس وقت وہ دونوں ہی تھے۔

"دل نہیں چاہتا اب ایک پل کو بھی آپ سے دور جانے کا۔" اس کے لہجے میں سچائی کی چھب تھی اور آنکھوں میں محبت کا ایک سمندر موجزن تھا۔ ایک ایسا سمندر جو خود بھی صدیوں سے پیاسا لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

انس انٹرویو دے تو آیا تھا' لیکن زیادہ پرامید نہیں تھا۔ شام کی چائے بنا کر سوہا چھت پر ہی لے آئی۔ بادلوں کی راجدھانی قائم تھی۔ کہیں کہیں گھروں میں لگے درخت تیز ہوا سے جھوم رہے تھے۔ اس ٹھنڈی ہوا اور ابر آلود موسم میں دل کو نئی نئی گدگداہٹیں سوجھتی ہیں۔ یہی حال سوہا کا تھا۔ بلاوجہ میں مسکرائے جانا' شوخی اور شرارت بھری باتیں کرنا۔ چھیڑ چھاڑ اور پر لطف چٹکلے۔ اچھے خاصے بور مزاج بندے بھی اپنا خول تڑخا کر باہر نکل آتے ہیں وہ تو پھر تھی ہی شوخ و چنچل سی' لیکن انس۔۔۔ چائے کا کپ آدھا خالی ہو چکا تھا اور وہ دور آسمان پر منڈلائے طائروں پر نگاہ جمائے جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

"کیا بات ہے۔ آج بڑے چپ چپ ہیں۔" انس جواب دیئے بنا یونہی چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ سوہا نے چند لمحے تو اس کے جواب کا انتظار کیا' پھر خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کرتی منڈیر سے ہٹ کر اندر کی طرف دیوار سے لگا کر رکھے گئے بینچ پر جا کر بیٹھ گئی۔

"جاب کی وجہ سے پریشان ہیں۔" انس ابھی بھی وہیں کھڑا تھا۔ سوہا کو اس کی خاموشی الجھانے لگی۔

"کیوں پریشان ہو رہے ہیں ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔" اب کی بار اس نے محض سر ہلایا۔ سوہا تیزی سے اٹھ کر واپس منڈیر تک آئی تو دور کسی گھر کی چھت پر چند ایک رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔

"اچھا... ا... اب سمجھی... میں جناب کی اداسی دور کرنے کو تسلیاں دے رہی ہوں اور یہاں پر آنکھیں سینکی جا رہی ہیں۔" اس نے جان کر انس کو اس گمبھیر خاموشی سے نکالنے کی خاطر یہ حربہ آزمایا تھا۔ انس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ ایک دم جھینپ سا گیا۔

"کیا پاگل ہو گئی ہو۔ تمہیں لگتا ہے میں یہاں کھڑا ہو کر یہ حرکتیں کر رہا ہوں۔"

"پہلے نہیں لگ رہا تھا، لیکن اب لگ رہا ہے۔" اس نے آنکھیں نچائیں۔

"دماغ خراب ہے۔ کیا محلے سے پٹوا کر نکلواؤ گی ہمیں۔ مطلب مجھے اور میرے بھائی کو۔ پورے محلے کی کڑی چوکیداری ہوتی تھی ہمارے گھر اور ہماری حرکتوں پر... چھڑے تھے نا! کسی محلے والی سے چکر نہیں چلا سکے۔" وہ اپنے سابقہ موڈ سے باہر آچکا تھا۔ بڑے ہی دکھ بھرے انداز میں دلی حسرت بیان کی۔ سوہا ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ انس ہنستی ہوئی سوہا کو تکنے لگا۔ اس کی ہنسی تھمی تو حیرت سے پوچھنے لگی۔

"ایسے کیا دیکھنے لگے۔"

"سوچ رہا تھا کہ تم اگر اسی طرح ہنستی رہو تو کیا ہی بات ہے۔"

"آپ ہمیشہ ایسے ہی باتیں کریں گے تو ہنستی ہی رہوں گی نا!"

"ہم... م... م۔" اس نے چائے کا خالی کپ رکھ کر پھر سے منڈیر پر ہتھیلیاں دھریں۔

"ہر کام کا، چیز کا اور بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ وہ وقت نکل جائے نا! تو نہ بات کی وہ اہمیت رہتی ہے نہ چیز کی قدر اور نہ کام کا فائدہ... ہر چیز اپنے وقت اور موقع محل کے حساب سے اچھی لگتی ہے۔" اس کا اداسی میں گھرے لہجے میں کسی یاد کی چنگاری تپش دے رہی تھی۔

"تو کیا محبت بھی وقت گزرنے کے بعد بے فائدہ ہو جاتی ہے۔" سوہا نے جانے کیوں پوچھ لیا۔ شاید اس کا دل مضطرب سا ہو گیا تھا۔

"اگر وقت پر اظہار نہ کیا جائے... تو شاید..."

انس پریشان تھا یہ کہنے کی ضرورت تھی نہ بتانے کی۔ پھر بھی اس نے فوری طور پر اس کی دلجوئی کی خاطر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن ٹھیک اسی وقت اسے زور کی ابکائی سی آگئی۔ یوں لگا پل بھر میں جیسے کلیجہ باہر کو الٹ پڑے گا۔ وہ بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھتی اندر کمرے میں بھاگی۔ انس بھی تشویش سے اسے دیکھتا اس کے پیچھے تھا۔ بظاہر

اب چھت پر خاموشی اور اندر کمرے میں آوازیں تھیں، لیکن چھت سے جڑی سیڑھیوں پر کوئی اور بھی تھا جو خاموش کھڑا چند باتیں سن چکا تھا۔
اس نے ہوا کے دوش پر لہراتا آنچل مٹھی میں دبوچا اور سسکتے دل کو تھپکتی واپس سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کے کانوں میں ایک آواز کی گونج تھی۔
"اگر وقت پر اظہار نہ کیا جائے تو... شاید..."
"شاید..."
"شاید..."

☆ ☆ ☆

صادق نے ماہا کو گھر چھوڑتے ہی واپس اپنے گھر کا رخ کیا۔ وہ چاہنے کے باوجود ولید اور اس کی ماں کی آمد کی پیشگی اطلاع نہ حبیب کو دے سکے تھے۔ نہ ماہا کی موجودگی کے باعث اسے اشاروں میں ہی کچھ بتا سکے تھے۔ اب وہ ولید اور ڈرنی کو حبیب سے ملوانے لے کر جا رہے تھے۔ ولید بے حد بے تابی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا مطلوبہ کمرے کے سامنے جا رکا۔ پھر اپنے بے ترتیب تنفس کو ذرا ہموار کیا اور بے حد آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ حبیب کو اسی وقت ایک میل نرس اس کے کہنے پر تکیے کے سہارے بیڈ پر، لیٹے سے بٹھا کر گیا تھا اور وہ اس وقت ایک دن پرانا باسی اخبار عدم دلچسپی سے یونہی الٹ پلٹ کر رہا تھا تب ہی دروازہ کھلا۔ اس نے بے دھیانی میں نظریں اٹھائیں اور پھر اس کی نظریں وہیں دروازے پر ساکت رہ گئیں۔ آنے والے شخص کو بھی شاید اسے اس مخدوش حالت میں ملنے کی توقع نہیں تھی۔ باپ بیٹا دونوں کا منہ بیک وقت کھلا رہ گیا۔
"ولی... !میرا بیٹا۔"
"پاپا۔" ولید کی آواز البتہ پورے کمرے میں واضح طور پر سنائی دی تھی۔ اگلہ لمحہ بے حد جذباتی تھا۔ وہ آگے بڑھا اور حبیب کی کھلے بازوؤں میں بے تابانہ سما کر سسک پڑا۔
"آپ کہاں چلے گئے تھے اتنے دن... یہ سب کیا ہوا، کیسے ہوا...؟" حبیب اسے خود سے لگائے ہولے ہولے سہلاتا اور تھپکتا رہا۔ اس کے کانوں میں ننھی منی پیار بھری سرگوشیاں کرتا رہا۔
"میں ٹھیک ہوں میرے بچے... اب تمہیں دیکھنے کے بعد تو بالکل فٹ فاٹ ہو گیا ہوں۔"
"میری یاد آتی تھی تو کیا جب بھی ایسے ہی روئے تھے۔ جسٹ لائیک آ بے بی بوائے... ہم... م... م..."
دھیرے دھیرے اس کی یہ سرگوشیاں، ولید کے کانوں میں مدھ ٹپکاتی اس کے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدلتی چلی گئیں۔
"اب بتاؤ... سب سیٹ ہے ینگ بوائے۔"
"سب سیٹ تھا۔ اب نہیں ہے... مجھے جب آپ کا پتا چلا تو سمسٹر اسٹارٹ ہونے والا تھا اور میں سب چھوڑ کر پاکستان آگیا۔" اس کا لہجہ ندامت آمیز تھا۔ حبیب بنا کچھ کہے اسے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا ولید کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔
"میں نے کوشش کی تھی تیاری کرنے کی، لیکن... مجھ سے پڑھائی نہیں کی گئی۔ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پاسیبل نہیں تھا میرے لیے۔ میری جان آپ میں بند ہے میں... میں چاہ کر بھی نہیں کر سکتا تھا پاپا۔ آئی ایم سوری۔"
اس کا سر اور نظریں جھک گئیں۔
"کوئی بات نہیں... آئی انڈر اسٹینڈ۔" حبیب نے ایک بار پھر بازو وا کر دیئے اور وہ اس کے سینے سے آن لگا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ دوبارہ کھلا اس وقت اس میں جس ہستی نے قدم رکھا اس نے حبیب کو صرف حیرت نہیں بلکہ ناگواری اور تنفر کی پستیوں میں دھکیل دیا۔
حبیب کے چہرے پر ڈزنی کو دیکھ کر جو ناگواری پھیلی تھی اس سے ولید اور خود ڈزنی بھی ایک دوسرے سے بری طرح شرمندہ ہوگئے تھے۔
"میں چلی جاؤں گی واپس۔ تمہاری زندگی میں مزید دخل اندازی کیے بغیر۔ فی الحال تم میری بات سن لو۔ میں تمہارے ہی کام سے آئی ہوں۔" وہ اپنا ہینڈ بیگ کھولتی ہوئی آکر بیڈ کی نزدیکی بنچ پر بیٹھ گئی۔ ولید بھی حبیب کے برابر سے اٹھ کر ڈزنی کے برابر میں جا بیٹھا۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر ایک فائل نکالی۔
"تمہارے منیجر نے یہ کچھ کاغذات بھجوائے ہیں میرے ہاتھ۔ اس میں تمہارے فلیٹ کے پیپرز بھی ہیں اور دو ایک کچھ اور اہم ڈاکومنٹس بھی ہیں۔" حبیب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات سننے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے فائل بڑھائی حبیب نے ہاتھ بڑھا کر تھامی اور اس کے ورق الٹنے لگا۔
"جب تمہارے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی تو منیجر کے لیے کلائنٹس کو مطمئن کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لیے تمہارے وہاں بزنس کی ساکھ اور تمہارے نام پر بہت برا اثر پڑا۔ اس لیے تمہارے منیجر نے' تمہارے بہنوئی کے مشورے پر ہی سب کچھ از خود وائنڈ اپ کرکے تمہارے بزنس میں لگا سارا پیسہ بینک میں جمع کروانے کی نیت سے یہ ڈاکومنٹس پاکستان بھجوائے تھے۔ تمہارے کومے میں چلے جانے کی خبر سن کر تو ویسے بھی سب کی امیدیں ہی ختم ہوگئی تھیں' لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم فوراً" ہی کومے سے باہر آگئے۔" وہ بے حد ٹھہر ٹھہر کر بہت ہموار آواز میں بات کر رہی تھی۔ اس کی رواں اور شستہ انگریزی ملی ٹوٹی پھوٹی اردو سمجھنے میں حبیب کو تو نہیں البتہ ولید کو کافی مشکل پیش آرہی تھی۔
"ان میں تمہارے کچھ کلائنٹس پارٹنرز کے ساتھ نیکسٹ ایئر کے کانٹریکٹ پیپرز بھی ہیں اور تمہارے فلیٹ کی ملکیت کے بھی۔۔۔ تم نے پاور آف اٹارنی اپنے بعد اپنے بیٹے ولید کو سونپ رکھا تھا' لیکن ولید ابھی اٹھارہ سال کا نہیں۔ اس لیے انہوں نے میرے ہاتھ صادق بھائی کے پاس پاکستان بھجوائے تھے۔ صادق تمہارے۔۔۔ برادر ان لاء۔۔۔ مگر اب تم خود سب معاملات دیکھ لو۔۔۔ اور آگے فیصلہ کرلو۔۔۔ اگر پاکستان میں رہنا چاہو تب بھی اور اگر واپس جانا چاہو تب بھی۔۔۔" ولید اس دوران خاموشی سے سب سنتا رہا۔ حبیب نے تھوڑی دیر ان کاغذات کا مطالعہ کیا پھر فائل بند کرکے انگوٹھے اور انگلی سے اپنی بند آنکھوں کو مسلنے لگا۔
"ابھی آپ کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے ٹائم ہے پاپا۔ پلیز۔ آپ اسٹریس مت لیں۔" ولید بے ساختہ بول اٹھا۔ ڈزنی نے اس کا بے تاب انداز دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہیے۔ ولید تو تمہارے پاس رکے گا' لیکن میری یہاں موجودگی کوئی پرابلم بھی کری ایٹ کرسکتی ہے۔ تمہیں دیکھنے اور یہ کام کرنے آئی تھی۔ تمہیں سروائیو کرتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گڈ بائے۔" اس نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا۔ پلٹ کر پیار سے ولید کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں بہت دھیرے سے بکھیر دیا۔ پھر حبیب کو دیکھے بغیر باہر آگئی۔ اسپتال کے لان میں صادق بھائی اپنے بچوں کے ساتھ مل گئے۔ واپسی کے سفر میں وہ بالکل اکیلی تھی۔ کھڑکی سے باہر دوڑتے بھاگتے منظروں پر نگاہیں دوڑاتی وہ حبیب کی زندگی میں اپنی دوبارہ آمد کا مقصد سوچتی رہی تھی۔ شاید اسے اسی کام کے لیے اس کی زندگی میں آنا تھا۔ اور بس۔۔۔ ماں۔۔۔ باپ اور بیٹے کی اس تکون کا ہر کونا ٹوٹا ہوا تھا۔ محبت کا بھی۔۔۔ رشتے کا بھی اور شاید احساس کا بھی۔ اس نے دھیرے سے اپنی نم آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

ذرا سی دیر میں اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ واش روم سے نکل کر بیڈ تک چل کر آنے کے بعد وہ سیدھی لیٹ گئی۔ حلق میں ابھی تک کھنچاؤ سے درد ہو رہا تھا اور آنتیں یوں لگتا تھا باہر ہی آگریں گی۔

گو کہ وہ اس کیفیت سے پہلے بھی گزری تھی۔ لیکن ہر بار کمزوری کا احساس سوا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ایک احساس اور بھی تھا۔ جو کمزوری پر پوری طرح غالب تھا۔ اور وہ تھا خوشی کا احساس، جس کے زیر اثر اس کے لب ناتوانی میں بھی دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

اس نے کمرے میں داخل ہوتے انس کو دیکھا۔ جس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور گلاس تھا۔

وہ خاموشی سے اس کے نزدیک بیٹھ کر گلاس میں پانی ڈالنے لگا۔ گلاس بھر کے سوہا کو دیتے سے اس نے سوہا کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور بے ساختہ نظریں چرالیں۔ سوہا اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور الجھن محسوس کر چکی تھی۔ اس لیے کچھ کھٹک سی گئی۔

"کیا ہوا کیا سوچ رہے ہیں۔"

"وامٹ کیوں ہوئی ہے تمہیں۔ تم نے کچھ ایسا ویسا کھایا تھا کیا۔" سوہا کا منہ کھل گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی انس نے جان بوجھ کر تجاہل برتا ہے۔

"میرا خیال ہے، ہم دو سے تین ہونے جا رہے ہیں۔" اس کے انداز میں شوخی تھی۔ انس نے مسکرا کر دھیرے سے دائیں ہاتھ سے اس کا گال تھپتھپایا۔ لیکن اس ردعمل میں جو زبردستی کا عنصر پوشیدہ تھا وہ اس کی نگاہوں سے مخفی نہ رہ سکا۔

"کیا بات ہے، آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔"

وہ تعجب سے دور ہٹی۔ پھر بولتے ہوئے اس کی داہنی طرف ہی بیڈ کے کنارے پر سر رکھ کر ترچھی لیٹ گئی۔ انس کا چہرہ اب سیدھا اس کی نگاہوں کی زد میں تھا۔

"نہیں خوشی تو ہوئی ہے لیکن ـــــ" اس کا لہجہ خود اس کی بات کی نفی کر رہا تھا۔

"انس! ـــــ آپ خرچے کی وجہ سے پریشان ہیں۔" اس نے انس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ انس کی خاموشی جواب دے رہی تھی۔

"آنے والا تو اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے۔"

"سوہا! ـــــ میرا خیال ہے اس سلسلے کو فی الحال یہیں روک دو تو اچھا ہے۔" اس نے نظریں ملائے بغیر سوہا کی سانس روک دی۔

سوہا اس کا مطلب سمجھنے پر جتنی تیزی سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔ وہ اتنی ہی تیزی سے باہر نکل گیا۔

سوہا منہ کھولے ہکا بکا سی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ارے ماہا تم اس وقت!"

کچن میں عفت اور نائلہ ہی تھیں۔ ماہا کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ دونوں رات دیر تک جاگنے کا پروگرام بنا بیٹھی تھیں۔ یقیناً" دونوں کو اتنے دن کی جمع کی ہوئی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرنی تھیں۔ ماہا کو سوہا کی کمی ایک دم بہت کھلی۔

"چائے پیو گی۔ میں اپنے اور نائلہ کے لیے بنا رہی ہوں۔"

"رہنے دو تم تو شاید بنا چکی ہو۔" وہ پھیکے پن سے مسکرائی۔
"نہیں اس میں کون سی مشقت لگتی ہے۔" عفت کے بجائے نائلہ نے کہتے ہوئے کیتلی میں پانی انڈیلا عفت دوبارہ سے پتی ڈالنے لگی۔
"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔" وہ یونہی بے خیالی میں ایک ہاتھ چوکھٹ پر رکھے عفت کو دیکھ رہی تھی۔ جب نائلہ کے پوچھنے پر عفت بھی چونک کر اسے دیکھنے لگی اور وہ خود بھی کسی گہرے خیال سے باہر آئی۔
"چلو اندر چل کر بیٹھو یہاں گرمی بہت ہے۔" اسے جواب دینے کی الجھن میں پڑتے دیکھ کر نائلہ نے خود ہی بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بنا کچھ کہے پلٹ کر عفت اور نائلہ کے کمرے کی طرف آگئی۔
"اور سناؤ حسیب بھائی کی طبیعت تو بہتر ہے نا اب۔"
"ہاں وہ ٹھیک تو ہیں الحمدللہ لیکن... صادق بھائی نے مجھے گھر بھیج کر اچھا نہیں کیا۔" اسے نائلہ کے پوچھنے پر ہی ایک دم یاد آیا کہ وہ کیوں اپ سیٹ تھی۔
"کیوں۔" نائلہ نے اسے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے دیکھ کر قریب رکھا ہوا تکیہ اٹھا کر اسے دیا۔
"کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ خود وہاں رک جائیں گے لیکن، وہ خود بھی گھر چلے گئے۔"
"تو کیا وہ وہاں اکیلے ہیں۔"
"نہیں وہ بتا رہے تھے ان کا کوئی کولیگ یا دوست آیا ہوا ہے دبئی سے ملنے وہ، رک گیا ان کے پاس۔" ماہا پوری تفصیل سناتے ہوئے بھی الجھی ہوئی تھی۔
"اور میں سوچ رہی ہوں کہ ان کا ایسا کون سا دوست ہے، جسے میں نہیں جانتی یا... وہ اتنا قریبی کب سے ہو گیا کہ ملنے آئے اور تیمارداری کو رک جائے۔" عفت نے چائے کی ٹرے لاتے ہوئے اس کی بات سنی۔
"اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔ جو بھی ہو گا۔ ان کا اپنا ہی ہو گا۔" اس نے تو بہت سرسری انداز میں ایک بات کی تھی۔ اس چیز سے بے خبر کہ وہ بات جا کے سوئی کی طرح ماہا کے دل میں چبھ گئی۔
"سنو!" نائلہ کسی دھیان سے چونک اٹھی۔
"ایسا تو نہیں کہ ان کا وہ بیٹا آگیا ہو پاکستان جو..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ماہا کی نظریں چائے کے کپ میں گڑ گئیں۔ اب یہ بات کس طرح زبان زد عام ہو چکی تھی۔ کیا اس نے کبھی سوچا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے کردار کے حوالے سے اس طرح سب سے سنتی پھرے گی۔
دوسری طرف عفت کی کہنی کے ٹھوکے نے نائلہ کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ کیا بات کرنے جا رہی تھی۔
نائلہ خاموش تو ہو گئی لیکن اس کا مقصد کوئی برا نہیں تھا۔ اس لیے اسے محسوس بھی نہیں ہوا۔ ماہا کی البتہ مضطرب حالت میں کچھ اور سنگینی در آئی۔ نائلہ کی تو فطرت اور سوچ میں ٹوہ اور کھوج کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لیے اس کے منہ سے نکل گیا لیکن ماہا جانتی تھی یہ بات سچ بھی ہو سکتی تھی۔
"سنو! تم پریشان کیوں ہو۔ صرف اس وجہ سے۔" عفت نے ہمدردی سے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔
"اگر نائلہ کی بات سچ بھی ہوئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔" عفت نے انجانے میں، ہمدردی کی غلیل میں رکھ کر اسے پتھر کھینچ مارا۔ ماہا نے تڑپ کر اسے دیکھا۔
"کیوں فرق نہیں پڑتا عفت! کسی کے کردار پر لگا داغ اسے چھپانا چاہیے یا پوری دنیا کے سامنے لے کر کھلے عام پھر کر سب کو باتیں بنانے کا موقع دینا چاہیے۔" نائلہ اور عفت اس کی بات سن کر اپنی اپنی جگہ چور سی بن گئیں۔
نائلہ کو تو خیر کیا کچھ یاد نہ آیا۔ لیکن عفت کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی بے اختیار حدید کو یاد کر کے رہ گئی۔ پھر

ایک محتاط اچٹتی نگاہ نائلہ پر ڈالی۔ لیکن نائلہ خود بہت دور سے واپس پلٹی تھی۔ جبھی لہجے کو زبردستی بشاش بنا کر بولی۔

"دفع کرو سارے جھمیلوں کو۔ آج ہم یہ باتیں کرنے نہیں بیٹھے۔ اتنی مشکل سے فرصت ملی ہے۔ کوئی اور بات کرو بے فکری کی، خوشی کی۔۔۔ رہا ان کا سوال تو کل صبح جا کر خود دیکھ لینا کون آیا ہے ملنے۔"

نائلہ بے تکلفی سے بولتی ہوئی پیچھے سرک کر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ اور ماہا نے پہلی بار اس کے کھلے ہوئے وجود پر نظریں دوڑا کر جھلکتی ہوئی بے فکری کو جانچا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔" بے حد سست رفتاری سے کپڑے پریس کرنے کے بعد شرٹ اٹھا کر انس کو دیتے ہوئے اس نے دھیرے سے استفسار کیا۔

"ہاں بہت ضروری ہے۔" وہ ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھا سنجیدگی سے ٹی وی دیکھتا رہا۔ سوہا تھوڑی دیر اس کی طرف شرٹ بڑھا کے کھڑی رہی۔ جب اس نے سوہا کی طرف نہیں دیکھا تو پھر مجبوراً قریب رکھے صوفے پر ڈال دی۔

"میری طبیعت ٹھیک ہے اب۔" وہ جانتی تھی وہ کتنا بودا بہانہ تراش رہی ہے۔

"مجھے مت بتاؤ، مجھے پتا ہے۔" اس سے بحث بیکار تھی۔

مردوں کے اندر دنیا جہان سے زیادہ نثار ہو جانے کے بعد سارے عالم سے بے پروا و بے نیاز بن جانے کی ادا عورت کو کتنا جلاتی ہے۔ شاید مردوں کو اچھی طرح سے اس کا علم ہوتا ہے۔ یہی ان کا وہ ہتھیار ہوتا ہے۔ جس سے وہ عورت کے دل کا شکار کرتے ہیں اور کبھی اس کے اعصاب اور اس کی روح کو گھائل کرتے ہیں۔ سوہا گہری سانس بھر کر تیار ہونے چل دی۔

ڈاکٹر کے کلینک پہنچ کر اپنی باری آنے تک اس کا یہ حال تھا کہ آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

ہر بار وہ بے اختیار آنکھیں مسلنے کے بعد انس کی طرف دیکھتی اور وہ بے نیاز سا بن جاتا۔

ڈاکٹر نے اس کے ٹیسٹ کیے اور چیک کرنے کے بعد کہا۔

"علامات تو پریگننسی کی ہی تھیں، لیکن آپ پریگننٹ نہیں ہیں۔"

"آپ کو پورا یقین ہے کہ میں پریگننٹ نہیں ہوں۔" سوہا نے چونک کر ڈاکٹر کو دیکھا اور پوچھا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا شادی کو" اس نے شفقت سے سوہا کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبایا۔ سوہا کا ہاتھ تو بالکل سرد ہو رہا تھا۔

"دو سال۔۔۔ یا اس سے کچھ کم۔" میں شادی کے بعد پریگننٹ ہوئی تھی پھر میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا اور ۔۔۔ اور میرا بچہ بچ نہیں سکا۔"

"آپ بالکل ٹینشن مت لیں۔ اگر کوئی تشویش یا پریشانی کی بات ہوتی۔ تو آپ کی ڈاکٹر، آپ کو اسی وقت بتا دیتی۔ لیکن، خیر میں آپ کی تسلی کے لیے ایک دو ٹیسٹ لکھ دیتی ہوں۔ یہ کروالیں، لیکن طبیعت سنبھلنے کے بعد او کے۔۔۔"

اٹھنے سے پہلے آخری بار ڈاکٹر کے چہرے پر چمکنے والی حوصلہ افزا مسکراہٹ نے اسے کافی تسلی دی تھی۔ لیکن یہ تسلی اسی شام کافور ہو گئی۔

"چھوڑو بھئی۔ جس کام میں ابھی ہاتھ نہیں ڈالنا۔ اس پر خرچ کر کے کیا کرنا۔" انس نے لاپرواہی سے پرسکرپشن ایک طرف ڈال دی۔

سوہا کے اندر جو تھوڑا بہت جوش و جذبہ ابھرا تھا۔ وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی اس طویل عرصے کی بیروزگاری میں تنگی معاش کے دن آن لگے تھے اور دوسری نوکری کا اب تک کوئی بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔

"اف اللہ" اسے بے حد تنگی اور گھٹن کا سا احساس ہونے لگا۔

☆ ☆ ☆

صادق صبح صبح ہسپتال جانے کو تیار تھے انہیں پہلے ماہا کو پک کرنا تھا پھر اسے ساتھ لے کر ہاسپٹل جانا تھا۔ انہوں نے یہ سوچ کر ماہا کو کال کی تھی کہ فون رضوانہ حسن نے اٹھایا۔

"ماہا تو صبح ہی نکل گئی تھی ہسپتال کے لیے۔"

رضوانہ کے مطمئن لہجے میں دی جانے والی خبر ان کے ہاتھوں کے چڑیاں طوطے سب اڑانے کے لیے کافی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی ولید کو کال کی۔

"ولید بیٹا میں بات کر رہا ہوں صادق' ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ انکل؟" حبیب کو ناشتا کرواتے ہوئے کال لینے والا ولید بے فکری ترک کر کے ایک دم چوکنا ہو گیا۔ دوسری طرف صادق اسے جو کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ماننا ہی تھا کیونکہ بہرالحال فی الحال سب کی بہتری اور بھلائی اسی میں تھی۔

"ٹھیک ہے میں فوراً" نکلتا ہوں۔"

اس کی سمجھ داری نے ایک بار پھر صادق کے دل میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات جگا دیے۔

دوسری طرف حبیب کو اپنی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا پا کر' اس نے مختصراً" سب احوال سنایا اور تیزی سے اپنا والٹ موبائل وغیرہ بیگ میں ڈال کر الوداعی بوسہ دینے کے لیے حبیب کی بانہوں میں سما گیا۔

"بس کچھ ہی دن کی بات ہے بیٹا! پھر یہ دوریاں ہمارے درمیان سے ختم ہو جائیں گی۔ ایک بار میں گھر آ جاؤں پھر تم بھی میرے پاس میرے ساتھ میرے گھر میں رہو گے۔" اس نے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا نوعمر چہرہ تھام کر محبت سے پیشانی پر بوسہ دیا۔

"آئی انڈر اسٹینڈ پاپا! سب کچھ ڈس کلوز ہو جائے گا' ہونا ہی ہے۔ بٹ ہسپتال از ناٹ آ سوٹ ایبل پلیس فار اینی ہیپننگ۔" (ہسپتال کسی بھی مسئلے یا معاملے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔)

اس کے تسلی آمیز انداز نے حبیب کے دل میں دور تک اجالا سا بکھیر دیا۔

"دیر ہو رہی ہے چلتا ہوں۔" وہ سلام کرتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

گمان غالب تھا کہ اگر ماہا کو گھر سے نکلے ہوئے دیر ہو چکی ہے۔ تو وہ یقیناً" پہنچنے ہی والی ہو گی اور وہ اس کے یہاں آنے سے پہلے پہلے' اس جگہ سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ تب ہی اپنی دھن میں تیز تیز قدم بڑھاتا کاریڈور میں کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"اوہ! آئی ایم ریئلی سوری میم۔" اس نے بدیسی زبان و انداز میں فوراً" معذرت کی۔ کیونکہ وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی' یقیناً" اس کی اپنی بے دھیانی اور عجلت پسندی کا شکار ہوئی تھی۔

"اٹس او کے۔" ماہا نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر اجنبی کو راستہ دیا اور تیزی سے دوسری طرف مڑ گئی۔ اسی کی طرح قدرے تیز رفتاری سے قدم بڑھاتا ولید ہسپتال کی عمارت سے دور جاتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
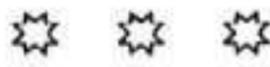
کمرے میں حسیب کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

اندر داخل ہونے' اس سے ملنے اور پھر ہاتھ میں تھاما سامان رکھنے تک اس کا انداز ایسا تھا جیسے' وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

"کیا بات ہے۔ کیا ڈھونڈ رہی ہو۔" حسیب جانتا تو تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی کسی بات کو جانتے بوجھتے کریدنے کا بھی اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔



"وہ یہاں..." وہ رکی چونکی اور پھر دو لفظ بول کر الجھ سی گئی۔

"یہاں کیا۔"

"رات آپ کے پاس کون ٹھہرا تھا۔"

وہ بغور حسیب کا چہرہ دیکھتی ہوئی اس کے بالکل نزدیک آگئی۔ جو دو حرفی سوال آدھے سانس لے کر اس کے لبوں پر دم توڑ گیا تھا۔ اب وہ مکمل ہو کر آنکھوں میں آن بیٹھا تھا۔

"تھا کوئی... تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"کون تھا آخر... میں پوچھ نہیں سکتی کیا۔ کیسے کسی انجان شخص پر بھروسہ کرکے صادق بھائی آپ کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔"

"نہ میں اکیلا تھا۔ نہ وہ انجان۔" اس نے چہرہ موڑ کر دوسری طرف دھیان لگانا چاہا اور ماہا اس کے اس انداز پر مزید ٹھٹک گئی۔ اس نے ہاتھ سے حسیب کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

"آپ اور صادق بھائی۔ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔"

چند لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

کتنی عجیب سی بات تھی۔ اگر وہ کچھ چھپا رہے تھے تب بھی' ماہا کو معلوم تھا کہ وہ کیا چھپا رہے ہیں اور حسیب جانتا تھا کہ ماہا کے دل میں شک اپنی جڑیں پکڑ چکا ہے۔ جب وہ یہاں تک پہنچ سکتی ہے کہ تھیلے میں کچھ ہے۔ تو کیا یہ نہیں جان سکتی تھی کہ اس کے اندر کچھ اور نہیں بلی ہے۔ جو کسی بھی وقت باہر آسکتی ہے۔

حسیب نے بغور دیکھا۔ اس کے کمزور چہرے پر سرخی کی جگہ زردی آگئی تھی۔ جسامت پہلے ہی دبلی تھی۔ اب کمزور ہو چلی تھی۔ اس کی جدائی اور جدائی کے واہموں نے ماہا کو آدھا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اور اب وہ پھر ایک واہمہ لے کر سامنے کھڑی تھی۔

"جیسا تم سوچ رہی ہو۔ ویسا کچھ بھی نہیں ہے ماہا۔" اس نے بمشکل دل کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کیا۔ ماہا نے نظریں چرالیں۔

"تم نے صادق بھائی سے وہ بات کی جو میں نے تم سے کرنے کے لیے کہا تھا۔" ابھی وہ مڑ کر بیٹھ بھی نہیں سکی تھی کہ حسیب نے ایک بار پھر اسے مضطرب کر دیا۔

"صادق بھائی..." وہ نظریں جھکا کر یہاں وہاں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ جب صادق نے کمرے کا دروازہ کھولتے وقت اس کی آواز سنی۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ وہاں آپ کے ایکسیڈنٹ کی خبر دے دی گئی ہے۔ کوئی مناسب سمجھے گا تو رابطہ کر لے گا۔"

صادق نے اندر آکر سلام کیا۔ ماہا اپنے جھوٹ سے گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اسے اندازہ کرنے میں دشواری ہو رہی

تھی کہ صادق نے اس کی کتنی بات سنی ہے۔
حسیب کو دل ہی دل میں ماہا کے جھوٹ پر افسوس ہوا۔ صادق ' ماہا اور وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس وقت وہ تینوں ایک بات کو جانتے بوجھتے ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ حسیب کا دل اچانک ہی اکتا گیا۔
" صادق بھائی۔ یہ سب کب تک چلے گا۔" اس نے ایک دم ہی فیصلہ کرلیا۔ آر یا پار۔۔۔ یہ آنکھ مچولی۔ چوہا بلی کب تک۔ کبھی تو سچائی سامنے آنا ہی تھی۔
" کیا۔۔۔ کس کے بارے میں بات کر رہے ہو۔" وہ ایک دم بوکھلا گئے۔
" ہم تینوں جانتے ہیں کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔ آپ نے ماہا کو بتایا کیوں نہیں کہ آپ ولید کو پاکستان بلوا چکے ہیں۔"
صادق اور ماہا۔ ہکا بکا رہ گئے۔ زمین دونوں کے قدموں تلے سے سرکی تھی لیکن الگ الگ انداز میں اور جب صادق سنبھلے تو ان کا جی چاہا کہ بڑھ کر حسیب کے منہ پر کم سے کم تھپڑ تو رسید کر ہی دیں۔
انہیں ایک نہیں دو باتوں پر غصہ چڑھا تھا۔ ایک تو اس کے یوں بے وقت بھانڈا پھوڑنے پر۔ دوسرے ان کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانے پر۔
دوسری طرف ماہا نے شاک سے باہر آکر جس طرح انہیں گھورا۔ وہ انداز' انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی چور بنا گیا۔ اس نے باری باری دونوں کی شکلیں دیکھیں اور پھر شدید غصے میں پیر پٹختی باہر نکل گئی۔
" ماہا۔۔۔ ماہا بیٹے رکو تو سہی۔۔۔" انہوں نے اسے روکنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس کے باہر نکلنے کے بعد جلبلا کر حسیب کی طرف پلٹے۔
" کیا ضرورت تھی یہ بکواس کرنے کی۔" اب ان کا مزید مروت دکھانے کا قطعی موڈ نہیں تھا۔
" ابھی نہیں تو کبھی نہ کبھی تو یہ بکواس کرنی ہی تھی۔"
" تو تم نے اس کبھی نہ کبھی کے لیے لوگوں سے بھرے ہسپتال کا انتخاب کرلیا۔ چند دنوں میں تمہاری چھٹی ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی تو معاملات سنبھالے جا سکتے تھے۔ تم جانتے نہیں ہو۔ مزنہ اور ماہا کے درمیان کس قدر کشیدگی ہے۔ اگر مزنہ مزاج کی تیز ہے تو تمہاری بیوی نے بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب وہ پتا نہیں وہ کس طرح ری ایکٹ کرے گی۔"
انہیں حقیقتاً" اپنے اعصاب شکستہ ہوتے محسوس ہونے لگے۔ حسیب بے شک ابھی بیمار تھا۔ چلنے پھرنے سے مجبور تھا۔ لیکن کچھ تو اسے بھی صادق کی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے تھا۔
" آپ پریشان مت ہوں صادق بھائی۔ میں سنبھال لوں گا۔" اس کا دل صادق کو یوں حواس باختہ سا دیکھ کر حقیقت میں نادم ہو گیا۔ اپنے تئیں اس نے کمرے میں بے قراری سے یہاں وہاں پھرتے صادق کو تسلی دینی چاہی تھی۔ لیکن وہ اور بھی بھڑک گئے۔
" رہنے دو میاں تم۔۔۔ ایک ذرا سی بات تم سے سنبھالی نہیں گئی۔ اور ایک میں ہوں۔ کل رات سے وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے جاہل عورتوں کی طرح جیسے میں نے تمہیں یعنی کسی ننھے منے بچے کو اکیلا بھرے بازار میں چھوڑ دیا ہو۔"
ان کے غصے کا گراف بتدریج اوپر کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اور ان کی گفتگو بدلتے ہوئے رنگ سے صاف واضح تھا۔
" ایک میں گدھا ہوں کہ جھوٹ پر جھوٹ' جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ کیوں کس لیے۔۔۔ ایسے جھوٹا بننے کے لیے ہی تو۔۔۔ بس میاں بہت ہوئی۔ اچھی خاصی سچویشن کو تم نے خود ہی بھاڑ میں جھونکا۔ اب اس کٹ

کھنی بلی کو بھی خود ہی سنبھال لینا میں تو چلا۔" وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔
"ارے ارے صادق بھائی پلیز میری بات تو سنیں۔" اسے اپنی بے بسی کا پوری طرح اندازہ ہو رہا تھا اور اپنی غلطی کا بھی۔ لیکن صادق بھائی اب کسی کی سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔
باہر لان میں بینچ پر بیٹھی ماہا نے انہیں تن فن کرتے باہر جاتے دیکھا اور سر جھٹک کر آنسو صاف کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

چڑھتے ہوئے دن کی تپش درختوں کی چھاؤں میں بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ وہاں بیٹھی خود سے اور اپنی سوچوں سے الجھتی ہار ہی گئی۔ کب تک یوں اکیلی بیٹھی رہتی اور کب تک جھگڑتی۔ خود سے الجھتی انہی سوچوں سے اور کڑھتی اپنے ہی خیالات پر۔
ولید۔۔۔ حبیب کا حقیقی بیٹا پاکستان آچکا تھا۔ اور اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ اس سے کیا ثابت ہوتا تھا۔ کم از کم دو باتیں تو بہت واضح۔۔۔ اس کی اپنی اہمیت اور حیثیت نہ صرف حبیب بلکہ اس سے جڑے دوسرے لوگوں کی نظر میں۔ اور دوسرے اس لڑکے کی اہمیت و حیثیت وہ بھی نہ صرف حبیب بلکہ اوروں کی نظر میں بھی۔
یعنی اتنا کچھ ہو جانے کے بعد 'اتنا ہجر' اتنی دوری تنہائی۔ موت جیسا عذاب ناک خوف جھیلنے کے بعد بھی حبیب نے بالآخر کی تو اپنے من کی ہی۔۔۔
"پھر میری۔۔۔ میری اور میری بات کی بھلا اہمیت ہی کیا ہے۔ اور میں کیوں فضول میں اپنا دل جلا رہی ہوں جب' کسی کو پروا ہی نہیں۔ میں اس شخص سے ناراض ہو کے یہاں بیٹھی ہوں۔ جس کو میری متوقع ناراضی کا پورا علم تھا۔ پھر بھی اس نے وہی کیا جو' اس نے چاہا۔ تو پھر میں وہ کیوں نہ کروں جو میں چاہوں۔۔۔ اور میں۔۔۔" وہ بے خیالی میں درختوں کی شاخوں پر پھدکتے پرندوں کو دیکھتی سوچے گئی۔
"میں بھلا چاہتی کیا ہوں۔۔۔ سوائے حبیب کے۔۔۔ اگر انہیں میری زندگی سے نکال دیا جائے تو بچے گا کیا میرے پاس۔۔۔"
قریب بنی ہوئی گیلی کیاری میں دو چڑیاں گھاس کے ایک سوکھے تنکے پر آپس میں چونچیں مار رہی تھیں۔
"اور کیا ولید اکیلا ہی پاکستان آیا ہے یا پھر۔۔۔" ایک سوچ نے کسی زہریلے بچھو کی طرح بے حد آہستگی سے اپنا زہر اس کی رگ میں پیوست کیا۔
"اگر یہ معمولی سا پرندہ اپنے گھونسلے کے لیے اتنی جدوجہد کرتا ہے۔ تو کیا میں اس ننھی چڑیا سے بھی گئی گزری ہوں۔ اس سے بھی زیادہ بے بس ہوں کہ وہ عورت اور اس کا بچہ میرے شوہر پر قبضہ کر کے میرا گھر اجاڑ کر' میرا دل اور دنیا ویران کر کے اتنی خاموشی سے حبیب کو اپنا بنالیں اور میں دیکھتی رہوں۔ کچھ نہ کروں۔ کچھ نہ کہوں۔"
اس نے گہری سانس لے کر خود اور اپنی یہاں وہاں بکھری سوچوں کو سمیٹا' یکجا کیا اور خاموش لیکن بے حد مضبوط قدموں سے ہسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگی۔
اسے یقین تھا کہ حبیب اس کا منتظر ہو گا اور یہ یقین اتنا بھی غلط نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور بنا کچھ کہے ایک جانب بیٹھ گئی۔
حبیب نے اسے اندر آکر یوں خاموشی سے بنا سوال جواب کیے ایک طرف بیٹھتے دیکھا۔ لیکن مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کی۔
اس کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں' ٹانگ پر رکھی ٹانگ کے ہلتے ہوئے پنجے موبائل کے تیزی سے دباتے ہوئے بٹنوں والے ہاتھوں کی لرزش' قدرے تیز تنفس اس بات کا گواہ تھا۔ کہ اس وقت اس کی حالت اس بھاپ بھرے

برتن کی مانند ہو رہی ہے۔ جو ذرا سی جنبش سے بال برابر جگہ ملنے پر پھٹ پڑے گا۔
حسیب اس کی کیفیت اور اس کا اعتبار دوسری بار ٹوٹ جانے پر اس کی حالت سمجھ رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔ کھولتے ہوئے برتن کا ڈھکن ہٹا کر جلتی بھاپ سے خود کو جلانے سے بہتر تھا کہ اس کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کر لیا جائے۔
وہ کافی دیر بلکہ نجانے کتنے گھنٹے یونہی کبھی سیل کبھی کھڑکی اور کبھی یہاں تو کبھی وہاں کو اپنی توجہ سے نوازتی رہی۔ پھر مغرب کی نماز پڑھ کر واپس آئی تو اپنا بیگ اٹھالیا۔
"کہاں جا رہی ہو؟" حسیب اسے واپسی کے لیے تیار دیکھ کر بے اختیار مخاطب کرنے پر مجبور ہو گیا۔
"گھر واپس..."
"لیکن کیوں؟" صبح کی بہ نسبت وہ اس وقت تک کافی پرسکون ہو چکی تھی۔
"کیوں مطلب! کل بھی تو چلی گئی تھی۔"
"اور میں یہاں اکیلا..." اس کی بات پر اس نے ایک زخمی نظر اس پر ڈالی اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔
"میں نے ڈاکٹرز سے بات کی ہے۔ اگلے ہفتے آپ کو چھٹی مل جائے گی۔ میں آجاؤں گی اس دن۔"
"کس دن؟" وہ حیرت سے سنتے چونک۔
"جس دن آپ ڈس چارج ہوں گے۔"
"اور اس سے پہلے..." ماہا نے جواب نہیں دیا۔
"ذرا مجھے ایک سیب تو دے دو۔ کھانے کا دل کر رہا ہے۔" وہ جھک کر بیگ اٹھاتے ہوئے رک گئی۔ پھر پلیٹ میں چھری اور سیب رکھ کر اس کی گود میں رکھ دیا۔
"اپنے بیٹے کو کال کر دیں۔ وہ آجائے گا۔ آپ اکیلے بھی نہیں رہیں گے اور میری کمی بھی محسوس نہیں ہو گی۔" اس نے بیگ اٹھا کر شانے پر ڈالا۔ اور پلٹ کر ایک نظر حسیب پر ڈالی۔
"چلی جاؤ اگر جانا چاہتی ہو۔ لیکن کل ضرور آجانا۔ کیا پتا زخم ایک بار پھر ہرے ہو جائیں اور اس بار میں جانبر نہ ہو سکوں۔" چھری کی نوک اس کی داہنی شہادت کی انگلی پر رکھی گھوم رہی تھی۔ ماہا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔

☆ ☆ ☆
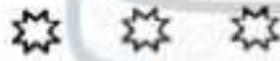
"کل آفس سے واپسی پر اماں کے یہاں آجایئے گا۔"
رات سونے سے پہلے سبز چائے کا کپ لے کر وہ کمرے میں آئی تو حدید کو ہوشیار باش دیکھ کر سوچا بات ہی کر لے۔
"کیوں۔ ابھی کل پرسوں تو آئی ہو رہ کر۔"
"ہاں بس... وہ... اماں کا فون آیا تھا۔ عفت کی رخصتی کے لیے جوڑے وغیرہ لینے ہیں اور باقی تیاریوں وغیرہ کے لیے بلایا ہے۔ مشورے کے لیے۔"
"تو یہ مشورہ وہ پرسوں نہیں کر سکتی تھیں۔" اس نے مصنوعی خفگی سے آنکھیں نکالیں۔ اس نے چائے کے کپ کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نائلہ جھکی کھڑی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے چائے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور اسے جھٹکا دے کر گرانے کی کوشش کی۔ نائلہ سمجھ چکی تھی۔ جبھی اس کی شرارت پر ہنستے ہوئے خود ہی شرافت سے قریب بیٹھ گئی۔

"تم نے اپنے لیے چائے نہیں بنائی۔"
"نہیں میں نے کھانے کے بعد شام میں ہی پی لی تھی۔" حدید نے گھونٹ بھرا۔ پھر اس کی سنجیدہ شکل دیکھی جو' اب اپنے ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سمٹ کر کچھ سنجیدگی میں ڈھل گئی۔
"وہ... اماں پریشان ہیں۔ عفت کے سسرال والوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں زیور کا بھی کہہ دیا ہے اور ساس نندوں کی پہناؤنیاں وغیرہ..."
"تم نے کیا کہا ان سے۔"
"میں کیا کہتی... آپ سے بات کیے بغیر میں ان کو تسلی تو دے سکتی تھی لیکن کوئی وعدہ نہیں کر سکتی تھی۔" حدید جواباً" خاموشی سے کچھ سوچتے ہوئے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔
"آپ کے آفس سے اگر لون وون مل جائے تو..." اس نے بے حد جھجکتے ہوئے یہ بات کی تھی۔ اپنے اور اس کے تعلقات کی لاکھ بہتری کے بعد بھی وہ اس قدر جلد خود کو اس ڈیمانڈ کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ سوچتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی تو بس اس کی شرٹ کے گریبان پر بنے ڈیزائن ہی میں الجھ کر رہ گئی۔
"ہوں..." اس نے سوچتے ہوئے کپ خالی کر کے رکھا۔
"کرتا ہوں آفس میں بات۔"
"اگر آسانی سے ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ..."
"میں مشکل اٹھا لوں گا۔" اس کا گمبھیر لہجہ خلوص کی آنچ پر تپ کر کندن سا ہوا۔ نائلہ کو تشکر کے الفاظ فالتو سے لگے۔
"تو پھر کل کا پروگرام ڈن سمجھوں۔"
"پہلے آج کا پروگرام تو کر لو ڈن۔" نائلہ نے جھینپ کر اسے دور دھکیل دیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے خود کو وقتی طور پر حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ جانیں اور ان کی اولاد...
دل ہی دل میں کئی بار پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ' اندر ہی اندر کھڑی تھی۔ پھر دل کے ہاتھوں زیادہ بے بس ہوتی تو' فون کر لیتی۔ دوسری جانب حسیب پوری شدت سے اسے اپنے پاس بلاتا تھا۔ اور اس کا دل جیسے سینے کی دیواروں سے لڑکھڑاتا مچل اٹھتا۔ دل میں خود سے ہزار وعدے اور سینکڑوں ارادے کرنے والی فقط تین دن بعد ہی اپنے دل سے ہار کر ہسپتال جانے کا ارادہ کر بیٹھی۔
اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے یوں گھر میں رکتے دیکھ کر رضوانہ حسن مضطرب ہو جاتی تھیں۔ وہ ماہا کی زندگی میں آ جانے والے ٹھہراؤ کو اب کسی صورت کسی تلاطم کی نظر کرنے کی حق میں نہیں تھیں۔
"تم صرف اپنی زندگی دیکھو میری بچی۔ اور ایک عورت کی زندگی مرد کے بغیر بالکل کاغذ کے پھول کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں خوشبو تو خیر آتی ہی نہیں۔ چند گھنٹے بھی اگر دھوپ میں پڑا رہ جائے تو رنگ بھی اڑ جاتا ہے۔ پھر ایسی بے رنگ اور بغیر خوشبو کی زندگی بھلا کس کام کی۔" ماہا نے ان کے سینے سے لگا سر اٹھا کر بے تابی سے ان کا چہرہ ٹٹولا۔
"کیا آپ مجھے سمجھوتا کرنے کو کہہ رہی ہیں امی..."
"کرنا ہی پڑے گا۔ جب ظاہر ہے تم نے اپنی سی سب کر کے دیکھ لی۔ تب بھی اس کی زندگی میں دوسروں کی جگہ تم نہیں لے سکیں۔ تب سب سے آخری راستہ یہی رہ جاتا ہے نا!"

"سب سے آخری اور سب سے مشکل بھی تو۔" وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی۔
"زندگی میں سب کچھ نہ تو آسان ہوتا ہے نہ ہماری مرضی کے مطابق تو پھر جب یہ طے ہے کہ زندگی کے اس سفر کو آخر تک ہمیں نبھانا ہی ہے۔ چاہے رو کر چاہے ہنس کر، تو پھر... ہنس کر کیوں نہیں۔" انہوں نے محبت سے اس کے بالوں کا بوسہ لیا۔
"اسے تھوڑا وقت دو، اسے ایک موقع دو... اور خود کو بھی... پھر وقت اور حالات کو فیصلہ کرنے دو۔ اس طرح کے طرز عمل سے تم حسیب کے دل میں اپنی اہمیت کم بھی کر سکتی ہو اور خدانا خواستہ بالکل کھو بھی سکتی ہو۔" ماہا ایک دم جیسے اکتا کر اٹھی۔
"میں نیچے جاتی ہوں عفت کے پاس اس سے پوچھتی ہوں کل شاپنگ پر جانے کے لیے کیا پروگرام ہے۔"
رضوانہ نے اپنی بات کے جواب میں اس کا لاتعلق سا ردعمل دیکھا۔ پھر اسے نیچے کی طرف جاتے دیکھ کر تاسف سے سوچ میں پڑ گئیں۔ جو لوگ دوسروں کی زندگیوں سے سبق نہیں سیکھتے، زندگی پھر انہیں اپنے انداز میں سبق سکھاتی ہے اور جو دل پتھر کی مانند کسی کے آنسوؤں، جذبات اور رشتوں کی نزاکتوں سے نہ پگھلیں۔ پھر انہیں ٹھوکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ٹھوکر ماہا کو بھی لگتے لگتے بچی تھی اور وہ اس پر بھی سنبھلنے کو تیار نہیں تھی۔ تو پھر اب...
"میری دعا ہے کہ خدا تمہیں کسی بھی سخت امتحان سے دور رکھے۔" بے حد بجھے ہوئے لیکن سچے دل سے ان کے لبوں نکلی دعا، پر پھیلا کر بارگاہ الٰہی قبولیت میں حاضری دینے عرش کی جانب پرواز کر گئی تھی۔
نائلہ دوسرے دن اپنے ساتھ ساتھ سوہا کو بھی رکشے میں بٹھا کر گھر لے آئی۔ عفت کے نکاح کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب پورے گھر میں خوشی کی ایک انوکھی سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ عفت نے اسے خوب بھینچ کر گلے لگایا۔ وہ بھی کسی جذبے کے تحت دیر تک چپکی کھڑی رہی۔
"اچھا چلو جلدی سے چادر وغیرہ لے لو عفت! میں ابا سے مل کر آتی ہوں۔"
"ابا سو رہے ہیں۔ انہیں شدید فلو کے ساتھ بخار چڑھا ہوا ہے۔ دوائی دی ہے میں نے۔" عفت کی دھیمی آواز سب سے آخر میں آئی تھی۔
"کیوں خیریت۔ اتنی گرمی میں فلو... خیر واپسی میں آئس کریم لیتی آؤں گی۔ کھائیں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔"
اپنے تئیں اس نے بڑی سمجھ داری سے حل نکالا تھا۔ اس کی ہنسی چھوٹی تو اماں نے بھی ہنس کر اس کے سر پر چپت رسید کر دی۔
"بڑی آئی ڈاکٹر۔ آئس کریم سے نزلہ ٹھیک کرے گی۔"
"ہاں اور نمک سے ہائی بلڈ پریشر۔"
ایک زبردست قہقہہ پڑا اور پھر گھر سے نکل کر شاپنگ سینٹر پہنچنے تک پورا راستہ نائلہ ان تینوں کو یقین دلاتی رہی کہ گرمی کی کھانسی اور فلو کا یہی سب سے آسان علاج ہے۔
اس کی اور عفت کی گفتگو اور نوک جھونک سے ماہا اور سوہا کے موڈ بھی بڑی حد تک بحال ہو گئے تھے۔
چاروں ایک یادگار دن گزار کر واپس لوٹی تھیں۔
نائلہ ہی کے مشورے پر عفت کے لیے ہلکے کام دار تین اور تین ہی بھاری زری دبکے اور نگوں سے بھرے ہوئے سوٹ لیے گئے تھے۔ سوہا نے برائے نام حصہ لیا۔ وہ تو بس سارا وقت نائلہ کے بیگ سے نکلتے نوٹوں کی اس گڈی کو دیکھے گئی۔ جس کی موٹائی بے شک زیادہ نہ تھی۔ لیکن اس کی موجودگی ہی سوہا کو حیرت میں ڈالنے کے لیے

کافی تھی۔ گھر واپسی پر امی اور چچی جان دونوں ہی گرما گرم چائے کے ساتھ ان تینوں کی منتظر تھیں۔ گو کہ نائلہ نے کمال مہربانی سے دوپہر کے کھانے کے ٹائم پر چھولیوں کی چاٹ اور کولڈ ڈرنک سے تینوں کی شاپنگ کا لطف بڑھا دیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ گھر پہنچیں سہ پہر جا رہی تھی اور بھوک کا احساس پھر سے جاگنے لگا تھا۔ اسی لیے نائلہ ہی نے گھر کے قریب سے سموسے اور جلیبیاں بھی لے ڈالیں۔ عفت نے بالکل سرسری انداز میں کہا تھا کہ

"مجھے تو دوبارہ سے بھوک لگنے لگی ہے اور ٹانگیں تھک کر چور ہو چکی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ گھر جا کر اگر چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو مل جائے۔"

نائلہ نے فی الفور سموسے اور جلیبیاں خریدنے کی سوچی اور جھٹ پٹ عمل کر ڈالا۔ ماہا اور سوہا تو حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی رہ گئیں۔ کیونکہ کچھ دنوں سے نائلہ انہیں مسلسل حیران ہی کر رہی تھی۔ لیکن اس حیرانگی کو زبان دینے کی ہمت بہرحال ان دونوں میں نہیں تھی۔ لیکن عفت تو اسی کی بہن تھی۔ بے اختیار اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ماہا کی طرف گھما کر بولی۔

"ارے بہنوں' ان آنٹی کو پہچانتی ہو۔ چہرہ بڑا جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ ارے.... لو یہ تو اپنی نائلہ بی بی ہیں۔ پر ان کے یہ کرتوت پہلے تو سامنے نہیں آئے۔" اس نے منہ کو ہونق بنا کر سموسے اور جلیبیوں کے شاپرز کی طرف اشارہ کیا۔ قل قل کرتی ہنسی کی دھنک چاروں اور پھیل گئی۔ اپنا مذاق اڑانے والوں میں نائلہ خود بھی شامل تھی۔

☼ ☼ ☼

جیسے جیسے رخصتی کے دن نزدیک آ رہے تھے۔ عفت کے دل میں نت نئے خدشات زور پکڑتے جا رہے تھے۔ عفت معراج سے روز کی طرح بات بھی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس میں ایک خاص وقفہ در آیا تھا۔

ایک دوبار اس نے کوشش کی کہ معراج کو ان کی والدہ کی باتوں کی بابت بتا کر ان سے دریافت کرے کہ آخر انہیں بیٹھے بٹھائے عفت میں کون سے کیڑے نظر آنے لگے۔ جو وہ دبے لفظوں میں اور کبھی کھلم کھلا اس طرح کی غلط باتیں کرنے لگیں۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ الٹا ایک دوبار تو معراج نے ان باتوں کو ہواؤں میں اڑا دیا۔ پھر سنجیدگی سے لینے کی کوشش بھی کی تو عفت اور اس کے درمیان ایک عجیب طرح کی تلخ کلامی کی سی صورت حال پیدا ہو گئی۔ عفت کو معراج سے اس معاملے میں اس قدر غیر سنجیدگی کی امید نہیں تھی۔

یہ ٹھیک تھا کہ اس نے ان چند دنوں میں عفت کے ساتھ محبت کے بلند و بانگ دعوے نہیں کیے تھے۔ لیکن محبت کا اظہار تو بہرالحال کیا تھا۔ لیکن اب عفت کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ اظہار صرف وقتی کشش کے زیر اثر آجانے کی وجہ سے معراج اس سے کر بیٹھا تھا۔ اور اب ہر گزرے دن کے ساتھ جب ان کے درمیان نزدیکیاں بڑھیں تو' وہ کشش بہت تیزی سے اپنا اثر کھوتی جا رہی تھی اور یہ احساس اس وقت اور شدید ہو گیا۔ جب معراج کی کال دیر سے اٹینڈ کرنے پر وہ اس کی طرف سے کوئی ایکسکیوز سنے بغیر برا ہی مان گیا۔

"کب سے فون کر رہا ہوں.... کہاں تھیں۔"

"دوسرے کمرے میں اماں اور ابا کو کپڑے دکھا رہی تھی۔" عفت کا خیال تھا کہ اس بات پر معراج شوخی میں آجائے گا لیکن....

"اچھا۔ یہ کوئی وقت ہے کپڑے دکھانے کا اور میں جو انتظار میں سوکھ رہا تھا کب سے۔"

"بتا تو رہی ہوں کہ دوسرے کمرے میں تھی۔ فون سائیلنٹ پر تھا۔" دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر جب وہ بولا تو اس کے لب و لہجے میں ایک عجیب سی ناگواری کی بو تھی۔

"تمہیں خیال رکھنا چاہیے نا! کہ میں صرف تمہاری آواز سننے کے لیے اتنی رات تک جاگتا ہوں۔ مجھے صبح

آفس بھی جانا ہوتا ہے۔" عفت ایک دم چپ رہ گئی۔
" یہ بھلا کس طرح کی بات ہے۔ مجھے بھی صبح بہت سے کام ہوتے ہیں۔ میں بھی آپ ہی سے بات کرنے کی خاطر جاگتی ہوں اور..." وہ بہت ضبط کرنے والی فطرت کی حامل تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا۔
" تو احسان جتا رہی ہو مجھے۔"
" کیا ہو گیا ہے آپ کو... کیا آپ نے احسان جتانے کے لیے کی تھی اپنے آفس جانے کی بات... نہیں نا... میں بھی ویسے ہی کہہ رہی ہوں جیسے آپ..." معراج نے جواب نہیں دیا۔
" او کے... آئی ایم سوری۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی کہ فون کریں تو آپ کو انتظار نہ کرنے پڑے... ٹھیک... اب جلدی سے اپنا موڈ ٹھیک کریں۔" بظاہر اس نے بڑے خوشگوار موڈ میں یہ بات کہی تھی۔ لیکن یہ صرف وہ ہی جانتی تھی کہ اس کے دل کے اندر کہیں، کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔
" اور سیل سائلنٹ کیوں تھا۔" اس کے پاس اب ایک نئی بات تھی۔
" ایسے ہی رات میں شور ہوتا ہے نا!"
" تو ہونے دو... میرا اور تمہارا تعلق کوئی چوروں والا تو نہیں۔ جو یوں چھپ چھپ کر اور چھپا چھپا کر بات کی جائے۔"
" میں سمجھی نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"
" اتنی سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔ حالانکہ اپنے گھر میں تو تم بہت سمجھ دار کہلاتی ہو۔" اس کا طنزیہ لہجہ، عفت کو بہت برا محسوس ہوا۔
" لیکن میں اتنی بھی سمجھ دار نہیں ہوں۔ ہونے اور کہلانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جیسے آپ کے گھر میں سبز قدم کہلائی جانے لگی ہوں لیکن ہوں نہیں۔" جانے کب کیوں اور کیسے یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکل گئے اور توقع کے عین مطابق معراج تپ گیا۔
" یار تم ہر وقت میرے گھر والوں کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو۔" اس کا انداز ہتھے سے اکھڑا ہوا تھا۔ عفت نے بے ساختہ اگلی بات کو لبوں میں دبا لیا۔ (میں نہیں آپ کے گھر والے پیچھے پڑے ہیں میرے)
" سوری... میرا خیال ہے۔ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔" عفت اب کی بار بھی کچھ نہیں بولی۔ لیکن جانے کہاں سے گھومتے گھامتے دو آنسو آنکھوں کی نچلی کناریوں پر ٹہلتے آنکلے۔
دیر سے ہی سہی لیکن معراج کو اپنے یکدم تلخ ہو جانے کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن اگر ابھی یہ احساس اتنی دیر میں جاگ رہا تھا تو کیا پتا۔ بعد میں گہری نیند ہی سویا رہتا اور معراج کو پتا ہی نہ چلتا کہ وہ زیادہ بول گیا۔ کم بولا یا غلط...
" میں فون بند کر رہی ہوں۔ میرا خیال ہے اس وقت ہم لوگ کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر پائیں گے۔" اس کا ازلی دھیما اور نرم لیکن سنجیدہ انداز واپس لوٹ آیا۔
" میں تو کر سکتا ہوں۔ لیکن تم خود سوچو۔ ایک بندہ اتنی دیر انتظار کے بعد..."
" معراج...!" اب کی بار اس نے قدرے بلند آواز میں اس کا نام لیا۔ معراج کے کانوں نے پہلی بار اس کے لبوں سے سنا تھا۔ لیکن اتنا دو ٹوک، واضح اور حد درجہ سنجیدہ... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چپ کر گیا۔
" آپ کو ضرورت کیا ہے میرا اتنا انتظار کرنے کی۔ یوں راتوں کو جاگ جاگ کر خود کو ہلکان کرنے کی۔ میں آپ کی ہوں... اور آپ ہی کی رہوں گی۔ آپ کے پاس آرہی ہوں نا۔ کچھ ہی دن باقی ہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔ پھر بات کو مزید آگے بڑھایا۔
" پھر آپ کو نہ انتظار کی ضرورت رہے گی۔ نہ کسی سے کچھ بھی چھپانے کی۔" کتنے لطیف جذبات کی ترجمانی

کرتے الفاظ تھے۔ لیکن کتنی گمبھیر صورت حال کو جتاتا ہوا لہجہ۔۔۔۔ وہ یوں تھی کہ بس بات ختم۔ اب وصل کے وقت تک کے لیے مکمل خدا حافظ۔

معراج سے کچھ بھی نہیں کہا گیا اور فون بند ہو گیا۔

اس نے ناگواری کی شدید لہر کو خود میں اٹھتے محسوس کیا اور عفت کو لگا وہ ابھی ذہنی طور پر معراج سے ہزاروں سال کے فاصلے پر ہے۔

☼ ☼ ☼

گھر واپسی پر ہمیشہ کی طرح انس نے مسکرا کر اس کا استقبال نہیں کیا۔ اس کے سارے تھکے ماندے وجود میں اصل تھکن اب اترنا شروع ہوئی تھی۔ وہ کچن میں کھڑا اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔ اس نے پشت پر جا کر سلام کیا۔ انس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

"کھانا تو کھالیں۔ پھر پی لیجئے گا چائے۔"

"بھوک نہیں ہے۔" وہ کپ لے کر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ انس منڈیر کے کنارے پر مگ رکھے' ہتھیلیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے برابر میں آ گئی۔

انس جانتا تھا کہ سوہا برابر میں آ کر کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھا کہ متوجہ ہی نہیں ہوا۔ سوہا کو اس کی پریشان کن خیالات کا علم تھا۔ لیکن وہ خود اس سلسلے میں بالکل بے بس تھی۔

"میں جانتی ہوں آپ بہت پریشان ہیں۔" اسے کچھ تو کہنا ہی تھا۔ انس کی خاموشی لاپروائی اور یوں خود ہی خود سے الجھتے رہنا۔ پریشان رہنا خود اس کے لیے بھی بہت تکلیف دہ تھا۔

"لیکن انس یوں پریشان رہنے سے' صرف آپ کا اپنا موڈ اور گھر کا ماحول ہی خراب ہوتا ہے اور بس۔۔۔۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔ سوہا نے بھی ہمت نہیں ہاری۔

میں یہ نہیں کہتی کہ ہنسیں بولیں قہقہے لگائیں۔ لیکن آپ یہ تو کر سکتے ہیں نا کہ اپنا ہر کام' ہر مسئلہ اللہ پر چھوڑ کر مطمئن ہو جائیں۔ جس نے پیدا کیا ہے۔ وہی پال بھی لے گا۔ اور جس نے مشکل دی ہے۔ وہی آسانی بھی دے دے گا۔ کیا آپ کا اس بات پر ایمان نہیں رہا۔"

اس کے انداز میں بے حد محبت تھی۔ انس نے ہارے ہوئے انداز میں سر جھکا لیا۔

"کیوں خود کو بلاوجہ بے مقصد و لا حاصل لایعنی سوچوں سے تھکا رہے ہیں۔" اس نے انس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ جواباً" انس اس کا ہاتھ تھام کر کمرے میں لے گیا۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے چلتی ہوئی آئی۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر انس اس کے برابر میں تکیے پر سر رکھ کر لیٹا اور آنکھیں موند کر اس کا ہاتھ اٹھا کر آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

"میں واقعی تھک گیا ہوں سوہا! میری تھکن سمیٹ لو۔" نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے آخری لمحات جس قدر بوجھل تھے' صبح ایک فون کال کے ذریعے اتنی ہی ہنگامہ خیز ہو گئی۔

"سوہا۔۔۔۔ سوہا! اٹھو جلدی۔" انس نے اس کا کندھا بے تابی سے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے اس کا سرخ جوشیلا چہرہ دیکھا۔

"آفس سے فون آیا ہے۔ مجھے بلایا ہے ایمرجنسی میں۔" اس کی نیند بھک سے اڑی تھی۔

"ہیں۔۔۔۔ کون سے آفس سے۔"

"ارے میرے آفس سے۔ جلدی اٹھو جلدی کرو۔ میرے کپڑے نکالو اور دعا کرو کہ کوئی اچھی خبر ہی سننے کو ملے۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے بھی پہلے سوہا چھلانگ مار کر بیڈ سے اتر کر الماری کی طرف لپک چکی تھی۔ برق رفتاری سے کپڑے استری کر کے نیچے آئی۔ تیزی سے ناشتا تیار کیا۔ اس کا انداز دیکھ کر نائلہ بھی کچھ اندازہ لگا چکی تھی۔ چنانچہ اسے بھی فوراً" خوشی میں شریک کر لیا اور مستقل درود پاک کے ورد کرتی رہی۔

اس کی دعاؤں کو بہت زیادہ انتظار نہیں کروایا گیا تھا۔ اس کے صبر کو انتہا تک نہیں آزمایا گیا تھا۔ ابھی تو تکلیف شروع ہی ہوئی تھی کہ مرہم آن اترا۔

وہ اللہ پاک کی جتنی بھی شکر گزار ہوتی کم تھا۔

انس اور حدید ساتھ ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔

اور انس کے گھر سے نکلنے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد مسرت و شادمانی میں ڈوبی اس کی کال بھی ریسیو ہو گئی تھی۔

انس اور اس کے دوسرے ساتھیوں پر لگے جھوٹے اور الٹے سیدھے الزامات غلط ثابت ہو گئے تھے۔ کمپنی کے اصلی مجرم پکڑے گئے تھے۔ نتیجتاً" ان سب کی خود بخود یاد بھی آ گئی تھی اور اہمیت بھی واضح ہو گئی تھی۔

انس کو نہ صرف نوکری پر باعزت طریقے سے بحال کر دیا گیا تھا۔ بلکہ پروموشن جو عرصے سے رکی ہوئی تھی' سمیت مراعات اور تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔ سوہا کی آنکھوں سے فون سنتے سنتے جو آنسو بہنا شروع ہوئے تو فون بند کرنے کے بعد تو وہ باقاعدہ رونے ہی لگی۔

نائلہ جو قریب ہی کھڑی خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ساری باتیں سن رہی تھی۔ مسکرا اٹھی اور بے ساختہ اسے گلے لگا لیا۔

"چلو شکر ہے یہ فکر تو تمام ہوئی۔ جاؤ اب جلدی سے شکرانے کے نوافل ادا کرو۔ میں کھانا دیکھ لوں پھر امی کو فون کر کے پوچھوں کیا کیا سامان رہ گیا ہے۔" اس کے چہرے پر بجی خوشی کے بڑے انوکھے رنگ جھلملا رہے تھے۔

سوہا سجدہ شکر ادا کر کے واپس پلٹی تو نائلہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھی۔ سیل فون اس طرح ہاتھ میں تھا۔ جیسے ابھی بھی بات ختم کی ہے۔

"کیا ہوا۔ ہو گئی تائی اماں سے بات۔"

جب وہ بولی تو گھر کی خاموشی میں اپنی خوشی سے چور آواز کی کھنکھناہٹ خود اسے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں ہو ہی گئی۔ اتنا کچھ کر لو۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا ہے۔" کچھ دیر پہلے کے برعکس اب اس کا انداز کچھ تھکا تھکا سا تھا۔

"کیوں کیا رہ گیا اب۔" اس نے فریج سے پانی کی بوتل نکالی اور گلاس سمیت لا کر سینٹر ٹیبل پر رکھ لی۔

"سب سے بڑی چیزیں۔ فرنیچر اور زیور۔۔۔" نائلہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ لوگ جاہلانہ رسم و رواج کو چھوڑنے کے بجائے' اسے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاوا ہی دیتے رہتے ہیں۔"

"ایسے مت کہو۔۔۔ جہیز تو ہمارے نبی پاک نے بھی اپنی دختر کو دیا تھا۔ یہ تو ہم ہی لوگ ہیں جو نمود و نمائش کے چکروں میں پڑے ہیں۔"

"اماں زیور کے لیے پریشان ہیں اور ان کی پریشانی۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی۔

سوہا کب اس کے پاس سے اوپر چلی گئی تھی اور کب واپس آئی پتا ہی نہیں چلا۔ اس کے ہاتھ میں گہرے کاہی ہرے رنگ کا مخملیں ڈبا تھا۔

"یہ لو۔۔۔ یہ میرا سیٹ ہے۔ جو شادی پر امی نے دیا تھا۔"

اس نے جس قدر سہولت اور آرام سے کہہ کر نائلہ کی طرف بڑھایا تھا۔ نائلہ اتنی ہی بے یقینی سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔

"لل..... لیکن سوہا پلیز..... پلیز لے کر جاؤ واپس۔ کیوں لے کر آئی ہو تم۔"

سوہا اب ناراضی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کیا عفت میری بہن نہیں ہے۔ یا اگر میرے مالی حالات اچھے نہیں تو میں خاموشی سے سب کی پریشانی دیکھتی رہوں اور ایک کام آنے والی چیز میرے پاس ہے۔ اسے سینے سے لگا کر رکھوں۔" نائلہ ابھی بھی متذبذب سی کھڑی تھی۔

"اگر تم نے نہیں لیے نا نائلہ۔ تو میں سمجھوں گی تم مجھے اپنی بہن نہیں سمجھتیں۔" آخری بات تابوت میں کیل جیسی تھی۔ لیکن نائلہ کو جانے کیا ہوا۔ اس نے ڈبا ہاتھ سے لینے کے بجائے سوہا کو گلے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

سوہا اس ردعمل کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اس کے اس طرح رونے سے گھبرا سی گئی۔

"نائلہ..... نائلہ کیا ہو گیا۔ پلیز خود کو سنبھالو۔ پلیز....."

اور نائلہ کے لیے خود کو سنبھالنا ہی تو مشکل تھا۔ یہی وہ زیور تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ذلت و رسوائی کی آگ میں جلتے جلتے رہ گئی تھی۔ اسی زیور کے لالچ نے اس کی جان بخشی کروائی تھی۔ یہی زیور شبیر حسین لینے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ اور اس کی جان تک لے لینے کے درپے تھا۔

اور اب یہی زیور تھا جو بالواسطہ ہی سہی لیکن، اس کی مشکل حل کرنے کے لیے سامنے آگیا تھا۔ وہ کیا کیا یاد کرتی اور کس کس طرح نہ پچھتاتی۔

"کچھ نہیں بس..... ذرا آج دل....." اس سے نہ بات بتائی گئی نہ مکمل کی گئی۔ بس بے ربط سا بول کر چپ کر گئی۔

"بس اب میں تمہیں روتے دھوتے نہ دیکھوں۔ خاموشی سے یہ ڈبا لو اور سنبھال کر رکھ دو۔ دے دینا تائی اماں کو انس اور میری طرف سے عفت کی شادی کا تحفہ۔ لو پانی پیو۔" شاباش اور ہاں عفت کے سسرال والوں کو انس کی نوکری والی خوش خبری ضرور سنا دینا۔" اس کا اشارہ معراج کے گھر والوں کی ذہنیت کی طرف تھا۔ اس نے بولتے ہوئے گلاس میں پانی ڈال کر اسے دیا۔ جسے وہ غٹاغٹ چڑھا گئی۔ پھر گلاس رکھ کر چند لمحے سوہا کا چہرہ دیکھتی رہی۔ تب بالکل بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

"سوہا! پلیز مجھے معاف کر دو۔ میری ان ساری حرکتوں کے لیے جن سے تمہیں تکلیف پہنچی۔" اب کے منہ کھلنے کی باری سوہا کی تھی۔

یہ اس کی زندگی کے وہ آخری الفاظ تھے۔ جنہیں وہ نائلہ کے منہ سے سننے کی توقع رکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

انس نے پورا دن آفس میں گزارا۔ اس کی واپسی مٹھائی کے ڈبے سمیت ہوئی تھی۔ حدید چونکہ پہلے ہی گھر آ چکا تھا۔ اس لیے اس کی واپسی پر نائلہ نے چائے کے ساتھ ہی تھوڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ چائے پی کر وہ اور سوہا، رضوانہ کی طرف چلے گئے۔ ابھی انس کی نوکری کا سرپرائز وہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ بھی نائلہ ہی کا مشورہ تھا کہ فون پر خبر سنانے کے بجائے سامنے جا کر خوشی دی جائے گی تو مزا دوبالا ہو جائے گا۔

رضوانہ کے گھر سے نکل کر ان کا ارادہ مزنہ کے یہاں جانے کا بھی تھا۔ کیونکہ حسیب ہاسپٹل سے ڈس چارج

ہو کر گھر آچکا تھا اور رابا حسیب کے ساتھ مزنہ کے یہاں شفٹ ہو چکی تھی۔
ان دونوں نے نائلہ اور حدید سے بھی چلنے کے لیے بہت اصرار کیا۔ خود نائلہ کا بھی بہت دل چاہ رہا تھا۔ لیکن حدید کو مستقل انکار کرتے دیکھ کر خود بھی رک گئی۔
اور کبھی کبھی انسان یونہی کسی کام کے لیے چل پڑتا ہے تو بہت سا بھلا مل جاتا ہے اور کبھی بے وجہ کوئی بات کرتے کرتے رک جاتا ہے اور زندگی بھر کا خسارہ دامن میں بھر لیتا ہے۔ کہ یہ زندگی اس کائنات کی سب سے بے اعتبار چیزوں میں سے اول نمبر پر آتی ہے۔ جو ابھی ہے تو ابھی نہیں.... انسان بے خبر ہے۔ وہ بے خبر ہی رہتا ہے اور بے خبری ہی میں....
وہ بھی بے خبر تھی۔ جبھی ڈور بیل کی مسلسل بنا رکے بجتی ہوئی آواز پر گنگناتے ہوئے اس خیال سے بے فکری میں برتن دھوتی رہی کہ حدید گھر پر ہے تو وہی دروازے تک جائے گا۔ لیکن کیوں.... کیوں سوچا اس نے کہ حدید دروازے تک جائے۔ جب وہ ہمیشہ خود جاتی رہی تھی تو اب بھی چلی جاتی۔ لیکن شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اور تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔
"کون ہے۔" حدید بولتا ہوا صحن کراس کر کے دروازے تک گیا۔
اس نے کان لگا کر آنے والے کی آہٹ سننے کی کوشش کی۔ پھر نا کام ہو کر پوری رفتار سے بہتے شور مچاتے نل کو بند کیا۔ اور کانچ کی پلیٹیں ہاتھ میں لیے پلٹی تو کھڑکی سے نظر آتے والا منظر اس کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔
حدید کو گریبان سے پکڑے اس کی گردن پر چھری رکھے اندر کی طرف تیز لیکن بے آواز قدموں سے بڑھتا وہ کوئی اور نہیں شبیر حسین ہی تھا۔
کانچ کی پلیٹیں ہاتھوں سے چھوٹیں اور بے پناہ شور کے ساتھ پختہ فرش سے ٹکرا کر کرچیوں میں بٹ گئیں۔
چھناکے کی زوردار آواز کے بعد موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)
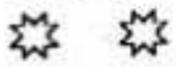
☼ ☼

مکمل ناول

سیاہ بادلوں والا برستا دن تھا۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ ساون رت تھی اور رم جھم کا سماں۔ نشیبی جگہ پر رکے ہوئے پانی میں شڑاپ شڑاپ موٹر بائیک سے چھینٹے اڑاتا وہ جب سیاہ گیٹ سے داخل ہوتا سرخ بجری والے پورچ میں جا رکا تو سامنے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے فیروز اور عزیر چونک پڑے۔

"ہیلو ایوری بڈی"

بھیگے بدن سے ٹھنڈی ہوا ٹکرانے پر ٹھنڈک کا احساس ہوا تو طلال لمبے ڈگ بھرتا ان کے قریب چلا آیا۔ سامنے مینو اس کی آمد سے قطعی بے نیاز کافی بنا رہی تھی۔

"ایک کپ کافی مل جائے گی۔"

"جی نہیں اضافی کافی نہیں ہے۔ اگر پہنچنے سے پہلے اطلاع کر دیتے تو کافی مل جاتی۔ اگر زیادہ طلب ہو رہی ہے تو کوثر سے کہہ دو۔" مینو نے صاف ہری جھنڈی دکھادی۔

"او کے..." وہ ایک دم ہی جانے کو اٹھا۔

فیروز کے سامنے جب وہ اس قسم کا انداز اختیار کیا کرتی تھی تو اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا۔ وہ پہلو میں بڑی جلن محسوس کرتا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ دانستہ اسے فیروز کے سامنے نظرانداز کرتی تھی۔ بس اس کا موڈ ہی ایسا تھا۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ وہ خود سر اور ضدی تھی۔ جانے کب بدک جائے۔ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ لیکن یہ طلال ہی محسوس کرتا تھا۔ ایسا زیادہ تر تبھی ہوتا تھا جب فیروز سامنے موجود ہوتا تھا۔ اور تب اسے اس کا رویہ بہت ناگوار گزرتا اور...

"کہاں چلے بیٹھو یار۔ ذرا گپ شپ ہو جائے۔" فیروز نے اسے روکنا چاہا۔

"میں کپڑے بدل آؤں۔ بھیگ چکے ہیں۔"

"پہلے یہ بتاؤ۔ کہاں غائب تھے۔" عزیر نے کافی کا گرما گرم کپ لبوں سے لگا کے پوچھا۔

"ہم اس انتظار میں سوکھ کر رہ گئے کہ کب جناب کی آمد ہو گی اور کب کیرم کھیلنے کا موقع ملے گا۔ فیروز اور مینو تو پارٹنرز ہیں ہی۔ تم میرے سامنے بیٹھ جانا۔"

"فی الوقت میرا موڈ نہیں۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لہجے کی تلخی پر قابو نہ پا سکا۔

اس کا موڈ حد سے زیادہ بگڑا ہوا تھا۔ ایک تو پہلے ہی اس گندمی رنگت والی نے سارے موڈ کا ناس مار دیا تھا اور اوپر سے فیروز اور مینو کے پارٹنر بننے کا سن کر وہ بالکل ہی چڑ گیا۔ حالانکہ یہ حقیقت بھی تھی۔ فیروز اور مینو کا رشتہ "تقریباً" طے تھا۔ آئندہ زندگی میں وہ دونوں قدم بہ قدم سنگ سنگ ہوں گے۔ مگر جانے کیوں جیسے وہ یہ حقیقت ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ مسلسل اس بات سے نظریں چرا رہا تھا۔

چھما چھم برستی بوندوں والا وہ دن اس کے اندر وحشتیں بڑھا گیا۔ اپنے کمرے کی بالکنی میں جھکے طلال کا دل بے حد گھبرا رہا تھا۔ سامنے سرو کے درختوں پر

نظریں جمائے وہ مایوسیوں کے دلدل میں دھنسا جیسے بے حد شکست خوردہ ہو گیا۔

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا مینو۔"

مضبوط سینے کے اندر چھپا حساس دل وحشت زدہ سا ہو کر چیخ پڑا۔

"طلال۔" سیاہ کھلے گیٹ سے باہر بھیگی ہوئی سڑک پر بارش میں نہاتے مینو ہاتھ ہلا ہلا کر اسے متوجہ کر رہی تھی۔

"نیچے آؤ۔"

"او کے رکو۔ آ رہا ہوں۔"

سینے میں محفوظ ساری سرد آہوں کو خارج کرتے ہوئے وہ سیڑھیاں پھلانگتا نیچے چلا آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا سرخ بجری والا پورچ عبور کر گیا۔

"لو جناب حاضر ہو گئے۔ ہم تم جیسے بے مروت نہیں۔"

"کیا بے مروتی دکھائی ہے میں نے۔" اس نے حیرت سے سیاہ آنکھیں پھیلائیں۔

"ایک کافی تک تو پلا نہیں سکیں تم۔"

"سچ طلال۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ تم سے ذرا بھی برداشت نہ ہو سکا اور منہ پھلا کر چل دیے۔ تب

میں بھی اکڑ گئی۔" وہ ہنسی... وہ بھی مسکرا دیا۔
"اچھا یہ بتاؤ فیروز اور عزیر کہاں گئے۔"
"تمہاری بائیک پر آوارہ گردی کرنے نکلے ہیں۔ سچ میں سوچ رہی تھی کہ برستی بوندوں میں تمہاری بائیک کے پیچھے بیٹھ کر مزے سے دور تک گھوم آؤں گی۔ مگر ان دونوں نے سارے منصوبے کو ملیا میٹ کر دیا۔ اچھا یہ بتاؤ۔ مجھے اس وقت آئس کریم کھلانے لے چلو گے ناں۔" اس کی ستارہ ایسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بے طرح چمک رہی تھیں۔
"بیمار ہو جاؤ گی۔ موسم خاصا خنک ہے اور اوپر سے بارش بھی ہو رہی ہے۔"
"تو کیا ہوا... زیادہ سے زیادہ مر ہی جاؤں گی ناں۔ کسی کا کیا جائے گا۔" اس کی بات پر طلال... کو دھچکا سا لگا۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ سا گیا۔ دفعتاً" اس کا دل چاہا۔ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہہ دے۔
"تمہیں کیا معلوم پگلی کہ سب سے زیادہ تو میرا ہی جائے گا۔ تم میری زیست کا حاصل ہو۔ میری روح ہو۔ تم جدا ہو گئیں تو پھر کس کام کی یہ زندگی۔"
"ہیلو کہاں کھو گئے۔ لے چلو ناں۔" وہ اس کی آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچاتی بولی۔
"اوکے۔"
وہ بلیک کلر کی اکورڈ سیاہ گیٹ سے باہر لے آیا۔ اس کی معمولی سے معمولی خواہش بھی رد کرنا جیسے اس کے لیے ناقابل عمل تھا۔ وہ اگر اسے آنکھیں بند کر کے انگاروں پر بھی چلنے کو کہتی تو بے دریغ عمل کر ڈالتا... سیاہ کول تار بھیگی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ ونڈ اسکرین پر پڑتی بوندوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ مینو کی معصوم اور دلچسپ باتوں سے بھی محظوظ ہوتا رہا۔
"آئس کریم پارلر" سے آئس کریم کے کپ تھامتے مینو بولی۔
"تھینک یو سو مچ طلال۔ کیا تم یہ ذمہ داری روز نہیں لے سکتے۔" اس کا دل چاہا کہ کہہ دے کہ میں ساری عمر کے لیے یہ ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔
سانولی شام میں اس گندمی رنگت والی بلا کو مقابل پا کر وہ ہمیشہ کی طرح دل کی بات زبان پر نہ لا سکا۔
"کیا سوچ رہے ہو۔" مینو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
"کچھ نہیں۔" سوچ میں ڈوبی جھلملاتی نیلگوں آنکھیں اس کے نازک سراپے پر مرکوز ہو گئیں۔
"یہ کبھی کبھی تم اتنے بور کیوں ہو جاتے ہو طلال۔"
"پتا نہیں۔" وہ اداسی سے مسکرایا اور پھر سنبھل گیا۔ "اے خوب صورت بلا۔ اب کیا ارادے ہیں۔ واپس چلیں یا..." وہ ہنسی۔
"اگر کہیں اور چلنے کو کہہ دیا تو واویلا مچا دو گے کہ جیب بالکل ہی خالی کروا دی۔ مابدولت اتنے سنگدل نہیں۔ اس لیے باقی کا پروگرام آئندہ کے لیے ٹال دیا۔"
"سر تسلیم خم ہے۔ جو مزاج یار میں آئے۔"
وہ سر کو ہلکا سا خم دے کر بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور طلال کی شرارتی آنکھوں میں بے شمار جگنو سے چمک اٹھے۔

☆ ☆ ☆

"مینو... مینو۔"
دل کی دھڑکنیں ایک تواتر سے اس لڑکی کا نام پکار رہی تھیں۔ وہ رات سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو اس کی آنکھوں میں اس کے سپنے در آئے۔ وہ بہت چھوٹا تھا تب سے اسے سیاہ آنکھوں اور گندمی رنگت والی مینو اچھی لگا کرتی تھی۔ وہ اس سے پورے پانچ سال چھوٹی تھی۔ مگر وہ بڑے رعب سے اس سے اپنے سارے کام کروایا کرتی تھی۔
"طلال یہ کر دو۔ طلال وہ کر دو... ساتھ والے گھر سے میرے لیے کیریاں توڑ لاؤ... میرے کپڑے استری کر دو... میرا ہوم ورک کر دو۔"
وہ رعب سے حکم چلائے جاتی۔ اور وہ دوڑ دوڑ کر اس کے سارے کام کیے جاتا۔ وہ ہر قیمت پر اس گڑیا سی لڑکی سے بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس میں کبھی ہمت

ہی نہ پیدا ہو سکی وہ مینو کی معمولی سی بات بھی رد کر جاتا۔
"اگر میری بات پوری نہ کی تو میں تم سے خفا ہو جاؤں گی۔وہ اسے دھمکی دے دیتی۔
"تم مجھ سے خفا ہو کر تو دیکھو۔ میں اپنی جان دے دوں گا۔"
"جھوٹ۔"
"آزمالو۔پھر تو یقین کرو گی۔"
"طلال اگر کوئی تمہیں قید کر لے تو تمہیں کتنی تکلیف ہوگی۔ہے ناں۔"
"کیا مطلب....."
"فیروز بہت ظالم ہے۔کل اس نے میرے سامنے ایک ننھی چڑیا کے سارے پر توڑ ڈالے۔وہ معصوم بتا بھی نہ سکی کہ اسے کس قدر تکلیف ہوئی ہوگی۔"
وہ شروع سے ہی بے حد حساس تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں کو دل پر لے لیتی۔دوسروں کی خوشیوں اور غموں کو اندر اتارنے کا طریقہ آتا تھا اسے.....وہ پھولوں سے پیار کرتی تھی۔ اسے رنگوں سے محبت تھی۔ آکاش کی وسعتیں' سیاہ بادل' جھومتی ہوائیں اس کی سیاہ آنکھوں میں طمانیت کا بھرپور احساس بھر دیتیں۔
گرمیوں کی چھٹیوں میں جب فیروز' تایا جی کے ساتھ چلا آتا تو تب مینو کو پارٹنر بنانے کے سلسلے میں دونوں میں خوب خوب جھڑپ ہوتی۔ طلال اس پر اپنا حق سمجھتا تھا اور فیروز الگ اس کا دعویدار ہوتا اور پھر خود بخود ہی دونوں میں سمجھوتا ہو جاتا کہ اسے باری باری پارٹنر بنائیں گے۔ لیکن خدا گواہ ہے جب وہ فیروز کی پارٹنر بن جاتی تو تب طلال کا سارا دھیان کھیل کے بجائے اسی کی جانب رہتا۔
ایک مرتبہ اس کی سالگرہ کے موقع پر طلال نے اسے بڑا خوب صورت "ڈولز ہاؤس" دیا۔ مینو نے اس تحفے کو اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ چھوڑا اور ساتھ میں فیروز کو جتا بھی دیا۔اس گڑیوں کے گھر میں وہ طلال کے ساتھ رہے گی اور فیروز نے غصے میں آکر وہ گھر توڑ پھوڑ ڈالا۔
"نہیں اس گھر میں صرف تم اور میں رہیں گے۔ طلال نہیں۔" اور مینو کتنے دنوں تک روتی رہی۔
"میں تمہیں دوسرا "ڈولز ہاؤس" لے دوں گا مینو۔" طلال نے اسے دلاسا دیا۔
"نہیں اسے بھی فیروز توڑ ڈالے گا۔وہ تمہاری اور میری دوستی سے جلتا ہے۔" اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔
"تم یوں کرنا اب کے اس "ڈولز ہاؤس" کو اپنی الماری میں تالے میں رکھ چھوڑنا۔ پھر تو وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"
"ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔" طلال کی تجویز پر وہ ایک دم ہی خوش ہو گئی۔
لیکن شعور کی منزلوں تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی اجاگر ہوتی چلی گئی کہ فیروز اپنے دعوے میں درست تھا۔ مینو بچپن سے ہی فیروز سے منسوب تھی اور ان دونوں نے مل کر ہی ایک گھر بنانا تھا۔ جبکہ طلال کا مینو کی زندگی پر کوئی حق نہیں تھا۔
مینو کو خود سے بھی زیادہ عزیز رکھنے والا' اس پر اپنی ملکیت جتانے والا طلال اندر ہی اندر ٹوٹ کر رہ گیا۔ محبت کا وہ پودا جو شعور کی منزلوں تک پہنچتے پہنچتے ایک تناور درخت بن گیا تھا اور جس کی جڑیں بہت اندر تک پھیل چکی تھیں' ان جڑوں کو کاٹنا اب اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔
کئی بار طلال کا دل چاہا' وہ امی سے اپنے دل کی بات کہہ دے۔ دو ایک بار دبے دبے لفظوں میں کہا بھی' لیکن کام نہ بن سکا۔
"امی' ہمارے خاندان میں بچپن سے جوڑے جانے والے رشتوں کی رسم کس قدر فرسودہ اور بودی ہے۔"
"کیوں کیا ہوا؟" امی چونک اٹھیں۔
"یہ ضروری تو نہیں۔ بچپن کے رشتے بڑے ہو کر بھی بچوں کے لیے قابل قبول ہوں۔" وہ گول مول انداز میں بولا۔
"تم کس کی بات کر رہے ہو۔"

"مینو اور فیروز کی... ہو سکتا ہے مینو کو فیروز پسند نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فیروز کے لیے یہ تعلق غیر اہم ہو۔"

"تم سے کسی نے کچھ کہا کیا؟ مینو نے یا پھر فیروز نے... ویسے میں ایک بات تم پر واضح کردوں۔ اس گھر میں رشتے جوڑنے کا کام بزرگوں کا ہے اور ان کے فیصلوں سے ٹکرانے یا انحراف کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں اور میرے خیال میں مینو اور فیروز بھی ایسی حماقت نہیں کریں گے۔"

امی کی باتوں میں حقیقت کی تلخیاں تھیں۔ وہ ان سے مزید کچھ نہ کہہ سکا اور نہ ہی کبھی مینو پر اپنے دلی جذبات آشکار کر سکا۔ وہ اس لڑکی سے کہتا بھی کیا؟ وہ اسے صرف اپنا دوست کہتی تھی۔ جواباً" وہ اسے کیا بتاتا... وہ اس کی محبتوں میں اتنی دور نکل آیا ہے۔ جہاں واپسی کی گنجائش ممکن نہیں۔

دیکھیں۔ یہ زندگی کس کروٹ بیٹھتی ہے اور اسے کون سا رنگ ڈھنگ دکھاتی ہے؟

☆ ☆ ☆
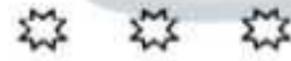
اس شام وہ اپنے چند یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ لبرٹی ایسے ہی گھومنے کے لیے نکلا تھا۔ جبھی سامنے گول گپوں کے اسٹال پر مینو اسے ایک اجنبی کے ساتھ نظر آگئی۔ وہ گول گپے کھانے کے ساتھ ساتھ اس شخص سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہی تھی اور دفعتاً" طلال کو لگا جیسے اس کی قوت بصارت جواب دے گئی ہو۔ تبھی اگلے لمحے اس کا خون کھول اٹھا۔

وہ تو گھر میں اپنی کسی سہیلی کی طرف جانے کا کہہ کر گئی تھی اور باہر یہ گل کھلاتی پھر رہی تھی۔

طلال کے لیے جیسے اس چمکیلے دن کی یہ بے درد ساعتیں گزارنا انتہائی دشوار ہو گیا۔ گھر آ کر وہ کتنی دیر سرسبز اور پھولوں سے بھرے لان کے درمیان یہاں سے وہاں ٹہلتے خود کو تھکاتا رہا۔

حالانکہ وہ بخوبی جانتی ہے کہ اس کا رشتہ بچپن سے فیروز سے طے ہے۔ پھر یہ بے راہ روی کیوں؟

"ہیلو بھئی۔ یہ ٹہل ٹہل کر خود کو کس خوشی میں تھکایا جا رہا ہے۔" اس کی پشت پر مینو کی آواز ابھری تو وہ ایڑیوں پر گھوما۔

وہ ابھی چند لمحوں پہلے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی اور اسے لان میں ٹہلتے پا کر سیدھا اس کی طرف چلی آئی تھی۔

طلال کی آنکھوں کے سامنے چند گھنٹوں پہلے کا منظر روشن ہو گیا۔ گول گپے کھاتی مینو کسی اجنبی کے ساتھ باتوں میں مگن مینو۔ وہ تمتماتے چہرے سمیت آہستگی سے غرایا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟"

"کک... کیا مطلب۔"

مقابل کے سخت لہجے اور کھردرے انداز نے مینو کو ایک لمحے کو گڑبڑا دیا۔ اس شخص نے آج تک اس سے اس انداز اور اس لہجے میں بات نہیں کی۔ تو پھر یکایک یہ اس کے لہجے میں حدت کیوں...؟ یہ اس کی نیلگوں آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں کیوں؟

"دیکھو مینو مجھ سے کسی قسم کا جھوٹ مت بولنا۔"

"آخر تم پوچھنا کیا چاہتے ہو۔"

"سچ سچ کہو وہ کون تھا۔ جس کے سنگ تم لبرٹی میں گول گپے کھا رہی تھیں۔ تم اتنی دیدہ دلیر ہو گئیں کہ کھلم کھلا ایک اجنبی کے ساتھ گھومنے پھرنے لگیں۔ کب سے یہ سلسلہ شروع ہے۔ تم نے اپنے خاندان کے ناموس کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچا۔"

"اوہ..." لمحہ بھر کو مینو کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔

غصے اور وحشت کی دھند کے پیچھے طلال جو کچھ کہتا رہا تھا اس نے جیسے مینو سے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ہی چھین لیں۔ وہ چند لمحے تو اسے بے حد حیرت سے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی گندمی رنگت میں سرخی دوڑ گئی اور حسین آنکھوں میں شعلے سے لپک اٹھے۔

"تم طلال... تمہیں مجھ سے باز پرس کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں خود کو تمہارے ان فضول سوالوں کا جواب دینے کا پابند نہیں پاتی۔"

مینو سے اس قدر روکھے اور کھردرے جواب کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ہاں واقعی وہ بھلا کون تھا اس کا؟
"سوری مینو۔ آئی ایم رئیلی سوری۔" سر جھکا کر بے حد مدھم لہجے میں کہتے وہ واپس جانے کو مڑ گیا۔
"طلال.... ایک منٹ۔"
اسے اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے رخساروں پر ندامت کا رنگ نمایاں تھا۔
"رکو.... رکو طلال۔"
وہ دوڑتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی اور اس کا بازو تھام لیا۔
"نہیں مینو۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے تم سے ذاتی سوال پوچھنے ہی نہیں چاہیے تھے۔" روشن آنکھیں بے تحاشا مضطرب تھیں۔
"کیوں پوچھنے نہیں چاہیے تھے۔ تم میرے بہترین دوست ہو۔ میں تمہیں شازل کے بارے میں سب کچھ بتادوں گی۔"
"اچھا بتاؤ کون ہے وہ...." وہ وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔
"میری فرینڈ اسما کا کزن۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہے۔ مجھ سے سچی محبت کرتا ہے ہماری اکثر ملاقات اسما کے گھر ہی ہوتی ہے۔ لیکن آج ضد کر کے وہ مجھے لبرٹی لے گیا اور وہاں تم نے دیکھ لیا۔"
"یہ سب ٹھیک نہیں ہے مینو۔"
کرچی ہوتے دل کو سنبھالے طلال نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ مینو کی سیاہ آنکھوں میں بڑی شوخ سی چمک تھی اور گالوں پر گلال بکھرا تھا۔ جو لمحہ بھر میں اس پر یہ ثابت کر گیا کہ معاملہ کافی دور تک جا پہنچا ہے۔ اور وہ لڑکی اس شخص کی محبت میں پاگل ہو رہی ہے۔
"وہ بہت اچھا انسان ہے طلال۔ بہت حساس اور کھرے جذبوں کا مالک۔ وہ بڑی خوب صورت باتیں کرتا ہے۔ اس کا دل بہت شفاف ہے۔ اس کی آنکھوں سے اس کی سچائیاں چھلکتی ہیں۔"
وہ آنکھیں بند کیے ایک جذب کے عالم میں بولے چلی گئی۔

"تم نے اتنی سی مدت میں اس کی محبت کو پرکھ بھی لیا مینو۔ اس کا اعتبار بھی کر لیا۔" اسے اپنی آواز دور پہاڑ کی چوٹی سے آتی محسوس ہوئی۔
"محبت کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے طلال۔ اس کے لیے صدیاں گزارنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" "پتا ہے طلال.... وہ کہتا ہے۔ اس کی زندگی کی اصل خوشی میری ذات سے وابستہ ہے۔ جس دن وہ میرا چہرہ نہیں دیکھ لیتا سورج نہیں نکلتا۔"
تو اس شخص نے ایسی کچھے دار باتوں سے مینو کو شیشے میں اتارا ہے۔ باوجود ضبط کے طلال کو پھر غصہ آ گیا۔ اس کے لہجے میں حدت دوبارہ سے عود کر آئی۔
"مینو.... ہر ایرے غیرے کی باتوں پر یقین کر لینا شریف بہو بیٹیوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ تمہیں کیا معلوم کہ یہ دنیا کتنی ظالم ہے۔ یہ تو تتلیوں کے رنگ بھی نوچ لیا کرتی ہے۔ یہاں لوگ آستینوں میں خنجر چھپائے پھرتے ہیں اور پھر موقع ملتے ہی پشت میں گاڑ دیتے ہیں۔"
"لیکن شازل بالکل ایسا نہیں ہے۔ تم اس سے ملے نہیں ہو ناں اس لیے اس کے متعلق اتنا غلط سوچ رہے ہو۔" وہ ایک دم ہی اٹھ گئی اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔
اور پھر طلال نے کتنی مرتبہ مینو کو موبائل پر اس شخص سے باتوں میں مگن دیکھا۔ وہ کئی بار شازل کے سنگ ادھر ادھر دکھائی بھی دی مگر اس دن کے بعد اس نے مینو سے اس موضوع پر بات کرنا ہی چھوڑ دی کہ اپنی محبت کے بارے میں برائی کوئی کہاں برداشت کیا کرتا ہے۔ اور طلال کی دانست میں وہ شازل کے لیے بے حد سنجیدہ تھی۔
"ان دنوں کہاں غائب رہتے ہو طلال.... گھر پر نظر ہی نہیں آتے۔" اس رات وہ دیر سے لوٹا تو اسے اپنا منتظر پایا۔
"مصروفیت بڑھ گئی ہے۔"
"مصروفیت تو پہلے بھی تھی۔ پھر یکایک کیا ہوا کہ تم مجھ سے بات کرنے سے بھی گئے۔" مینو نے بڑی

گہرائی سے اس کی آنکھیں پڑھنا چاہیں۔
"تم کہو۔ اتنی رات گئے کیوں جاگ رہی ہو۔" اس نے بات بدلی۔
"تمہارے انتظار میں۔ آج تم سے پورا پورا حساب چکانے کا ارادہ ہے۔ اتنے دنوں سے جو مجھے نظر انداز کر رہے ہو۔ قسم سے تم نے تو بالکل بور کر کے رکھ دیا ہے۔"
"اچھا۔ میرے خیال میں تو آج کل تمہیں قطعی بور نہیں ہونا چاہیے۔" وہ بولا تو مینو کتنی دیر ہنستی رہی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔
"تو اس کا مطلب، جناب کو مابدولت کے بارے میں پوری پوری معلومات ہیں۔"
"بالکل ایک دوست ہونے کے ناطے میرا فرض ہے کہ میں تمہارے متعلق ہر طرح کی معلومات رکھوں۔" وہ صاف آواز میں بولا۔
"تمہیں اچھے برے کے فرق سے آگاہ کروں۔ جیسے ... جیسے کہ میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ شخص شازل تمہارے لیے قطعی مناسب نہیں۔ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں کوئی ایسی خوبی بھی نہیں جس کے تحت وہ کرنل آفتاب احمد کی دختر نیک اختر امینہ آفتاب کا شریک سفر بننے کا اہل ہو سکے۔"
"یعنی تمہارے خیال میں نچلے طبقے کا ہونا کوئی جرم ہے۔" مینو کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔
"کوئی جرم نہیں، لیکن تم اس شخص کی حقیقت سے لاعلم ہو۔"
"مجھے اس کے متعلق کچھ جاننا بھی نہیں۔ پلیز تم مجھے اس سے بدظن کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ جو بھی ہے جیسا بھی ہے۔ مجھے ہر حال میں قبول ہے سمجھے۔"

☆ ☆ ☆

شہر میں ان دنوں ایک طویل جھڑی لگ گئی۔ اور اپنے سنگ اداسی کا بے پناہ سماں لے آئی۔ لیکن سردی کی جلد گہری ہوتی شام نے اس میں اضافہ کر دیا۔

سرمئی بادلوں کے ہلکے سے اندھیرے میں بالکنی میں آرام کرسی پر نیم دراز وہ سامنے آکاش کی وسعتوں میں کچھ تلاشتا بے حد آزردہ ہو رہا تھا۔ کمرے میں مکمشی کی افسردہ آواز گونج رہی تھی۔
"تمہیں زندگی کے اجالے مبارک
اندھیرے ہمیں آج راس آگئے ہیں۔"
"ہیلو طلال جی۔"
جھرنوں جیسی مدھر آواز پر طلال نے گردن موڑی۔ ٹیوب لائٹ کی اجلی روشنی کے بیچوں بیچ سیاہ آنکھوں اور سیاہ پلکوں والی اپنے نازک سراپے سمیت موجود تھی۔
"بہت اداس ہو۔" اس نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اور کس ہستی کے ٹھکرا دینے پر اسے زندگی کی خوشیوں کی مبارک دے رہو۔ سچ کہو طلال کون ہے وہ۔ تم نے تو کبھی اس کے بارے میں ہوا بھی نہیں لگنے دی۔"
"وہ صرف ایک خواب ہے۔ سپنا ہے۔" وہ دل گیر ہو گیا۔
"میں اسے حقیقت میں بدل دوں گی۔ تم ایک بار مجھے اس کا ایڈریس تو بتاؤ۔ کان سے پکڑ کر تمہارے قدموں میں لا ڈالوں گی ... غضب خدا کا۔ ایک اتنے مخلص اور کھرے شخص کا اس لڑکی نے یہ حال کر دیا کہ بالکل مجنوں بنا چھوڑا ... اگر تم نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا تو آج اس حال تک نہ پہنچتے۔ دوستی کا دعوا کرتے ہو اور دوستوں سے حال دل بھی چھپاتے ہو۔ دس از ناٹ فیئر۔"
"میں تمہیں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔" طلال نے ایک گہرا سانس بھرا۔
"کیوں کہ وہ میری پہنچ سے بہت دور ہے۔ بے حد دور۔"
"تو پھر بھول جاؤ اسے۔" مینو نے لاپروائی کا شاندار مظاہرہ کیا۔
"چاند کو پانے کی تمنا دیوانگی کے سوا کچھ نہیں

ہوتی۔" اس نے شان بے نیازی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

اور پھر جلد گہری ہوتی شامیں بے حد اداس گزرنے لگیں۔ طلال کو وہ اکثر شازل کے سنگ دکھائی دے جاتی۔ ادھر ادھر کئی بار اس نے مینو کو اس شخص کے ہمراہ دیکھا۔ لیکن کبھی کچھ نہ کہہ سکا۔ ہر موضوع پر بے تکان بولنے والے کی زبان اس موضوع پر آکر رک سی جاتی۔ پتا نہیں کیوں جیسے اسے یقین سا تھا ایک نہ ایک دن مینو خود ہی شازل کو پہچان لے گی۔ کسی دن شازل کی اصلیت مینو پہ آشکار ہو گئی تو وہ ان راہوں سے واپس لوٹ آئے گی، جو راہیں اسے گم گشتہ منزل کی طرف لے جا رہی ہیں۔ لیکن طلال کے سارے مفروضے محض مفروضے ہی رہے۔ وہ ہر گزرتی ساعتوں کے زیر اثر شازل کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ تبھی ایک شام طلال دبے دبے لفظوں میں کہہ اٹھا۔

"مینو۔ تم بہت غلط جا رہی ہو۔"

"کیا مطلب۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو مینو۔ اس خاندان کے نفوس بہت غیرت والے ہیں۔ وہ قطعی طور پر تمہارا تعلق شازل کے ساتھ برداشت نہیں کریں گے۔"

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے اور مجھے تو کبھی کبھی تم پر بے انتہا حیرت ہوتی ہے طلال۔ تم اچھے دوست ہو۔ بجائے میرا ساتھ دینے کے بجائے میری مدد کرنے کے الٹا میرا دل دکھا رہے ہو۔ میری منزل کھوٹی کر رہے ہو۔ تم میرے معاملے میں اتنے پتھر دل تو نہیں تھے۔"

"میں تمہارا دوست ہی ہوں مینو۔" طلال نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"تبھی تو تمہیں غلط راہوں سے واپس موڑ لانا چاہتا ہوں۔"

"ہم کوئی دوسری بات نہیں کر سکتے طلال۔"

بے حد ترش لہجے میں کہا گیا تو طلال علی نے بھانپ لیا کہ وہ اس موضوع پر کچھ بھی سننا پسند نہیں کرتی۔

"دوسری بات تو یہی ہے کہ تم فیروز کے بارے میں سوچو۔"

"کیوں سوچوں۔" وہ ٹھنکی۔

"اس لیے کہ تمہاری نسبت اس سے طے ہے۔"

"لیکن میں اس رشتے کو بالکل بھی نہیں مانتی۔ جب یہ سب ہوا۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ میں کوئی گائے بھینس نہیں ہوں۔ جسے یہ بزرگ اپنے دلپسند کھونٹے سے باندھ دیں۔" وہ بہت کڑوے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"آفتاب ماموں اس سلسلے میں بہت پکے ہیں۔"

"طلال تم کیوں مجھے بزدل بنانے پر تلے ہو۔" وہ چڑ سی گئی۔

"فار گاڈ سیک۔ اگر ہمت نہیں بندھا سکتے تو۔ تو ناامید بھی مت کرو۔"

وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔ تبھی طویل شیشوں والے دروازے نے زور سے بند ہو کر اس کی خفگی کا اظہار کر دیا۔ اور پھر رات کھانے کی میز پہ بھی وہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود نہیں تھی کرنل آفتاب کے ساتھ ساتھ عزیر اور شمروز نے بھی مینو کی عدم موجودگی کو بری طرح محسوس کیا۔

"یہ مینو کہاں غائب ہے۔ حالانکہ اس سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔" کرنل آفتاب بیٹی کی رگ رگ سے واقف تھے۔

"میں اسے بلانے گئی تھی۔ لیکن وہ سر درد لیے پڑی ہے اور صاف طور پر کہہ دیا کہ بھوک بھی نہیں ہے۔" حنا نے جواباً کہا تو کرنل آفتاب کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ہویدا ہو گئے۔

"یہ اچانک سر درد کا کیا جواز۔ دوپہر میں تو اچھی بھلی تھی۔ میرا خاصا دماغ کھا کر گئی تھی۔"

"آپ جانتے تو ہیں بابا جان، وہ شروع سے ہی ایسی ہے۔ چھوٹی موٹی سی اور موڈی بھی ضرور اس کے خلاف مزاج کوئی بات ہوئی ہے۔ جبھی سر درد کا کہہ دیا۔" شمروز کے لہجے میں بہن کے لیے محبت کوٹ

کوٹ کر بھری تھی۔

"ٹھہو میں اسے دیکھتی ہوں۔" امو جان اپنی لاڈلی کی طبیعت ناسازی کا سن کر ایک دم ہی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر خاموش بیٹھے طلال کی طرف گردن گھما کر پوچھنے لگیں۔

"ضرور طلال کو اس بارے میں علم ہو گا۔ ذرا بتاؤ تو۔ اس کے سر درد کی کیا وجہ ہے۔"

"مجھے خود بھی علم نہیں ممانی۔" طلال اس اچانک سوال سے گڑبڑا اٹھا۔

اور پھر رات کھانے کے بعد طلال نے اس کی ناراضی کو بری طرح محسوس کرتے ہوئے۔

اس کے کمرے میں مدھم دستک کے ساتھ اندر چلا آیا۔

"مینو۔ خفا ہو کیا؟"

سیاہ آنکھیں لمحہ بھر کو اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ خمار آلود گلابی اندھیرے میں سفید سلک زیب تن کیے وہ بے حد دل گرفتہ اور اداس لگ رہی تھی۔ گندمی رنگت میں املتاس کی سی زردیاں گھلی تھیں۔

"طلال۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئی۔

"تم نہیں جانتے۔ شازل میرے لیے کیا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں مینو۔ میں تمہارے احساسات کو بخوبی سمجھ رہا ہوں۔"

"پھر تم اس سلسلے میں بزرگوں سے بات کرو گے ناں۔ میرے حق میں بولو گے ناں۔" اس نے ایک دم ہی طلال علی کے مضبوط ہاتھ تھام لیے۔ "تم بابا جان کو قائل کر لینا شازل کے لیے۔" معصومیت کے پردے میں لپٹی یہ باتیں طلال علی کو بے انتہا اذیت دے گئیں۔

"بولو طلال۔ میرا ساتھ دو گے ناں۔"

"ہر جنم میں۔ آخری سانسوں تک۔" نیلے پانیوں والی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے تو سیاہ آنکھیں لو دینے لگیں۔

"پتا کیا طلال۔ مجھے خود سے بھی زیادہ تم پر اعتماد ہے۔ جانے کیوں مجھے یقین سا ہے کہ ساری دنیا میرا ساتھ چھوڑ سکتی ہے مگر تم نہیں۔ ایسا کیوں ہے طلال۔"

"میں کیا جانوں۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"بس طلال۔ تم سدا میرے ساتھ رہنا۔ میری پرابلمز شیئر کرتے رہنا۔ ہر مقام پر۔ ہر مشکل میں میری ڈھال بن جانا۔ تمہارے مضبوط وجود کے پیچھے چھپ کر میں دنیا کی ہر آفت سے محفوظ ہو جاتی ہوں۔ تم خدا کی طرف سے میرے لیے تحفہ ہو۔" وہ ایک جذب کے عالم میں بولتی چلی گئی۔

"میں نے شازل کو بھی تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"کیا بتایا ہے۔" وہ چونکا۔

"یہی کہ تم میرے بہت اچھے دوست اور بچپن کے ساتھی ہو۔"

"تمہارا اتنا ہی تسلیم کر لینا میرے لیے بہت کافی ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو زندگی کے طویل سفر میں زاد راہ کا کام دیں گے۔ ان الفاظ کے سہارے میں اپنی گم گشتہ منزل کی طرف ہولے ہولے گامزن رہوں گا۔" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

"پتا نہیں طلال۔ تم بھی کبھار کیسی باتیں کرتے ہو کہ بالکل ہی میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔"

"تم میری باتیں کبھی بھی سمجھ نہیں پاؤ گی پاگل لڑکی۔" وہ ایک دم ہی ہنس دیا۔ "چلو اب اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔ باقی مذاکرات کل پر موقوف۔ اوکے گڈ نائٹ اینڈ سویٹ ڈریمز۔" وہ اس کے کمرے کا زیرو پاور کا بلب روشن کر کے جانے کو مڑا۔

"طلال۔۔۔"

"کہو۔۔۔" وہ جاتے جاتے رک گیا۔

"تم بہت اچھے ہو۔"

"اور تم مجھ سے بھی زیادہ اچھی۔" وہ ہنس دیا۔

☼ ☼ ☼

فصل بہار کی آمد کے ساتھ ہی کائنات نے ایک نیا

لبادہ اوڑھ لیا تو موسم کا یہ اثر "آفتاب لاج" کے مکینوں پر بھی خاطر خواہ ہوا۔ تب شگوفوں اور دھنک رنگ پھولوں کی ساری رنگینیاں اور مسکراہٹیں کرنل آفتاب احمد کے اس خوب صورت گھر میں اتر آئیں جب اس خاندان کے لاڈلے سپوت شمروز آفتاب کی شادی خانہ آبادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ سبھی بے انتہا خوش تھے مگر امینہ آفتاب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس گھر میں بھابھی اس کی پسند سے آرہی تھی۔ عافیہ نہ صرف اس کی دوست تھی بلکہ اس کی کلاس فیلو بھی رہی تھی۔

"بھیا آپ کی اور عافیہ کی جوڑی چاند سورج کی ہے۔" مسرت سے تمتماتے چہرے سمیت مینو نے کہا تو شمروز ہنس دیا۔

"بھئی ظاہر ہے ہماری گڑیا کی پسند کوئی ایسی ویسی تھوڑا ہی ہے۔"

"تو پھر لایئے انعام۔" اس نے ہتھیلی پھیلادی۔

"کس خوشی میں۔"

"اتنی پیاری شریک سفر بطور تحفہ دینے کی خوشی میں۔"

"بے فکر رہو گڑیا۔" شمروز کے لہجے میں شرارتوں کا رنگ شامل تھا۔

"تمہارا انعام بھی اتنا ہی حسین ہے کہ تم تاحیات رشک کروگی۔"

"اس انعام کا حدود اربعہ بتایئے۔" وہ پوچھنے لگی۔

"وہ پیارا سا انعام فیروز عالم ولد افتخار عالم ہے۔ جس کے نام کی پکی پکی مہر لگانے کے سلسلے میں عنقریب ہی اقدام اٹھایا جارہا ہے۔"

"بھیا۔" اس کا چہرہ یکلخت ہی سفید پڑ گیا۔

"ارے بھئی اگر یقین نہیں آرہا تو بے شک اس طلال سے تصدیق کرلو۔" اندر آتے طلال پر نگاہ پڑتے ہی شمروز نے کہا۔

"یہ کل ہی تو فیروز کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ کیوں طلال۔ تم تعریف کر رہے تھے ناں مینو کے منگیتر کی۔"

خوشگوار ساعتوں کے جلو میں طلال اس گندمی رنگت والی کی بگڑتی حالت پر پریشان ہوگیا۔ اس لیے بات مذاق میں ٹالنے کو بولا۔

"یار تعریف اس خدا کی جس نے اس سرپھری لڑکی کو بنایا۔"

"یار بات مذاق میں نہیں ٹالو۔ یہ ہماری گڑیا کی زندگی کا سوال ہے۔ سچ کہو فیروز ایک بہترین شخص ہے ناں اور مینو کے لیے بالکل مناسب بھی۔" شمروز بولا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں شمروز۔۔۔ یہ تو بزرگوں کے فیصلے ہیں اور بزرگوں کے فیصلے اکثر درست ہی ہوتے ہیں۔"

طلال نے مدھم لہجے میں کہتے سامنے کھڑی لڑکی کی جانب دیکھا جو خود کو سنبھال چکی تھی۔ البتہ سیاہ آنکھوں میں دھند سی ہویدا تھا۔ یہ دھند طلال کو اپنے وجود کے اطراف میں پھیلتی محسوس ہوئی اور اس کے اندر کی بے چینی میں اضافہ کرگئی۔ اس پیاری سی دل جان کے قریب ہستی کو ذرا سی بھی اذیت پہنچے' یہ اس کے لیے قطعی ناقابل برداشت تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شانزل کے سلسلے میں اس کی پیش قدمی ایک غلط ترین عمل ہے لیکن اگر وہ اس میں خوش تھی تو اس کے لیے یہی بہت تھا۔ اس عزیز از جان ہستی کے لبوں پہ مسکراہٹ دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ اور اس نے آن واحد میں سوچ لیا کہ چاہے کوئی شانزل کے معاملے میں اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ وہ ضرور اس کی خوشی میں ساتھ دے گا۔ یہ فیصلہ گو کہ طمانیت لیے ہوئے تھا لیکن دل کے گوشوں میں اضطراب ضرور جاگ اٹھا کہ مینو کی ہمراہی کے خواب تو اس نے بھی دیکھے تھے۔ مگر اس کی محبت خود غرض نہیں تھی۔ تبھی تو وہ تیاگ دینے کے اصول پر کارفرما تھا۔ اور چپ چاپ اس کی خوشیوں کے لیے سرگرم بھی۔

☆ ☆ ☆

شادی سے ایک ہفتہ پہلے فیروز کا نزول بھی ہوگیا اور

مینو کی مشکلات میں مزید اضافہ کر گیا۔ فیروز کا حاکمانہ انداز اور اجارہ دارانہ رویہ مینو کا خون خشک کیے رکھتا۔ اسے فیروز کی نظروں سے خوف آنے لگا تھا۔ اس مرتبہ کا فیروز پچھلے فیروز کی نسبت یکسر بدلا بدلا تھا۔ بہت اکھڑ مزاج خشک اور بد دماغ بھی۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں، جو اس کی شخصیت کو مزید رعب دار بنا رہی تھیں۔

"کیسی ہو مینو۔"

وہ لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ جبھی اپنے سامنے فیروز کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کے گھورنے کا انداز.... وہ سر جھٹک کر تیکھے انداز میں بولی۔

"کیسی نظر آ رہی ہوں۔"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ "ویسے آج کل بڑی ہواؤں میں ہو۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے سنا ہے کہ شمروز کی ہونے والی دلہن سراسر تمہاری پسند کی ہے۔ بھئی میں عورتوں کو ان کی اوقات میں رکھنے کا قائل ہوں۔ یہ تو تمہارے بھائیوں اور آفتاب چچا کا قصور ہے کہ انہوں نے تمہیں اتنا سر چڑھا رکھا ہے کہ تم ان کے تمام فیصلوں پہ اثر انداز ہوتی ہو اور ان پر اپنے فیصلے تھوپتی پھرتی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہارے بگاڑنے میں طلال علی کا بھی بہت ہاتھ ہے دوستی کے نام پر وہ تمہاری ہر جائز و ناجائز خواہش مانتا ہے۔ اور نتیجتاً" تم اتنی خود سر اور بد دماغ بن چکی ہو کہ کسی کے قابو کی نہیں رہیں۔"

سامنے کھڑے فیروز عالم کی نازیبا اور سخت گفتگو جیسے مینو کے نازک دل پر بہت گراں گزری۔ بے چینی سے انگلیاں موڑتی، ضبط گریہ سے سرخ ہوتی آنکھیں لیے وہ اتنا ہی بولی۔

"پلیز فیروز۔ زبان سنبھال کر بات کریں۔"

"دیکھا یہ اسی بد دماغی کا اثر ہے کہ تم اپنے ہونے والے شریک سفر سے تمیز سے بات تک کرنا بھول چکی ہو۔ جتنا جی چاہے پر پرزے نکال لو۔ لیکن اتنا ذہن میں رکھنا تمہیں عنقریب میری دلہن بن کر میرے گھر آنا ہے اور میں تمہارے سارے پر کتر ڈالوں گا۔"

فیروز عالم کے سفاکانہ لہجے پر مینو کی آنکھوں کے سامنے برسوں پرانا واقعہ گھوم گیا جب فیروز عالم نے بڑی بے دردی اور بے حسی سے ایک ننھی چڑیا کے پر نوچ پھینکے تھے اور اس پر ذرا بھی تاسف محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ ڈر سی گئی۔

بے درد ساعتوں کی اس اذیت ناک گھڑی میں یہ سوچ اس گندمی رنگت والی لڑکی کے دل میں اتر گئی۔

"اگر فیروز عالم نے اس کا حشر بھی اس چڑیا جیسا کر ڈالا تو...."

لمحوں میں ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور آنکھوں کے سامنے تنی اندھیرے کی چادر نے جیسے فیروز عالم کا وجود بالکل ہی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ مگر اس کی آواز مسلسل کانوں کو چھیدے ڈال رہی تھی۔

"ذہن میں رکھنا مینو۔ میرے گھر میں تم میرے حکم کے تابع ہوں گی۔ اور اس کے لیے خود کو ابھی سے ذہنی طور پر تیار کر لو۔"

"وہ وقت کبھی نہیں آئے گا فیروز عالم۔" اندر ہی اندر ڈولتی مینو یہ جملہ پوری شدت سے سامنے کھڑے شخص کے منہ پر مار کر اسے اس کی اوقات یاد دلانا چاہتی تھی لیکن موقع کی نزاکت کے تحت چپ ہو رہی۔ شادی کا موقع تھا اور پھر وہ اس گھر کا مہمان تھا۔ اس لیے معاملہ بد مزگی تک نہ ہی پہنچے تو بہتر ہے۔

دفعتاً" وہ جانے کو مڑی تو فیروز عالم اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

"اچھا یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ذرا یہ انگوٹھی پہن کر تو دکھاؤ۔" اس نے جیب سے سرخ رنگ کی مخملیں ڈبیا نکال کر ایک بیش قیمت انگوٹھی نکالی اور اس کا ہاتھ تھامنے کو ہاتھ آگے بڑھایا۔

"کیوں پہنوں یہ انگوٹھی۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"اس لیے کہ میں کہہ رہا ہوں۔"

"مگر میں آپ کا حکم کس خوشی میں مانوں۔" وہ رکھائی سے بولی۔

"اس لیے کہ میں تمہارا منگیتر بھی ہوں اور عنقریب ہونے والا شریک سفر بھی۔" وقت کے اس گھیرے سے میں سامنے کھڑی لڑکی کی کسی حجت کی پروا کیے بغیر فیروز عالم نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ سختی سے تھاما اور انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی۔

"یہ زیادتی ہے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"یہ اپنا حق استعمال کرنے کا طریقہ ہے۔" وہ ہنسا۔

"جنگلی' بد تہذیب۔"

وہ دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی اور بستر پر گر کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ آج تک اس سے کسی نے اتنی بدتمیزی اور بد تہذیبی سے بات نہیں کی۔ آج تک کسی نے اس پر اپنا حکم اس بھونڈے انداز میں نہیں تھوپا تو پھر وہ کون ہے اس پہ اس طرح اجارہ داری جمانے والا۔ بابا جان نے اس اجڈ شخص کو اس کی زندگی میں شامل کر کے ذرا بھی اچھا نہیں کیا۔ اس کے مقابلے میں وہ شازل کتنا نرم مزاج' دھیما اور خوب صورت سوچوں کا مالک ہے اور وہ.... وہ طلال بھی.... طلال نے آج تک اپنے کسی رویے سے اسے تکلیف نہیں دی۔ نہ ہی کبھی اس کی کسی بات سے روگردانی کی ہے۔ وہ نہایت خود اعتمادی سے طلال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی تمام باتیں منوا لیا کرتی تھی۔

اس نے انگوٹھی انگلی سے اتار پھینکنے کا سوچا لیکن انگوٹھی جیسے اس کی انگلی میں پھنس گئی تھی۔ زور لگانے کی کوشش میں اس کی انگلی سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ تیزی سے سوج بھی گئی۔

شام تک جب مینو اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی تو لاؤنج میں سب کے درمیان بیٹھے طلال کو بے حد تشویش ہوئی.... خدا کرے اس لڑکی کی طبیعت ٹھیک ہو۔

"کہاں چل دیے۔" چائے کی پیالی رکھ کر وہ جانے کو اٹھا تو فیروز عالم نے پوچھ لیا۔

"میں مینو کو بلانے جا رہا ہوں دراصل وہ شام کی چائے ہم سب کے ساتھ پیتی ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کی طبیعت خراب ہے جبھی وہ یہاں موجود نہیں۔"

"موجود ہو بھی کیسے سکتی ہے۔" فیروز مسکرایا۔

"مابدولت جو یہاں موجود ہیں۔ اس کے ہونے والے شریک سفر۔ ایسے شرمانا لجانا مشرقی عورت کی گھٹی میں پڑا ہے۔"

"لیکن میں مینو کو بخوبی جانتا ہوں۔ وہ شرمانے والوں میں سے نہیں۔ ضرور کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو اس کے مزاج کے خلاف ہے۔"

"طلال۔" فیروز نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"اگر تم میری ہونے والی بیوی کے ارد گرد منڈلانا چھوڑ دو تو ہو سکتا ہے اسے خود کو میری پسند کے مطابق ڈھالنے میں آسانی ہو۔ میں اسے ایک مکمل عورت کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور جو اس کے ایک اشارے پر اپنی جان دے ڈالتی ہے۔" فیروز کی باتوں پر طلال کے دل کے گوشوں میں جیسے اضطراب سا انگڑائیاں لینے لگا۔

"یاد رکھو فیروز۔ مینو ایک نازک لڑکی ہے۔ تمہاری ذرا سی سختی اسے ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم اس پر کسی سختی سے بہتر اسے وقت دو.... وقت خود ہی اسے تمہاری پسند کے مطابق ڈھال دے گا۔ اگر ابتدا میں تم نے اس سے سختی کی تو برے نتائج بھی نکل سکتے ہیں اور ایک بات اور فیروز وہ ابھی اپنے والدین کے گھر میں ہے۔ وہ ابھی تمہارے گھر نہیں گئی۔"

وہ اپنی بات کا رد عمل جاننے کو رکا نہیں اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا فیروز لب بھینچے بیٹھا رہ گیا۔ جبکہ شمروز اور عزیر کو اس کی دماغی حالت پر شک سا ہوا۔

"فیروز لگتا ہے۔ تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں یا ہو سکتا ہے تم کسی کی پڑھائی پٹی کے زیر اثر ہو جانتے ہو ناں کہ ہمیں اپنی بہن اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

شمروز کے سخت لہجے پر فیروز نے جیسے اندر ہی اندر خود کو سرزنش کی۔ جذباتی پن میں وہ مینو کے بھائیوں کے سامنے ہی اکڑ دکھا بیٹھا جو سراسر حماقت ہے۔ اور پھر ابھی تو صرف منگنی ہوئی ہے۔ کوئی نکاح نہیں ہوا جو اس کے بھائی اس کا لحاظ کریں اور اپنی بہن کے خلاف استعمال ہونے والے سخت جملوں پر صبر کا مظاہرہ کریں۔

"یار شمروز میں تو ایسے ہی طلال کو چڑا رہا تھا۔ جانتا ہوں ناں کہ وہ مینو کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتا.... کیا مثالی دوستی ہے دونوں میں۔" فیروز نے ایک دم پینترا بدل لیا۔

☆ ☆ ☆

اپنے سامنے اشکوں کے چراغ روشن کرتی مینو کو دیکھ کر طلال کے دل پر جیسے ایک گھونسا سا پڑا۔ سیاہ پلکوں والی آنکھیں سرخ تھیں۔ لب بھری تھیں اور سارا چہرہ متورم تھا۔

"کیا ہوا ہے مینو۔" وہ تیر کی طرح اس کی طرف لپکا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیے۔ اس کے ہاتھ تھام لینے پہ ایک ہلکی سی چیخ مینو کے لبوں سے خارج ہو گئی۔

"یہ... یہ کیا ہوا مینو۔ یہ انگلی اتنی سوج کیسے گئی۔"

اس نے مینو کے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ نازک سے ہاتھ کی موٹی انگلی بری طرح سوجی تھی اور اس پر سرخی مستزاد۔

"لگتا ہے یہ انگوٹھی تمہیں بہت تنگ ہے۔ تم نے آخر یہ انگوٹھی پہنی کیوں۔ اگر پہننا ضروری تھی تو مجھے دے دیتیں۔ میں تمہارے سائز کی بنوا دیتا۔" اس کی بات پر مینو کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"یہ انگوٹھی فیروز نے زبردستی پہنادی ہے۔"

"فیروز نے...."

رگ جاں سے قریب اس ہستی کو تکلیف میں دیکھ کر جیسے طلال کی نیلگوں آنکھیں غصے سے پوری کی پوری وا ہو گئیں۔ اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا۔ آخر فیروز نے ایسی حماقت کیوں کی۔

"طلال وہ بہت جنگلی انسان ہے۔ حقیقت میں وہ انسان کہلائے جانے کے قابل نہیں۔ وہ مجھے کوئی بے جان سی گڑیا سمجھتا ہے جسے وہ با آسانی توڑ پھوڑ ڈالے... وہ کہتا ہے۔ میں نے پر پرزے نکال لیے ہیں اور وہ اس چڑیا کی طرح میرے سارے پر کتر ڈالے گا' جیسا کہ اس نے بچپن میں کیا تھا۔ کیا تم یہ گوارا کر لو گے طلال کہ کوئی میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور.... اور...."

ہچکیوں نے اسے اپنی بات پوری نہیں کرنے دی۔

"میں تمہیں نقصان پہنچانے والے ہاتھوں کو کاٹ ڈالوں گا مینو۔ تم خاطر جمع رکھو.... اس فیروز کے مزاج تو میں درست کر دوں گا.... وہ خود کو سمجھتا کیا ہے۔" وہ تلملا رہا تھا۔

"میری زندگی کا مالک۔"

"میں اس کے دماغ سے یہ خناس نکال دوں گا۔"

طلال کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ مینو کی آنکھوں میں وہ ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا' کجا اس فیروز نے اسے اشکوں کے خزانے لٹانے پر مجبور کر دیا۔ بے درد ساعتوں کو پرے دھکیلتے اس نے اپنے لرزتے کانپتے وجود کو بمشکل سنبھالا اور فیروز کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

فیروز موبائل پر کسی سے محو گفتگو تھا۔ طلال کو سخت طیش میں دیکھ کر وہ چونک پڑا۔

"کیا ہوا طلال۔" اس نے موبائل آف کر کے جیب میں ڈال لیا۔

"فیروز تم نے مینو کو آخر سمجھا کیا ہے۔ کوئی بے جان شے۔ بس یہ تمہاری سختی اور تمہارے سنگدلانہ رویے کا کوئی اثر نہیں ہو گا.... وہ بہت نازک لڑکی ہے فیروز میں نے تمہیں پہلے بھی تنبیہہ کی تھی کہ اسے نرمی سے اپنی پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرو۔ اتنا یاد رکھو میں اسے ذرا سی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میری دوست ہے اور یہ سبھی جانتے ہیں۔"

"میں بھی جانتا ہوں۔" فیروز ٹھنڈے لہجے میں بولا

"تو پھر تم نے مینو کے ساتھ وہ زیادتی کیوں کی.... کیوں اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی پہنا کر اسے اذیت پہنچائی جانتے ہو اس کی انگلی سوج چکی ہے۔"

"یار مجھے کیا معلوم تھا کہ انگوٹھی اسے تنگ ہے۔ وہ آسانی سے اس کی انگلی میں چلی گئی تھی۔"

وہ سرے سے ہی معصوم بن گیا۔ وہ لڑکی جب تک یہاں ہے اس پر کسی قسم کا رعب جمانا اور اکھڑ بازی دکھانا فضول ہے۔ جب وہ اس کے گھر کی چھت تلے ہو گی تو تب وہ اسے دیکھ لے گا۔

یہاں اسے ضبط سے کام لینا ہو گا۔ اماں نے اس لڑکی کی خود سری کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل درست تھا۔ اور وہ خود بھی بچہ نہیں تھا جو اس کے انداز نہ پہچانتا۔ اماں نے بالکل درست کہا ہے۔ وہ جب تک اس لڑکی پر سختی نہیں کرے گا وہ یونہی بد دماغی دکھاتی رہے گی۔ اس کے ماں باپ اور بھائیوں نے اسے مکمل طور پر سر پر چڑھا کر رکھا ہے اور خصوصاً" وہ طلال....

اسے مینو کی طلال سے دوستی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ لیکن وہ قبل از وقت اس لڑکی پہ کسی قسم کی پابندی لگانے کا مجاز نہیں تھا۔ وہ وقت کے انتظار میں تھا اور وہ وقت شادی کے بعد ہی آسکتا تھا۔ پھر نہ معلوم یہاں آکر وہ خود پر ضبط کیوں نہ کر پایا اور ایسا احمقانہ آمیز رویہ اختیار کر ڈالا جس نے ماحول میں تلخی بھی پیدا کر دی اور شہروز اور طلال کو بیخ پا بھی کر دیا اسے خود کو مکمل طور پر ٹھنڈا رکھنا ہو گا۔

"میں اپنے رویے کی مینو سے معافی مانگ لوں گا۔" فیروز مدھم لہجے میں بولا۔

"یہی بہتر رہے گا۔" طلال نے سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

مہندی کی وہ رات، جب بے شمار تاروں کی بارات "آفتاب لاج" میں اتری تو اموجان نے مینو سے فیروز کے سلسلے میں بات کر ڈالی۔

"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی اموجان۔" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ضدی لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں بیٹا۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح اس کی پیشانی چوم لی۔

"ابھی تو صرف نکاح کریں گے۔ رخصتی تو بعد میں دھوم دھام سے ہو گی۔"

"لیکن مجھے نکاح نہیں کروانا.... اور وہ بھی اس فیروز کے ساتھ، بچپن میں وہ اتنا ضدی اور اکھڑ مزاج نہیں تھا لیکن اب تو وہ ایک دم جنگلی بن گیا ہے۔ جانتی ہیں اس نے میری انگلی میں جو انگوٹھی زبردستی پہنائی تھی وہ کتنی مشکل سے اتری ہے۔ وہ بھی طلال کی مدد سے۔"

"میں فیروز کو جانتی ہوں۔ اس میں بچپنا ہے۔ لیکن وہ بہت پیارا لڑکا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے تیرے لیے مناسب ہے۔"

اموجان کے قطعیت سے بھرپور لہجے پر مینو چند لمحوں کے لیے اندر ہی اندر ڈول گئی۔ لیکن پھر اپنی بے تحاشا خود اعتمادی کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے اموجان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور نہایت مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔

"لیکن اموجان.... میں شازل سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"کون شازل....؟"

ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ انہیں مینو سے اس قدر بے باکی کی توقع نہیں تھی۔

"شازل اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ اسما کا کزن ہے، بہت اچھا، بہت سلجھے خیالات کا مالک ہے۔"

"آہستہ بولو مینو۔ تمہیں اپنے بابا کے مزاج کا بخوبی علم ہے۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو وہ آنگن میں تیری قبر بنا ڈالیں گے۔" وہ بے حد سخت لہجے میں، لیکن دبے دبے انداز میں بولیں کہ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ اور وہ مہمانوں کی سامنے کسی قسم کا تماشا ہرگز نہیں چاہتی تھیں۔ اس خاندان کی ایک عزت تھی۔ بڑا نام

تھا۔ اور یہ مینو اس عزت' اس نام کو خاک میں ملانے چلی تھی۔

"تم ہمارے لاڈ و پیار کا بہت غلط فائدہ اٹھا رہی ہو۔ دیکھ چندا تمہاری عمر ابھی اتنی نہیں کہ زندگی کے اہم ترین معاملات میں خود سے فیصلہ کر سکو۔ ایسے فضول کے خیالات ذہن سے نکال دو بچے۔" ان کا لہجہ نرم ہو گیا۔

"میں بچی نہیں ہوں اموجان..... پلیز آپ بابا جان سے اس سلسلے میں بات کریں۔" اس نے بے حد ضدی لہجے میں کہا۔

"عقل سے کام لو مینو۔ یہ سب بہت ناممکن ہے۔ تم اور فیروز بچپن سے منسوب ہو۔ سارے خاندان کو اس حقیقت سے آگاہی ہے۔ بس فیصلہ ہو چکا ہے۔ شمروز کی بارات کے ایک ہفتے بعد تمہارا نکاح ہے۔ سب کو تمہارے نکاح کا پتا چل چکا ہے۔ تمہارے بابا سب رشتہ داروں' دوستوں سے مبارک باد وصول کر رہے ہیں۔ اب تم جاؤ اپنے کمرے میں۔"

"یقین کریں اموجان۔ میں نے کبھی فیروز کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا وہ مجھے شروع سے پسند نہیں۔ اس کے اور میرے خیالات بہت مختلف ہیں۔ ہمارے مزاج مختلف ہیں۔"

"تم ویسے ہی جذباتی ہو رہی ہو مینو۔ شادی کے بعد سارے خیالات' ساری سوچیں اور مزاج ایک دوسرے سے میل کھانے لگتے ہیں۔ دیکھ لینا۔ فیروز کا ساتھ پا کر تم شازل کو بھول جاؤ گی۔"

اموجان کافی دیر تک اسے ہولے ہولے سمجھاتی رہیں۔ اس کا سر تھپکتے ہوئے زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کرتی رہیں اور تب وہ آنسو ضبط کیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اموجان جس بات کو محض اس کا بچپنا اور جذباتی پن سمجھ رہی تھیں' جسے اس کی نادانی اور جذبات کا ابال خیال کر رہی تھیں' وہ حقیقت میں امنہ آفتاب کے دل کا ٹھوس فیصلہ تھا۔ جس سے وہ ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

باہر ڈھولک پر بڑی زبردست تھاپ پڑی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے دو الگ الگ پارٹیاں بنائے گلے پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر حملہ کر رہے تھے۔ بڑے قمقموں سے سجا سنورا لان بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ شمروز اور عافیہ کی مہندی کا انتظام ایک ہی جگہ کیا گیا تھا۔ کرنل آفتاب احمد چونکہ لڑکی والوں پر بوجھ ڈالنے کے حق میں نہیں تھے اس لیے انہوں نے عافیہ کے گھر والوں کو بھی یہیں بلوا لیا تھا پیلے جوڑے میں گھبرائی شرمائی عافیہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی اور لڑکوں نے چھیڑ چھیڑ کر شمروز کا برا حال کر دیا تھا۔

"بھئی یہ مینو کہاں غائب ہے۔" حنا نے مہندی کے لیے لڈی ڈالتی لڑکیوں کو ایک نظر دیکھا تو اسے مینو کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔

"میں نے اسے اموجان کے کمرے سے تھوڑی دیر پہلے نکلتے دیکھا تھا۔" آمنہ نے اطلاع فراہم کی۔

"تو پھر کہاں گئی..... عافیہ اس کی بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس وقت اسے اس کے ساتھ ہونا چاہیے اور خود عافیہ بھی کتنی بار اس کا پوچھ چکی ہے۔"

حنا' مینو کی تلاش میں اس کے کمرے تک چلی آئی۔ مینو بالکنی میں ریلنگ کے اوپر جھکی جیسے بہت اپ سیٹ اور دلگرفتہ لگ رہی تھی۔

"مینو..... مینو خدایا تم ابھی تک سر جھاڑ منہ پھاڑ کھڑی ہو۔ ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئیں۔ باہر فنکشن عروج پر ہے۔ لڑکیاں لڈی ڈال رہی ہیں اور اب عافیہ بھابھی کی مہندی کی رسم ادا ہونے کو ہے۔ اس کے بعد شمروز بھائی کی رسم ہوگی۔ تمہیں بالکل بھی احساس نہیں ہے مینو۔ شمروز بھائی تمہارے چہیتے بھائی ہیں اور عافیہ تمہاری گہری دوست۔ وہ دونوں اور سارے مہمان تمہارے بارے میں کیا خیال کریں گے۔"

حنا نے اچھا خاصا لیکچر دینے کے ساتھ ساتھ مینو کی اچھی طرح گوشمالی بھی کر ڈالی۔

"اچھا تم چلو۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"ہر گز نہیں۔ تم بالکل بھی قابل اعتبار نہیں ہو۔

تم میرے سامنے باتھ روم میں گھسو۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو۔۔۔ اور فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔" حنا کا اس کے سر سے ٹلنے کا مطلق ارادہ نہیں تھا۔

"ایک تو تم سے جیتنا قطعی ناممکن ہے حنا۔"

وہ ست روی سے بیڈ پر پھیلے کامدار کپڑے اٹھا کر ڈریسنگ میں گھس گئی۔ یہ موقع فضول کی اکڑ اور ضدی بازی دکھانے کا نہیں۔ وہ شادی کے دو دن گزار کر سکون سے اموجان سے بات کرے گی اور بابا جان کے سامنے بھی اپنے موقف کے لیے ڈٹ جائے گی۔ چاہے یہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے وہ شازل کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ کبھی بھی نہیں۔

خود سے اٹل فیصلہ کر کے مینو بڑے سکون سے تیار ہو کر باہر نکلی تو حنا نے توصیفی انداز میں اسے سر تا پا دیکھا۔

"بڑی آفت لگ رہی ہو۔"

"اچھا۔" وہ خواہ مخواہ ہی ہنس دی۔

"جانتی ہو' تمہارے نکاح اور پھر رخصتی کے لیے بڑا زبردست پروگرام ترتیب دیا جا رہا ہے' سبھی بہت ایکسائیٹڈ ہو رہے ہیں۔ شمروز بھائی کے بعد تمہاری شادی اس خاندان کی سب سے بڑی خوشی ہے۔"

حنا کی باتیں مینو کو جیسے گہری اذیت سے دوچار کر گئیں۔ وہ سرعت سے ایک دم ہی ساری سیڑھیاں اتر آئی۔ مگر آخری سیڑھی پر بڑے زوردار انداز میں اس کی ٹکر فیروز سے ہو گئی۔ ضبط گریہ سے سرخ آنکھیں لیے وہ فیروز کو بہت پریشان اور الجھی الجھی سی دکھائی دی۔

"سنبھل کر محترمہ۔ ابھی سے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے۔ ابھی تو ہمارے نکاح میں ہفتہ باقی ہے۔"

وہ اسے اپنی بانہوں میں سنبھالے سنبھالے اس کے کان کے قریب جھکا کہہ رہا تھا۔ مینو کے اعصاب کو ایک شدید جھٹکا سا لگا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اس سے الگ ہو گئی۔ اس شخص نے جیسے اس کے حواس معطل کر دیے تھے۔ گندمی رنگت والی لڑکی کا چہرہ یکلخت یوں زرد پڑ گیا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر ہلدی مل دی ہو۔ فیروز نے بڑی گہری گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"ویسے آج تم غضب ڈھا رہی ہو۔ بائی دا وے کس کے قتل کا ساماں ہے۔"

"کم از کم آپ کے نہیں۔" وہ تلخی سے بولی تو ایک سرد سی مسکراہٹ فیروز عالم کے لبوں کو چھو کر گزر گئی۔

"اسے کہتے ہیں رسی جل گئی پر بل نہیں گیا۔ بس ایک ہفتہ ہے۔ اس کے بعد۔۔۔ دو دنوں میں تمہیں سیدھا نہ کر دیا تو فیروز عالم نام نہیں۔"

مقابل کی سرخ سرخ آنکھوں میں دیکھتے جیسے مینو کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سرد لہریں اتر گئیں۔ ان سفاک لمحات میں اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر سارا گھر اکٹھا کر لے اور سب کو اس شخص کی اصلیت دکھا دے۔

"ارے مینو' تم یہاں رک کیوں گئیں۔ اپنے ہونے والے دولہا سے بعد میں باتیں بگھار لینا فی الوقت مہندی کی رسم کے لیے چلو۔"

حنا کی شرارت بھری آنکھوں کو نظرانداز کرتے وہ تیز تیز قدموں سے لان کی طرف چلی گئی۔ مہندی کی رسم کب شروع کب ختم ہوئی۔ اس کا اسے قطعی ہوش نہیں تھا۔ فیروز عالم کی سنگدلانہ باتیں جیسے اسے اندر ہی اندر چھید کر ادھ موا کیے دے رہی تھیں۔

اف بابا جان اور اموجان کو اس سفاک انسان میں ایسی کون سی خوبی دکھائی دے گئی جو زندگی بھر کے لیے اسے اس دشوار ترین صعوبت کا حقدار بنا دیا۔

"ہیلو پاگل لڑکی کہاں گم ہو۔"

طلال علی نے خود میں گم اس بے حد پیاری لڑکی کی سیاہ پلکوں والی آنکھوں کے سامنے انگلیاں نچا کر اسے چونکا دیا۔

"اس فیروز عالم کی دہشت مجھے یقیناً" مار ڈالے گی طلال۔" اس لڑکی کا اضطراب اور ٹوٹا لہجہ طلال کو تشویش میں مبتلا کر گیا۔

"پیاری لڑکی۔ اتنا دکھی مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فیروز سے بندھن بندھنے کے بعد تمہیں وہ

سفاک شخص بے حد پیارا اور نرم دل لگنے لگے گا۔"
"طلال۔"
ضبط گریہ سے سرخ سرخ آنکھیں لیے وہ بے حد الجھی الجھی سی تھی۔
"طلال کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے۔ پلیز تم اس نکاح کو روک لو۔ جس طرح بھی ممکن ہو۔"
"میرے خیال میں یہ اب قطعی نا ممکن ہے۔ کیونکہ سارے انتظامات مکمل ہیں۔ سب بہت خوش ہیں۔"
"پلیز طلال۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ "میری خاطر کچھ کرو۔"
اس کے بے تحاشا زرد پڑتے چہرے کو دیکھ کر طلال بھی اپنی محبت کے کھو جانے کا درد فراموش کر بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ضدی لڑکی کی مدد کیسے کرے۔ رگ جاں سے قریب اس ہستی کی تکلیف جیسے اسے اپنے اندر محسوس ہو رہی تھی۔
"مینو، سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ یہ بزرگوں اور خاندان کی عزت کا سوال ہے۔"
"اور یہ میری بھی زندگی کا سوال ہے۔" لب کاٹتے ہوئے اس نے پانیوں سے لبریز آنکھیں اٹھائیں۔ "بات دراصل یہ ہے طلال کہ میں نے شازل کے سنگ کورٹ میرج کا پروگرام بنالیا ہے۔ جس دن شمروز بھائی کا ولیمہ ہے اس سے اگلے دن ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔"
"اوہ نو۔۔۔" شدید قسم کے جذباتی دھچکے کے دوران ایک ٹک اس نادان لڑکی کو دیکھتے ہوئے طلال نے سینے میں شدید ترین جلن محسوس کی۔
"یہ 'یہ تم کیا کہہ رہی ہو مینو۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے چلی ہو۔" بدقت اس کے لبوں سے پھنسے پھنسے انداز میں نکلا۔
"تو تم نے دلدل میں اترنے کا تہیہ کرلیا ہے۔"
"مجھے شازل پر پورا اعتبار ہے طلال۔"
"بات اعتبار یا بے اعتباری کی نہیں۔ بات تمہاری جلد بازی اور کم عقلی کی ہے۔ تم اتنا بڑا قدم اٹھانے چلی ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھو مینو۔ محبت کرنے والے مرجایا کرتے ہیں لیکن یوں رسوائیاں سوغات میں نہیں دیا کرتے۔ پھر وہ کیسا شخص ہے۔ اور کیسی ہے اس کی محبت؟ جو تمہیں کانٹوں پر گھسیٹنے پر تلا ہے۔ جانتی ہو مینو تمہارا یہ قدم کرنل آفتاب احمد کی عزت کو کیسے اچھالے گا۔۔۔"
"طلال تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ تم کیا جانو محبت اس کائنات کی سب سے خوب صورت حقیقت ہے۔"
اس کے چہرے پر پھیلے گلال اور آنکھوں میں دمکتے رنگوں کو دیکھتے طلال نے بڑے کرب سے سوچا۔
"بھلا یہ مجھ سے بہتر کون جانتا ہو گا مینو کہ محبت کیا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو تیاگ مانگتا ہے اور جو دل کے نہاں خانوں میں چھپائے جانے کا متقاضی ہے۔ اسی سبب تو مینو تم آج تک میرے دلی جذبات و احساسات کو نہ جان سکیں۔"
"سنو طلال میں اچھی طرح سمجھ گئی۔ بزرگوں کو میرا اور شازل کا ساتھ تاحیات قبول نہیں ہو گا۔ وہ صرف فیروز فیروز کا راگ الاپتے رہیں گے۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم چپ چاپ مجھے شازل کے پاس چھوڑ آؤ۔ ہماری کورٹ میرج میں ہمارا ساتھ دو۔"
"مجھے بزرگوں سے بات کر لینے دو ہو سکتا ہے قسمت تمہارے ساتھ یاوری کر جائے۔"
تبھی رات گئے ولیمہ سے فارغ ہونے کے بعد طلال نے بہت ہمت جمع کر کے مینو کی پسند و ناپسند کی بابت شمروز آفتاب کو آگاہ کر ڈالا تو "آفتاب لاج" کی بلند و بالا مضبوط دیواروں کے اندر کتنے ہی طوفانوں کا گزر ہو گیا۔ اور یہ طوفان اپنے ساتھ جیسے سب کچھ بہا لے گیا۔
"یہ بات بابا جان تک نہ پہنچے طلال۔ تم اس نادان لڑکی سے صاف صاف کہہ دو کہ اس کا نکاح ٹھیک ایک ہفتے بعد صرف اور صرف فیروز سے ہے اور اسی میں اس کی خوشیاں اور اس خاندان کی عزت ہے۔"

شمروز بھائی کا فیصلہ طلال کی زبانی سن کر مینو نے جیسے تہیہ کرلیا۔ وہ کل رات ہی یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی کہ دنیا ظالم سماج بن کر رگوں کو کاٹنا جانتی ہے۔ دو دلوں کو ملانا نہیں۔ محبت کوئی سنگین جرم تو نہیں کہ اسے اس کے گلے کا پھندا بنا کر تاحیات اسے پھندے سے لٹکنے کے لیے مجبور کر دیا جائے۔ اسے پورا یقین تھا۔ شازل کی ہمراہ اس کی زندگی جنت سے کم نہیں ہوگی۔



ولیمہ سے اگلے روز مینو نے اموجان کے تکیے کے نیچے دبی سیف کی چابی نکالی اور لوہے کے بڑے سے مضبوط سیف میں سے وہ تمام زیورات نکال لیے جو اموجان نے اس کی شادی کے لیے بنا کر رکھے تھے اور جنہیں وہ گاہے بگاہے اسے پہنا پہنا کر دیکھا کرتی تھیں۔ وہ کوئی چوری نہیں کر رہی۔ ان زیورات پہ اس کا حق ہے۔

وہ اندر ہی اندر بہت مطمئن تھی۔ اسے شازل کو میسج کر کے اپنے آنے کے بارے میں بتانے کا موقع بھی نہیں ملا شازل کے پلان کے مطابق اسے آئندہ رات گھر سے نکلنا تھا۔ لیکن وہ موقع کی نزاکت کے طفیل ایک رات پہلے ہی نکل آئی۔ نہ اس نے شازل کو آگاہ کیا اور نہ ہی طلال کو اس کی ہوا لگنے دی.... سنسناتے قدموں اور ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ وہ ہینڈ بیگ پر اپنی گرفت مضبوط کیے جب وہ "بلال گنج" کے اس چھوٹے سے مکان کے سامنے اتری تو حد سے زیادہ مضبوط اور باہمت تھی۔

آج وہ ایسے تمام رشتے بہت پیچھے چھوڑ آئی جو اس کی محبت کی راہ میں رکاوٹ اور اس کی منزل کے سامنے دیوار تھے۔ آج وہ تمام دیواریں پھلانگ آئی۔ شازل اسے اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر کتنا خوش ہو جائے گا۔ وہ کہتا تھا۔

"مینو، میں تمہارے لیے مر جانے کی حد تک سنجیدہ ہوں... اگر تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے تو اس کا ثبوت دو۔"

اور آج وہ ثبوت کے طور پر اپنی ساری کشتیاں جلا کر اس تک آن پہنچی۔

اس کی آنکھوں میں ٹمٹماتے مستقبل کے روشن جگنوؤں میں امیدوں کے بے حد گہرے گہرے رنگ تھے۔ یہ سامنے کھلے دروازے سے آہستگی سے قدم آگے بڑھاتی مینو جب اندرونی کمرے کی کھڑکی تک پہنچی تو اندر سے آتی آوازوں میں اپنا نام سن کر ٹھٹک سی گئی۔

"ارے تم اسے نہیں جانتے آصف۔ وہ پاگل اور خبطی لڑکی میرے عشق میں اس حد تک دیوانی ہے کہ میرے لیے سب کچھ کر گزرے گی.... بس کل کی بات ہے۔ پھر وہ بے تحاشا زیورات سمیت میرے سامنے ہوگی۔ اس نے مجھے ایک ایک بات بتادی تھی کہ اس کے گھر والوں نے اس کے لیے کتنے زیورات اور کتنا بینک بیلنس رکھ چھوڑا ہے۔" یہ شازل کی آواز تھی۔

"صرف زیورات اور بینک بیلنس لے کر ہی خوش ہوگئے۔" یہ کوئی اجنبی آواز تھی۔

"ارے کیا کچی گولیاں کھیلی ہیں میں نے۔ کورٹ میرج کے بعد اس کا گلا دبا کر اسے مجبور کردوں گا کہ اپنے باپ سے جائیداد میں اپنا حصہ مانگے۔ تم نہیں جانتے۔ اس کے پاس اتنی دولت اور جائیداد ہے کہ ساری عمر عیاشیوں میں گزرے گی۔ سمجھو اپنی تو لاٹری نکل آئی۔ دولت اور جائیداد ہتھیانے کے بعد اسے راستے سے بالکل اس طرح ہٹادوں گا جیسے عاتکہ کو ہٹایا تھا۔" شازل کی باتیں۔ جواباً اجنبی زور سے ہنسا۔

"دیعنی پنکھے سے لٹکا کر خودکشی کا کیس بنادو گے۔"

"بالکل۔" شازل کی مکروہ ہنسی کمرے سے باہر کھڑی مینو کا خون خشک کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی بھک سے اڑا گئی۔

"خدایا۔ شازی کا اتنا گھناؤنا اور مکروہ روپ وہ لچھے دار باتیں کرنے والا وہ تتلیوں اور خوشبوؤں سے پیار کرنے والا۔ وہ کوئی نرم دل اور خوب صورت فطرت کا مالک نہیں بلکہ ایک سفاک قاتل ہے۔ جو دولت کے

لیے پہلے بھی کسی بے گناہ کا خون بہا چکا ہے۔" وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹی تو کرسی سے ٹکرا گئی۔

"یہ کون....؟" شازل کسی کی موجودگی کا احساس کر کے ایک جست میں کمرے سے باہر آگیا اور سامنے کھڑی لڑکی کے بے تحاشا زرد چہرے اور سیاہ آنکھوں سے جھانکتے خوف نے اسے پوری طرح باخبر کر دیا کہ وہ اس کے بارے میں حرف بہ حرف جان چکی ہے۔ یقیناً" اس نے وہ تمام باتیں سن لی ہیں جو آصف اور اس کے درمیان ہوئی ہیں۔

"مینو تم.... تم تو کل آنے والی تھیں ناں۔"

دو قدم آگے بڑھتے شازل نے اپنے حواسوں پر قابو پاتے نرم لہجے میں آخری داؤ کھیلنا چاہا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ نہ سن پائی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی ابھی آئی ہو۔

"اگر میں کل آتی تو آج تمہارا مکروہ چہرہ کیسے دیکھ پاتی.... اف خدایا میں تمہیں کیا سمجھی تھی اور تم کیا نکلے.... تم ایک دھوکے باز، سنگ دل اور قاتل شخص ہو۔ تم نے مجھ سے پہلے کسی اور کی زندگی بھی برباد کی ہے۔ اف مجھے سب نے کتنا سمجھایا طلال نے کتنا قائل کیا لیکن میں تمہاری محبت میں اندھی ہو کر تمہاری اصلیت کو نہ پہچان سکی تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا شازل آخر کیوں۔"

وہ ہینڈ بیگ وہیں چھوڑ چھاڑ جنونی انداز میں شازل کی طرف بڑھی اور اس کا گریبان دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر بری طرح چیخنے لگی۔ زور دار جھٹکوں نے شازل کی قمیص کے بٹن اکھیڑ ڈالے۔

"اگر تمہیں دولت ہی چاہیے تھی تو مجھ سے ویسے ہی مانگ لیتے۔ اس کے لیے میرے جذبوں سے کھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں تم نے میری زندگی میں آگ لگا دی۔"

"سنو جو کچھ تم نے سنا ہے سب غلط ہے۔ تم یہاں کرسی پر بیٹھو۔ میں تمہیں ساری بات تسلی سے بتاتا ہوں۔"

شازل نے اسے کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھانا چاہا۔ روتی دھوتی لڑکی کے مسلسل بہتے آنسو اس کی وحشتوں اور دکھوں کے گواہ تھے۔

وہ کمینہ شخص اس کے سامنے خول چڑھائے آیا تھا اور وہ اسے پہچان بھی نہ سکی۔ اف طلال نے اسے پہچان لیا تھا اور وہ اس مخلص اور بے ریا ساتھی کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑاتی رہی۔

"تم ایک مکار شخص ہو شازل میں، میں تمہیں حوالات کی سیر کرواؤں گی۔ میں تمہیں پھانسی پر چڑھا دوں گی۔ تم قاتل ہو تم...."

"یار تم کیا اس لڑکی کی بکواس سن رہے ہو۔ گردن دبا کر یہیں اس کا کام تمام کر دو.... زیورات تو شاید وہ اس بیگ میں لے آئی ہو گی۔"

عقب میں کھڑا آصف اس سارے تماشے سے جھنجلاتے بولا تو جیسے شازل کے اعصاب کو بھی جھٹکا سا لگا۔

"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ اس کا گلا یہیں دبا دینا چاہیے۔ اب تو یہ میرے ایک قتل کی گواہ بھی بن چکی۔ اس نے ہماری ساری باتیں سن لی ہیں۔"

"تو پھر انتظار کا ہے کا.... اسے قتل کرنے کے بعد ہم یہ زیورات لے کر دوسرے شہر بھاگ جائیں گے کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو دوبارہ سے کسی نئے شکار کی تلاش میں نکلیں گے۔"

آصف کی باتیں۔ شازل کی باتیں سفاکانہ لمحات کی ان بے درد ساعتوں میں مینو کے دل سے جیسے اس بات کا ملال نہیں جا رہا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کی عزت روند کر اس کمینے شخص تک پہنچی ہے۔

اچھا ہے وہ اسے مار ڈالے۔ وہ اب واپس جا کر کیا کرے گی۔ ان سب کو کیا منہ دکھائے گی۔ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کے لیے واپس لوٹنے کی گنجائش نہیں بچتی اسے نہ زمانہ قبول ہے اور نہ یہ معاشرہ۔

آصف اس کا بیگ کھولے زیورات نکال رہا تھا۔ وہ چیل کی طرح جھپٹی اور اس کے منہ پر طمانچہ مار کر بیگ اس کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔

"خبردار جو میرے بیگ کو ہاتھ لگایا تو۔" آصف نے

اپنا سرخ ہوتا گال سہلاتے قدرے تعجب سے اس نازک سی لڑکی کی جانب دیکھتے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔
"تم تو کہتے تھے یہ انتہائی بزدل لڑکی ہے۔"
"یار جس طرح مغلوب بلی حملہ آور کتے پر جھپٹ پڑتی ہے بالکل اسی طرح یہ بھی اپنی آخری کوشش کر رہی ہے۔"
شازل اسے دبوچنے کو مینو کی جانب لپکا تو اپنی عزت اور جان بچانے کے خیال نے جیسی اس کے کمزور سے وجود میں بجلیاں بھر دیں۔ وہ بیگ دونوں بازوؤں میں سنبھالے بیرونی دروازے کی طرف بھاگی لیکن ہرنی بھی کبھی چیتے کے پنجوں سے نکلنے کی جسارت کر سکتی ہے۔ شازل نے ایک ہی جست میں اسے جالیا۔ اس کے ہاتھوں سے بیگ جھپٹ کر آصف کی طرف اچھالا اور اسے بازوؤں سے دبوچ کر اندر کے کمرے میں لے آیا۔
"چھوڑو مجھے، مجھے جانے دو.... میں یہاں ایک لمحے کو بھی نہیں رکوں گی۔" وہ کسمسائی۔
"تم یہاں اپنی مرضی سے آئی تھیں اور یہاں سے رہائی تمہاری روح کے جسم سے پرواز کرنے کے بعد ہی ہو گی۔ لیکن اس سے پہلے تم نے ہمارا اصل مقصد پورا کرنا ہے۔ کل ہمارا نکاح ہو گا۔ اس کے بعد تم اپنے گھر والوں سے جائیداد کا مطالبہ کرو گی اور....."
"بکواس مت کرو۔" وہ خوفزدہ آنکھوں اور زرد پڑتے چہرے سمیت حلق کے بل چلائی۔
"میں تمہارے ناپاک ارادوں کو کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی.... تم ایک ذلیل شخص ہو۔ جس نے میرے اعتماد کو دھوکا دینے کے ساتھ ساتھ مجھ سے میرے گھر والوں کا پیار اور عزت بھی چھین لی۔ اسما اگر تمہاری حقیقت سے واقف تھی تو اس نے مجھے خبردار کیوں نہیں کیا....."
"اسما بیچاری تو خود بھی میری حقیقت سے لاعلم ہے۔ وہ میری دور کی کزن ہے۔"
شازل نے چہرے پر پھیلی مکروہ مسکراہٹ مینو کو اندر تک لرزا گئی۔
"بس صرف ایک دن صبر کر لو۔ نکاح کے بعد تم قانونی طور پر میری بیوی بن جاؤ گی اور....."
"اور پھر جائیداد لینے کے بعد تمہارا قصہ پاک۔"
آصف نے جیب سے خنجر نکال کر مینو کی سیاہ ہراساں آنکھوں کے سامنے لہراتے باقی کا جملہ مکمل کیا۔ اس اثنا میں شازل اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس چکا تھا۔ اس کا موبائل بھی اس کے قبضے میں چلا گیا تھا۔
مینو ہچکیاں لیتے ہوئے روتی رہی۔
کاش اس نے اموجان کی حکم عدولی کا نہ سوچا ہوتا۔
کاش وہ ان لڑکیوں میں سے ہوتی جو ماں باپ اور خاندان کی ناموس کی خاطر اپنی گردن کٹوا دیا کرتی ہیں۔
کاش وہ اپنے بچپن کے رشتے کو اپنی تقدیر مان کر سر جھکا دیتی۔ اور..... اور وہ طلال.....
کاش وہ طلال کی سمجھانے والی باتوں کو پلو سے باندھ لیتی اور اپنے اس مخلص اور بے ریا، سچے دوست کی نیت پر شک نہ کرتی۔
خدایا اس نے اتنے لوگوں کا دل دکھایا اور اس سزا کی حقدار ٹھہری کہ وہ اس شخص کے ہاتھوں بے نیل و مرام ٹھہرے، جس کی چاہت پہ اندھوں کی طرح اعتبار کر کے اس نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ اپنا مقام اپنی عزت اپنا وقار اور شاید اپنی جان بھی۔
دھندلائی آنکھوں کے اس پار اسے کمرہ ان دونوں اشخاص کے وجود سے یکسر پاک دکھائی دیا۔ وہ دروازہ باہر سے بند کر گئے تھے۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ باہر مکمل خاموشی تھی۔ ان دونوں کے بولنے کی آوازیں تک نہیں آ رہی تھیں۔
وہ نڈھال سی زمین پر پڑی رہی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجنے کے ساتھ ساتھ دکھنے لگی تھیں۔ نہ معلوم اس کے غائب ہونے پر گھر والوں کا کیا ردعمل ہو گا۔
وہ بے ریا اور کھرا شخص طلال اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا پھر رہا ہو گا۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ اس کے

ساتھ کیا گزر گئی۔۔۔ وہ سمجھ رہا ہو گا وہ اپنی محبت کی چھاؤں میں پرسکون اور مطمئن مستقبل کے سنہرے روپہلے خوابوں کو سچائیوں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہی ہو گی۔ وہ شادمانیوں کے ہنڈولوں میں جھول رہی ہو گی۔

"طلال۔۔۔ طلال آکر دیکھو۔ مجھے اپنی ہٹ دھرمی' ضد اور کم عقلی کی کتنی سخت سزا ملی ہے۔ تم ٹھیک کہتے تھے۔ وہ دھوکے باز ہے۔ میں اس کی حقیقت سے لاعلم ہوں۔ طلال' طلال ایک بار چلے آؤ اور مجھے اس ظالم کے چنگل سے نجات دلا کر اپنے بازوؤں میں چھپا لے جاؤ۔۔۔ میں تمہارے بغیر اس سفاک دنیا کا ایک لمحہ کو بھی سامنا نہیں کر سکتی تم ٹھیک کہتے تھے۔ یہاں لوگ اپنی آستینوں میں خنجر چھپائے پھرتے ہیں اور موقع دیکھ کر بے دردی سے پشت میں اتار دیتے ہیں۔"

اف یہ کیسا درد ہے۔ ہڈیوں کو چٹخانے والا درد۔۔۔ رگوں کو جھلسانے والا درد۔ وہ بے حس و حرکت' نڈھال سی پڑی رہی اور بے درد اندھیری رات کی بے حد خوفناک ساعتیں دھیرے دھیرے سرکتی رہیں۔ ساری رات یوں بندھے رہنے سے اس کے ہاتھ پاؤں بالکل بے جان ہو رہے تھے۔ اور سارا وجود پھوڑا۔۔۔ سر پکے ہوئے پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔

"لو یہ ناشتا کر لو۔" صبح کمرے کا دروازہ کھلتے ساتھ ہی شازل ہاتھوں میں پلیٹ میں دو سلائس اور آملیٹ رکھے اندر چلا آیا۔ اس کے عین سامنے پلیٹ رکھ کر اس نے اس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا باہر گھسیٹ لیا۔

"خود ناشتا کر لو گی یا میں نوالے توڑ کر منہ میں ڈالوں۔" وہ چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر اس کے پشت پر بندھے ہاتھ کھولتے بولا۔

"چلو ناشتا خود ہی کر لو۔ کیا یاد کرو گی کہ کس حاتم طائی سے پالا پڑا تھا۔"

"مجھے بھوک نہیں۔"

"دیکھو بھوک ہڑتال سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ عصر کے بعد ہمارا نکاح ہے۔ میں نے کورٹ میرج کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ تمہیں اس حالت میں گھر سے باہر نہیں لے جا سکتا۔ البتہ ایک مولوی کا انتظام کر لیا ہے۔ چند روپوں کی خاطر وہ ہمارا نکاح کروا دے گا۔ اس کے بعد میں قانونی اور شرعی طور پر اس خاندان کا داماد بن جاؤں گا جس پر تمہیں ناز ہے۔ نکاح نامہ ملتے ہی تمہاری طرف سے جائیداد میں حصے کا دعویٰ دائر کر دوں گا۔ اگر تم خود سے میرا ساتھ دیتے ہوئے اپنا حصہ اپنے ماں باپ سے مانگ لو گی تو یہ میرے ساتھ ساتھ تمہارے لیے بھی بہتر ہو گا۔ تب تمہیں میں اذیت ناک موت نہیں ماروں گا۔ خنجر سے گلا کاٹنے کی بجائے پنکھے سے لٹکا دوں گا۔ تب اس نازک گردن کو ٹوٹنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگے گا۔ ہے ناں جامع منصوبہ۔۔۔ فل پروف پلان۔" وہ ہنسنے لگا۔

مینو نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ جواباً" مقابل نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔

"ذلیل لڑکی۔ میں جتنی نرمی برت رہا ہوں اتنا سر پر چڑھتی آرہی ہو۔"

اس کے ہاتھ دوبارہ سے پشت پر باندھ کر وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ناشتے کی پلیٹ البتہ اس کے سامنے ویسے ہی دھری رہی۔

یہی وقت ہے۔ وہ اپنی آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ اس کے بعد شاید اسے کسی کوشش کا کوئی موقع نہ ملے۔ اس ذلیل شخص کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بہتر ہے وہ اپنی عزت و ناموس بچاتے ہوئے ماری جائے۔ وہ اپنے گھر والوں کو اس خبیث شخص کی مکاریوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دے گی۔

اپنے بندھے ہاتھ کھولنے کی کوشش میں وہ خود کو گھسیٹ کر دروازے تک لے گئی۔ اس کے بندھے پاؤں بھی بہت درد کر رہے تھے۔ البتہ وہ اس کے منہ میں کپڑا دوبارہ ٹھونسنا بھول گیا تھا۔

ان اذیت ناک گھڑیوں کی بے درد ساعتیں بہت سفاک تھیں۔ وقت کم ہونے کے پیش نظر اس بزدل سی کمزور لڑکی نے اپنی پوری طاقت پشت پر بندھے ہاتھوں کو زور زور سے ہلانے میں صرف کر دی۔ جبھی ہاتھوں پر بندھی رسی یکلخت ڈھیلی پڑ گئی۔ تو اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔۔۔ شازل جلدی میں اس کے

ہاتھوں کو ڈھیلے انداز میں رسیوں سے جکڑ گیا تھا۔ اس پہ مستزاد اس کی قسمت اس کے حق میں تھی، جبھی اپنے ہاتھوں کو آزاد کرانے کے ساتھ ساتھ اپنے پیروں کی گرہیں بھی کھول ڈالیں۔

اس نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا.... دروازہ باہر سے بند تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف لپکی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ اور شکر ہے کھڑکی میں جالی اور سلاخیں بھی نہیں تھیں۔ دھک دھک کرتے دل سمیت زیورات والا بیگ بغل میں دبائے وہ کھڑکی سے دوسری طرف اتر آئی۔ اور چند لمحے اسی طرح دبکی بیٹھی رہی۔ مکان بالکل خالی تھا۔ ورنہ دوبارہ دھرلی گئی ہوتی.... صحن عبور کر کے بیرونی دروازے تک پہنچی تو اس دم دروازے کے باہر کھٹکے نے جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔ اگر آصف یا شازل ہوا تو اس کی خیر نہیں۔ وہ چند ثانیے دم سادھے رہی۔ پھر کی ہول سے باہر دیکھا۔ سامنے کسی بچے کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

"سنو۔" اس نے ہلکی آواز میں بچے کو پکارا.... بچہ آواز سن کر بند دروازے کی سمت دیکھنے لگا تھا۔ وہ جلدی سے دوبارہ بولی۔

"سنو.... میں اس مکان میں قید ہوں۔ کیا تم مجھے یہاں سے نکال سکتے ہو۔ پلیز تم یہ دروازہ کھول دو۔ دیکھو دیر مت کرو۔ تم بہت اچھے بچے ہو۔ پلیز یہ دروازہ کھول دو۔" وہ ایک تواتر سے بولتے بولتے ہانپ گئی تھی۔

بچے نے دروازے کی کنڈی کھولی تو وہ ہر نتیجہ سے بے پروا گلی میں دور تک سرپٹ دوڑتے دوڑتے مین روڈ تک آگئی۔ شکر خدا کا۔ بالکل سامنے رکشا مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر وہ بے دم سی سراسیمگی کے عالم میں بار بار پیچھے مڑ کر اپنے تعاقب کا اندازہ کرتی رہی۔ جانے اس کی کون سی نیکی کام آگئی تھی کہ ان دونوں شیطانوں میں سے کسی سے اس کا سامنا نہیں ہوا۔ نہ معلوم دونوں کن کارگزاریوں میں مصروف تھے۔ اپنی دانست میں وہ ایک بے بس اور بزدل سی لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بے فکر ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

رکشا جب "آفتاب لاج" کے اونچے گیٹ کے باہر رکا تو بالکل سامنے بائیک سے باہر نکلتے طلال علی کی آنکھیں حیرت واستعجاب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بھیگے موسم کی اس ٹھنڈی اور اداس دوپہر میں اس لڑکی کو اپنے مقابل پا کر وہ جیسے پتھر سا ہو گیا۔ جس کی کل رات سے گمشدگی نے "آفتاب لاج" کے نفوس کی روح تک قبض کر لی تھی اور ان کی عزت کو دھجی دھجی کر ڈالا تھا۔

"وہ کہاں گئی طلال۔ تمہیں ضرور اس کا علم ہو گا۔"

کرنل آفتاب احمد بے چینی سے ٹہلتے بار بار ہتھیلیوں کو مسلتے بہت دلگرفتہ تھے۔

بالکل سامنے فیروز عالم اور اس کے گھر والے بھی موجود تھے۔ ایک ہفتہ بعد مینو کا نکاح تھا اور وہ گھر سے غائب تھی۔ وہ اس کی عدم موجودگی کا ان لوگوں کو کیا جواب دے پائیں گے۔ آہ! اس لڑکی نے ان کی عزت خاک میں ملادی۔ انہیں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے ماموں جان۔ میں اسے خود سے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ناکام ہو گیا۔"

"وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی تھی۔" امو جان دوپٹے کے پلو میں منہ چھپائے ندامت سے روتی رہیں۔

"مجھے اگر معلوم ہوتا وہ گھر سے نکل جائے گی تو میں اس پر پہرے بٹھا دیتی۔ اس کے سامنے دیوار بن جاتی۔ مجھے اس سے اس انتہائی قدم کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو میری بہت معصوم اور بھولی بچی تھی۔ ضرور اس مخص نے اسے گمراہ کر دیا اور...."

"امو جان آپ خوامخواہ دوسروں پر الزام نہ دھریں۔" شمروز صبر وضبط کا مظاہرہ کرتا بہت ادھ موا لگ رہا تھا۔

"اپنا سکہ کھوٹا نکلا۔ اس میں کس دوسرے کا کیا

دوش۔"

"جاؤ طلال، جا کر میری بچی کو ڈھونڈ لاؤ۔ اسے سینے سے لگانے کو میری ممتا تڑپ رہی ہے اور۔" امو جان بولیں تو کرنل آفتاب احمد چیخ پڑے۔

"خبردار جو کسی نے اس کی واپسی کی بات کی تو.... اگر وہ میرے سامنے آ گئی تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے سینے میں گولیاں اتار دوں گا۔ اس کا گلا دبا دوں گا۔"

"مجھے تو پہلے سے اس کے لچھن درست دکھائی نہیں دے رہے تھے بھائی جان۔" فیروز عالم کی والدہ کرنل آفتاب احمد کے زخموں کی پروا کیے بغیر بے حد ٹھنڈے لہجے میں بولیں۔

"بھلا میرے فیروز میں کون سی کمی تھی جو اسے غیر خاندان کا لڑکا بھا گیا۔ یہ سب تربیت کی کمزوری ہے بھائی جان۔ اگر شروع سے لڑکی کو لگام میں ڈال کر رکھا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ آج وہ ہمارے سروں میں خاک ڈال کر یوں گھر سے باہر قدم نہ نکالتی۔ توبہ توبہ اس لڑکی نے اپنی عزت کی پروا کی نہ خاندان کی ناموس کی...."

"فیروز تم فکر نہ کرو.... میں اسے ڈھونڈ لاؤں گا۔" طلال نے خاموش بیٹھے فیروز کو تسلی دی۔

"کیا فائدہ۔" اس کا مبہم انداز طلال کو چونکا گیا۔

"کیا مطلب۔"

"چھوڑو مطلب جان کر کیا کرو گے۔ بس اتنا جان لو کہ سب تباہ و برباد ہو گیا کچھ بھی باقی نہیں بچا۔"

تب طلال آنکھوں میں دکھوں کی بے شمار پرچھائیاں لیے بائیک پر اسے یہاں وہاں ڈھونڈتا پھرا۔ اس نے سارے شہر کے کتنے ہی چکر لگا ڈالے۔ جن جن جگہوں پر مینو اسے اس شخص کے ساتھ دکھائی دی تھی۔ وہ ان تمام جگہوں پر ہو آیا لیکن مینو کہیں دکھائی نہیں دی۔

"اچھے دوست ہو تم طلال.... جو اسے ڈھونڈ نہیں سکے۔" حنا بولی تو وہ تڑپ اٹھا۔

"کل سے اب تک ان سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہوں حنا۔ نہ معلوم وہ کہاں جا چھپی ہے کہ دل کی تمام تر شدتوں سے پکارنے کے باوجود اس تک یہ آواز پہنچ نہیں پا رہی۔"

"ایک بار پھر کوشش کر دیکھو۔"

حنا مدھم لہجے میں بولی تو وہ بائیک کی چابیاں اٹھائے گیراج میں آ گیا۔ آہنی گیٹ کھول کر بائیک پر بیٹھا ہی تھا کہ تبھی پتھر بن گیا۔ ہاں وہ بالکل سامنے رکشے سے مینو اتری تھی۔ جس کی سیاہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بے حد نمایاں تھے اور نازک گال پر انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔ پیڑی زدہ ہونٹ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

"مینو تم۔" وہ بائیک سے اتر کر اس کی جانب لپکا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں۔" مینو دفعتاً اس کے بازو سے لگ کر سسک پڑی۔

"وہ.... وہ بہت مکار شخص ہے طلال اسے مجھ سے نہیں، میری ذات سے وابستہ دولت سے محبت تھی۔ مجھ پر جب اس کی اصلیت کھلی تو اس نے مجھے قید کر دیا۔ وہ دولت حاصل کرنے کے بعد مجھے قتل کر دینا چاہتا تھا۔ دولت کے اس پجاری نے پہلے بھی کسی معصوم لڑکی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ تم نے اسے بالکل ٹھیک پہچانا تھا۔ طلال تم.... تم...."

چہرے پر بے پناہ شکستگی لیے جل تھل آنکھوں سمیت امینہ آفتاب نے غم سے نڈھال اپنے اندر کا ایک ایک زخم دکھا ڈالا۔ تبھی طلال کرب کے بے پایاں احساس کے زیر اثر بہت دیر تک ایک ٹک اس کے کمزور چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا رہا۔

میں بہت مشکل سے اس کی قید سے نکل کر بھاگی ہوں طلال۔ اف وہ قاتل شخص۔" مینو نے جیسے جھرجھری سی لی.... اور اندر کی جانب بڑھی۔

"ٹھہرو مینو...."

"کیوں۔" وہ چونکی۔

"اندر کا ماحول تمہارے لیے قطعی سازگار نہیں۔ شموز اور عزیر سخت طیش میں اور آفتاب ماموں وہ تمہاری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتے۔ تمہارے کل رات گھر سے غائب ہو جانے پر ان سب کو بہت

شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ فیروز اور اس کی والدہ ان سب نے تمہارے چلے جانے پر بہت سخت رویہ اپنا رکھا ہے۔ فیروز کی والدہ کی باتیں تو کسی کا بھی خون کھولانے کے لیے کافی ہیں۔ انہوں نے سراسر اموجان کی تربیت پر انگلی اٹھائی ہے۔"

"میں ان سب کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں گی۔ میں نے بھلے نادانی کے تحت گھر سے باہر قدم نکالا تھا لیکن میں اپنی عزت بچا کر واپس لائی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں مینو۔ تم میرے لیے اب بھی پہلے والی مینو ہو پوتر' پاکباز اور صاف و شفاف مینو۔ لیکن ذرا صبر سے کام لو مینو۔ گھر سے باہر ایک رات بھی گزار کر آنے والی لڑکیوں پہ یہ زمانہ تہمتیں دھرتا ہے۔ انہیں بے آبرو گردانتا ہے۔ اور وہ سب بھی تمہارے پاکباز ہونے پہ شک کریں گے۔"

بلال کی تلخ باتوں پہ جیسے مینو کا سر گھوم کر رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"تو' تو اب کیا ہو گا بلال۔"

"تم یوں کرو۔ تم میرے ساتھ چلو ابھی تمہارا ان سب کے سامنے جانا ٹھیک نہیں۔ میں نہیں چاہتا وہ تم پر انگلیاں اٹھائیں اور شمروز اور عزیر تمہارا اگلا دبانے کو لپکیں۔ حالات جب ساز گار ہوں گے تو میں تب تمہیں ان کے سامنے لے آؤں گا۔"

اس کا بازو تھام کر طلال نے اسے اپنی بائیک کے پیچھے بٹھایا اور بائیک اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا لے گیا۔

"لیکن تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔"

"تمہیں مجھ پر اعتبار ہے ناں مینو۔ تم اتنا تو جانتی ہوں کہ میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گا جو تمہارے خلاف ہو۔ ابھی میں وقتی طور پر تمہیں اپنے دوست کی طرف چھوڑ دوں گا۔ اس کی دو بہنیں ہیں۔ ان کی سنگت میں تم خود کو قطعی تنہا محسوس نہیں کرو گی۔"

"لیکن اپنا گھر ہوتے ہوئے میں غیروں کے گھر کیوں رہوں۔ پلیز طلال مجھے اموجان کے پاس لے چلو۔ میں ان کے قدموں میں سر رکھ کر اپنی نادانی کی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ بابا جان سے لپٹ کر اپنے اندر کا غم ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔

"پاگل لڑکی۔ میں حالات بہتر دیکھ کر تمہیں ان کے سامنے لے جاؤں گا۔ مگر اس وقت چپ چاپ میرے کہنے کے مطابق چلو۔ میں تمہاری بہتری کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

وہ قدرے جھلا کر بولا تو مینو کی آنکھوں میں کھنڈروں جیسی ویرانی اتر آئی اور چہرے پر ایسا کرب' ایسا دکھ پھیل گیا جیسے کند چھری سے کوئی شہ رگ کاٹ رہا ہو۔

نہ معلوم اسے گھر سے دور' اپنے پیاروں سے جڑا ہوا کتنا عرصہ بن باس کاٹنا ہو گا۔ اس کے ایک غلط قدم کی اتنی گھناؤنی سزا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر کتنے دن وہ مینو سے ملنے اپنے دوست کی طرف جا ہی نہ سکا۔ جانے کیوں ہمت ہی نہ ہو سکی۔ خدایا وہ اس لڑکی کے لیے ایسا کیا کرے کہ سب کچھ پہلے جیسا خوشگوار اور ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔ سردیوں کی جلد گہری ہوتی شام بے حد اداس تھی.... دور سرو کے درختوں پر نظریں جمائے ہوئے طلال نے اپنے سینے میں بے پناہ خلش محسوس کی۔ دھند کے اس پار نگاہیں کچھ کھوجنے کا ارادہ باندھے ہوئے تھیں' مگر کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف سیاہی ہی سیاہی تھی۔ دل جب حد سے زیادہ بے چین ہوا تو وہ عاطف کی طرف چلا آیا۔ اسے سامنے دیکھتے مینو امید و بیم کی کیفیت کے تحت اس کی جانب بڑھ آئی۔

"تم نے گھر والوں سے میرے متعلق بات کی.... وہاں کے حالات ساز گار ہو گئے نا۔"

"تم کیا سمجھتی ہو۔ میرے پاس الہ دین کا چراغ ہے جسے رگڑتے ہی سب پہلے جیسا ہو جائے گا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں بے وقوف لڑکی۔ تم ان سب کی عزت کو روند کر نکلی تھیں اور تم سمجھ رہی ہو کہ تمہاری واپسی

کوئی آسان عمل ہے۔"
"تو پھر..." برداشت کی ساری حدیں دم توڑ گئیں۔ زخمی دل پسلیوں کے پنجرے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔
"تم ایسا کرو طلال... تم اپنے ہاتھوں سے مجھے زہر دے ڈالو... تاکہ میں اس اذیت سے چھٹکارا حاصل کرلوں... اور... اور وہ سب بھی بدنامی سے بچ جائیں۔" بوجھل لمحوں کی سفاکی میں طلال خود کو مکمل طور پر بے بس محسوس کررہا تھا۔
"ایسی باتیں نہ کرو مینو... میں برداشت نہیں کرسکتا۔" باوجود ضبط کے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔
"تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔ ہر گزرتی ساعت میرے دکھوں میں اضافہ کررہی ہے۔ احساس جرم مجھے چین نہیں لینے دے رہا اور..." اس دم دروازے پہ کھٹکا ہوا اور عاطف کی بہن آصفہ ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لیے اندر آگئی۔
"مداخلت کی معافی چاہتی ہوں۔"
"ارے نہیں آیئے۔"
طلال سیدھا ہو بیٹھا اور مینو نے ہتھیلیوں کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں رگڑ ڈالیں۔
"ویسے آپ کی کزن بہت خاموش اور کم گو ہیں... حالانکہ میں بھی کم بولتی ہوں۔ لیکن یہ تو الفاظ کو برتنے کے معاملے میں مجھ سے بھی زیادہ کنجوس ہیں۔" آصفہ نے چائے بنا کر کپ طلال کی طرف بڑھایا۔
"عاطف گھر لوٹ آیا کیا۔ یہاں آنے سے پہلے میری اس سے موبائل پہ بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میرے سامنے ہوگا۔"
"نہیں... وہ ابھی تک نہیں لوٹے۔" آصفہ مسکرائی۔ تب ہی معصومہ بھی وہیں چلی آئی۔ وہ دونوں بہنیں مزاجاً" بہت ملنسار اور دوستانہ انداز کی مالک تھیں۔ مینو کو وہاں رہنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ مگر وہ اس دل کا کیا کرتی جو زخمی ہونے کے ساتھ ساتھ حزن و یاسیت میں گھرا تھا۔ جب سے شازل کا گھناؤنا رویہ سامنے آیا تھا' وہ راتوں کو نیند میں ڈر کر اٹھ جاتی تھی۔ تب کتنی دیر تک اس کے وجود پر لرزہ ساطاری رہتا۔
پتا نہیں اس کے غائب ہوجانے پر شازل کا کیا ردعمل ہوگا۔ پتا نہیں وہ اس گھر میں موجود بھی ہوگا یا نہیں۔ حالانکہ اس نے طلال کے پوچھنے پر اسے شازل کا ایڈریس بتا دیا تھا۔ لیکن اس کی خود سے ہمت نہ ہوسکی کہ طلال سے اس بابت دریافت کرے کہ اس نے کیا کیا؟ سردیوں کی ان گہری ہوتی شاموں میں جیسے یہ ملال مینو کے دل سے جاتا ہی نہیں تھا۔ اپنے خاندان کے اتنے کھرے اور سچے بندے سے دامن چھڑا کر سراب کے پیچھے اندھادھند بھاگنے کی سزا کتنی کڑی تھی اس کا اندازہ آج ہو رہا تھا۔ شازل کی چاہت کو دنیا کی خوب صورت حقیقت جاننے والی اس نادان لڑکی کو سمجھ میں آگیا تھا۔ محبت اور دھوکے میں بہت فرق ہے۔

☆ ☆ ☆

طلال... "آفتاب لاج" واپس لوٹا تو طویل شیشوں والے دروازے کے اس پار کا منظر بے حد واضح تھا۔ اموجان' شمروز' عزیر اور عافیہ بھابھی ہیٹر کے سبب گرم شدہ اونچی چھت والے لاؤنج میں درمیان میں چائے کی ٹرالی کے گرد بیٹھی تھیں۔ عافیہ بھابھی چائے بنا رہی تھیں کہ تب ہی طلال ہیلمٹ سمیت صوفے میں دھنس گیا۔
"آؤ برخوردار... کہاں غائب تھے۔" کرنل آفتاب احمد نے پوچھا۔
"یوں ہی... ادھر ادھر..." غیر مبہم سا جواب طلال کے لبوں سے نکلا۔
"چائے پیو گے۔" عافیہ بھابھی نے مدھم سی مسکراہٹ سمیت پوچھا۔ "دل نہیں کررہا بھابھی..." وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ تب ہی اموجان ذرا سخت لہجے میں بولیں۔
"طلال... پھر بھی ساتھ دو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوبارہ میرون صوفے کے آخری کونے پر ٹک گیا۔

موسم سرما کی اداسی کا رنگ نمایاں تھا اور طویل لاؤنج میں موجود نفوس کی غیر معمولی سنجیدگی نے اس میں مزید اضافہ کردیا۔ چائے کا خالی کپ ٹرالی پر رکھتے ہوئے طلال نے "دفعتاً" بے حد مدھم آواز میں کہا۔

"اگر مینو کا پتا چل جائے تو..." اس کی بات پر شمروز اور عزیر کی گردنیں جھک گئیں۔ عافیہ بھابھی نے آنسوؤں کو پلکوں پر ہی روک لیا اور کرنل آفتاب احمد بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے۔

"کہاں ہے میری بیٹی... تم نے اگر اسے ڈھونڈ نکالا ہے تو اسے میرے سامنے کیوں نہیں لائے۔"

"امو جان..." شمروز نے لرزتی آواز میں چٹانوں جیسے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں نے آپ پر پہلے بھی واضح کیا ہے کہ وہ یہاں نہیں آسکتی۔ وہ اس گھر کے لیے مرچکی ہے۔ اس خاندان کے لیے بھولی بسری یاد بن چکی ہے۔"

"تم ماں نہیں ہو نا شمروز... اس لیے اتنی سفاکی سے یہ سب کہہ سکتے ہو۔ مگر طلال تم مجھے میری بچی کے پاس لے چلو۔ میں خود اسے اس گھر میں لے آؤں گی۔ میں دیکھتی ہوں کس میں مجھے روکنے کی ہمت ہے۔" امو جان نے کرنل آفتاب احمد کی جانب دیکھا جو ہمت وضبط کا پیکر بنے اپنی بھیگی پلکوں کو بار بار جھپک رہے تھے۔ اپنی لخت جگر کو دیکھنے کو ان کی آنکھیں بھی ترس رہی تھیں۔ اس لیے وہ مکمل خاموشی اختیار کیے اندر ہی اندر سلگ رہے تھے اور جب طلال' مینو کو "آفتاب لاج" کی جانی پہچانی فضاؤں میں لے آیا تو سیاہ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی مانوس سی خوشبو مینو کے روم روم میں اتر گئی۔ دو چار گہرے گہرے سانس بھرنے کے بعد وہ طلال کی سنگت میں جھجکتے جھجکتے طویل شیشوں والے دروازے کی جانب بڑھی تو اندر مکمل سناٹا تھا۔

"سب کہاں ہیں طلال..." مضبوط دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹتی اپنی آواز مینو کو بہت اجنبی سی لگی۔

"امو جان کے کمرے میں..." مینو جب امو جان کے کمرے میں داخل ہوئی تو "آفتاب لاج" کے سناٹوں میں دبی دبی چیخیں گھل مل گئیں۔ ملاپ کا وہ منظر بے انتہا رقت آمیز اور روح فرسا تھا۔ وہ نادان لڑکی جب امو جان کی بوڑھی بانہوں میں چھپی سسکیاں بھر رہی تھی تو باقی سارے نفوس کے ساتھ ساتھ "آفتاب لاج" کے درو دیوار بھی ان آہوں میں بڑی خاموشی کے ساتھ شریک تھے۔

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے بچی۔" پھول سی بچی کی خستہ حالت اور شکستہ وجود کو دیکھ کر جیسے امو جان کے ساتھ ساتھ کرنل آفتاب احمد کو بھی شدید جھٹکا لگا۔

"میں اب تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"سچ امو جان..." وہ اشکوں سے تر چہرہ لیے بولی۔

"میں بہت تھک چکی ہوں۔ مجھے اپنے آنچل میں چھپالیں۔ میں کڑی دھوپ میں کھڑی ہوں۔ میں آپ سب کی مجرم ہوں امو جان' بابا جان... میں نے نادانی میں آپ کی عزت کو روند کر اس گھر سے باہر قدم نکالا تو مجھے احساس ہوا کہ گھر کی چار دیواری کے علاوہ عورت کی کوئی جائے پناہ نہیں۔"

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"ہوں... تو ٹھوکر لگنے پہ گھر لوٹی ہو۔" ہوا کے دوش پر شمروز کی کرخت آواز لہرائی۔

"مگر اتنا سمجھ لو... اس گھر میں اب تمہارے لیے کوئی گنجائش نہیں۔"

"خدا کے واسطے شمروز... سمجھنے کی کوشش کرو... وہ تمہاری بہن ہے۔ اس گھر سے نکل کر وہ کہاں جائے گی۔"

"اس شخص کے پاس... جس کے لیے ہم سب سے ناتا توڑا تھا۔ اب کیا لینے آئی ہے یہاں... خاندان کی عزت تباہ کرکے... ہمیں دنیا کے سامنے ذلیل کرکے اس کا دل نہیں بھرا' جو دوبارہ لوٹ آئی۔ سب ہی کو پتا ہے یہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور یہ ہم سب کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ دنیا والوں کی اٹھتی انگلیاں میرے لیے ناقابل برداشت ہیں امو جان۔" شمروز آفتاب کی سرخ ہوتی نگاہوں سے

کوندتے شعلے مینو کو اپنے آرپار ہوتے محسوس ہوئے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ گر رہی ہے' مر رہی ہے۔

"خدا کے لیے شمروز بھائی... مجھے معاف کردیں۔" وہ ان کے قدموں میں جاگری۔

"بس شمروز... میری بیٹی گھر آچکی... اب تم اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں بولو گے۔ ابھی اس کا باپ زندہ ہے۔" کرنل آفتاب احمد کی کرخت آواز میں قطعیت تھی۔ شمروز نے ایک نظر انہیں دیکھا اور تب ہی روتی بلکتی مینو پر ایک نگاہ ڈال کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اور پھر کتنے ہی پھیکے دن پر لگا کر اڑ گئے۔ وہ لڑکی... وہ سب سے منفرد لڑکی' وہ اپنے فیصلے خود کرنے والی لڑکی' ساون کی رت میں خود کو بہت تنہا' بہت اکیلا محسوس کرتی رہی۔ وہ اس گھر میں دوبارہ لوٹ آئی تھی' لیکن وہ پہلے کی طرح نہ شمروز بھائی اور عزیز بھائی سے لڑ لڑ کر اپنی باتیں منوا سکتی تھی اور نہ بابا جان کے کندھے سے لگ کر ان سے اپنے اندر کی بات شیئر کر سکتی تھی اور تو اور طلال علی کے ساتھ بھی اس نے خود کو جیسے خول میں بند کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ اس کا دوست اور بے حد مخلص ساتھی تھا۔ لیکن احساس جرم کچھ اتنا شدید تھا کہ اس کے دل سے پچھتاووں کے داغ دھل ہی نہیں پاتے تھے۔ کاش اس نے شازل پر اندھا اعتماد نہ کیا ہوتا' کاش... اس شام وہ بالکنی میں کھڑی تھی۔ باہر بالکنی کے اس پار ہلکے ہلکے برسنے والی بوندیں تیز بوچھاڑ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔

"تم اتنی مایوس کیوں ہو۔" رات جب زیادہ گہری ہو تو سویرا قریب ہوتا ہے پگلی۔

"جھوٹی امید مت دلاؤ طلال۔"

"جھوٹی امید کیوں... ابھی بھی خوب صورت مستقبل تمہارا منتظر ہے۔ جب تمہاری شادی فیروز سے ہو جائے گی تو تم دیکھ لینا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فیروز اپنے پیار اور خلوص سے تمہاری زندگی سے تمام دکھوں کو دھو پھینکے گا۔"

"فیروز..." وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ وہ اس نام کو تو بھول ہی چکی تھی۔ ہو سکتا ہے طلال کی باتیں سچ ہو جائیں اور فیروز اس کی سسکتی زندگی میں بہاریں لانے کا سبب بن جائے۔ امید کی ایک مدھم سی کرن ابھری۔

"اچھا اپنا ہاتھ لاؤ۔" بلال نے اپنی جیب سے بال پوائنٹ نکالا اور اس کی نازک سی ہتھیلی پر لکھ دیا۔

تم واقعی اچھی لڑکی ہو۔
یا مجھ کو اچھی لگتی ہو۔
چہرے کی اداسی دور کرو۔
کیوں جی' اپنا رنجور کرو۔
تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔

"طلال... تمہیں پتا ہے۔ ان اندھیری راہوں میں تمہاری ذات اب بھی میرے لیے جلتے چراغ کی مانند ہے۔" ہتھیلی پر لکھے اس کے الفاظ پڑھ کر مینو نے بڑی اداسی سے کہا۔ جب ہی وہ ایک دم چونکی۔

"ذرا یہ تو بتاؤ طلال... تمہیں تمہاری "وہ" ملی یا نہیں۔"

"وہ ملتی بھی کیسے... اسے ڈھونڈ لانے کا وعدہ تو تم نے کیا تھا۔ مگر تم اپنے دھندوں میں ایسی الجھیں کہ پھر غریب کو بھول ہی گئیں۔" نیلے پانیوں والی آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔

"تو کیا میں اب اس کے لیے کوشش کروں۔"

"اب تو وہ خواب و خیال بن چکی۔"

"پھر تم شادی کیوں نہیں کر لیتے طلال... کب تک اسے یاد کرتے رہو گے۔"

"میں اس کی یاد میں ساری زیست تنہا گزار دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں مینو۔ کوئی دوسرا اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔"

"اچھا مینو... آئس کریم کھانے چلو گی؟" وہ اسے اداسیوں سے بھرے کمرے سے باہر نکالنے کی خاطر بولا۔

"یاد ہے نا مینو... تمہیں سردیوں میں ٹھنڈی

آئس کریم کھانا کتنا مرغوب تھا۔" اس کی بات پر مینو کی آنکھوں میں تکلیف کے آثار ابھر آئے۔ اب تو وہ ساری باتیں خواب و خیال بن گئیں۔

"آؤ نا۔۔ کیا سوچنے لگی۔" اس کے نا۔۔ نا کہنے کے باوجود طلال اسے اپنے ہمراہ گھسیٹ لے گیا اور بائیک پہ بٹھا کر آئس کریم کھلانے کے ساتھ ساتھ اسے کتنی دیر بھیگی سڑکوں پر لے کر گھومتا پھرا۔

"اگر کہو تو تیز بائیک چلاؤں۔"

"نہیں طلال۔۔ اب مجھے تیزی سے اور عجلت سے خوف آنے لگا ہے۔ میں نے عجلت میں ہی تو شازل کے لیے گھر سے باہر قدم نکالا تھا اور۔۔۔" وہ بجھ سی گئی۔

"دیکھو لڑکی۔۔ اگر اداس ہونے کا دوبارہ سے ارادہ ہے تو میں اتنی تیز بائیک چلاؤں گا کہ تمہاری چیخیں نکل جائیں گی۔"

"نہیں میں اداس نہیں ہوں۔" وہ زبردستی مسکرا دی۔۔ اور جب اس برستی رم جھم میں وہ اس شخص کی سنگت میں خاصا وقت گزار کر گھر واپس لوٹی تو اندر فیروز کو موجود پایا۔۔ وہ ٹھٹک کر لاؤنج سے باہر ہی رک گئی۔ اندر ہونے والی گفتگو میں اپنا نام سن کر وہ پتھر بن گئی۔

"دیکھو فیروز۔۔ میری بچی معصوم ہے۔ تم اس کی اس نادانی کو نظر انداز کر کے کھلے دل کا ثبوت دو اور اسے اپنی عزت بنا کر گھر لے جاؤ۔۔ میں۔۔"

"چہ خوب۔۔ اپنی بے عزت بیٹی کو میرے سر منڈھنے کا آپ سب نے سوچ بھی کیسے لیا۔ وہ گھر سے باہر نہ معلوم کس کے ساتھ منہ کالا کر کے لوٹی ہے۔۔۔ آپ نے بے غیرتی کا ثبوت دیتے اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی، لیکن میں ہرگز، ہرگز بے غیرت اور بے شرم نہیں۔ ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے سے بہتر ہے کہ میں اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالوں۔"

فیروز عالم کی غصے سے بھرپور آواز لاؤنج کی دیواروں میں گونجی تو وہاں موجود سب ہی افراد کی گردنیں ندامت سے جھک سی گئیں۔ اس لڑکی نے انہیں اتنا مجبور اور بے زبان کر دیا تھا کہ وہ اپنی ناموس کے دفاع میں کچھ کہنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ "فیروز۔۔ مینو اگلے دن ہی لوٹ آئی تھی۔ طلال نے اسے ہمارے غصے سے بچانے کے لیے اپنے دوست کے گھر رکھ چھوڑا تھا۔" اموجان کی آواز پست تھی۔

"آپ کا مطلب ایک رات باہر گزارنا کسی لڑکی کے لیے معمولی بات ہے، جو لڑکی اپنی عزت کے موتی کی حفاظت نہ کر سکی۔ اس کے لیے میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔ آپ میری طرف سے انکار سمجھیں اور میرے بڑوں کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ اپنی آبرو باختہ لڑکی کو اپنے پاس سنبھال کر رکھیں۔" فیروز کے کھردرے لہجے پر اموجان تیورا کر گر پڑیں اور باہر کھڑی مینو کا زرد چہرہ اور کانپتا وجود دیکھ کر اس کے بالکل عقب میں کھڑے طلال نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔

"ہمت سے کام لو مینو۔۔ خود کو سنبھالو۔"

"یہ فیروز۔۔ مجھے کتنی غلط لڑکی سمجھتا ہے طلال۔" وہ کانپ رہی تھی۔

"میں حالات سے لڑتے لڑتے تھک چکی ہوں طلال۔ اب مجھ میں مزید سکت نہیں رہی کہ میں دوسروں کی مزید نفرتیں اپنے دامن میں سمیٹ سکوں۔ میرے وجود کا ریشہ ریشہ زخموں سے چور ہے۔" دبی دبی سسکیاں اس کے حلق سے خارج ہو گئیں۔

"فیروز کی باتوں کا اثر نہ لو۔۔ وہ کم عقل شخص ہمیشہ سے کانوں کا کچا ہے۔ اس کے اپنے بھی ٹھوس خیالات نہیں رہے جن کی بنا پر وہ زندگی کے فیصلے کر سکے۔" طلال نے روتی بلکتی لڑکی کو تسلی دی۔

"میں بھلے ایک رات باہر رہی ہوں طلال۔۔ لیکن میں نے اپنی عزت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی اور اس فیروز نے کتنی آسانی سے مجھے آبرو باختہ اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا۔ کیا میری سزا کی یہ مدت کبھی ختم نہیں ہو گی طلال؟"

"کیوں۔۔ یہ سزا ختم نہیں ہو گی بھلا۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ ہر اندھیری رات کے بعد سورج نکلتا ہے جو پوری دنیا کو روشن و منور کر دیتا

ہے۔"

"طلال... تمہارا دل تو میری طرف سے صاف ہے نا... تو تم مجھے بری اور آبرو باختہ لڑکی نہیں سمجھتے۔" اس کی ذہنی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔

"طلال تم نے شازل کے ساتھ کیا کیا... تم نے مجھ سے اس کا ایڈریس لیا تھا۔ اگر تم اسے پکڑ کر میرے سامنے لے آؤ تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی برباد کرنے والے کے سینے میں خنجر اتار دوں گی۔"

"وہ پکڑا جا چکا ہے مینو... میں نے اگلے دن ہی پولیس کے ہاتھوں اسے گرفتار کروا دیا تھا۔ وہ اپنے گناہوں کی سزا ہر حال میں بھگتے گا۔ پلیز مینو... میری خاطر خود کو سنبھال لو... تم تو بہت مضبوط لڑکی ہو۔ تم فکر نہ کرو۔ میں خود فیروز کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

☆ ☆ ☆

صبح بارش برسی تھی اور ہر طرف جل تھل کا نظارا تھا۔ تب ہی اسے سامنے کے دروازے سے فیروز ہاتھوں میں بیگ اٹھائے نظر آیا۔

"سنو فیروز..." طلال اس کے سامنے آگیا۔

"کہو..."

"کہاں کی تیاری ہے۔"

"گھر واپس جا رہا ہوں۔"

"بس اس لڑکی سے اتنی ہی محبت تھی تمہیں کہ اسے ذرا سا کانٹا چبھا تو اس کے درد کی پروا کیے بغیر اسے بے یارومددگار چھوڑ کر بھاگ رہے ہو۔"

"اس کی مدد کرنے والے تم جو موجود ہو۔" فیروز نے تیکھے انداز میں کہا۔

"میں دوسری بات کر رہا ہوں فیروز... اور اس معاملے میں قطعی سنجیدہ ہوں۔ تم جانتے ہو نا یہ مینو کی زندگی کا سوال ہے۔ وہ تمہاری بچپن کی مانگ ہے اور بچپن کے ساتھی کو اس طرح بیچ منجدھار میں چھوڑ کر بھاگا نہیں کرتے۔ تمہیں مینو کا اعتبار ہونا چاہیے۔ وہ ایک پاکیزہ لڑکی ہے جس کے دامن پر کوئی داغ نہیں۔"

"تم اس کی وکالت مت کرو..." فیروز ایک دم غصے ہو گیا۔

"صورت سے کیا، میں اتنا ہی بے وقوف نظر آتا ہوں کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لوں گا۔ جاؤ جاؤ میاں... کسی اور کو شیشے میں اتارو... اور اگر اس لڑکی سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو اس پاکیزہ لڑکی کا ہاتھ خود ہی تھام لو... اس کے لیے میرے یا کسی اور کے سامنے گڑگڑانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم بہت کم ظرف ہو فیروز..." "تم میں تو اتنی بھی انسانیت باقی نہیں کہ تم کسی کا درد بانٹ سکو۔ مجھے افسوس ہوتا ہے تمہاری ذہنیت پر۔" طلال نے ہلکی سی غراہٹ سمیت کہا تو عقب سے کرنل آفتاب احمد کی آواز گونجی۔

"اس کم ظرف کو جانے دو طلال... یہ میری مینو کے قابل نہیں۔ جو غلط فیصلہ میں نے برسوں پہلے کیا تھا، شکر ہے خدا نے مجھے اس پر عمل پیرا ہونے سے بچا لیا۔" کرنل آفتاب احمد کہہ رہے تھے اور ساتھ میں کھڑی امو جان کی آنکھوں میں دھندلاہٹیں نمایاں تھیں اور دل اس غم میں پھٹا جا رہا تھا کہ وقت کی تمام تر ساعتیں ان کی بیٹی کے خلاف تھیں۔ یہ گھڑیاں کتنی سفاک اور ظالم تھیں۔ کیا اس کے لیے کوئی راہ نجات نہیں۔ کیا وہ اس قابل نہیں کہ اس کا جرم معاف کر دیا جاتا۔ کیا وہ معافی کی حقدار نہیں تھی۔

"میری بیٹی کا کیا ہو گا آفتاب؟" بت بنے کرنل آفتاب احمد پر امو جان نے ایک دکھی نگاہ ڈالی۔

"کیا میری مینو کی زندگی سدا اذیت کی بھٹی میں سلگتی رہے گی۔ کیا اس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں کھل سکے گی۔"

"وہ ضرور مسکرائے گی امو جان۔"

دل کی گہرائیوں سے نکلی گونج دار آواز نے جیسے ان سب کو چونکا دیا۔ شمروز، عزیر اور عافیہ بھابھی بھی وہیں آ گئے تھے اور حنا بھی... معاملہ اتنا گمبھیر تھا کہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ فیروز کھلے

گیٹ سے باہر نکل چکا تھا اور اب طلال علی کے جملوں نے جیسے ہر طرف سنسنی سی پھیلا دی تھی۔
"مینو ضرور مسکرائے گی امو جان۔ میں اسے مسکرانا سکھاؤں گا۔ میں اس کی اندھیری راہوں میں روشنیاں بھروں گا۔ میں صرف اس کا دوست ہی نہیں اس کی زیست کا ساتھی بھی بننا چاہتا ہوں۔"
"تم طلال۔"
سطوت آرا کی آواز قریب ہی ابھری۔ بیٹے کی باتوں پر ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔
"کہیں تم جذباتی پن میں تو ایسا نہیں کہہ رہے۔"
"نہیں امی۔ یہ کوئی جذباتی پن نہیں ہے۔ نہ ہی کسی پر احسان ہے۔ اور نہ ہی یہ قربانی ہے۔ میں قربانی دے بھی نہیں سکتا۔ میں کوئی ولی یا پیغمبر نہیں ہوں۔ میں ایک عام سا گناہ گار شخص ہوں جو بچپن سے اپنی زیست کی خوشیوں کو پالینے کا تمنائی ہے اور وہ خوشی صرف اور صرف مینو ہے۔"
"تمینو۔" ملی جلی آوازیں ابھریں۔
اور تبھی اس بھیگی سی نرم جھم والی گلابی شام میں ہر آنکھ اشکبار ہو گئی اور اس شخص کے کھلے دل اور مخلصانہ پن کی معترف بھی جس نے ان سفاک لمحات میں حالات کی سنگینی کو کم کرنے کے لیے اس بے بس اور کمزور لڑکی کا سہارا بننا قبول کر لیا تھا۔
طلال، مینو کے سامنے اس کے اداسیوں بھرے کمرے میں کھڑا یقین انداز میں کہہ رہا تھا۔
"میری آنکھوں میں جس کے انتظار کا رنگ تھا، وہ تم ہی ہو مینو۔ یقین مانو یہ میں تم پر احسان نہیں کر رہا۔ میں یہ اپنے لیے کر رہا ہوں۔ پلیز ایک بار میری آنکھوں میں جھانک لو۔ تمہیں یقین آجائے گا کہ صدیوں سے میں تمہارا طلب گار تھا۔"
بے یقینی کی کیفیت میں اس بے حد دکھی لڑکی نے ان گہری گہری سمندر جیسی آنکھوں میں جھانکا جہاں اسے اپنا عکس صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ تبھی ایک آسودہ حال مسکراہٹ ان لبوں کو چھو گئی۔
"طلال۔۔۔ تم۔۔۔ تم۔" اس نے بہت کچھ کہنا چاہا۔۔۔ مگر الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔۔۔ البتہ اس کے کانوں میں طلال کا گرم لہجہ اندر تک اتر گیا۔
"تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔" اور باہر چھما چھم گرنے والی بوندیں بھی مسکرا دیں۔

☼ ☼

حمیرا نوشین

''وقسم اللہ پاک کی ایسا منظر اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھ کر آرہی ہوں کہ میری توبہ......''

وہ سب جو لاؤنج میں اپنے کسی نہ کسی کام میں مصروف تھیں سب ہی کی توجہ میرب نے اپنی جانب مبذول کروائی۔

''اب ایسا کیا انوکھا دیکھ لیا تم نے جو یوں اپنے گال پیٹ رہی ہو۔''

''یہ پوچھو کیا نہیں دیکھا اللہ معاف کرے قیامت کے آثار ہیں وہ... وہ ساتھ والے کرائے کے گھر میں جو نیا نویلا جوڑا کچھ ہی دنوں پہلے شفٹ ہوا ہے۔'' اس نے یاد دہانی کروائی۔

''ہاں پھر کیا ہوا انہیں۔ طلاق تو نہیں دے دی اس خوبرو نوجوان نے۔''

''ارے ایسی کوئی بات نہیں۔''

''تو پھر کیا بات ہے اب بتا بھی چکو۔'' ذوبیہ کو اس کے تجسس دلانے پر غصہ آگیا۔

''ہائے کیسے بتاؤں دونوں میاں بیوی...'' اس نے زور سے آنکھیں میچیں۔

ایشال جو انہماک سے نوٹس بنانے میں مصروف تھی میاں بیوی کے قصے پر پوری توجہ اس کی طرف کرلی ضرور کوئی رومانٹک سین دیکھ کر آئی ہے۔ ہائے۔ دل میں گدگدی ہوئی۔

''ہاں۔ ہاں دونوں میاں بیوی کیا کر رہے تھے۔''

''مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے اگر تائی امی نے سن لیا تو میری تو شامت ہی آجائے گی کہ میں دوسروں کے گھروں میں کیوں جھانکتی ہوں۔'' ایشال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

''امی تمہاری اس گندی عادت کے بارے میں بخوبی جانتی ہیں۔ ویسے بھی وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں اس لیے خدا کے واسطے اب تجسس ختم کردو ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔'' اس پر جھنجلاہٹ سوار ہوئی۔

''صبر کرو بتاتی ہوں دونوں میاں بیوی لان میں جھولے پر بیٹھے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پیار بھری باتیں کر رہے تھے۔ کافی دیر دونوں محو گفتگو رہے مگر ایک دم اچانک پتا نہیں کیا ہوا چار فٹی کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے۔ چنی منی آنکھیں ابل کر باہر آنے لگیں اور وہ شہابی رنگت والا شہزادہ' اس کے بھی تیور بدل گئے چٹیا سے پکڑ کر ایسے کھینچ کر چماٹ ماری کہ موصوفہ کو دن میں رومینس کرنے کا مزا آگیا ہوگا۔ اس نے بھی جوابی کارروائی میں میاں کی کھڑی (جوتا) اتار کر اس کے سر پہ دے ماری اور وہ بیچارا موقع پر......''

''دم توڑ گیا ہائے بے چارا بیوی کے ہاتھوں مارا گیا ہائے کوئی جائے تھانے میں رپورٹ درج کروائے۔ میں ابھی حماد بھائی کو فون کرتی ہوں۔'' حمنہ جلدی سے موبائل اٹھانے کے لیے اٹھی تو میرب نے اس کی قمیص کا پلو پکڑ کر کھینچ لیا تو وہ ڈیڑھ من کی ذوبیہ کے اوپر آگری اور وہ اپنا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''بے وقوف مرا نہیں وہ۔ بے ہوش ہوا ہے۔'' میرب نے اسے تسلی دی۔

''پھر اب ڈاکٹر کو فون کردوں۔'' اسے اب بھی تشویش لاحق تھی۔

''وہ خود ہی ڈاکٹر بنی ہوئی ہے۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے کبھی پیاز سنگھا رہی ہے تو کبھی پرفیوم اس

کے نتھنوں میں چھڑک رہی ہے۔ سارے ٹوٹکے بیکار
گئے جب اس نے اپنی گرد آلود چپل اس کی ناک کے
قریب کی تو وہ فوراً ہی ہوش میں آگیا۔" اس کی بات
سن کر سب نے قہقہہ لگایا۔

"اچھا۔ اب کہاں ہے وہ۔"

"وہیں اسی جھولے میں لٹا کر گرم دودھ میں ہلدی ملا
کر اسے زبردستی پلا رہی ہے۔"

"چلو دیکھنے چلتے ہیں۔" حمنہ فوراً ہی اوپر چھت پر
جانے کو تیار ہوگئی تو وہ سب اوپر کی جانب چل دیں۔
ایشال کے کان تو کسی رومانٹک قصے کے منتظر تھے مگر
یہاں تو معاملہ ہی اور تھا وہ منہ بنا کر اپنے ادھورے
نوٹس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☼ ☼ ☼
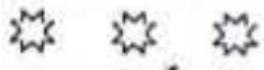
صبح سے گھر میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ملازمہ

جی جان سے گھر کی صفائیوں میں لگی ہوئی تھی اور غزالہ بیگم فالتو چیزیں کمروں سے نکال نکال کر صادق (ملازمہ کا بیٹا) کے حوالے کررہی تھیں کہ چاہے تو انہیں بیچ کر اپنے کچھ پیسے بنالے اور اگر ضرورت کی کوئی چیز اس میں ہے تو اپنے پاس رکھ لے۔ ایک دم سے اتنا سامان مل جانے پر اس کی تو لاٹری نکل آئی تھی۔

گرد و غبار سے اسے الرجی ہونے لگی تو وہ تائی امی کے پورشن میں چلی آئی وہاں بھی پینٹ کی مہک نے اس کا استقبال کیا وہ ناک سکوڑتی کمرے میں چلی آئی جہاں سب کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔

"کیا ہوگیا ہے یہ ایک دم سے صفائیوں کا خبط کیوں سر پر سوار ہوگیا ہے ادھر امی نے پورے گھر کا کاٹھ کباڑ اکٹھا کر رکھا ہے اور یہاں پینٹ کی ناگوار بو پھیل رہی ہے کہیں آپ حماد بھائی کی شادی کی تیاری تو نہیں کررہیں۔" وہ تائی سے مخاطب ہوتی ہوئی بولی۔

"ارے نہیں بیٹا حماد کی شادی یوں اچانک تھوڑی ہوگی تم بہنوں نے ہی ساری تیاری کرنی ہوگی۔" عظیمہ نے محبت سے اسے دیکھا۔

"تو پھر معاملہ کیا ہے۔" وہ متجسس ہوئی اور نگاہیں ایشال پر ٹکادیں۔

"تمہیں دوسروں کے گھروں سے جھانکنے کی فرصت ملے تو اپنے گھر کے حالات کا پتا چلے۔" ایشال نے اس پر طنز کیا۔

"بھئی اب ساتھ والے خود جھانکنے کا موقع دیں تو کیا کروں، بندہ بشر ہوں وہی فلم جو تین گھنٹے ٹائم ضائع کر کے دیکھی جاتی ہے۔ ساتھ والے وہی انٹرٹینمنٹ مہیا کردیں تو کون کافر ہے جو فائدہ نہیں اٹھائے گا۔ رومینس، شرمیلی و بھڑکیلی ادائیں، لڑائی سب کچھ لائیو دیکھنے کو ملتا ہے۔" وہ دانتوں میں لب دبا کر مسکراتے ہوئے بولی تو ایشال نے اسے کشن کھینچ مارا۔ عظیمہ بھی مسکراتی ہوئی کچن کی طرف روانہ ہوئیں۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عدیل چچا انگلینڈ سے مع فیملی تشریف لارہے ہیں یہ سب تیاریاں ان ہی کی وجہ سے ہورہی ہیں۔" ایشال کپڑوں کی تہ مکمل کرتی ہوئی بولی۔

"کیا۔" وہ ایک دم اچھل پڑی۔

"چچا کو اچانک پاکستان آنے کی کیا سوجھی۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم، آئیں تو ان سے پوچھ لینا۔" اس نے کپڑے الماری میں ترتیب سے رکھے۔

"اس کا مطلب "گپلو" بھی آرہا ہے اب مزا آئے گا گھر میں رہنے کا۔ وہ مسکرائی۔

"وہ **گپلو** ستائیس سال کا خوبرو جوان بن چکا ہے اپنے سے پانچ سال چھوٹی کے قابو میں اب وہ نہیں آئے گا۔ لہٰذا اپنی شرارتوں کا گلا گھونٹ کے دفنا دو۔" حماد کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔

"حماد بھائی آپ اتنے ویل مینرڈ اور ڈاکٹر ہو کر اس کی شرارتوں سے بچ پائے ہیں جو اسے عفان بھائی سے باز رہنے کو کہہ رہے ہیں۔" ایشال نے اس کی چلبلی طبیعت پر چوٹ کی مگر وہ بے نیازی سے چیونگم چباتی رہی اس کے دماغ میں اس وقت بہت کچھ چل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہارون، شکیل اور عدیل تینوں بھائی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ تینوں بھائیوں میں حد درجہ محبت و اپنائیت پائی جاتی تھی۔ آٹھ کنال پر مشتمل بنگلے میں تینوں کے الگ الگ پورشن تھے۔ ہر پورشن کے درمیان میں ایک لان تھا۔ سب ایک دوسرے کے ہاں با آسانی اور جب دل چاہے آجاسکتے تھے، کوئی میر تیر نہ تھی۔ جس کا جہاں دل چاہا کھالیا کسی قسم کا کوئی فرق نہ تھا ان کے والد نے ان کی تربیت اس نہج پر کی تھی کہ رشتوں میں محبت اپنائیت اور خلوص نہ ہو تو زندگی جینے کا کوئی مزا نہیں۔ زندگی کا حسن ایک دوسرے کے احساس اور محبت سے ہے۔

ماں باپ کے دنیا سے رخصت ہوجانے پر بھی ان کے خیالات نے ان بھائیوں کا دامن پکڑے رکھا اور بدستور تینوں کے خاندان میں محبت کی فضا برقرار تھی۔ ہارون کی تین بیٹیاں ایشال، حمنہ، ذوبیہ اور ایک ہی بیٹا

حماد تھا۔ شکیل کے ایک بیٹی میرب اور دو بیٹے حارث اور ابراہیم تھے۔ سب سے چھوٹے عدیل کا ایک ہی بیٹا عفان۔ جب وہ بارہ برس کا تھا تو وہ انگلینڈ شفٹ ہو گئے مگر رابطہ مسلسل رہا' ہر سال وہ پاکستان کا چکر لگا لیتے مگر عفان اپنی تعلیم کی وجہ سے چند بار ہی پاکستان آسکا۔ اب اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ وہیں پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔

وہ سب کافی عرصہ بعد پاکستان آرہے' تھے سب ہی ان سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ دوریوں نے ان کے درمیان رشتوں کی کشش کو کم ہونے نہیں دیا تھا۔

ان کے سامان کی لوڈنگ ملاحظہ کر رہی تھیں جو کہ بے حد و بے حساب تھا اور کرنجی آنکھوں والے ہیرو کے جانے کا دکھ اسے ستا رہا تھا۔ جب تک ان کی گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی وہ وہیں ٹنگی رہی۔ چار فٹی اسے خونخوار نگاہوں سے گھورتی ہوئی گاڑی میں بیٹھی تھی مگر اسے کب پروا تھی وہ انہیں ہاتھ ہلا کر رخصت کر کے ہی پیچھے لوٹی تھی۔

میرب نے ذوبیہ کا ہاتھ دبا کر اسے اصل بات بتانے سے روکا اور وہ اس کے اتنی زور سے ہاتھ دبانے پر دانت پیس کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"میرب اب اٹھ بھی جاؤ عارفہ چچی کب سے تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہیں۔" ذوبیہ بلا مبالغہ کوئی دسویں مرتبہ اسے جگانے کے لیے آئی تھی مگر وہ ایسی گہری نیند میں تھی کہ نیتیوں کو بھی مات دے رہی تھی۔ آخر کار اس نے تنگ آکر پانی کی چند بوندیں اس پر چھڑک دیں۔ پانی کی بوندوں سے گھبرا کر اس نے جو غصے سے ہاتھ اٹھا کر روکنا چاہا تو ذوبیہ کے ہاتھ میں پکڑے جگ سے اس کا ہاتھ ٹکرایا اور وہ پوری کی پوری پانی میں نہا گئی وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور اسی وقت عارفہ اندر کمرے میں داخل ہوئیں وہ ذوبیہ کو دل ہی دل میں کوستی گیلے کپڑوں سمیت ان سے لپٹ گئی انہوں نے بھی اسے بے تابی سے گلے لگا لیا۔

"بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری بڑی دیر سے سو رہی تھیں۔" وہ فکر مندی سے بولیں۔

"وہ.... چچی ساتھ والے کرائے دار اپنے گاؤں شفٹ ہو رہے تھے میں ان کے ساتھ کچھ پیکنگ وغیرہ کروا رہی تھی۔ بڑی اچھی فیملی تھی۔ بس اسی وجہ سے تھوڑی تھکن محسوس ہو رہی تھی اس لیے آنکھ لگ گئی۔" اس کے اتنی مہارت سے جھوٹ بولنے پر ذوبیہ کی آنکھیں ابل پڑیں یہ سچ تھا کہ ساتھ والے یہاں سے اپنے گاؤں شفٹ ہو رہے تھے مگر میرب میڈم ان کی مدد نہیں کروا رہی تھیں بلکہ چھت پہ سے

شام کو ساری نوجوان پارٹی لان میں چائے کے ساتھ لوازمات سے انصاف کر رہی تھی جبکہ بڑوں نے اپنی محفل لاؤنج میں سجائی ہوئی تھی۔ میرب نہا کر فریش ہو کر تائی امی کے لان میں چلی آئی۔ سامنے ہی عفان ہاتھ میں چائے کا مگ پکڑے کسی بات پر مسکرا رہا تھا۔ ہائیں یہ "گپلو" ہے یہ تو اچھا خاصا اسمارٹ ڈیشنگ اور سوبر لگ رہا ہے وہ اس کی وجاہت سے متاثر ہوئی اور بغیر سلام دعا کے اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو کر اس کا ناقدانہ جائزہ لینے لگی۔

"یہ بتاؤ یہ تم نے اپنی توند کیسے غائب کی بازو بھی اچھے خاصے ہلکے ہو گئے ہیں اور ناک کا سائز بھی کافی کم ہو گیا ہے کہیں تم نے ری۔ شیپ کی خدمات تو حاصل نہیں کیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے بازوؤں کو چھوتے ہوئے بولی اور وہ آنکھوں میں ناگواری لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"وہاٹ نان سینس؟" وہ بولا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

"کیا مطلب۔" وہ کچھ نہ سمجھا۔

"بھئی تم نے وہاٹ نان سینس کا مطلب پوچھا میں نے بتا دیا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ تم اپنی انگریزی کا رعب جھاڑ رہے ہو یا میرا امتحان لے رہے تھے۔" اس نے پھر اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں مگر وہ لب

بھینچے بیٹھا رہا۔ وہ وہیں اس کے قدموں میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور کباب اٹھا کر کھانے لگی۔

"میرب تم یہاں آجاؤ میں اندر سے چیئر لے آتا ہوں۔" حماد فوراً" اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کی کہ مزید کوئی بدتمیزی مت کرنا باقی سب بھی کھنکھار کر اسے سرزنش کرنے لگے اور عفان شرمندہ سا چائے کے سپ لیتا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ ال مینوڈ لڑکی ابھی تک نہیں بدلی اسکائپ پہ بھی جب بھی بات ہوتی وہ اسے ایسا ہی نشانہ بناتی تھی تنگ آکر اس نے اس سے بات کرنی ہی چھوڑ دی تھی۔ اتنے سالوں بعد ملنے پر بھی اس کی فطرت ذرا نہ بدلی تھی۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتا اسی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ذوبیہ' حمنہ' ایشال تینوں تائی امی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں وہ سخت بور ہو رہی تھی کچھ سوچ کر وہ چچی کے پورشن میں چلی آئی۔ عافیہ تو اسے نظر نہ آئیں مگر سامنے ہی "گھلو" بیٹھا نظر آگیا اس کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔

"ہر وقت کتابوں میں منہ دیئے رہتے ہو کیا فائدہ اتنی کتابیں پڑھنے کا کونسا تم نے ان سے کچھ حاصل کرلینا ہے۔ خوب صورت چہرے پڑھا کرو کتابوں سے زیادہ چہروں پہ داستانیں رقم ہوتی ہیں۔" میرب نے عفان کے ہاتھ سے کتاب چھینی اور دھپ سے اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی عفان نے ناگواری سے اس کے ہاتھوں سے کتاب واپس چھین لی۔

"تم نے کتابوں سے بڑھ کر کیا حاصل کرلیا بڑوں سے بات کرنے تک کی تو تمہیں تمیز نہیں ہے تم سے پانچ سال بڑا ہوں آئندہ اگر مجھ سے بات کرنی ہو تو تم کا صیغہ مت استعمال کرنا۔" وہ غصے سے کہتا اٹھ کر دوسرے صوفیہ پر بیٹھ گیا۔ میرب اس کی بات سن کر جلبلا کر رہ گئی تھی۔

"اور اگر آپ نہ کہوں تو کیا کرلو گے۔" وہ تن کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"کہہ کر دیکھو اپنے ہاتھ کا پرنٹ تمہارے گال پہ ایسا پرنٹ کروں گا کہ بھول کر بھی "تم" کا لفظ تمہارے منہ سے نکلنے کی جرات نہ کرسکے گا۔ اور ہاں اگر تمہیں چہرے پڑھنے آتے ہیں تو میرے چہرے پر غور سے پڑھ لو کہ تمہارے لیے کتنی ناپسندیدگی لکھی ہوئی ہے۔"

عفان اس کی آنکھوں میں جھانک کر درشتی سے بولا تو وہ اس کے لہجے سے سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے اتنی سختی سے بات کرے گا آنکھوں میں نمی لیے غصے و صدمے سے نڈھال وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی تب ہی حماد بھی وہیں چلا آیا۔

"کیا ہے بڑی گہری خاموشی ہے۔" اس نے میرب کو چپ بیٹھے دیکھ کر کہا۔

خامشی ہی میں عافیت ہے فراز
جب کوئی اپنا ہم زباں نہ ملے

بے ساختہ میرب کے لبوں سے شعر ادا ہوا اور عفان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"شعری ذوق تو میڈم کا عمدہ ہے مگر حرکتیں الاماں۔"

"واہ بھئی بہت خوب تو عفان میاں ہماری میرب کا شعری ذوق ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ درپردہ آپ کی خامشی اسے کھل رہی ہے بھئی ہماری اتنی شوخ کزن سے ایسا برتاؤ تو نہ کرو کچھ تو اس کی سنو اپنی سناؤ۔" حماد' عفان کو مخاطب کرتا ہوا بولا مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی اور میرب ناک سکوڑ کر "ہونہہ" کہتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ حماد' عفان کی طرف دیکھ کر رہ گیا جسے اس وقت کتاب کے سوا کسی کی بھی پروا نہ تھی وہ بھی وہاں سے خامشی سے کھسک لیا۔

☼ ☼ ☼

"آہا تم نے ٹھیک کہا تھا کہ گھلو کے ساتھ رہنے کا مزا تو اب آئے گا۔" ایشال مسکراتی ہوئی آئی اور اس کے برابر بیٹھ گئی جو ٹیب پر گیمز کھیل رہی تھی۔

"رہنے دو کیا خاک مزا آئے گا سڑیل' بدمزاج جب

سے آیا ہے مجھے دیکھ کر منہ سے گوند چپکائے بیٹھا ہے میری کسی بات کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا اگر کبھی بولتا ہے تو صرف انگارے ہی اگلتی ہے اس کی زبان۔ پتا نہیں اپنی ڈگری کا غرور ہے یا اپنی وجاہت کا۔" اس نے غصے سے کہتے ہوئے ٹیپ آف کیا اور سائیڈ ٹیبل پر پڑے چپس کے پیکٹ سے چپس نکال کر کھانے لگی اس دن والا واقعہ وہ دانستہ گول کر گئی۔

"اس لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اس سڑیل بد مزاج بندے کے ساتھ تمہیں عمر بھر رہنا پڑے گا تو کتنا مزا آئے گا تمہیں بھی اور ہمیں بھی۔ تمہاری بد تمیزیوں پر روز تمہاری کلاس ہوا کرے گی۔ شوہرانہ حقوق جب عفان بھائی کے پاس آجائیں گے تو وہ کب تمہاری بونگی حرکتوں کو برداشت کریں گے کھینچ کے تھپڑ رسید کریں گے۔ ہائے! مجھے تو ابھی سے سوچ کے مزا آرہا ہے کہ میرب صاحبہ کو سیدھا کرنے والا بندہ ملا۔" ایشال اس کے پیکٹ سے چپس نکال کر کھاتی ہوئی شرارت سے بولی۔

"کیا مطلب۔"

"مطلب تو تم امی اور آنٹی سے پوچھو جن کے درمیان تم دونوں کے رشتے کی بات چیت چل رہی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی اور میرب یہ خبر سن کر جیسے سانس لینا ہی بھول گئی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے اس خشک مزاج سے تو تمہارا جوڑ ملتا ہے ویسی ہی انگارے چبائے رکھنے اور لیے دیے رہنے والی۔"

"اے خبردار تمہارے بھائی کو جاکر بتاتی ہوں کہ آپ کی منگیتر کے بارے میں کس قسم کی باتیں کر رہی ہے۔" ایشال نے اسے آنکھیں نکال کر دھمکایا جو کہ میرب کے بھائی حارث سے منسوب تھی میرب اپنی کہی بات پر شرمندہ ہو گئی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میری امی اپنی اتنی ہنس مکھ اکلوتی بچی کو اس سڑیل سے بیاہ دیں۔"

"بھئی سوال تو اب ڈالا جا چکا ہے اور جواب "ہاں" میں دیا جانے والا ہے۔" زوبیہ نے آکر مزید جلتی پر کام کیا۔ اور میرب اس کی بات سن کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور سیدھی عفان کے کمرے میں جا گھسی وہ جو بڑے ریلیکس انداز میں شرٹ اتارے کوئی انگلش مووی دیکھ رہا تھا اس کی آمد سے گڑبڑا گیا۔

"ال مینرڈ" وہ بڑبڑایا۔ جلدی جلدی شرٹ پہنی۔

"بدتمیز۔" میرب فوراً" بولی۔ عفان نے غصے سے اسے گھورا۔

"ایسے کیوں گھور رہے ہیں کیا نظروں ہی نظروں میں کھائیں گے۔ آپ نے ال مینرڈ کا مطلب پوچھا میں نے بتا دیا۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"تمہیں ایٹی کیٹس کا بالکل بھی نہیں پتا کہ یوں کسی کے روم میں بغیر ناک کیے نہیں آنا چاہیے۔" اس نے غصے سے کہا۔

"اور آپ کو ایٹی کیٹس بہت اچھی طرح آتے ہیں؟ میں تو آپ کے کمرے میں بنا دستک دیے آرہی ہوں اور آپ میری زندگی میں مجھ سے پوچھے بغیر داخل ہونے کی جرات کر رہے ہیں۔" اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا مطلب۔۔؟"

"کچھ پڑھ لکھ کر بھی آئے ہیں یا گوروں کے دیس میں یوں ہی عمر گنوا دی ہر بات پہ پوچھتے ہیں "کیا مطلب"۔" اس نے اس کی نقل اتاری اور عفان کا ضبط جواب دے گیا اس نے اسے ہاتھ سے پکڑا اور باہر کی طرف دھکیلا۔

"میری امی جان سے جاکر پوچھو کہ وہ مجھے تمہاری زندگی میں تم سے پوچھے بنا کیوں شامل کر رہی ہیں اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہارے سائے سے بھی گریز کروں۔" اس نے کہتے ہوئے دھڑاک سے دروازہ بند کر دیا اور باہر کھڑی میرب اپنی انسلٹ پر کھول کر رہ گئی اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ عفان میاں تمہیں اب ساری عمر میرے ہی سائے میں رہنا پڑے گا۔

وہ جتنا عفان کے رویے کے بارے میں سوچتی دل اتنا ہی اس سے بدلہ لینے کے لیے مضبوط ہوتا جاتا وہ غصے

سے مٹھیاں بھینچتی اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں شامل ہو کر اپنی انسلٹ کا بدلہ ضرور لے گی۔ اس کی زندگی اجیرن کرنے کی اس نے ٹھان لی تھی جب ہی تو امی نے جب اس عفان کے رشتے کے متعلق اس کی رائے لی تو اس نے جیسے آپ کی مرضی کہہ کر اپنی رضامندی دے دی۔ غزالہ بیگم اس کے اتنی جلدی ہاں کردینے پر مسرور ہوگئیں۔ عفان انہیں بے حد پسند تھا اور وہ اسے داماد کے روپ میں قبول کرنے کو فوراً" تیار تھیں مگر میرب کی مرضی بھی لازمی تھی اس کی ہاں نے ان کو خوشی سے سرشار کردیا انہوں نے فرط مسرت سے اسے گلے لگالیا۔

"تم نے میرا مان رکھ لیا عفان جیسے داماد خوش نصیبوں کو ملتے ہیں میں ابھی جاکر تمہاری چچی کو خوش خبری سناتی ہوں وہ تو خوشی سے نہال ہی ہوجائے گی۔" وہ اٹھیں۔

"امی بات سنیں۔"

"ہاں کہو کیابات ہے۔" وہ مڑیں۔

"وہ......"

"ہاں ہاں کہو بیٹا ہچکچاہٹ کیسی۔"

"امی آپ نے عفان سے تو پوچھ لیا ہوتا کیا پتا وہ اس رشتے پر راضی نہ ہو ہوسکتا ہے میں اسے پسند نہ ہوں۔"

"ارے نہیں بیٹا وہ تو دل سے راضی ہے عارفہ نے اس کی مرضی معلوم کرلی ہے اس کی ایماء پر ہی اس نے تمہارے رشتے کا تقاضا کیا ہے۔" غزالہ بیگم اسے تسلی دے کر سیدھی عارفہ کی طرف سدھاریں اور وہ دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوئی اس کو ستانے کے منصوبے سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

عدیل اور عارفہ کو شادی کی جلدی تھی اور اسی لیے وہ پاکستان آئے تھے۔ عارفہ تنہا رہتی تھک چکی تھیں۔ چاہتی تھیں کہ جلدی سے گھر میں بہو آجائے تو رونق ہو۔ سب نے ان کی خوشی دیکھتے ہوئے شادی کی تیاریاں شروع کردیں۔ سب کزنز مل کر میرب کو چھیڑتیں۔

"بڑی چھپی رستم نکلی ہمارے سامنے اس کو کھلو کھلو کہہ کر ستاتی رہی اور دل میں کھلو کی محبت بسائے بیٹھی تھی۔" وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہتی اور مسکراتی رہتی۔

"ویسے میرب ایک بات تو بتاؤ عفان بھائی تو تمہیں رونمائی میں یقیناً" کوئی اچھا سا گفٹ دیں گے تم انہیں کونسی بڑی شرارت گفٹ کروگی۔" زوبیہ نے دانتوں میں لب دبائے پوچھا۔

"ہائے وہ وقت تو آنے دو میری دل میں کیسے کیسے ارمان جوان ہورہے ہیں تم سب جان جاؤ گی۔" وہ سانس بھرتے ہوئے بولی اور وہ سب اس کی بے باکی پر کھلکھلا کر ہنس دیں جانتی تھیں کہ عفان اس کی شرارتوں کے عتاب سے بچ نہیں پائے گا۔ عفان کی سنجیدہ طبیعت کے پیش نظر انہیں اندیشہ بھی لاحق تھا کہ کہیں دونوں پہلے دن کھڑاگ ہی نہ ہوجائے۔

☼ ☼ ☼

چغتہ ہاؤس بقعہ نور بنا ہوا تھا ہر چہرے پر خوشیاں بکھری تھیں۔ عفان دولہا کے روپ میں غضب ڈھا رہا تھا۔ اور وہ دلہن بنی چاند کو شرمائے دے رہی تھی۔ سرخ لہنگے پر سلور نگینوں کا کام تھا جسے پہن کر اس کی شہابی رنگت دمک رہی تھی۔

"ہائے عفان بھائی تو تمہارا روپ دیکھ کر شاید ہی اپنے ہوش قائم رکھ پائیں۔" حمنہ نے اس کی تعریف کی وہ واقعی نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ وہ رخصت ہوکر عدیل انکل کے پورشن میں آئی تھی کمرا بے حد خوب صورتی و نفاست سے سجایا گیا تھا۔ سب کزنز اس کے کانوں میں نصیحتیں انڈیلتی وہاں سے رخصت ہوئیں تو اس نے مسکراتے ہوئے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگالی۔ قدموں کی آہٹ پاکر وہ بیڈ سے اتری اور صوفے پر جابیٹھی۔

"اونہہ میں کیوں وہاں بیٹھ کر اس کر یلے کا انتظار کر

کے اسے اہمیت دوں۔" وہ بڑبڑائی اور لاپروا انداز میں اپنے ہاتھوں میں پہنی چوڑیوں کو ایک ایک کر کے اتارنے لگی آف وائٹ شیروانی پہنے ہوئے عفان کمرے میں داخل ہوا دونوں کی نگاہیں بیک وقت ٹکرائیں اس کا دلکش روپ دیکھ کر عفان مبہوت ہو کر رہ گیا۔

ایک پل کے لیے میرب بھی اپنی نگاہیں عفان پر سے ہٹانا بھول گئی اس کی وجاہت کو وہ باوجود غصہ کے دل میں سراہے بنا نہ رہ سکی۔ عفان کی مخمور نگاہوں سے گھبرا کر وہ سنجیدہ صورت بنائے پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب صوفہ پر بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑا کسمسائی' عفان نے دھیرے سے اس کے جھمکے کو چھوا اور نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں۔ وہ نظروں کی تپش سے جھلنے لگی چوڑیاں اتارتے اس کے ہاتھوں میں لرزش آگئی۔ وہ اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا اس نے مخملیں ڈبیا کھولی اور ڈائمنڈ کا لاکٹ پہنانے کے لیے اس کی گردن کو چھوا تو میرب کے پورے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔

"زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے مجھے دیں میں خود ہی پہن لوں گی۔" میرب نے لاکٹ اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہا مگر عفان نے مٹھی بند کرلی۔

"جملہ حقوق میرے پاس محفوظ ہیں یہ فریضہ میں خود انجام دوں گا۔ لاکٹ پہنا کر وہ اسے اپنے ساتھ لیے آئینے کے مقابل آگیا۔ "ان سفید گلابوں میں تم دہکتا ہوا سرخ گلاب لگ رہی ہو۔" عفان کی سرگوشی نے اس کے اوسان خطا کر دیے اس کو ستانے کے منصوبے ہوا میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے ایک نئے اور جائز رشتے کا احساس اس کی سوچوں پہ غالب آچکا تھا وہ چاہ کر بھی اس سے اپنا دامن چھڑا نہیں پا رہی تھی۔

ہوش تو اس وقت آیا جب باہر دروازہ دھڑا دھڑ پیٹا جا رہا تھا اور عفان نے اسے جگا دیا۔ سب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔" عفان نے مسکراتے ہوئے اس کے کھلے بالوں کو چھوا تو وہ اس کی نگاہوں سے گھبرا کر جھپاک سے واش روم میں گھس گئی فریش ہو کر نکلی تو اسے صوفے پر براجمان پایا۔

"آپ ابھی تک یہاں بیٹھے ہیں باہر جائیں۔" میرب کو اس کی موجودگی سے الجھن ہونے لگی۔

"تم جلدی سے تیار ہو جاؤ' اکٹھے باہر چلیں گے۔" وہ اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

"نہیں ناں پلیز! مما بابا کیا سوچیں گے میں اکیلی ہی باہر آؤں گی' آپ نکلیں یہاں سے۔" اس نے پوری قوت سے اسے دروازے سے باہر دھکیلا اور دھڑاک سے دروازہ بند کرلیا۔ عفان کا اونچا قہقہہ اسے شرمندگی سے دوچار کر گیا۔

"اف... اتنا رومانٹک مزاج..." موبائل پر بار بار ذوبیہ کی بیل آ رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے جلدی سے بالوں میں برش پھیرنے لگی' ذہن میں یہی سوچ تھی کہ اب آفتوں کے سوالوں سے وہ کس طرح اپنے آپ کو بچا پائے گی۔

☼ ☼ ☼

میرب کی زندگی میں ایک دم ہی حسین موڑ آیا تھا۔ اسے پریشان کرنے کے جو منصوبے سوچ بیٹھی تھی سب اپنی موت آپ مر گئے۔ ایک دم سے اس کی اہمیت بڑھ گئی' سب اس کا بے حد خیال رکھتے۔ عارفہ اور عدیل تو اس پر جان چھڑکتے تھے۔ عفان کا رویہ بھی اس کے ساتھ بے حد اچھا تھا اگرچہ دل میں ٹھانے ہوئے تھی کہ اسے خوب زچ کرے گی' اس کا جینا مشکل کر دے گی' مگر وہ تو موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے رویے سے کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ شادی سے پہلے اسے دیکھ کر چراغ پا ہو جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بونگی حرکتوں میں بہت کمی آگئی تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ شرمگیں مسکراہٹ اس کے لبوں کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ جو اپنے آپ سے سدا کی لاپروا تھی خوب بن سنور کر رہنے لگی عفان کی ستائشی نگاہیں اس کے سراپے پر پڑتیں تو وہ مسرور ہو جاتی۔ سب کزنز اس کی اس مثبت تبدیلی پر حیران تھیں' وہ تو سوچ رہی تھیں کہ عفان بے چارا سر

پکڑ کر روئے گا یا پھر میرب روتی نظر آئے گی' مگر یہاں تو ایسا کوئی معاملہ نظر نہ آتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں بے پناہ خوش نظر آتے۔ انہیں اس طرح دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیتے اور غزالہ بیگم اس کے چہرے پہ کھلتے رنگ دیکھ کر مطمئن ہو جاتیں۔

عفان کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں وہ اکیلا ہی انگلینڈ جا رہا تھا اور میرب اس کے جانے سے اداس تھی میرب کی اداسی اسے بھی افسردہ کر رہی تھی۔ وہ اسے بہت جلد اپنے پاس بلانے کے وعدے لے کر اور خوب صورت یادوں کے سہارے انگلینڈ روانہ ہو گیا۔ عفان کی کوششوں سے وہ دو ماہ بعد ہی اپنے **ہمسفر** کے پاس تھی۔ یہ دو ماہ اس نے اس کی جدائی میں کیسے گزارے تھے یہ وہی جانتی تھی۔ کتنے دن تک وہ یقین ہی نہ کر سکی کہ وہ عفان کے پاس ہے۔ دو محبت کرنے والے دلوں کو ملنے کی خوشی کیسے خوب صورت جذبوں سے آشنا کرتی ہے' اس کا اندازہ اسے اب ہو رہا تھا۔ شب و روز بہت حسین لگ رہے تھے عفان اس پر اپنی چاہتیں لٹاتا اور وہ شانت ہو جاتی۔ روز آفس سے واپسی پر اسے گھمانے پھرانے لے جاتا رات کو ڈنر باہر سے کر کے آتے' صبح کا ناشتا عفان تیار کرتا اور وہ مزے سے کھاتی۔ زندگی میں کوئی فکر و پریشانی نہ تھی راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ شوہر کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے' وہ بالکل بے خبر تھی۔ ہوش تو اس وقت آیا جب رات کو عفان نے اسے بانہوں میں لے کر بتایا کہ صبح کا ناشتا وہ بنائے گی' لہٰذا صبح جلدی اٹھ جائے۔ اس کی بات سن کر وہ چونک گئی۔

"ناشتا... مگر مجھے تو ناشتا بنانا نہیں آتا امی ہی بنا کر دیتی تھیں اور مجھے تو یہ تک نہیں پتا کہ ناشتے میں کیا کچھ بنانا ہوتا ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر فکر مندی سے بولی تو وہ مسکرا دیا۔

"اتنے دنوں تک میں تمہیں ناشتا کرواتا رہا اور تم مزے لے لے کے کھاتی رہیں تمہیں یہ بھی پتا نہیں چلا کہ ہم ناشتے میں کیا کھاتے ہیں۔" وہ شاکی ہوا اور میرب شرمندہ ہو گئی۔

"اینی وے میں بوائل انڈا اسلائس اور دودھ لوں گا' تم اپنے لیے جو بنانا چاہو بنا سکتی ہو۔" اس نے دھیرے سے اس کے گال کو چھوا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور میرب نے صبح اٹھنے کی فکر مندی میں پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

✲ ✲ ✲

روٹین لائف شروع ہوئی تو میرب کو ایک دم ہی بوریت کا احساس ہونے لگا۔ عفان صبح آفس کے لیے نکلتا تو شام پانچ بجے گھر میں گھستا سارا دن وہ بولائی بولائی پھرتی' دو افراد کے کام ہی کتنے ہوتے تھے جب سارے کام کر کے فارغ ہو جاتی تو اسکائپ پہ گھر والوں سے بھی فردا" فردا" بات کر لیتی' مگر تنہا دن کاٹے نہ کٹتا۔ آس پاس کے گھروں سے بھی کوئی روابط نہ تھے کہ تھوڑا سا ٹائم پاس ہو جاتا۔ ایک دو بار عفان کے دوست کی فیملی کی طرف گئے انہوں نے بھی ایک بار چکر لگا لیا اور بس۔ زندگی تیز رفتار مشین کی طرح یہاں دوڑ رہی تھی۔ شام کو چائے وغیرہ پی کر عفان پھر سے لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ جاتا اور نجانے کیا کیا سرچ کرتا رہتا' وہ اس کے پاس بیٹھی بور ہوتی رہتی۔ کئی مرتبہ اس کا لیپ ٹاپ آف کر دیتی۔

"سارا دن آپ آفس میں ہوتے ہیں اور گھر آکر بھی اس میں منہ دیے رہتے ہیں آپ کو میرا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ میں اکیلی کتنی بور ہوتی ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام لیتی۔

"بھئی آفس جانا بھی ضرور ہے اور کچھ اہم کام کرنے ہوتے ہیں تو ادھر بھی ٹائم دینا پڑتا ہے"

میرب کی خواہش ہوتی کہ وہ آفس سے آنے کے بعد سارا وقت اس کے ساتھ گزارے' اس سے باتیں کرے' اس پر توجہ دے' اسے سراہے' جبکہ عفان پر کام کا برڈن ہونے کی وجہ سے اس کے لیے بہت کم ٹائم

بچتا۔ کبھی کبھار وہ اس کی بات مان لیتا اور ادھورا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوجاتا اور کبھی سخت برہم ہوجاتا۔

"زندگی رومینس کے سہارے نہیں گزاری جاسکتی میرب صاحبہ! ہوش میں آؤ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو گھر کے کاموں میں دلچسپی لو۔ جلی روٹیاں، کچا پکا سالن، گھر کی ابتر حالت کبھی اس بارے میں بھی غور و فکر کرلیا کرو۔ سارا وقت میں تمہارے پہلو سے لگ کر نہیں بیٹھ سکتا مجھے سکون سے اپنا کام کرنے دو۔" وہ پل میں اجنبی بن گیا۔ خوش مزاجی اور رومینس جو شادی کے چند ہفتوں میں اسے عفان میں نظر آیا تھا، وہ سب مفقود ہوتا جارہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر سے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ میرب کی شوخ طبیعت کو یہ کب گوارا تھا، وہ کڑھتی رہتی اور اکثر ہی اس بات پر دونوں کی تکرار ہونے لگی۔ اس دن بھی وہ اس سے مکمل کی چھٹی کے لیے اصرار کررہی تھی کہ کہیں گھومنے پھرنے چلتے ہیں اور عفان اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا کہ وہ اس طرح اچانک بغیر وجہ کے چھٹی نہیں کرسکتا، مگر اس کی عقل میں بات ہی نہیں سما رہی تھی۔

"عجیب روکھی پھیکی زندگی ہے گھر میں دو افراد ہیں، ان میں سے ایک کو اپنے آفس ورک سے ہی فرصت نہیں اور دوسری سارا دن تنہائی کا زہر پیتی ہے۔" وہ جل کر بولی۔

"بھئی یہ زہر تم نے بخوشی پیا ہے۔ تمہیں ہی یہاں آنے کی جلدی تھی۔ رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔ فون پر پہلا فقرہ ہی تمہارے لبوں سے یہ ادا ہوتا تھا کہ مجھے کب بلا رہے ہیں۔"

"ہاں پاگل تھی میں جو خود سے اپنے لیے سزا تجویز کی مجھے کیا پتا تھا کہ آپ یہاں آکر بالکل ہی بدل جائیں گے۔" وہ بھنائی اور عفان اس کی بات سنی ان سنی کر گیا۔ اس کی کم گوئی میرب کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی، مگر ادھر کب پروا تھی۔ وہ مسلسل اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔ اس دن وہ جھنجلا کر اس پر چیخ پڑی۔

"مجھے یہاں پر ملازمہ بنا کر لے کر آئے تھے کہ دن بھر آپ کے اور گھر کے کام کروں۔ مجھے اچھی طرح پتا چل چکا ہے کہ چچی آپ کی خدمت کرتے کرتے تھک چکی تھیں، اس لیے آرام سے پاکستان میں رہ رہی ہیں اور مجھے یہاں قید بامشقت میں پھنسا دیا ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی اور عفان اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔

"تم ہوش میں تو ہو کیا کہہ رہی ہو۔ ماں کبھی بھی اپنے بچوں کی خدمت سے نہیں تھکتی۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ میرے سب کام بخوشی کیا کرتی تھیں اور کبھی تھکن کا اظہار تک نہ کیا۔ وہ تو ہم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ کے لیے پاکستان رک گئی ہیں کہ ہم یہاں پر ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھیں اور کچھ وقت تنہا گزاریں۔ پاپا بھی اپنے بھائیوں کے پاس کچھ وقت گزارنا چاہتے تھے۔ چند ماہ بعد وہ دونوں واپس آجائیں گے اور میرب صاحبہ لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ اپنے شوہر اور گھر کے کام کرکے خوشی محسوس کرتی ہے، مگر تم پتا نہیں کس قسم کی لڑکی ہو، جو شوہر کے کاموں کو ایک بوجھ سمجھ کر کرتی ہے اور اگر تم میرے کاموں سے اکتا چکی ہو تو پلیز! کل سے میرے کسی کام کو ہاتھ مت لگانا، میں اپنے کام خود کرنا جانتا ہوں۔" عفان نے ماتھے پہ تیوری چڑھائی۔ اسے میرب کی بات بہت بری لگی تھی اور میرب کو عفان کے لہجے نے ہی تپا دیا تھا، وہ کب کسی کی سنتی تھی۔ اس نے بھی دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ اب وہ اسے زچ کرکے رہے گی۔ غصے سے ساری رات وہ کروٹیں بدلتی رہی اور عفان دوسری طرف کروٹ لیے سوتا رہا۔

صبح ہوئی تو وہ کسلمندی سے بستر پر پڑی رہی، نہ عفان نے اسے ناشتا بنانے کو کہا اور نہ اس نے خود سے بنا کر دیا۔ وہ آفس جانے کے لیے تیار ہورہا تھا، اس کی اٹھا پٹخ سے اس کے آرام میں خلل پڑ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چیزوں کو اس لیے زور زور سے پٹخ رہا ہے کہ وہ شور و غل سے اٹھ کر اس کے لیے ناشتا بنا دے، مگر وہ کان لپیٹے پڑی رہی۔

"میری بلا سے... بغیر ناشتے کے ہی جائے۔ نواب صاحب کی صلوٰتیں بھی سنوں اور صبح اٹھ کر ناشتا بھی پیش کروں۔ بغیر کچھ کھائے جب دو چار دن گھر سے نکلے گا تو بیوی کی قدر آئے گی۔" اس کے خالی پیٹ گھر سے جانے کا سوچ کر ہی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بستر سے اٹھی منہ ہاتھ دھو کر کچن کا رخ کیا اور اگلے ہی پل اس کے سارے خیالات غلط ثابت ہوئے۔ عفان نہ صرف خود ناشتا کر کے گیا تھا بلکہ اس کے لیے بھی بنا گیا تھا بجائے شرمندہ ہونے کے اس نے ناشتا لیا۔ اور لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ ٹی وی آن کیا اور مزے سے ناشتا کرتے ہوئے پروگرام دیکھنے لگی' چہرے پر کسی بھی قسم کی شرمندگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

"ہونہہ بڑا آیا مجھ پر رعب جمانے والا۔ میں ان بیویوں میں سے نہیں ہوں جو تمہاری غلامی کروں گی۔' شوہر کی جی حضوری کے لیے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑی رہوں گی۔ میں میرب شکیل ہوں' میں کیوں کسی کے رعب میں آؤں۔" وہ سارا دن اس نے اسکائپ پہ گھر والوں سے بات کرتے گزارا یا پھر ٹی وی دیکھتے' رات کے کھانے کے لیے بھی اس نے کوئی تیاری نہ کی۔ گھر کی جو چیز جہاں تھی جوں کی توں پڑی رہی۔ شام کے پانچ بجے تو وہ پھر سے کمرے میں آکر لیٹ گئی کہ عفان کے آنے کا ٹائم ہو رہا تھا اور وہ اس پر اپنی مکمل ناراضی ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ شام پانچ سے چھ اور چھ سے آٹھ بجے کا ٹائم ہو گیا' اسے ہر آہٹ پہ عفان کے آنے کا گمان ہوتا۔ تنہائی سے اسے خوف آنے لگا وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ بھوک سے الگ پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ صبح کے دو سلائس کب کے ہضم ہو چکے تھے۔ اسے رہ رہ کر رونا آرہا تھا اور عفان پر بے حد غصہ بھی۔ ساڑھے آٹھ بجے وہ آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ سیدھا کچن میں گھسا تھا ذرا دیر بعد وہ بیڈ روم کی طرف آتا دکھائی دیا تو وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیے۔ عفان نے سائڈ ٹیبل پر کھانا رکھا اور کمرے سے چلا گیا

اس نے اٹھ کر بے صبری سے کھانا شروع کر دیا۔

"بے حس انسان رات کے نو بجے بیوی کے کھانے کا خیال آیا۔ سارا ٹائم پتا نہیں کہاں آوارہ گردی کرتا رہا یہ نہیں سوچا کہ بیوی گھر میں بھوکی بیٹھی ہے۔" کھانا کھاتے ہوئے وہ بجائے اپنی غلطی ماننے کے اسی کو قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ کئی دن اسی روٹین میں گزر گئے وہ اپنے سارے کام خود کرتا۔ اسے کسی کام کے لیے نہ پکارتا۔ میرب نے جب دیکھا کہ اس کے کام نہ کرنے سے' عفان کو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اس کی اپنی بازار کا کھانا کھا کر طبیعت خراب رہنے لگی ہے تو اس نے ہار مان لی۔ ایک ہی چھت تلے دو نفوس کب تک اجنبیت کی دیوار تھامے رہتے' آخر میرب کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔ صبح اس نے عفان کے اٹھنے سے پہلے ہی ناشتا ٹیبل پر لگا دیا اور اس کا انتظار کرنے لگی' عفان تیار ہو کر کچن میں جانے لگا تو اس نے پکار لیا۔

"وہ ٹیبل پہ ناشتا لگا ہے آجائیں۔" وہ چپ چاپ آکر بیٹھ گیا اور خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ میرب کو اپنا آپ بڑا آکورڈ لگا اس نے اپنی ضد اور انا ختم کر کے اسے خود پکارا تھا اور وہ اسے مکمل نظر انداز کر رہا تھا۔ ناشتا کر کے وہ آفس روانہ ہوا اور وہ وہیں ٹیبل پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگی۔

"اس شخص کی خاطر میں نے اپنے آپ کو کتنا بدل ڈالا' مگر اس کو ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ پتا نہیں' اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے' میں تو سوچ رہی تھی میری ناراضی پر تڑپ اٹھے گا۔ محبت بھرے لفظوں سے مجھے منائے گا' مگر یہاں تو اسے میری کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے' اگر اسے میرا خیال نہیں ہے تو مجھے بھی اس کے نخرے اٹھانے کی' کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رہے اکیلا... میں واپس پاکستان چلی جاؤں گی۔" وہ بڑبڑاتی شام کو وہ گھر لاک کر کے قریبی پارک چلی آئی۔ رات کے سائے پھیلنے لگے' مگر اس کا گھر واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ عفان کے رویے سے سخت دلبرداشتہ ہو رہی تھی۔ اس سے دور جانے کا خیال بھی اسے تڑپا رہا تھا اور اس کے پاس رہ کر اس کی بے رخی بھی برداشت نہ

ہو رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے اسی سنگدل کو سوچے جا رہی تھی اور دوسری طرف عفان اسے گھر پر نہ پا کر پریشان تھا۔ بے وقوف' پتا نہیں اسے کب عقل آئے گی' راستوں کا پتا نہیں ہے اور نجانے کہاں نکل گئی وہ پریشان ہوتا ہوا' باہر سڑک پر نکل آیا۔ دو چار سڑکیں ناپیں' مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ اس نے فون کیا بیل جا رہی تھی' مگر وہ اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ وہ غصے سے دانت چبا رہا تھا۔ "آج ایک بار تم میرے ہاتھ لگ جاؤ وہ حشر کروں گا کہ طبیعت صاف ہو جائے گی محترمہ کی۔ پتا نہیں کیوں ایسی لاپروا لڑکی سے میں نے شادی کی حامی بھرلی؟ امی کی خواہش پر خوامخواہ اپنے لیے مصیبت مول لے لی۔" وہ بار بار اس کا نمبر ملاتا اور بڑبڑاتا رہا آخر کار اس نے فون ریسیور کر ہی لیا۔

"کہاں ہو تم....." وہ دھاڑا۔

"آپ کے جہنم کدے سے بہت بہتر جگہ پر ہوں۔"

"ایسا کرو اس جنت نظیر وادی میں ساری رات گزارنا اور جب کچھ یہاں کے اوباش لڑکے' تمہاری طرف ہاتھ بڑھاتے دکھائی دیں تو پھر جہنم کے داروغہ اور جہنم کدے کو مت یاد کرنا۔" وہ جل کر بولا اور فون آف کر دیا۔ دوسری طرف میرب اس کی بات سن کر بوکھلا گئی اجنبی ملک' اجنبی لوگ' رات کے گہرے ہوتے سائے عفان کی بات سن کر اسے خوف زدہ کر گئے۔ درختوں کے لمبے سائے انہیں دیکھ کر یوں لگا' کوئی ہاتھ بڑھا کر دبوچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے' دل کی دھڑکن نے تیزی پکڑلی۔ اس پر مستزاد' سامنے سے دو ہپی ٹائپ نوجوان اسے اپنی طرف آتے دکھائی دیے تو اس کا رہا سہا دم بھی ختم ہو گیا۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس نے عفان کو فون کیا۔

"میں قریبی پارک میں ہوں مجھے لینے آ جائیں۔" کہہ کر فون فوراً" بند کر دیا اور وہ اس کی بات سن کر مسکرا دیا' جانتا تھا کہ اس کی بات سن کر وہ چڑیا کی طرح سہم جائے گی اور خود فون کر کے اسے بلائے گی۔ اپنی ترکیب کی کامیابی پر وہ زیر لب مسکراتا پارک کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پارک میں داخل ہوا تو ایک سائڈ پر درخت سے ٹیک لگائے میرب کھڑی نظر آ گئی۔ تیزی سے اس کے قریب گیا اور بازو سے پکڑ کر گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"بتا کر نہیں آ سکتی تھیں پتا بھی ہے کب سے خوار ہو رہا ہوں۔" اس نے غصے سے دانت پیسے۔

"میں آپ کے لیے ایسی کون سی عزیز ہستی ہوں جو میرے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ آپ اپنی شامیں جہاں دل چاہے گزاریں' میں گھر سے کبھی نہیں نکل سکتی۔" اس نے بھی غصے سے اپنا بازو چھڑایا آس پاس کے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو عفان کو اپنا غصہ ضبط کرنا پڑا۔ گھر آ کر اس پر برس پڑا وہ کب پیچھے رہنے والوں میں سے تھی' اس نے بھی خوب دل کی بھڑاس نکالی۔

"مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا مجھے واپس پاکستان بھیجیں۔ میں یہاں رہ کر آپ کی زیادتیوں کا شکار نہیں ہو سکتی۔ مجھے پتا ہے' آپ نے شادی ہی اس مقصد کے لیے کی ہے کہ مجھ سے بچپن میں کی گئی شرارتوں کا بدلہ لے سکیں۔ آپ تو میرے سائے سے بھی بچنا چاہتے تھے نا تو بس ٹھیک ہے' مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کا۔ مجھے کل ہی یہاں سے بھیج دیں' میں ایک دن بھی آپ کے ساتھ مزید نہیں گزارنا چاہتی۔" وہ چیخے جا رہی تھی اور عفان حیرت سے منہ کھولے اسے تکے جا رہا تھا کہ اس کے دل میں' اتنی شدید بدگمانی ہے۔ وہ بولتے بولتے لڑکھڑائی' عفان نے آگے بڑھ کر اسے تھامنا چاہا تو وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ فوراً" ایمبولینس منگوائی اور ڈاکٹر کی طرف دوڑا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے مسٹر عفان۔ آپ کی مسز پریگننٹ ہیں۔ کمزوری اور ذہنی دباؤ کے باعث ایسا ہوا۔ ابھی وہ غنودگی میں ہیں' تھوڑی دیر تک نارمل ہو جائیں گی اور لگتا ہے یہ اپنی ڈائٹ کا بالکل بھی خیال نہیں رکھ رہیں بہر حال یہ غذائی چارٹ ہے' کچھ

میڈیسن لکھ دی ہیں، پراپر استعمال کروائیں۔ یہ ان کا کارڈ ہے وزٹ کرتے رہیے گا۔" برٹش ڈاکٹر اسے صورت حال سے آگاہ کررہی تھی اور وہ یہ خبر سن کر بالکل ساکت تھا۔

"میں.... میں بابا بننے والا ہوں، او گاڈ!" دفعتاً خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹنے لگی۔ میڈیسن لے کر وہ روم کی طرف گیا تو وہ بہت زرد لگی۔ اسے سہارا دے کر اسپتال سے باہر لے آیا۔ گھر آکر فریش جوس بنا کر پیش کیا۔

"مجھے نہیں پینا، مجھے اپنے گھر جانا ہے، اپنے مما بابا کے پاس جانا ہے۔ میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ میں یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔ آپ جیسے خشک مزاج انسان کے ساتھ میں ہرگز رہنا نہیں چاہتی۔" میرب کی ایک ہی رٹ تھی۔

"ٹھیک ہے میں تمہاری کل ہی سیٹ اوکے کروا دیتا ہوں، مگر سفر کرنے کے لیے بھی تو کچھ ہمت چاہیے۔ اتنا لمبا سفر تم اس خراب طبیعت میں کیسے کروگی۔ یہ لو یہ جوس پیو تاکہ کل تک تمہاری طبیعت بہتر ہوجائے۔" اس نے گلاس میرب کے لبوں سے لگایا تو وہ فٹافٹ پی گئی۔ گویا وہ جانے کے لیے اپنے آپ کو توانا کرنا چاہتی تھی۔ عفان کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ ساری رات اس کے قریب رہا، بار بار اسے چھوتا، اس کی طبیعت پوچھتا، کبھی کھانے کو کچھ لا کر دیتا اور وہ اس کے اتنا خیال رکھنے پر جھنجلا گئی، غصے سے اسے پرے دھکیل دیا۔

"دور ہوجائیں مجھ سے، ہاتھ مت لگائیں مجھے۔"

"ٹھیک ہے نہیں لگاتا ہاتھ۔" عفان نے مسکراتے ہوئے اپنے دہکتے لب اس کی پیشانی پر رکھ دیے اور میرب کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن تک اس نے اس کا خوب خیال رکھا۔

"میری سیٹ کب کی ہے میں یہاں سے جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔"

"پہلے اپنی صحت تو ٹھیک کرلو۔ برسوں کی بیمار لگ رہی ہو۔ وہاں پہ کیا سب کو یہ تاثر دینا چاہتی ہو کہ میں نے تم پر بہت ظلم کیا ہے تمہارا کوئی خیال نہیں رکھا۔"

"ہاں میں سب کو بتاؤں گی کہ آپ نے میرے ساتھ کتنا برا سلوک کیا ہے۔ مجھے بے کار شے سمجھ کر ایک طرف پھینک رکھا تھا۔ اور یہ بیماری اس وقت تک رہے گی جب تک تنہائی کا عذاب ختم نہیں ہوجاتا۔"

"بس تنہائی کے دن اب ختم ہونے والے ہیں میرب جان، ایسی مصروفیت تمہارے پاس آنے والی ہے کہ فرصت کو تم ترسا کروگی۔" وہ دل میں سوچ کر مسکرایا۔

اس دن آفس جانے سے پہلے وہ اس سے کہہ گیا تھا کہ شام کو وہ تیار رہے، آج کی سیٹ کنفرم ہے۔ سارا دن وہ خوشی خوشی پیکنگ کرتی رہی۔ دو تین سالن بھی بنا کر فریز کردیے تھے۔ گھر جانے کے خیال نے اس میں بجلی بھردی تھی۔ بابا، مما، بھائیوں، کزنز سب سے ملنے کی خوشی نے اس کے چہرے پر پھول کھلا دیے تھے۔ شام کو وہ لیمن کلر کا ایمبرائیڈڈ سوٹ پہنے، ہلکے سے میک اپ میں بالکل تیار تھی اور لاؤنج میں بیٹھی بے صبری سے اس کا انتظار کررہی تھی۔ کال بیل پر اس نے پوچھ کر دروازہ کھولا تو اپنے سامنے عفان کے ساتھ عدیل اور عارفہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ عارفہ تائی خوشی سے سرشار اسے گلے لگالیا۔ عدیل چچا نے بھی مسرور ہوکر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرب نے شاکی نگاہوں سے اس ستمگر کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا آج کی سیٹ کنفرم ہے۔" وہ مسکرایا اور میرب دل مسوس کررہ گئی۔

"دل تو لگ گیا نا تمہارا یہاں پر۔ اس نکمے نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا۔" وہ محبت سے بولیں تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی نفی میں سر ہلادیا۔

"بس اب میں آگئی ہوں نا تمہارا خیال رکھنے کے لیے چند دنوں میں ہی کیا حال ہوگیا ہے، لگتا ہے اپنے

آپ سے بالکل ہی غافل رہی ہو۔" انہوں نے اس کا اترا چہرہ دیکھا جو کہ کافی کمزور لگ رہا تھا۔ وہ اپنے آنسو پی گئی۔

"میرب جلدی سے کھانا لگاؤ اتنی دیر میں مما بابا فریش ہوتے ہیں بلکہ ہم دونوں مل کر لگاتے ہیں۔" عفان نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور وہ تھکے قدموں سے اس کے ساتھ کچن کی طرف چل دی۔ رات کو وہ اس پر برس پڑی۔

"مجھے پتا ہے آپ نے چچی کو میرے بارے میں سب باتیں بتادی ہیں کہ میں نے ان کے بارے میں کس قسم کی باتیں کی تھیں اور یہ بھی کہ میں آپ کا بالکل بھی خیال نہیں رکھتی۔ پتا نہیں' کیسے شوہر سے واسطہ پڑا ہے، جو بیوی کو اپنی ماں کی نظروں میں ذلیل کرنا چاہتا ہے' آپ اس حد تک میرے خلاف جائیں گے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" آنسو اس کے گالوں پر تواتر سے بہنے لگے عفان نے اس کی خود ساختہ باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور چپ چاپ کروٹ بدل کر لیٹ گیا تو اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی۔

☼ ☼ ☼

عارفہ سارا دن اس کا خیال رکھتیں۔ کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں۔ وہ دل میں شرمندہ ہوتی رہتی کہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی۔ عدیل چچا نے اس کے لیے پھلوں کا ڈھیر لگا دیا اور چچی جوس نکال نکال کر زبردستی اسے پلائے جاتیں۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر انہوں نے اس کی کمزوری کو ہوا کیوں بنالیا تھا۔

"بس چچی اب اور دل نہیں چاہ رہا اور پلیز آپ اس طرح سے میرا خیال رکھنا چھوڑ دیں۔ کل سے میں سب کام خود کروں گی۔ جب سے آپ آئی ہیں' مسلسل کاموں میں لگی ہوئی ہیں حالانکہ اتنے لمبے سفر کی تھکن کے بعد آپ کو آرام کرنا چاہیے تھا۔"

"ارے کیسی تھکن بیٹا اس دفعہ تو اتنے لمبے سفر کا پتا ہی نہیں چلا کہ کب تمام ہوا۔ سارا وقت ذہن تمہاری طرف ہی رہا۔ یہی خیال خوش کرتا رہا کہ میرے اللہ نے میری کتنی جلدی سن لی۔ غزالہ بھی یہ خبر سن کر بڑی خوش تھی تمہارے لیے' اداس بھی تھی کہ اس حال میں وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں جو ہوں اپنی بچی کا خیال رکھنے کے لیے۔ بس ذرا دو تین ماہ گزر جائیں' ڈاکٹر سفر کی اجازت دے دے تو جا کر سب سے مل آنا۔" وہ مسلسل بولتی جارہی تھیں اور میرب ان کی مبہم گفتگو سمجھ نہ پارہی تھی۔

"چچی امی کون سی خبر سن کر خوش ہوئی تھیں۔" اس نے حیرانی سے پوچھا تو وہ ہنس دیں۔

"ارے بھئی نانی بننے کی خبر اس نے تو سنتے ہی صدقے کرنے شروع کردیے تھے۔"

"نانی بننے کی خبر۔" وہ الجھ گئی۔ ذہن پر زور ڈالا۔

"او وہ اس کا مطلب اس دن جو میری طبیعت خراب ہوئی تھی اس کی وجہ یہ تھی میری بے ہوشی کا فائدہ اٹھا کر عفان نے مجھے اتنی بڑی خبر سے بے خبر رکھا۔ اف میرے خدایا! تو چچی اس وجہ سے مجھے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دے رہیں اور میرا اتنا خیال رکھ رہی ہیں۔" اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا وہ جو سمجھ رہی تھی عفان نے اپنی امی کو اس کی فضول باتیں بتادی ہوں گی' سب اس کا وہم تھا۔ اسے عفان پہ بے پناہ پیار بھی آرہا تھا اور غصہ بھی کہ اتنی بڑی خبر اس سے کیوں چھپائی۔

شام کو وہ بالکنی میں کھڑی نیچے دیکھ رہی تھی ایک عمر رسیدہ جوڑا اپنے چھوٹے سے لان میں باغبانی میں مصروف تھا۔

"تمہاری ابھی تک دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کی عادت گئی نہیں۔۔۔۔" کب عفان اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا اسے پتا ہی نہیں چلا اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا میرب نے ہاتھ جھٹک کر دور ہونا چاہا' مگر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"مما بابا کہاں ہیں۔"

"مارکیٹ گئے ہیں۔" پھولے منہ سے جواب ملا۔

"اتنی پیاری شکل کو کیوں بگاڑ کر رکھتی ہو مجھے سزا

کریلا کہتی ہو اور خود باسی بھنڈی لگ رہی ہو ان دنوں۔" عفان نے اسے چھیڑا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بھئی اب اپنا موڈ درست کرو کتنے دنوں سے تمہاری بے رخی برداشت کر رہا ہوں تم یہی چاہتی تھیں نا کہ تم پر مکمل توجہ دوں تمہارے ساتھ وقت گزاروں تمہارے آنچل کے سائے میں اپنی ساری تھکن بھلادوں اب جب میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں تو تم لفٹ ہی نہیں کرا رہیں۔" وہ شاکی ہوا اور اسے ساتھ لگائے اندر کمرے میں لے آیا۔

"بات مت کریں مجھ سے۔ آپ ایک دھوکے باز انسان ہیں مجھے کہتے رہے کہ تمہاری سیٹ کنفرم کروا رہا ہوں پاکستان بھیج رہا ہوں اور اصل بات سے مجھے بے خبر رکھا اس خبر کے متعلق سب جانتے ہیں اور جس کی ذات سے تعلق تھا اسی کو پتا نہ چلنے دیا۔"

"کون سی بات۔۔۔؟" وہ انجان بنا گویا محترمہ کو پتا چل چکا ہے۔

"انجان نہ بنیں آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں کس بارے میں بات کر رہی ہوں۔" اس نے اٹھنا چاہا، مگر عفان نے ہاتھ پکڑ کر اسے پھر اپنے قریب بٹھالیا۔

"بھئی دیکھو پہیلیاں نہ بجھاؤ صاف بات کرو تم کون سی خبر کی بات کر رہی ہو۔ میں کچھ نہیں جانتا اور جہاں تک تمہارے پاکستان جانے کی بات ہے تو تمہاری طبیعت کے پیش نظر، میں نے مما کو یہاں بلوالیا تاکہ وہ تمہارا خیال رکھ سکیں۔ جونہی تم اپنے آپ کو بہتر سمجھو میں تمہاری سیٹ اوکے کروادوں گا۔"

"چچی اور امی کو آپ نے میری بیماری کا بتایا اور وہ بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہوگئی ہیں وہ میری بیماری کو کچھ اور ہی سمجھ رہی ہیں۔" اس کا چہرہ گلابی ہوا عفان نے اس کے گلابی گال پہ انگلی پھیری۔

"کون سی غلط فہمی۔"

"یہی کہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکی۔

"ہاں کیا یہی کہ۔۔۔" اس نے اپنی مسکراہٹ لبوں میں چھپالی۔

"وہ۔۔۔ وہ چچی سمجھ رہی ہیں کہ وہ دادی بننے والی ہیں انہوں نے پاکستان میں بھی سب کو بتادیا ہے۔ مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔" بتا کر اس نے ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا اور عفان کا قہقہہ ابل پڑا۔

"اچھا تو تم اس والی طبیعت کی بات کر رہی تھیں۔ دیکھو وہ جہاں دیدہ ہیں ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔" وہ لب دانتوں تلے دبا کر مسکرایا تو میرب کو اس کی مسکراہٹ بڑی پراسرار لگی اس کی شوخ نگاہوں سے وہ پل میں سمجھ گئی کہ وہ اس کے ساتھ شرارت کر رہا ہے۔

"آ۔۔۔ آپ جانتے تھے نا سب کچھ۔ مجھے الو بنا کے رکھا اتنے دنوں۔" وہ اس پر مکوں سے پل پڑی اور عفان نے ہنستے ہوئے اس کے مکے برساتے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"کیا تمہیں اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی۔"

"نہیں بالکل بھی نہیں مجھے بے بی نہیں چاہیے میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔"

"تم بے وقوف تو نہیں ہو اللہ کی نعمت کی ناشکری کر رہی ہو۔" عفان کو اس کی بات پہ غصہ آگیا۔

"میں اس کی نعمت کی ناشکری نہیں کر رہی ایسا میں صرف آپ کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں ہاں آپ کی وجہ سے۔ میرے ساتھ ساتھ اسے بھی اپنے باپ کی کم گوئی اور کم توجہی کا عذاب سہنا پڑے گا۔" عفان نے اس پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"تم نہیں سدھرو گی میرب عفان بچے کی اماں بن جاؤ گی، مگر بچوں والی حرکتیں اور باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ بے وقوف ہماری نئی برانچ سیٹ ہو رہی تھی جس کی وجہ سے میں پچھلے دنوں بہت بزی رہا اور تم نے پتا نہیں کیا کیا خیالات اپنے ذہن میں پال لیے۔ اتنی مصروفیت میں بھی تمہیں ناشتے بنا بنا کے کھلاتا رہا اور تمہارا منہ پھر بھی سوجا رہا۔ میری اس مصروفیت سے ہمارا مستقبل جڑا ہوا ہے۔ بجائے اس کے کہ تم مجھے

کام کرنے کو پرسکون ماحول دیتیں اپنی تلخ باتوں اور رویے سے مجھے پریشان کیے رکھا۔" عفان نے اس کی ستواں ناک کو ہولے سے دبایا تو وہ شرمندہ ہوگئی۔

"یاد رکھو محبت کا حسن تھوڑی بے توجہی میں بھی ہے اگر میں ہر وقت تمہارے سر پر سوار رہوں اپنی باتوں سے ہم ایک دوسرے کا مغز کھاتے رہیں تو بہت جلد ایک دوسرے سے اکتا جائیں گے۔ پیار کے لمحے اور پیار بھری باتوں میں ذرا وقفے آجائیں تو ان کا حسن برقرار رہتا ہے۔ ہماری محبت ایک خوب صورت اور پائیدار رشتے میں مربوط ہوکر' مضبوط ہو چکی ہے۔ تمہارے وجود کا خوب صورت احساس میرے پاس ہر پل موجود رہتا ہے۔ ضروری تو نہیں ہر لمحہ اظہار' ہماری محبتوں کا محتاج ہو۔" عفان کے لہجے میں چاہتوں کا اقرار بول رہا تھا۔ محبت کا رنگ اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔

"اور وہ جو آپ کہہ رہے تھے کہ میرا بس چلے تو تمہارے سائے سے بھی گریز کروں۔" اس نے یاد دہانی کروائی۔

"وہ جملہ یونہی بے دھیانی میں بولا گیا تھا۔ تمہاری بے وقوفانہ حرکتوں کی وجہ سے اور تم جو شادی سے پہلے مجھے کن کن القابات سے نوازتی تھیں۔ میرے لیے کوئی فیلنگز نہیں رکھتی تھیں۔ سچ بتانا کہ شادی کے بعد تمہارے دل میں میری محبت نے ٹھکانا بنایا کہ نہیں۔" وہ اس کے بالوں کی لٹ انگلی پر لپیٹتا ہوا بولا۔

"یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ میں اب تک آپ کے ساتھ رہ رہی ہوں ورنہ کب کی چھوڑ کے جا چکی ہوتی۔ آپ کی زندگی ان چند مہینوں میں اجیرن کردیتی۔" اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

"اچھا تو اتنے خطرناک منصوبے تھے تمہارے۔" میرب نے چہرہ جھکالیا۔ عفان نے اس کا چہرہ اوپر کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر شرارت سے بولا۔

"بھئی یہ خشک مزاج بندہ تمہاری سنگت میں بہت رومانٹک ہو چکا ہے' مگر ہمارا رومینس اس چھوٹے سے فلیٹ میں سما نہیں پائے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ رومینس کے نتیجے میں ہر سال ہمارے آنگن میں ایک پھول تو ضرور کھلا کرے گا اور اتنے سارے پھولوں کی موجودگی میں یہ فلیٹ چھوٹا نہیں پڑجائے گا۔" عفان کی بات پر میرب نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ 'اس کے سینے میں منہ چھپالیا۔ بدگمانی کے بادل دور ہوتے چلے گئے۔ اتنے دنوں سے دلوں پہ جو غبار چھایا تھا' چھٹ چکا تھا۔ بڑے شفاف محبتوں سے گندھے دل ایک دوسرے پر آشکار ہوئے تھے۔ عفان نے گرم سانسوں سے مہکتے وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور دھیمے سروں میں میرب کی سماعتوں میں رس گھولنے لگا۔

سنو جاناں مجھے یہ اعتراف اب برملا ہے کہ
میری رگ رگ میں خون بن کے تو بہتا ہے
میری آنکھوں میں جس خواب بن کے تو رہتا ہے
کہ میرے جسم کا ہر اک حصہ
اور سینے کی ہر دھڑکن
سب ہی سانسیں یہ کہتی ہیں
مجھے تم سے محبت ہے
یہی سچ ہے
مجھے تم سے محبت ہے۔

دیا شیرازی

"امی امی مجھے تنو نے مارا ہے۔"
مریم کھانا بنا رہی تھی جب بلال زارو قطار روتا ہوا آیا۔ مریم کے دل پر گھونسا پڑا۔

"کیا تنو نے تمہیں مارا ہے مگر کیوں؟" مریم کو اس کی پڑوسن کے بیٹے تنویر عرف تنو پہ بہت غصہ آیا۔ جو تقریباً" بلال کا ہم عمر ہی تھا۔ اس کے سوال پہ بلال کچھ نا بولا بس روتا رہا۔

"ہاتھ لگنے دو اس تنو کو میرے' پھر دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔" وہ غصے سے بولی اور ساتھ ساتھ بلال کو پچکارنے لگی۔

"اچھا اب رونا بند کرو' چیز کھاؤ گے۔ پیسے دوں۔"
آئس کریم کھاؤں گا۔" بلال رونا چھوڑ کر فرمائش کرنے لگا۔ بات آئی گئی ہو جاتی اگر مریم میں ذرہ برابر عقل یا صبر ہوتا لیکن اس نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں تھی۔

لیکن مریم کو تو اپنے بیٹے کے سامنے سب کیڑے مکوڑے نظر آتے۔ کسی کی کیا مجال جو اس کے بیٹے کا نام بھی لے سکے اب چاہے اس کے بیٹے نے کس کا سر ہی کیوں نا پھاڑ دیا ہو' بدلے میں ذرا سا کوئی تھپڑ جڑ دیتا اور مریم صاحبہ باقاعدہ دنگل کرنے پہنچ جاتیں۔ آس پڑوس کے لوگ اس کی اس عادت سے خوب واقف تھے' اس لیے اس کے بیٹے کو دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ چھوٹے تو چھوٹو بڑے بھی کنی کتراتے تھے۔

بچے پھر بچے ہوتے ہیں' گھنٹہ دو سرے ہی دن تنو اور بلال شیرو شکر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ مریم نے دروازے کے سامنے لٹکتے پردے کو ایک طرف کھسکا کر گلی میں جھانکا۔ ساری گلی میں ککڑوں کوں ہو گئی ہوئی تھی۔ موقع غنیمت تھا وہ جھٹ سے لپک کر تنو کے سر پہ جا کھڑی ہوئی۔

مریم نے زور سے تنو کا کان پکڑ کر موڑا۔ "کمینے میرے بیٹے کو مارتا ہے۔ میں ہاتھ نا توڑ دوں تمہارے۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے کو ہاتھ لگانے کی۔" درد سے تنو کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔ وہ سخت خوف زدہ اور سہما ہوا لگ رہا تھا۔

"چاچی پہل بلال نے کی تھی۔ اس نے پہلے میرے ہاتھ پہ کاٹا تھا۔ پھر میں نے مارا۔" تنو گھبرا کر صفائی دینے لگا۔ لیکن مریم کو اس کی بات سننے سے کوئی غرض نہیں اسے تو صرف اپنا غصہ نکالنا تھا۔

"چاچی کے بچے اگر آئندہ تم نے بلال کو مارا نہ تو الٹا لٹکا دوں گی سمجھے۔ بلال تم گھر چلو۔ تمہاری پسند کا کارٹون چل رہا ہے۔ اے سی بھی آن ہے۔" مریم سرخ چہرہ لیے ایک طرف کھڑے تنو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"لیکن امی ہم ابھی کھیل رہے ہیں۔" بلال نے احتجاج کیا اسے ابھی تنو کو بھی منانا تھا جو اسے ناراض نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

"یہ کوئی ٹائم ہے کھیلنے کا۔ سورج سر پہ کھڑا ہے۔ شام ڈھلنے دو' پھر کھیلنا آکر۔"

"یا اللہ کتنی گرمی ہے۔" مریم نے دوپٹے سے پسینہ پونچھتے ہوئے خود کلامی کی۔

"لیکن امی..." بلال نے احتجاج کیا۔
"لیکن ویکن کچھ نہیں چلو۔" وہ بلال کو ہاتھ سے پکڑ کر دیلیز پار کر گئی۔ ایک دھماکے سے دروازہ بند ہوا تو ٹکر ٹکر بند دروازے کو دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"ارے رکو... رکو... رکو... ٹھہو پہلے مجھے جانے دو بس پانچ منٹ میں آتی ہوں تم یہیں کھڑی رہو۔" مریم نے تیزی سے خالی غسل خانے کی طرف جاتی صبا کو روک لیا۔ صبا اس کی بھتیجی تھی۔ سولہ سترہ سال کی اور ماموں کی شادی اٹینڈ کرنے آئی تھی' سارا گھر مہمانوں سے اٹا پڑا تھا۔ غسل خانے کے باہر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک نکلتا تو دوسرا گھس جاتا۔ اب جو ایک بار گھس گیا وہ کم از کم ایک گھنٹہ تو لگا ہی دیتا۔ باہر کھڑے چاہے اس نے خود سے پہلے جانے والوں کو کتنا ہی برا بھلا کہا ہو۔ ایک بار اندر جانے کے بعد سارے اصول بھول جاتا۔ باہر چاہے لوگ غصے سے بلبلا رہے ہو' اندر بیٹھے شخص کا سکون قابل دید

ہوتا۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھلا تھا۔
صبا جو ڈیڑھ گھنٹے سے انتظار میں کھڑی تھی اسے مریم نے روک لیا۔ وہ ہی پہلے میں والی عادت' اسے اپنے آگے کوئی نظر ہی کہاں آتا تھا۔ چھوٹے بلال اور ایلین کو لے کر وہ غسل خانے پہ قابض ہو گئی۔ پہلے بچوں کو نہلا دھلا کران کو تیار کر کے باہر بھیجا پھر خود نہائی' صبا سے کیا پانچ منٹ کا وعدہ اسے یاد ہی کب تھا۔ اسے تو بس یہ فکر تھی کہ میں سب سے پہلے تیار ہو جاؤں باقی جائیں بھاڑ میں اُس کی بلا سے۔ گھنٹہ بھر بعد جب وہ نہا کر باہر نکلی تو ثمرین' عائمہ اور صدف کو تیار ہوتے دیکھا وہ بھی اسی طرف آ گئی۔
"ثمرین ذرا میرا ہیئر اسٹائل تو بنا دو پلیز!" وہ نرمی سے بولی۔
"اچھا بھابھی بس میں اپنا میک اپ ختم کر لوں۔"
"ارے یہ بعد میں سکون سے کرتی رہنا۔ دیکھو ابھی بچے نہیں ہیں تو سکون سے بنا لو۔ ابھی ایلین آ گئی تو بنوانے نہیں دے گی۔"
ثمرین کو پتا تھا مریم نے جو ایک بات منہ سے نکالی اس پہ ضد پکڑ لیتی تھی۔ اب چاہے سامنے والا اپنا سر ہی کیوں نہ پھوڑ دے اُس نے نہیں ماننا تھا۔
"اچھا بھابھی۔" ثمرین نے اپنا میک اپ بیچ میں چھوڑا اور مریم کا ہیئر اسٹائل بنانے لگی۔
"صدف تم ذرا میرا میک اپ کر دو جیسا اپنا کیا ہے نا ویسا ہی کرنا۔" صدف نے ابھی کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ چپ چاپ اس کا میک اپ کرنے لگی۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ دوسری صورت میں ساری عمر ان کی بدتمیزی کی داستان لوگوں کو سنائی جاتی۔ اندر سے چاہے دونوں کتنا بھی تلملا رہی ہوں مریم کو اس کی فکر نہیں تھی اُس کا کام ہو رہا تھا یہی بڑی بات تھی۔
عائمہ جو اپنے ہاتھ پاؤں پہ اسکائی بلیو نیل پالش لگا رہی تھی۔ جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کا ورد کرنے لگی۔ لیکن وہ مریم ہی کیا جو ٹل جائے۔ جلد ہی اس کی باری بھی آ گئی۔
"عائمہ ذرا میرا ایک کام کرنا۔" مریم اپنے مخصوص التجائیہ لہجے میں بولی۔
"جی بھابھی۔۔۔"
"دیکھو! خالہ امی نے کھانا کھول دیا ہے تو ایک پلیٹ بریانی لے کر آؤ اور دو چمچے بھی اور بلال اور ایلین کو بھی لے آؤ صبح سے کچھ نہیں کھایا بھوک لگی ہو گی بہت۔"
عائمہ نے بے بسی سے ثمرین کو دیکھا جو مریم کے بال بنا رہی تھی۔ ثمرین نے شانے اچکا کر اپنی بے بسی کا اعلان کیا۔

✲ ✲ ✲

"ارے' ارے معصب کہاں جا رہے ہو۔ رکو ذرا میری بات سنو۔" مریم کی آواز پہ بیس سالہ معصب نے پلٹ کے دیکھا۔ کار کی چابی گھمانا معصب بھلا مریم کی چیل سے نظروں سے کہاں چھپ سکتا تھا۔ مریم رشتے میں اس کی ممانی لگتی تھی لیکن خاندان کے باقی افراد کی طرح وہ بھی انہیں بھابھی بلاتا تھا۔ کچھ وہ تھی بھی شوخ و چنچل ہر آئے گئے کو چھیڑتی' بات بات پہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتی' اتنی لگاوٹ اور پیار سے بات کرتی کہ اکھڑ سے اکھڑ بندہ بھی موم ہو جاتا۔ ساری باتیں اچھی لیکن یہ "پہلے میں" والی بات سب کو ناگوار گزرتی۔
سب کنی کتراتے' لیکن صاف انکار کوئی نا کر پاتا۔ وجہ "گل شیر ماموں" تھے۔ اپنی بیوی کے الٹ' دریا دل اور حلیم انسان تھے۔ خود کو پیچھے رکھ کر دوسروں کو سکھ پہنچانے کی کوشش کرتے۔ ہر مشکل میں ان کو بلایا جاتا۔ دامے' درمے' سخنے ہر طرح مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ البتہ ان باتوں کو مریم سے پوشیدہ رکھا جاتا۔ دوسری صورت میں وہ منہ کھٹا کر کے وہ چیز واپس لے لیتی جو ماموں نے دی ہو' چاہے اس کے لیے جھگڑا ہی کیوں نا کرنا پڑے۔ اس صورت حال سے ماموں بہت گھبراتے تھے اور اگر وہ چیز حاصل نا کر پاتی تو بیچ چوراہے پہ اس شخص کا ایسا بھانڈا پھوڑتی کہ وہ منہ چھپاتا پھرتا۔
"جی بھابھی کہیے۔" معصب مودب کھڑا تھا۔

"بیٹا مجھے ذرا ابرار بھائی کے گھر چھوڑ دو کب سے تیار بیٹھی ہوں۔ تمہارے ماموں تو اب تک ظاہر نہیں ہوئے۔ آدھے گھنٹے کا کہہ کے گئے تھے چار گھنٹے ہو گئے۔" مریم حسب عادت التجائیہ لہجے میں بولی۔

"ابرار ماموں کا گھر مطلب 'تیس منٹ کی ڈرائیو۔ آنے جانے میں ایک گھنٹہ 'سی این جی الگ گلے میں ... ابا جی تو مجھے چھوڑیں گے نہیں۔" معب دل ہی دل میں حساب کتاب جوڑنے لگا۔

"بھابھی ماموں بس آتے ہی ہوں گے۔ ابھی بات کی ہے مجھ سے۔" معب نے جان بچانے کو جھوٹ گھڑا۔

"ارے چھوڑو ان کو تمہیں نہیں پتا ان کا۔" ان کے پانچ منٹ مطلب ایک گھنٹہ خوشی سے لگ جائے گا۔ میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ تم یہ بیگ پکڑو میں بس ابھی آئی بچوں کو لے کر۔" وہ بھاگ کر اندر گئی معب نے ہاتھ میں پکڑے بیگ کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری۔

✡ ✡ ✡

"مریم بھابھی ذرا یہ چاول بانٹ لیتیں۔ تین گھنٹے لگے ہیں پکانے میں اب مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔" بسمہ اس کی جٹھانی نے التجا کی۔ آج اس کی بیٹی کا عقیقہ تھا۔ چوتھا بچہ تھا۔ بریانی اور میٹھے چاول گھر میں ہی بنائے تھے اب بانٹنے کا مرحلہ تھا۔ بچی کب سے دودھ کے لیے روئے جا رہی تھی۔

"ارے بھابھی مجھے کہاں آئیں گے بانٹنے۔" مریم نے جان چھڑانے کو کہا۔

"بس جیسے آتے ہیں بانٹ دو۔ دو چار بوٹیاں تھوڑے تھوڑے چاول ڈال دینا تڑے میں 'پندرہ بیس گھر تو ہیں۔" بسمہ کو اس کی طبیعت کا پتا تھا وہ کسی کے کام آنے والی نہیں تھی۔ لیکن مجبوری تھی اس میں اب واقعی ہمت باقی نہیں بچی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ لیکن اب جیسے بانٹوں 'یہ نہیں کہنا کہ صحیح نہیں بانٹے۔" مریم نے احسان کرتے ہوئے کہا۔ بسمہ نے اس کو بھی غنیمت جانا لیکن لیکن اس کا سکون اس وقت غارت ہو گیا جب مریم نے اپنی پلیٹ بوٹیوں سے بھر کے وہیں کھانی شروع کر دی۔ بسمہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مریم کو کوئی پروا نہیں تھی۔ بمشکل آٹھ گھروں میں کھانا بھیج کر مریم نے ہری جھنڈی دکھا دی۔

"بھابھی بوٹیاں ساری ختم ہو گئی ہیں اب باقی گھروں میں خالی چاول کیسے بھیجوں۔" بسمہ کو تو جیسے کرنٹ چھو گیا ہو وہ باقاعدہ تصدیق کرنے دیگچے میں جھانکنے لگی جہاں خالی چاول اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

"اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئیں 'اپنے ہاتھوں سے سات کلو گوشت ڈالا تھا۔" بسمہ کے ہوش اڑ گئے۔

"بھئی تمہارے سامنے ہی بانٹے ہیں اب یہ مت کہنا کہ اپنے گھر دیگچہ بھر کے لے گئی۔" مریم نے ناگواری سے کہا۔ بسمہ کو بات سنبھالنی پڑی۔

"ارے نہیں میں نے یہ کب کہا تم نے شاید پہلے گھروں میں زیادہ بوٹیاں بھیج دیں۔" وہ چاہتے ہوئے بھی یہ نا کہہ سکی کہ جو تم نے پلیٹ بھر بھر کے خود کھائیں اور میاں کو بھیجیں وہ کیا ہوئیں۔

"دیکھا بسمہ بھابھی اسی لیے میں منع کر رہی تھی یہ بانٹنے والا کام بہت خواری کا ہوتا ہے۔ نیکی برباد گناہ لازم۔" مریم خفا ہو کر واپس جانے کو تیار ہو گئی بسمہ کو الٹا معافی مانگنی پڑی۔

✡ ✡ ✡

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی مریم نے اپنے بالوں میں اتری چاندی پہ ہاتھ پھیرا۔

"کتنے برس بیت گئے۔" مریم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"وقت گزرنے کا پتا ہی نا چلا۔" اس کے چہرے پہ اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا سوچ رہی ہیں" بیڈ پر نیم دراز گل شیر نے صبح کے باسی اخبار سے رہ جانے والی اکا دکا خبریں پڑھتے ہوئے سرسری نظر بیوی پہ ڈالی پھر پوچھنے لگا۔

"سوچ رہی ہوں وقت اتنی تیزی سے گزر گیا اب تو زندگی کی شام ہونے کو ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔

"مان رہی ہو نا بوڑھی ہو چکی ہو۔" گل شیر نے اخبار سائڈ پر رکھا اور بیوی کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

"ماننے نا ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے۔ بچے جوان ہو گئے ہیں ماشاء اللہ ہمیں تو بوڑھا ہونا ہی تھا۔" مریم کے چہرے پر بچوں کا ذکر کرتے ہوئے مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شکر کرو عزت سے گزر گئی۔ بچے پڑھ لکھ گئے بڑھاپے میں سر چھپانے کو چھت مل گئی۔ میں تو جب بھی سوچتا تھا مجھے ناممکن ہی لگتا تھا پچیس' تیس ہزار کی نوکری سے یہ سب کرنا۔" گل شیر عاجزی سے بولے۔

"ساری عمر گزر گئی بیوی کی اچھائی نا مانی۔ اگر میں یوں پائی پائی نا جوڑتی تو آج اس چھت کو ترس رہے ہوتے۔۔۔۔" مریم نے تفاخر سے کہا۔ گل شیر پھیکی ہنسی ہنس دیا۔

"گھر تو ان کے بھی بن گئے مریم بی بی جن کو اللہ کے سوا کسی کا آسرا نہیں تھا۔ اب سب کے گھر بننے میں تمہارا ہاتھ تو نہیں تھا۔ یہ تو اللہ کے کرم ہیں۔ ہم کیا ہماری اوقات کیا۔ تم پیسا سمیٹنے میں عجلت اور بے صبری دکھاتی رہیں۔ بسمہ بھابھی نے صبر کا دامن تھامے رکھا۔ اللہ نے ان کو بھی اکیلا تو نہیں چھوڑا۔ سارے بچے لائق فائق ہیں نوکریوں سے لگ گئے ہیں۔"

"ان لائف فائق بچوں کو گورنمنٹ اسکولوں میں دھکے کھاتے اور اپنی خواہشوں کو روندتے' کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہو گا' یہ وہ ہی جانتے ہوں گے۔ صرف اور صرف بسمہ بھابھی کی کم عقلی کی وجہ سے۔ اتنی مہنگائی میں بچے پہ بچے پیدا کرتی گئیں نا بچوں کی پراپر ڈائٹ کا دھیان تھا اچھی تعلیم کا۔ دیکھا نہیں تھا کیسی عجیب حلیے میں پھرتے تھے ان کے بچے۔ مجھے تو رحم آتا تھا ان بیچاروں پر اور میں نے آپ کے بچوں کو اسٹینڈرڈ لائف دینے میں اپنی زندگی لگا دی۔ اتنا تو مان گئے آپ۔

اچھا گھر' اچھی تعلیم' اچھا کھانا' کپڑے پورے خاندان کے بچوں سے اچھا رکھا ہے انہیں۔ سارا دن ان کے لیے خود کو ہلکان کیے پھرتی تھی۔" شوہر کے منہ سے اپنی بے صبری اور جٹھانی کی تعریف سن کے اس کے پتنگے ہی تو لگ گئے۔

سو بار کی دہرائی ہوئی باتیں پھر شروع کر دیں۔ میں نے یہ کیا میں نے وہ میں میں۔ یہ میں کا بھوت اس کے سر سے اترتا ہی نہیں تھا۔

"یہ سب بھی اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں سب سے اچھا رکھا۔" گل شیر تحمل سے گویا ہوا۔

"ہاں تو میں نے کب انکار کیا ہے لیکن کوشش بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔" وہ ابھی ایک گھنٹہ اور بولنے والی تھی۔ اپنی ساری اچھائیاں اسے فر فر یاد تھیں گل شیر نے تھک کر دوبارہ اخبار اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

آج کل عافیہ باجی کینیڈا سے آئی ہوئی تھیں۔ ابرار اور گل شیر کی بڑی بہن ان کو اپنے بیٹے فراز کے لیے لڑکی پسند کرنی تھی۔ مریم کو پورا یقین تھا وہ ایلین ہی کو پسند کریں گی۔ وہ خاندان کی تمام سلجھی لڑکیوں میں نمایاں تھی۔ فر فر بولتی انگلش۔ جدید فیشن کے ملبوسات' بے پناہ کانفیڈنس وہ سب لڑکیوں میں ممتاز نظر آتی۔ عافیہ باجی کی پرفیکٹ بہو تو ایلین ہی لگتی۔ وہ کینیڈا کے ماحول میں بھی جلدی مکس اپ ہو جائے گی۔ یہ ایک ماں کا تجزیہ تھا۔

دوسری طرف بسمہ بھابھی کی چار بیٹیاں تھیں۔ سب نے ایم اے' بی اے کر رکھا تھا۔ گھرداری میں ماہر خوب صورت تھیں مگر فیشن سے عاری۔ یہ بڑے بڑے دوپٹے لیے بوڑھی روحیں لگتیں' یہ بھی مریم کا تجزیہ تھا۔ تیسری جانب فوزیہ چھوٹی نند کی دو بیٹیاں تھیں۔ پڑھی لکھی اور ماڈرن تھیں لیکن شکل میں مار کھا گئی تھیں۔ دونوں کا رنگ اپنے باپ پر پڑا تھا۔ ماں گوری تھی اور ابا کالے میاں تھے۔

"سانولی سلونی نتاشا اور ہانیہ۔۔۔ ادھر فراز ماں کی طرح گورا چٹا۔ کوئی جوڑ نہیں بنتا۔" مریم نے ناک سے مکھی اڑائی۔ مریم ہروقت عافیہ کے پیچھے پڑی رہتی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ مریم نے اپنی اچھی خاصی بچت عافیہ اور فراز کی آؤ بھگت پہ لٹادی۔ مریم بے مقصد کسی پر ایک پائی خرچ نہیں کرتی تھی۔ یہاں مقصد بیٹی کا مستقبل تھا۔ عافیہ کو مہنگے مہنگے گفٹ دیے جاتے۔ عافیہ نانا کرتی رہ جاتیں بھاوج کے مزاج سے خوب آشنا تھیں یہ سب صرف خلوص نہیں تھا۔ عافیہ 'بسمہ اور ابرار کے گھر ٹھہری ہوئی تھیں۔ وجہ بچیوں کے مزاج سے آشنائی پانا تھی۔ سفید پوش ابرار بھائی نے پہلے ایک دو روز بھرپور اہتمام کیا اب نارمل ایک چیز بنتی تھی اس میں سالن دال اور سبزی کی بھی باری آجاتی۔ مریم کانوں کو ہاتھ لگاتیں۔ کچن میں آکر ڈھکن اٹھا کے سالن چیک کیا جاتا اور بھاگ کر کبھی قورمہ 'کبھی بریانی۔ کبھی نہاری پکا کرلائی جاتی۔

"بس چار دن کی محبت تھی تم لوگوں کی 'اتنی دور سے آئی مہمان کو دال سبزی کھلا رہے ہو۔" باقاعدہ جتا کے جاتی بسمہ چپ رہتی۔ عافیہ شرمندہ ہو کر رہ جاتیں۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی بھابھی یہ مرغن غذائیں اب میں نہیں کھا سکتی۔ مجھے سبزی اور دال ہی پسند ہے۔" عافیہ نے بڑی بھاوج کا بھرم رکھا مریم کھسیانی ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

آخر وہ وقت آن پہنچا جب عافیہ نے کسی ایک لڑکی کا نام لینا تھا۔ کچھ اپنی کچھ فراز کی پسند کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بسمہ بھابھی کی دوسرے نمبر والی بیٹی عریشہ کا نام لے لیا۔

مریم کے تو سینے پہ سانپ لوٹ گئے۔ اس کی ساری کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔

"بہت گھنی نکلیں یہ بسمہ بھابھی اور ان کی بیٹیاں بظاہر کیسے مٹی کا مادھو بن کے بیٹھی رہتیں اور اندر ہی اندر لڑکے پر ڈورے ڈالتی رہیں۔" مریم نے جل کے سوچا۔

آج شام منگنی کی سادہ سی تقریب تھی۔ صرف خاندان کے لوگ ہی بلائے گئے تھے۔ مریم کا دل جانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ طوہا" کرہا" تیار ہوئی تھی۔ بسمہ بھابھی کے میکے والے ابھی نہیں پہنچے تھے کہ باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوتا۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز سن کر وہ ادھر ہی آرہی تھی جب اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی یہ بسمہ بھابھی کی آواز تھی۔

"سچ پوچھیں تو عافیہ بس مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا جب آپ نے عریشہ کا نام لیا۔ مجھے تو پورا یقین تھا آپ ایلین ہی کو پسند کریں گی۔ پھر مریم بھابھی کا بھی بہت دل تھا فراز کو داماد بنانے کا۔ پسند تو مجھے بھی تھا لیکن میں خود سے تو شاید ساری عمر آپ کو نہ کہہ پاتی۔"

"بس بھابھی مجھے بھی آپ کی یہی ادا اچھی لگتی ہے۔ سچ پوچھیں تو ایلین بہت اچھی لڑکی ہے لیکن میں مریم کے ہروقت "میں میں" کرنے سے خائف تھی۔ انہیں اپنے علاوہ اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ میں ڈر گئی تھی 'بیٹیاں ماں کا پرتو ہوتی ہیں ایلین اسی کی گود میں پلی ہے۔ اس میں بھی یہ عادت نا ہو۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اسے کسی تجربے کی نظر کر کے میں اپنا بڑھاپا خراب کرنا نہیں چاہتی۔" عافیہ نے دل کی بات کہہ ہی دی۔

مریم بت بنی یہ سنتی رہی۔ الفاظ تھے یا بم جو یکے بعد دیگرے اسے اپنے اعصاب پر پھٹتے محسوس ہوئے۔ سب کچھ پانے کی چاہ میں دوسروں کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھنے کا جنون در حقیقت حسد ہی تھا جو کسی کو خود سے آگے دیکھتے ہوئے اس پر حاوی ہو جاتا تھا اور وہ اب تک اسے اپنی خوبی گردانتی رہی تھی۔ لیکن یہ بات اس کی پیاری بیٹی کی زندگی میں اندھیرا لے آئے گی 'یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہمیشہ سب سے آگے رہنے والی مریم زندگی کی اس اہم بازی میں مات کھا گئی تھی۔

☆ ☆

# کچھ موتی چُنے ہیں

ادارہ

## سکون

"میں انسان کے اندر ایسا اضطراب پیدا کروں گا جو اسے ہر وقت بے چین و بے قرار رکھے گا۔ اس اضطراب کو دور کرنے کے لیے کبھی وہ زمین کی تہوں کو کھود ڈالے گا' کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں کو سر کرے گا اور کبھی چاند ستاروں تک پہنچ جائے گا اس کو سکون نہیں ملے گا۔" بڑی سرکار نے جواب دیا۔

"اور سکون اسے کہاں ملے گا؟" انتہائی حیرت سے سوال کیا گیا۔ بڑی سرکار نے جواب دیا۔

"اگر میں سکون پہاڑ کی چوٹیوں اور زمین کی تہوں اور سمندروں کی گہرائی میں رکھوں تو انسان اسے وہاں بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا' مگر میں سکون کو انسان کے اندر رکھوں گا' جس کے بارے میں وہ بہت کم سوچے گا۔"

(قیصرہ حیات۔۔۔ الف اللہ اور انسان)

حرمت روا۔۔۔ ڈلوال

## تعریف

سنو خدا نے بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں اور ہر مخلوق کو زیر کرنے کا طریقہ بھی مختلف ہے درندے پکڑنے کے لیے اسے شکار کرتے ہیں' پرندے کو اسیر کرنے کے لیے دانہ ڈالتے ہیں' آبی جانور کو پھانسنے کے لیے جال ڈالتے ہیں لیکن اشرف المخلوقات کے لیے تعریف کا ایک جملہ کافی ہے اور سنو ہر مخلوق اسیر ہو کر آزادی چاہتی ہے مگر یہ آدم زاد تعریف کے جال میں قید ہو کر کبھی آزادی نہیں چاہتا لہٰذا اب تم قیامت تک اسے اس ہتھیار سے زیر کرتے رہو گے۔

(منورہ نوری خلیق۔۔۔ آزمائش)

یاسمین کنول۔۔۔ پسرور

## آئی لو پاکستان

"میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "کیا تم نے میری کار دیکھی ہے؟"

"ان دنوں آپ کے پاس کون سی کار ہے؟"

"ان دنوں میرے پاس سلور مرسڈیز ہے۔ تم بے شک ابھی جا کر دیکھ لو اس کے اگلے شیشے پر "آئی لو پاکستان" کا اسٹیکر لگا ہوا ہے۔ وطن دوستی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"یہ ثبوت ہے آپ کی پاکستان کے ساتھ محبت کا؟"

"اور کیا میں نے اسٹیکر لگا کر اپنا فرض پورا کر دیا اب میں ملک کے لیے اس سے بڑھ کر کیا کر سکتا ہوں؟"

(مستنصر حسین تارڑ۔۔۔ الو ہمارے بھائی)

آمنہ ناز محمد۔۔۔ میرپور ساکرو

## عورت

مزے کی بات یہ ہے کہ جتنا مردوں نے عورتوں کو سمجھنے کا دعوا کیا ہے اتنا عورتوں نے مردوں کے متعلق کبھی کوئی قول اپنی عقل سے نہیں بنایا۔

مردوں نے کہا "مرد ظالم ہوتا ہے" وہ چپ چاپ ظلم سہنے لگیں۔

مردوں نے کہا "عورت ڈرپوک ہوتی ہے۔" وہ چوہیا تک سے ڈرنے لگیں۔

پھر فرمایا۔ "وقت پڑے تو عورت جان پر کھیل جاتی ہے۔" بس جھٹ جان پر کھیل گئیں۔

"ماں کی ممتا کا ساری دنیا ڈھول پیٹتی ہے باپ کی باپتا کا کوئی رونا نہیں روتا۔"

(عصمت چغتائی)

طاہرہ بھٹی۔۔۔ ملتان

## پیر صاحب کی کرامت

ایک پیر صاحب نے پہلے پہل ٹارچ کی ایجاد سے خوب فائدہ اٹھایا ان کا دعوا تھا کہ جو بھی شخص ان کے پاس چالیس دن کا چلہ کاٹ لے وہ اپنی کھلی آنکھ سے اللہ کے نور کا دیدار کر سکتا ہے۔ بہت سے لوگ چلہ کاٹنے آئے۔ ان چالیس دن میں پیر صاحب ہر شخص سے روزانہ صدقے کا ایک بکرا اور دوسری خیر خیرات کے لیے کچھ نہ کچھ رقم بٹورتے رہتے تھے۔ چلہ کاٹنے والے دن بھر روزہ رکھتے اور رات کو عبادت کرتے رہتے تھے۔ چالیسویں دن پیر صاحب اگر بتیوں اور عود ولوبان سے مہکائے ہوئے حجرے میں چلہ کش کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے اور اس کے چہرے کو اپنے فیرن میں ڈال کر اسے حکم دیتے کہ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرے اور پلکیں جھپکائے بغیر اپنی آنکھیں پوری توجہ سے پیر صاحب کے قلب کی جانب ٹکٹکی باندھ کر جمائے رکھے۔ حجرے میں بہت سے مردان باصفا حلقہ باندھ کر ذکر جہر کی محفل برپا کرتے تھے۔ اس ڈرامائی ماحول میں کسی خاص لمحے میں پیر صاحب اپنے فیرن میں ہاتھ ڈالتے اور چھپائی ہوئی ٹارچ کا بٹن آن کر کے اس کی شعاعوں سے اپنے سینے کو بقعہ نور بنادیتے۔ بعض چلہ کش نور الٰہی کے اس دیدار کو تاب نہ لاتے ہوئے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

(قدرت اللہ شہاب۔۔۔ شہاب نامہ)
شاہدہ عامر۔۔۔ کراچی

## مشیت ایزدی

تدبیر بھی تقدیر کے آگے سرنگوں ہوتی ہے۔ مشیت ایزدی کے سامنے لبیک کہنا ہی بندگی کا اصل مفہوم ہے۔ ہمارے تمہارے چاہنے، سوچنے یا کرنے سے ہی اگر تمام مسئلے حل ہو سکتے تو پھر خدا کہاں ہے، ہم منزل کی سمت قدم بڑھا کر سفر تو شروع کر سکتے ہیں لیکن منزل پالینا ضروری نہیں ٹھہرتا ہے۔ ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا ہی منزل کا مفہوم ہے۔

(محمد یحییٰ خان۔۔۔ کاجل کوٹھا)

سمیرا تعبیر۔۔۔ سرگودھا

## تعریف

ہم خدا سے تب رجوع کرتے ہیں جب دنیا ہمیں رد کر چکی ہوتی ہے۔ تمام دروازوں سے دھتکارے جانے کے بعد ہم خدا کے در پر دستک دیتے ہیں۔ ہماری اولین ترجیح دنیا ہوتی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ ہمیں لگتا ہے کہ ترتیب کے ردوبدل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتنی بڑی بھول ہے۔ ترتیب ہی تو اصل چیز ہے کہ کون پہلے اور کون بعد میں آتا ہے۔!!!

(بشریٰ سعید۔۔۔ سفال گر)
ام ایمن۔۔۔ نڈانوالہ کھاریاں

## طوعاً" کرہاً"

جب روز قیامت اللہ زمین آسمان کو بلائے گا۔ تو ہر چیز کھنچی چلی آئے گی۔ طوعاً" کرہاً"۔ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ جب ہم اللہ کے بلانے پر نماز اور قرآن کی طرف نہیں آتے تو اللہ ہمارے لیے ایسے بنا دیتا ہے، یہ دنیا اتنی تنگ کر دیتا ہے کہ ہمیں زبردستی، سخت ناخوشی کے عالم میں آنا پڑتا ہے اور پھر ہم کرہاً" بھی بھاگ کر آتے ہیں اور اس کے علاوہ ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ اس کی طرف طوعاً" آجاؤ محمل۔! اور ورنہ تمہیں کرہاً" آنا پڑے گا۔

(نمرہ احمد۔۔۔ مصحف)
ثمینہ اکرم۔۔۔ لیاری

## جوہری

ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے مگر سامنے والا جوہری نہ ہو یا جوہری کی نگاہ نہ رکھتا ہو تو ہیرے کو معمولی سا موتی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح کبھی کبھی تقدیر ہمیں بھی مٹی کے پیالے میں امرت پیش کرتی ہے مگر ہم مٹی کے پیالے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ٹھکرا دیتے ہیں۔

(راحت حسین۔۔۔ امرت اور پیالہ)
سیدہ نسبت زہرا۔ کھوڑ پکا

## حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ میں ان سے احسان کرتا ہوں اور وہ برائی کرتے ہیں۔ میں ناتا ملاتا ہوں' اور وہ توڑتے ہیں۔ جو میں صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں۔" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اگر حقیقت میں تو ایسا ہی کرتا ہے تو ان کے منہ پر جلتی راکھ ڈالتا ہے اور ہمیشہ اللہ کی طرف سے تیرے ساتھ ایک فرشتہ رہے گا' جو تجھے ان پر غالب رکھے گا' جب تک تو اس حالت میں رہے گا۔"
صحیح مسلم۔ (باب نمبر 1763)
امینہ ملک ۔۔۔ کراچی

## گوہر آبدار

☆ اللہ تعالیٰ کی عبادت رات کے پہلے حصے میں پھول اور پچھلے حصے میں پھل ہوتی ہے کیونکہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہیں۔
☆ وہ بدبخت روح جس سے رب تعالیٰ نے منہ موڑ لیا ہو اب وہ خواہ جس قدر افسوس کرے اور غم میں گھلتی رہے رب تعالیٰ کو دوبارہ پانا اس کے نصیب میں نہیں ہوگا۔
☆ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ان کو ہی ملتی ہے جو راتوں کو جاگ کر فکر کے ساتھ ذکر الٰہی کرتے ہیں۔
☆ بے زاری اور بے بسی کے عالم میں ترک دنیا کوئی کمال نہیں اصل کمال تو یہ ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر اللہ سے لو لگائی جائے۔
طاہرہ ملک' رضوانہ ملک ۔۔۔ جلال پور پیروالا

## حکمت

"حکیم لقمان سے کسی نے پوچھا"۔
"حکمت کس سے سیکھی؟"
"اندھوں سے وہ پہلے زمین کو اچھی طرح ٹٹول لیتے ہیں تب آگے بڑھتے ہیں۔"
فوزیہ ثمر ۔۔۔ گجرات

## انسان

☆ جانور میں عقل اور فرشتے میں خواہش نہیں ہوتی
مگر
انسان میں دونوں ہوتی ہیں۔
اگر
وہ عقل کو دبا دے تو جانور
اور
اگر خواہش کو دبا دے تو فرشتہ
☆ انسان ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا
تالا کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ
دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی
☆ انسان بزدل اتنا ہے کہ سوتے ہوئے خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور بے وقوف اتنا کہ جاگتے ہوئے بھی اپنے رب سے نہیں ڈرتا۔
ثمینہ اکرام ۔۔۔ لیاری

## "پانی"

نہ اس کا کوئی رنگ ہے نہ ذائقہ پھر بھی

اللہ کی قدرت ہے کہ
پانی... اوپر کو اٹھے تو "بھاپ"
اوپر سے گرے تو "بارش"
جم کے گرے تو "اولہ"
گر کے جمے تو "برف"
پھول پر گرے تو "شبنم"
پھول سے نکلے تو "عرق"
آنکھ سے نکلے تو "آنسو"
بہے تو "دریا" قدم اسماعیل سے نکلے تو زم زم
اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے تقسیم ہو تو "آب کوثر"
اور اگر نہ ملے تو "کربلا"... پس
تم اپنے رب کی کون کونسی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

بنت قدرت علی... کراچی

## آنکھ کے راز

☆ ہر جھکنے والی آنکھ حیادار نہیں ہوتی کیونکہ وہ بھید چھپانے کے لیے ہی جھکتی ہے اور شرمندگی کی وجہ بھی...!

☆ ہر بھیگنے والی آنکھ غم زدہ نہیں ہوتی کیونکہ وہ پچھتاوے کی وجہ سے بھی بھیگتی ہے اور خوشی کے عالم میں بھی...!

☆ ہر بند ہونے والی آنکھ پر سکون نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ نیند کی وجہ سے بند ہوتی ہے اور درد چھپانے کے لیے بھی...!

عائشہ عالم... نورا جہ منڈی

## کرنیں

☆ موسم کی شدتوں کا احساس غریب کی کٹیا میں ہوتا ہے۔

☆ ہر کوئی اپنی پسند کی عینک پہن کر دنیا کا نظارہ کرنا چاہتا ہے عینک اتارتے ہی ہر چیز دھندلی نظر آنے لگتی ہے۔

☆ دیوار سے نکلی ہوئی اینٹ سے دیوار گرتی تو نہیں پر بدنما ضرور معلوم ہوتی ہے۔

☆ خوش اخلاقی کے ہتھیار سے آپ دشمن کو بھی زیر کر سکتے ہیں۔

☆ ہر کامیاب عورت کے پیچھے کسی نہ کسی مرد کا ہاتھ ہوتا ہے کوئی بھی عورت بھائی، خاوند، بیٹے اور باپ کی سپورٹ کے بغیر منزل نہیں پا سکتی۔

شمائلہ سہل جاوید... کراچی

## فلسفہ حیات

ایک سردار جی کپ میں چمچہ ہلا کر چائے کی چسکی لیتے، برا سا منہ بناتے، کپ نیچے رکھتے اور دوبارہ چمچہ ہلانے لگتے۔ پھر کپ اٹھاتے، چسکی لیتے، برا سا منہ بناتے اور کپ نیچے رکھ کر چمچہ ہلانے لگتے۔
جب وہ یہ عمل پانچ، سات بار دہرا چکے تو چمچہ ٹرے میں پھینک کر بولے۔
"لو بھئی دوستو! ایک بات تو طے ہو گئی۔"
دوستوں نے چونک کر پوچھا۔ "وہ کیا؟"
سردار جی اس یقین سے بولے "یہی کہ اگر چائے میں چینی نہ ہو تو چاہے لاکھ چمچہ ہلائیں۔ چائے میٹھی نہیں ہو سکتی۔"

زینب باجوہ... سیالکوٹ

## اکیلا دسمبر...!!!

سرد راتوں کی بھیگی تنہائی
برستی بوندوں کے چھوتے ہی سلگتا سا بدن
بیتی یادوں بیتے لمحوں میں سلگتا ہوا دل
یوں گزرے سال کے
سارے دکھ سارے غم
اکیلا دسمبر ہی سمیٹ لیتا ہے...!!!

ثمینہ کوثر عطاری... ڈوگہ گجرات

## غلطی

☆ بہت سے لوگ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے اور فرشتہ ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ (اسٹالن)

☆ غلطی مان لینے سے آدمی کا ذہنی بوجھ کم ہو جاتا ہے۔(سارس)

☆ اگر آپ سیکھنا چاہیں تو آپ کی ہر غلطی آپ کو سبق دے سکتی ہے۔(اسٹالن)

☆ اگر کسی اونچے مقام پر پہنچ جاؤ تو کوئی ایسی حماقت نا کرو کہ نیچے پھسل جاؤ۔(اوائے ہتیتا)

☆ جو انسان کبھی غلطی نہیں کرتا' وہ کوئی کام بھی نہیں کرتا۔(ایڈورڈ جے فلپس)

☆ غلطیاں دونوں سے ہوتی ہیں۔ بے وقوف سے بھی اور عقلمند سے بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک کو آخر تک احساس نہیں ہوتا اور دوسرے کو فوراً" احساس ہو جاتا ہے۔

## حیرت انگیز باتیں

○ اسکاٹ لینڈ میں ایک زمانے میں ماہی گیروں کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ کان میں سونے کی ایک بالی پہنیں تاکہ اگر وہ ڈوب جائیں تو ان کے کفن دفن کا خرچ پورا کیا جاسکے۔

○ گورنر مشرقی پاکستان' جسٹس' شہاب الدین جب اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو گورنمنٹ ہاؤس (ڈھاکہ) سے رخصت ہوتے ہوئے اپنے مطالعے کے کمرے میں آئے تو اپنے قلم کی سیاہی یہ کہہ کر دوات میں ڈال دی کہ وہ حکومت کی کوئی چیز ساتھ لے جانا نہیں چاہتے۔

○ دہلی کے ممتاز داستان گو "میر باقی علی" کو اپنے فن کے بھرپور اظہار کے لیے مختلف فنون کی اصلاحات ہوئی تھیں۔ طبی اصلاحات جاننے کے لیے انہوں نے باقاعدہ طور پر طبیہ کالج' دہلی میں طب کی تعلیم حاصل کی۔

ثمو شعیب بٹ' گوندلانوالہ

## اگر

بچھڑنا ہی اگر لکھا ہے قسمت میں
تو اس میں دیر کا ہے کی

چلو اس پل اسی لمحے بچھڑتے ہیں
ابھی تم آنکھ جھپکو گے
ابھی میں ہاتھ اپنے دل پہ رکھوں گی

رات اس نے پوچھا تھا
تم کو کیسی لگتی ہے؟
چاندنی دسمبر کی
میں نے کہنا چاہا تھا
سال و ماہ کے بارے میں
گفتگو کے کیا معنی
چاہے کوئی منظر ہو
دشت ہو سمندر ہو
جون ہو دسمبر ہو
دھڑکنوں کا ہر نغمہ
قربتوں کا ہر لمحہ
منظروں پہ بھاری ہے
ساتھ جب تمہارا ہو
دل کو اک سہارا ہو
ایسا لگتا ہے جیسے
اک نشہ سا طاری ہے
لیکن اس کی قربت میں
کچھ نہیں کہا میں نے
تکتی رہ گئی مجھ کو
چاندنی دسمبر کی

(اعتبار ساجد)
ناز شریف' گجرات

## چمکتی کلیاں

☆ دنیا کی سخت ترین سزاؤں میں ایک سزا انتظار ہے۔

☆ ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پہ ظلم ہے۔

☆ اگر کسی کو خوشی نہیں دے سکتے تو تم دکھ بھی نا دو۔

☆ جس بات سے تم دوسروں کو روکتے ہو اسے خود بھی نا کرو۔

☆ ماں کے بغیر کائنات نامکمل ہے۔

☆ کسی سے اس طرح ملو کہ وہ دوبارہ آپ سے ملنے کی تمنا کرے۔

☆ پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لیے کانٹوں کی چبھن کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

سمیرا عبدالغنی بٹ' در نجف لودھرہ

## نور زیست

☆ کسی بھی انسان کی معذوری اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ کوئی انسان خود کو بدصورت بنانا پسند نا کرتا اگر خود کو بنانا اس کے اپنے اختیار میں ہوتا۔ ہم بدصورت لوگوں سے نفرت کرتے ہیں' ہمیں معذور لوگوں پر ہنسی آتی ہے' ہم ان پر رحم کھاتے ہیں' ہمیں ان پر ترس آتا ہے۔ بس ان سے محبت نہیں ہوتی۔ شاید اس لیے کہ ہم انہیں تخلیق کرنے والے کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

☆ محبت میں یہ قباحت ہے کہ جس سے محبت ہوجائے اسے آسانی سے آزاد نہیں کیا جاسکتا۔

☆ بددعا کبھی زبان سے نہیں دی جاتی' وہ جو آنسو پلکوں میں اٹکا رہ جائے بذات خود ایک بددعا ہوتا ہے اور دکھا ہوا دل خود ایک بددعا کی گزرگاہ بن جاتا ہے۔

☆ لوگ تو ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوتے' غم میں کون شریک ہوگا۔

لبنیٰ مشتاق' پھول نگر

## لفظ باتیں کریں گے

☆ جس شخص کو عبرت حاصل کرنے کا شوق ہو' اس کے لیے ہر ایک نئی چیز موجب عبرت ہے۔ (حکیم بقراط)

☆ زیادہ گفتگو کرنا ہرچند کہ اچھی باتیں ہوں دلیل دیوانگی ہے۔ (ارسطو)

☆ زمانہ پیری نہایت مسرت ناک ہے' بشرطیکہ اور صحت اور سچا دوست میسر ہو۔ (حکیم سقراط)

☆ دنیا کی مصیبتیں بظاہر زخم ہیں مگر درحقیقت ترقیوں کا موجب ہیں۔ (مجدد الف ثانی)

☆ تین چیزوں کا ہمیشہ احترام کرو۔ استاد' والدین اور قانون۔ (شیکسپیئر)

☆ علم دل کو اس طرح شاداب رکھتا ہے جیسے خشک زمین کو بارش۔ (حکیم لقمان)

☆ سچائی کا نام حسن ہے اور حسن کا نام سچائی ہے۔ (کیٹس)

☆ محبت پانا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں مگر محبت پھیلانا ہر ایک کے لیے ممکن ہے۔

☆ شیطان ایک ایسا شریف ہے جو اس جگہ کبھی نہیں جاتا جہاں اسے خوش آمدید نہ کہا جائے۔

☆ شدید روشنی اور گہری تاریکی سے دور رہیں کیونکہ یہ دونوں ہی آپ کی آنکھوں کی چمک کو مدھم کردیتی ہیں۔

☆ کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں اس لیے چیزوں کو کھو کر بھی خوش رہنے کا ڈھنگ سیکھیں۔

☆ بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔

☆ صبر کی دو قسمیں ہیں ایک ناپسندیدہ چیز ملنے پر اور دوسرا پسندیدہ چیز نہ ملنے پر۔

تکلیفوں سے مت گھبراؤ کیونکہ تکلیفیں انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سوچنے سے آدمی دانا بنتا ہے اور دانائی آدمی کو جینے کے قابل بناتی ہے۔

☆ انسان اپنی طرف سے پوری کوشش' پوری تدابیر اختیار کرتا ہے اور جب کامیابی اس کے قریب جا پہنچتی ہے تو دو چیزیں اس کے اور کامیابی کے دوران حائل ہوجاتی ہیں ایک موت اور دوسری تقدیر۔

سیدہ نسبت زہرا' کھوڑ پکا

بُشریٰ محمود

ثمینہ کوثر عطاری، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی نظم

دسمبر مجھے راس آتا نہیں،

کئی سال گزرے کئی سال بیتے
شب و روز کی گردشوں کا تسلسل
دل و جاں میں سانسوں کی پرتیں الٹتے ہوئے
زلزلوں کی طرح ہانپتا ہے
چٹختے ہوئے خواب
آنکھوں کی نازک رگیں چھیلتے ہیں
مگر میں اک سال کی گود میں جاگتی صبح کو
بے کراں چاہتوں سے اٹی زندگی کی دعا دے کے
اب تک وہی جستجو کا سفر کر رہا ہوں
گزرتا ہوا سال جیسے بھی گزرا
مگر سال کے آخری دن نہایت کٹھن ہیں
میرے ملنے والو
نئے سال کی مسکراتی صبح گر ہاتھ آئے تو ملنا
کہ جلتے ہوئے سال کی ساعتوں میں، یہ بجھتا ہوا
دل
دھڑکتا تو ہے مسکراتا نہیں
دسمبر مجھے راس آتا نہیں

سدرہ وزیر، کی ڈائری میں تحریر
عرش صدیقی کی نظم

اسے کہنا،

اسے کہنا دسمبر آ گیا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی برس اک
اور ماضی کے گپھا میں ڈوب جائے گا
مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں نہ جاگے گا
اسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کے
کہرے دیواروں پر لرزاں ہیں
اسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو گئے ہیں

اور ان پر برف کی چادر بچھی ہوتی ہے
اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو کیسے برف پگھلے گی
اسے کہنا کہ لوٹ آئے

ملیحہ خان، کی ڈائری میں تحریر
ناصر کاظمی کی غزل

تم آ گئے ہو تو کیوں انتظارِ شام کریں
کہو تو کیوں نہ ابھی سے کچھ اہتمام کریں

خلوص و مہر و وفا لوگ کر چکے ہیں بہت
مرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں

ہر آدمی نہیں شائستۂ رموزِ سخن
وہ کم سخن ہو مخاطب، تو ہم کلام کریں

جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

وہ طلب میں جو گمنام مر گئے ناصر
متاعِ درد انہی ساتھیوں کے نام کریں

## رباب علی، کی ڈائری میں تحریر
ابرار عمر کی نظم

### دسمبر اب بھی تیرا منتظر ہے

وہ لمحے سوچ کی دہلیز پر ٹھہرے ہوئے ہیں
دسمبر کے مہینے میں
ہزاروں سال پہلے جب
تیرے وعدے کے ہونٹوں نے
میری آنکھوں سے بہتی زندگی کے ہاتھ چومے تھے
میری بے رنگ باتوں کے کنارے
تم نے خوابوں کے سہارے اور اشکوں کے ستارے
رکھ دیے تھے
اور ہوا کو اپنی چاہت کی حفاظت کا اشارہ کر دیا تھا
ہوا کی خنکیوں میں اب بھی تیری نرم باتیں
آہٹوں کا جال بنتی ہیں
سماعت اب بھی تیرے قہقہوں کا شور سنتی ہے
خیال اب تک تمہاری انگلیوں سے
میرے دل کے سرخ آنسو پونچھتا ہے
نگاہیں برف کے پھیلے کینوس پر جا بجا
تیری رفاقت کی ضرورت پینٹ کرتی ہیں
ٹھٹھرتے پانیوں کے تن پہ بکھری دھوپ
تیرا ہجر روتی ہے
کہاں ہوتا ہے تو
محبت کی سلگتی راہ گزاروں کے کناروں پر
دسمبر اب بھی تیرا منتظر ہے

---

## عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر، کی ڈائری میں تحریر
رضی ترمذی کی نظم

### تم آؤ،

دسمبر کی شاموں میں
اتنی دل آویز افسردگی ہے کہ جی چاہتا ہے
کبھی کہیں بیٹھ کر خوب جی بھر کے روئیں
ہواؤں میں یوں چھوٹی چھوٹی بدلیاں
تیرتی پھر رہی ہیں
کہ جیسے کسی یاد سے دل میں ٹھنڈک کی
اک لہر سی دوڑ جائے
فضا اس قدر خوبصورت ہے جیسے
کوئی دوست بیٹھا ہوا، دوست کو
اپنے غم کی کہانی سناتے
مگر تم کہاں ہو!
تم آؤ!
میں بھی تمہیں اپنے غم کی کہانی سناؤں
تم آؤ بھی کہیں بیٹھ کر خوب جی بھر کے روئیں

---

## بیا اسامہ انجم، کی ڈائری میں تحریر
خلیل اللہ فاروقی کی نظم

### سوال،

تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ دل کے کھیل میں کیا جیتنے والے بھی روتے ہیں
وہ جن کی چشم خود بیں اوروں کو دیکھا نہیں کرتی
بھلا کس غم کے دل کے تار میں موتی پروتے ہیں
تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ کیا مانند شیشہ پتھر میں بال آتا ہے
اثر انگیز ہے اب تک محبت کا وہی جذبہ
جو ایسے ہوش مندوں کو بھی یوں پاگل بناتا ہے
تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
مزاج حسن میں یوں یک بیک کیا انقلاب آیا
ستارہ دیکھنا اور دیکھ کر افسردہ ہو جانا
بڑی تاخیر سے تم کو ستاروں کا حساب آیا
تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ ترک ربط پر کیا مجھ سے وحشی یاد آتے ہیں
تعلق توڑنا آساں تھا تو کیوں آنکھ یہ تم سے
انا پرور، جفا پیشہ بھی یوں آنسو بہاتے ہیں
تمہاری بھیگتی پلکوں سے میں نے بارہا پوچھا
کہ جلنے اور جلانے میں بھلا کیوں لطف آتا ہے
بس اک چھوٹی انا کے واسطے برباد ہو جانا
خودی کے زعم میں انسان کتنے دکھ اٹھاتا ہے

شگفتہ سلیمان

فرزانہ جاوید ———— کراچی

ایک خوشبو کی طرح کوچۂ روز و شب سے
جو دبے پاؤں گزر جائے وہ سال اچھا ہے

شازیہ گلزار ———— بھکر

سنو! ان دنوں ہم سے رابطہ بحال رکھنا
سُنا ہے اکثر لوگ دسمبر میں بچھڑ جاتے ہیں

یاسمین ملک ———— کراچی

تیری یاد کی برف باری کا موسم
سلگتا ہے دل کے اندر اکیلے
ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں اک دسمبر اکیلے

فائزہ محمد زبیر خان ———— کراچی

وہ بات کیوں کریں جس کی خبر ہی نہ ہو
وہ دُعا کیسے کریں جس کا اثر ہی نہ ہو
کیسے کہہ دوں تمہیں لگ جائے میری عمر
کیا پتا اگلے پل میری عمر ہی نہ ہو

روبینہ یاسمین ———— پتوکی

ملن کے چند سکے ڈال اس میں
میرے ہاتھوں میں ہے کاسہ دسمبر
جمع پونجی وہی ہے عمر بھر کی
میری تنہائی اور میرا دسمبر

سدرہ وزیر ———— پھیل

ٹھٹھرتی ہوئی شبِ سیاہ وہ بھی طویل تر
محسن ہجر کے ماروں پہ قیامت ہے یہ دسمبر

غنوی اکرم ———— لیاری

دسمبر کی یہ پہلی شام ہی کتنی ظالم ہے
آغازِ شام ہی سے یادوں کے بادل چھا گئے

مینا بخاری ———— ڈوگہ گجرات

دسمبر جب بھی لوٹتا ہے میرے خاموش کمرے میں
میرے بستر پر بکھری کتابیں بھیگ جاتی ہیں

ثمینہ کوثر عطاری ———— ڈوگہ گجرات

میرے لفظوں پہ حاوی ہے تمہارے ہجر کا موسم
میری غزلیں، میری نظمیں، میرے اشعار روتے ہیں
دسمبر کی حسیں شامیں زمیں پر جب اُترتی ہیں
میرے چھوٹے سے کمرے میں تیرے اقرار روتے ہیں

رابعہ عمران چوہدری ———— رحیم یار خان

مفہوم بدلتا ہے تحریر بدلنے سے
کچھ فرق نہیں پڑتا تفسیر بدلنے سے
اے میرے مسیحا تم اب چارہ گری چھوڑو
یہ درد رفع ہوگا تقدیر بدلنے سے

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک ———— جلال پور پیر والا

مت پوچھ ہم سے ہماری بندگی کا عالم اے ابلیس
غافل ہیں مگر ٹھوکر جب بھی لگے سجدہ خدا کو ہی کرتے ہیں

سیدہ لوبا سجاد ———— کھروڑ پکا

اتا کا بول نہیں قائل مجھے لعنت سبھی سے ہے!
جو دل میں بغض رکھتے ہیں میں ان اپنوں سے ڈرتا ہوں

ریحانہ ———— راولپنڈی

دوستی ان سے ہو گئی ہے عدم
جن کی ہر بات کاروباری ہے

اُم ایمن ———— کھاریاں

وہی آہٹیں در و بام پر وہی رتجگوں کے عذاب ہیں
وہی ادھ بجھی میری نیند ہے وہی ادھ جلے مرے خواب ہیں
یہ نہ پوچھ کیسے بسر کیے، شب و روز کتنے پہر جیے
کسے دن رات کی تمیز تھی کسے یاد اتنے حساب ہیں

صبا شبیر، لوہا ہی، عائشہ اسلم ——— ڈونگہ گجرات

میری آنکھوں میں سورج اُگلتا رہا، چاند جلتا رہا
تیری یادوں کا سورج نکلتا رہا چاند جلتا رہا
یہ دسمبر کہ جس میں کڑی دھوپ بھی میٹھی لگنے لگی
تم نہیں تو دسمبر سلگتا رہا چاند جلتا رہا

کہکشاں انجم ——— فیصل آباد

لمحہ لمحہ لگتا ہے کبھی اک سال
لمحے بھر میں کبھی سال گزر جاتا ہے

ثمرہ، اقراء ——— کراچی

ممکن نہیں ہے مجھ سے یہ طرزِ منافقت
دُنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— کراچی

چاہت کا اک میٹھا میٹھا درد جگائے شام ڈھلے
تیری یادیں آجاتی ہیں ہم کو رُلانے شام ڈھلے
دن کے اُجالوں میں تو مناؤں لاکھ جتن سے بہلا لوں
لیکن دل کا پاگل پنچھی ایک نہ مانے شام ڈھلے

ندا، فضہ ——— فیصل آباد

خرچ جتنا کروں یہ بڑھتی ہے
یاد تیری عجیب دولت ہے

رُباب علی ——— قصور

اجنبی کتنا اکیلا ہے محبت کا سفر
تو ساتھ نہ ہوتا تو میں ڈرتا رہتا
اس کو جانا تھا تو کوئی زخم بھی دے کر جاتا
اس بہانے میں اُسے یاد تو کرتا رہتا

حنا کرن ——— پتوکی

زندگی تھک کے گرتی ہے تو خیال آتا ہے
جان لیوا ہے لاحاصل تمناؤں کی کوشش

سیمی ظفر، فرحین ظفر ——— کراچی

نشانیاں اپنے گھر کی کیا بتاؤں تجھے
جہاں ویرانیاں دیکھو چلے آنا

عائشہ ——— گوجرہ

چاہت اتنی مختصر جاناں
تو پھر یادیں بے شمار کیوں

ناہید راشد ——— کراچی

تم محبت خرید لائے ہو
گھر میں پہلے عذاب کم تھا کیا

یاسمین نازش ——— چکوال

اس شخص سے فقط اتنا سا تعلق ہے فراز
وہ پریشان ہو تو ہمیں نیند نہیں آتی

ردا راجپوت ——— بھائی پھیرو

مل رہا ہے نہ کھو رہا ہے تو
کتنا دلچسپ ہو رہا ہے تو

رانی ——— شور کوٹ

میں ریزہ ریزہ تو ہوتا ہوں ہر شکست کے بعد
مگر نڈھال بہت دیر تک نہیں رہتا
جواب مل ہی تو جاتا ہے ایک چپ ہی سہی ہو
کوئی سوال بہت دیر تک نہیں رہتا

رُباب سرفراز ——— پھول نگر

کتنا رویا تھا میں تیری خاطر
اب جو سوچوں تو ہنسی آتی ہے

نوشین اقبال نوتی ——— گاؤں بدو مرجان

ملے گا تو روئے گا اب بھی وہ لگ کے سینے سے
کہ اپنے حال کا ماضی سے فاصلہ نہ رہے
اُتار کر تجھے دل میں، میں پھوڑ لوں آنکھیں
پلٹ کر جا بھی سکے تو وہ راستہ نہ رہے

کرن، بینش ——— کراچی

تم کو کیا خبر جاناں ہم اُداس لوگوں پر
شام کے سبھی منظر اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں

حمنہ حبیب ——— عبدالحکیم

حُسن سے تکمیلِ عشق، عشق سے تکمیلِ حُسن
اک کمی تیرے بغیر، اک کمی میرے بغیر

امامہ جٹ ——— عبدالحکیم

تسکینِ دل کے واسطے وعدہ تو کیجیے
ہم جانتے ہیں آپ سے آیا نہ جائے گا

زینب احسن ——— منصور آباد

کتنا مشکل ہے محبت کی کہانی لکھنا
بہتے پانی پہ پانی سے پانی لکھنا

روبینہ شریف

## کدھر ہے

کچھ مولوی سفر پر جا رہے تھے۔ بس میں بیٹھنے سے پہلے سب مولویوں نے مشورہ کیا کہ راستے میں جہاں بھی لڑکی نظر آئی تو استغفراللہ کہیں گے۔

کافی دیر ہوگئی کوئی لڑکی نظر نہ آئی اچانک ایک مولوی نے کہا۔ "استغفراللہ" باقی سب بولے۔

"کدھر کدھر کدھر کدھر۔"

نشانورین۔۔۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

## ڈرم

ایک صاحب نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔

"مجھے باورچی نے بتایا ہے کہ کل رات تم بری طرح نشے میں چور تھیں اور ڈرم سے لپٹ کر عشقیہ گانے گا رہی تھیں۔"

"میں معافی چاہتی ہوں سر۔" سیکریٹری نے کہا۔

"میں تمہیں ایک شرط پر معاف کر سکتا ہوں کہ آئندہ تم ڈرم سے لپٹ کر نہیں گاؤ گی۔"

"تو پھر آپ کو بھی وعدہ کرنا ہوگا جناب کہ شراب پی کر آپ بھی ڈرم میں گھس کر نہیں سوئیں گے۔"

غزل ناز۔۔۔ ملتان

## بے چاری

ایک لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ اتنے میں اس کا شوہر آیا اور بوائے فرینڈ کو مارنے لگا۔

لڑکی: "مار کمینے کو۔۔۔ دوسروں کی بیوی کو گھمانے لے آتا ہے۔"

اتنے میں بوائے فرینڈ کو جوش آیا اور وہ شوہر کو مارنے لگا۔

لڑکی: "مار سالے کو مار۔۔۔ نہ خود گھمانے لے جاتا ہے اور نہ کسی اور کو گھمانے دیتا ہے۔"

ثمینہ اکرم۔۔۔ لیاری

## وہم

علاقے کے بازار میں ایک خاتون نے اپنے سابق پڑوسی کی دس بارہ سالہ بچی کو سودا خریدتے دیکھا تو شفقت سے اس کا حال چال پوچھنے کے بعد دریافت کیا۔

"اور تمہارے امی ابو کیسے ہیں؟"

"امی تو ٹھیک ہیں، لیکن ابو بیمار ہیں۔" بچی نے جواب دیا۔

"ارے بیٹا وہ بیمار ویمار کچھ نہیں ہیں انہیں وہم ہوگیا ہوگا کہ وہ بیمار ہیں۔" خاتون نے بڑے یقین سے کہا۔

کچھ عرصے بعد اسی بازار میں خاتون کی ملاقات بچی سے ہوئی تو انہوں نے ایک بار پھر اس کے والدین کی خیریت دریافت کی۔

"امی تو ٹھیک ہیں۔" بچی نے دھیمی آواز میں سنجیدگی سے جواب دیا۔

"لیکن ابو کو وہم ہوگیا تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ کل ان کا چالیسواں تھا۔"

ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

## ڈراپ سین

چچا چکرم کی وجہ سے کمال اور ان کی اہلیہ کی ازدواجی زندگی ہمیشہ الجھنوں اور بدمزگی کا شکار رہی۔ چچا ہربات میں ٹانگ اڑاتے، مہمانوں کے سامنے بدتمیزیاں کرتے، برے حلیے میں رہتے اور کھانے کی میز پر سب سے پہلے پہنچتے۔ ان کی فرمائشوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ ان کی وجہ سے کئی بار میاں بیوی میں طلاق ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کافی بوڑھے ہونے کے بعد آخر کار چچا کو ڈبل نمونیا ہوگیا اور وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔ سوئم ہوچکا تو کمال نے گہری سی سانس لے کر بیوی سے کہا۔

"اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں بیس سال تک تمہارے چچا کو اس گھر میں ہرگز برداشت نہیں کرتا۔"

"میرے چچا۔" بیوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"خدا کی پناہ میں تو آج تک یہی سمجھتی آئی کہ وہ آپ کے چچا ہیں۔"

فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ گجرات

## جانور

بیمار شوہر: "مجھے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

بیوی نے (حیرت سے) "وہ کیوں؟"

شوہر: "روز صبح مرغے کی طرح اٹھ جاتا ہوں۔ پھر گھوڑے کی طرح بھاگ کر آفس جاتا ہوں۔ وہاں سارا دن گدھے کی طرح کام کرتا ہوں۔ گھر آکر تمہارے سامنے طوطے کی طرح "ہاں جی" "ہاں جی" کرتا ہوں۔ بکرے کی طرح کھانے میں سبزی ملتی ہے۔ بلی کی طرح بچے سنبھالتا ہوں۔ اور پھر رات کو بھینس کے ساتھ سو جاتا ہوں۔ میرے اندر کون سی انسانوں والی بات ہے۔"

ثمینہ۔۔۔ کراچی

## چوری

لڑکا: "جان تم اب بدل گئی ہو۔"

لڑکی: "وہ کیسے؟"

لڑکا: "اب تمہارا ہاتھ پکڑتا ہوں تو تم شرماتی نہیں ہو۔"

لڑکی: "پچھلی بار شرما کے آنکھیں بند کی تو پرس سے دو سو روپے غائب تھے چور کہیں کے۔"

یاسمین ملک۔۔۔ کراچی

## دیوار

میاں بیوی میں لڑائی چل رہی تھی۔ بیوی نے شوہر سے کہا۔

"اگر میں تمہارے رستے کی دیوار ہوں تو اسے گرا کیوں نہیں دیتے۔"

شوہر بولا۔ "جی تو بہت چاہتا ہے، مگر دوسری دیوار بنانے میں خرچہ بہت آئے گا۔ بس یہ سوچ کر رک جاتا ہوں۔"

ثمینہ شاہین۔۔۔ بہاول نگر

## جھوٹ

شوہر نے بیوی سے کہا۔

"یوں تو تم بہت اچھی ہو۔ لاکھوں میں ایک ہو، مگر تمہارے اندر ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ کبھی کبھی تم جھوٹ بولنے لگتی ہو۔"

بیوی نے منہ بنا کر کہا۔ "کیا کروں سہیلیوں کے سامنے آپ کی تعریف تو کرنی ہی پڑتی ہے نا۔"

ریحانہ یاسمین۔۔۔ شورکوٹ

## قابل دید

"یہ ریوالور کی نال، جو تمہاری پسلیوں میں چبھ رہی ہے، کیا تم اس کا مطلب سمجھتی ہو؟" ڈاکو نے غرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اوہ میرے خدا!" ڈاکا زنی کی شکار عورت نے خوشی سے چیخ کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں اپنا وزن کرنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔"

مہوش کامران۔۔۔ اٹک

## گوشت

آدمی نے ہرن کا شکار کیا اور بڑی محنت سے اس کا گوشت تیار کیا۔ ٹیبل پر گوشت رکھتے ہوئے اس نے اپنے بچوں سے کہا۔

"تم لوگ بوجھو کہ یہ گوشت کس جانور کا ہے؟"

بچے کافی دیر سوچتے رہے آخر یہ گوشت کس جانور کا ہے۔

اس آدمی نے بچوں کو کہا۔ "چلو میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ یہ گوشت اس جانور کا ہے، جو تمہاری ماں مجھے پیار سے بولتی ہے۔"

اچانک ایک بچی چلایا۔ "ارے مت کھانا یہ گوشت گدھے کا ہے۔"

نایاب عقیل۔۔۔ جہلم

## محبت

ایک صاحب دفتر سے گھر لوٹے تو اپنی نوجوان ملازمہ سے بولے۔

"جاؤ گلی کے کونے پر تمہارا بوائے فرینڈ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

ملازمہ نے چونک کر پوچھا۔ "مگر صاحب! آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ میرا بوائے فرینڈ ہے؟"

"اس نے وہی ٹائی لگا رکھی ہے جو کچھ دن پہلے گھر سے غائب ہوگئی تھی۔" صاحب اطمینان سے بولے۔

شاہدہ عامر۔۔۔ کراچی

## سکون

ایک خاتون نے ٹریول ایجنٹ کو ٹیلی فون کیا۔

"اس سال ہمیں چھٹیاں گزارنے کے لیے کسی دور دراز جگہ پر جانا ہے۔ ہمیں سکون کی تلاش ہے۔ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں شہر کے ہنگامے، شور شرابے، ٹریفک، موبائل، کیبل نشریات وغیرہ کچھ نہ ہو۔"

"ہاں۔۔۔!" خاتون نے مزید معلومات دیں۔ "بس ایک خیال رکھنا کوئی اور بڑا جدید قسم کا شاپنگ پلازہ ضرور قریب ہونا چاہیے۔"

نسرین بشیر۔۔۔ لاہور

## معصومیت

ایک معصوم شخص سے ایک پولیس والے نے پوچھا کہ۔

"تم نے یہاں سے کسی چور کو بھاگتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟"

اس نے کہا۔

"یہاں سامنے تین بازار ہیں، پہلا اور دوسرا بازار چھوڑ کر تیسرے میں داخل ہو جائیں تو اس بازار میں تین گلیاں ہیں پہلی اور دوسری گلی چھوڑ کر دیں اور تیسری میں داخل ہو جائیں اس گلی میں تین گھر ہیں۔ پہلا اور دوسرا چھوڑ کر تیسرے میں داخل ہو جائیں، اس گھر میں تین کمرے ہیں۔ پہلا اور دوسرا کمرا چھوڑ دیں اور تیسرے کمرے میں داخل ہو جائیں۔ اس کمرے میں تین الماری ہیں۔ پہلی اور دوسری الماری چھوڑ کر تیسری کھولیں اور اس الماری میں تین دراز ہیں۔ پہلی اور دوسری دراز چھوڑ کر جب تیسری دراز کو کھولیں گے تو آپ کو اس کے اندر ایک تصویر نظر آئے گی وہ میری ماں کی تصویر ہے اس ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

کشور منیر۔۔۔ کراچی

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔
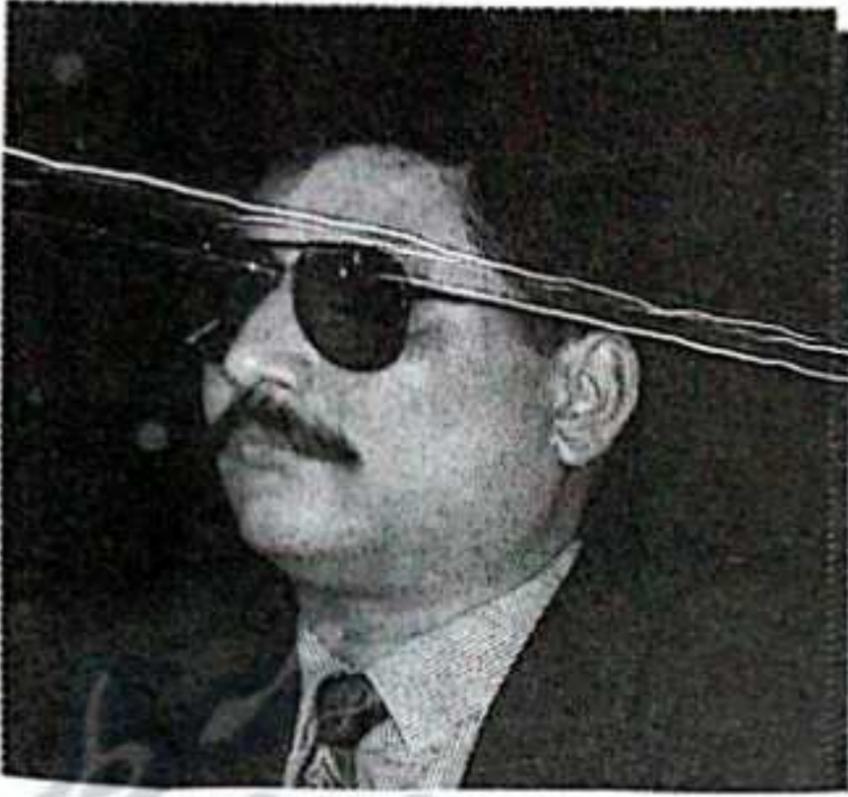
آر' رانا بوبی..... سیالکوٹ

س نین بھیا! یہ راحیل رانا بوبی کون ہے؟ اور تم مجھ کو وہ کیوں سمجھتے ہو جو کہ میں نہیں ہوں؟

ج لیجئے قارئین ' پھر آگئے محترم ' محترمہ بن کر ' پھر پوچھتے ہیں کہ میں ان کو محترم کیوں سمجھتا ہوں۔ منے بوبی! تمہاری تصویر ہمیں تمہارے شہر سے ایک بہن نے بھیج دی تھی۔ ہم سمجھے تھے کہ تم خوش ہو گے مگر وہ ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔

طیبہ کنول ڈار..... جہلم

س بھیا! ساس پہلے تو اپنی بہو کو بڑے شوق سے بیاہ کر لاتی ہے پھر اس کے ساتھ جھگڑا کیوں کرتی ہے؟ جواب ضرور دیجیے گا۔

ج مستقبل میں ساس بننے کی ٹریننگ دیتی ہے ' سمجھیں۔

س گھونگھٹ اٹھاتے وقت دلہن چانٹا مار دے تو؟

ج تو یہ طے پایا کہ ساس سے پرانی دشمنی ہے۔

نوڈار..... گوجرانوالہ

س ۔ بھیا جی! انسان کر ' چیز کو اپنائے تو وہ عظیم بنتا ہے؟

ج ۔ انسانیت کو۔

س ۔ قرنی بھیا! انسان کی عظمت کس چیز میں پوشیدہ ہے؟

ج ۔ اس کی نیک نیتی میں۔

صائمہ شمس..... رینالہ خورد

س ۔ بھیا! آپ اپنی شادی پر اس محفل کی بہنوں کو (یعنی ہم کو) کیا تحفہ دیں گے؟

ج ۔ محفل چھوڑنے کا مشورہ۔ اس سے بہتر تحفہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

عینی طفیل..... کراچی

س ۔ آپ بہت ہی اداس ہوں۔ ایسے میں آپ کو نہلے پہ دہلا مارنا پڑ جائے تو کیا آپ مار سکیں گے یا منہ پر بارہ بجا کر سوالات کی فائل ایڈیٹر کی میز پر رکھ کر یہ جا وہ جا؟

ج ۔ جیسے تیسے کر کے نہلے پہ دہلا مارنے کی کوشش کر ہی رہے ہیں۔

خورشید جمال..... کراچی

س ۔ قرنی جان! جاتے جاتے بزم کا سارا حسن بھی لے گئے۔ آخر کیوں؟

ج ۔ واپس تو آگیا لیکن بزم کا حسن آتے آتے شاید دیر لگ جائے۔

## اس ماہ کا خط

### آسیہ ارم۔۔۔ ملیر

اس مہینے کا کرن 14 کو ملا۔ سب سے پہلے حمد پڑھی' کیا بات ہے امجد اسلام امجد کی نعت رسولﷺ سے گزر کر "اداریہ" پڑھا جو میں ضرور پڑھتی ہوں۔ اب کی دفعہ اداریہ میں بہت سی باتوں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا' اب کی دفعہ اداریہ اے ون تھا۔ زاہد افتخار سے ملاقات اچھی تھی۔ زاہد افتخار اچھی پرسنلٹی کے مالک ہیں۔ میری بھی سننے میں شاہین صاحبہ نے اس دفعہ منشا یاشا سے ملاقات کروائی' اچھا لگا۔ "آواز کی دنیا" میں مظہر قریشی کو پڑھا' ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ نے اداس' رنجیدہ بھی کیا' اتنا مفصل انٹرویو تھا' پڑھ کر مزہ آیا۔

"مقابل ہے آئینہ" میں شفق راجپوت کو پڑھا اچھا لگا' اللہ پر یقین ہر مسلمان کی اولین صفت ہونی چاہیے' اچھا لگا شفق آپ کو جان کر۔ اب آتے ہیں سلسلے وار ناول کی طرف تنزیلہ کا راپنزل اچھا جارہا ہے مگر تنزیلہ آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ نینا اپنے باپ سے متنفر کیوں ہے اور کاشف کو پلیز ایسے بغیر سزا نہ چھوڑیے گا اور پلیز تنزیلہ اسٹوری کو ذرا آگے بڑھائیں' اس دفعہ آپ نے راپنزل کو دونوں طرف یعنی نینا کی طرف بھی موڑا ہے اور شہرین کی طرف بھی' اب دیکھتے ہیں کہ اصل راپنزل کہاں سے نکلتی ہے۔ "شاید" بہت زبردست جارہا ہے مگر جیسے ہی ناولٹ شروع کیا دل دھک سے رہ گیا یہ کیا تین سال آگے آگئے' اب فکر لگی کہ تحریر کی سب سے دلچسپ ہستی کو صفحہ ہستی سے نہ مٹا دیا ہو۔ جی ہاں دادا جان جو اس تحریر کی جان ہیں جلدی جلدی پڑھا تو سکون ملا کہ نہیں بھئی دادا جان زندہ ہیں۔ فائزہ پلیز اب سالار کی گتھی سلجھادی کہ وہ ایسا کیوں ہے کہ اپنے باپ اور ماں کے لیے اتنے نازیبا الفاظ استعمال کرتا رہا ہے اور آپ سے گلہ ہے کہ ام ہانی اور سالار کی شادی کے فوراً" بعد کچھ تو رومانس دکھاتیں' یہ کیا کہ فوراً" ہی سالار کی خود پسندی دکھادی اور کہاں گئی۔ سالار کی وہ محبت جو وہ ام ہانی کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر یہ ایک دلچسپ تحریر ہے۔

نبیلہ ابر راجہ کا "میں گمان نہیں یقین ہوں" کا آخر کار دی اینڈ ہوگیا۔ اچھی تھی پڑھ کر بس بوریت نہیں ہوئی تھی۔ پلیز اب کوئی زبردست سی تحریر لکھوائیں جسے ہمیں پڑھ کر سب کو کرن کا انتظار بڑھ جائے۔ "ردائے وفا" پڑھا مجھے تو نائلہ کا کردار بالکل بھی پسند نہیں اور اس قسط میں تو بالکل بھی اچھا نہیں لگا' نہ تو اپنے رب سے معافی' نہ بندے سے' تو پلیز نائلہ کو اس طرح معافی نہیں ملنی چاہیے اور اس تحریر میں فرحین نے بہت زیادہ ٹریجڈی دکھائی ہے' پڑھ کر دماغ ریلیکس ہونے کے بجائے مزید الجھ جاتا ہے' اس لیے اس ناول کو میں آخر میں پڑھتی ہوں۔

سمیرا غزل صدیقی کی چھوٹی سی تحریر "روشن لمحہ" نے بڑے سبق چھپائے ہوئے تھے' کبھی کبھی چھوٹی بات دل پر اثر کر جاتی ہے جو بڑی نہ کرواسکے۔ اللہ ہماری بھی اسی طرح اصلاح فرمائے جیسے رشید کی ہوئی۔ (آمین) بعض دفعہ ہمیں مکمل ناول وہ نہیں سمجھا پاتے جو چھوٹے افسانے سکھا جاتے ہیں۔ جیسے عابدہ احمد کا "برف کے آدمی" عابدہ جی آپ نے تو سیدھا دل پر ہاتھ مارا ہے۔ سچ عابدہ بہت اچھے طریقے سے آپ نے اس تحریر میں ہمارے لیے سوچ کے روزن کھولے ہیں' شکریہ آپ کا۔ ام ایمان قاضی کی کاوش "زندگی مسکرانے لگی" بہت اچھی تحریر تھی مگر بہت سی جگہ جھول تھا۔ جیسا نو یہ کو دکھایا تھا تو یہ بات ناقابل ہضم ہے کہ اس کے باپ کے بھیجے پیسوں سے کوئی اتنے آرام سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور پھر نہ تو باپ کو

پتا چلتا ہے۔ کبھی نہ چچا' تایا کو۔ سوری اتنے اچھے طریقے سے شروع کرنے کے بعد (اسٹوری کو) آپ نے مزہ کرکرا کردیا۔
"تیرے نصیب کی بارشیں" آسیہ عارف نے معاشرے میں پنپتی خود غرضی کی طرف توجہ دلائی ہے' صحیح ہے کہ آج ہر رشتے میں مفاد پرستی شامل ہوگئی ہے۔ والدین کی محبت بھی اس خون آشام بلا کی نظر ہورہی ہے۔ ویل ڈن آسیہ اچھی تحریر تھی۔
عنبرین ولی کا "دامن دل" پڑھا اور بہت ہی دیر تک یقین ہی نہیں آیا کہ کوئی اتنا سفاک' بے رحم' سنگ دل' وحشی بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی ایک اولاد کا گلہ گھونٹا' دوسری کو زندہ جلایا۔ (یعنی بیوی کو) اور پھر بھی کسی طرح کا کوئی ملال نہیں' یا اللہ! بہت دیر تک دل کو قابو کرنے میں لگایا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو بہت بھیانک ہے۔ اف.... ابھی تک رونگٹے کھڑے ہیں۔ خیر ایک اچھی اور ڈیفرنٹ تحریر تھی۔ عنبرین! اس دفعہ کے ہر افسانے نے اک الگ طرح سے ہی متاثر کیا' جیسے شازیہ ستار کا "خواب زندہ ہیں" بہت اچھے۔ شازیہ سمجھ نہیں آرہا کہ کس افسانے کو نمبر ایک دینا چاہیے۔ آپ نے ٹھیک لکھا کہ ہم سب اپنی اپنی فیلڈ میں رہتے ہوئے بھی اپنے وطن کی خدمت احسن طریقے سے کرسکتے ہیں۔ بس کچھ کرنے کی لگن ہونا چاہیے۔
عائشہ جمیل کا "فیصلہ" بہت مزہ آیا پڑھ کر خاص کر گلوں کی اماں اور گلوں کے ابا کے القابات سن کر لطف آیا واہ بھئی۔ اچھی سیرت اور نیک شریف بیٹیاں ماں باپ کا مان و فخر ہوتی ہیں۔ اللہ یہ فخر و مان سب کو نوازے۔ (آمین) مریم ماہ منیر کا "تم ہی میرا حوصلہ ہو" پڑھا۔ مریم منیر آپ نے اپنی کہانی کو شروع تو اچھے طریقے سے کیا۔ اچانک روشن سے عفت کا نکاح سامنے آیا۔ کہانی میں بہت جھول ہے۔ سلسلے کرن کے سب بہت پسند آئے۔
ج۔ پیاری آسیہ "کرن" پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کا تبصرہ اچھا لگا کہ آپ نے ہر تحریر کو بہت توجہ سے پڑھا۔ آپ ہر ماہ تبصرہ کیا کریں' شکریہ۔

## ثناء شہزاد... کراچی

نومبر کا شمارہ حسب معمول 12 تاریخ کو ملا۔ کرن بہت انتظار کرواتا ہے۔ سرورق اچھا لگا۔ ماڈل کا ڈریس پسند آیا۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور اپنے وطن کی سلامتی کے لیے سچے دل کی دعا کی۔ حمد و نعت سے روح کو تازہ کیا۔ انٹرویو پہ سرسری نظر ڈال کر "مقابل ہے آئینہ" پر پہنچے' مجھے لگا تھا اس بار میں موجود ہوں مگر وہاں شفق راجپوت براجمان تھیں۔ ان کے جواب اچھے لگے۔ افسانے پانچوں زبردست تھے۔ چھوٹے سے افسانے میں بہت بڑا سبق چھپا ہوتا ہے۔ ناولٹ اس بار زیادہ پسند نہیں آئے۔ "تم ہی میرا حوالہ" میں روشن کا عفت سے نکاح کب ہوا پتا ہی نہیں چلا۔ "زندگی مسکرانے لگی" میں نوبیہ پر اسید کے سمجھانے کا اثر نہیں ہوا' جب ٹھوکر لگی جب ہی اسے سمجھ آیا کہ دوسروں کے ساتھ غلط کرتے کرتے کبھی ہمارے اپنے ساتھ بھی غلط ہوجاتا ہے۔ "شاید" میں فائزہ افتخار تو ہمیں ایسا گم کردیتی ہیں کہ ہمیں اردگرد کا ہوش ہی نہیں رہتا' سعد' ثانیہ سے ہی شادی کرے کیونکہ وہ اس سے محبت کررہی ہے۔ بس یہی دعا ہے کہ سالار کو عقل آجائے' وہ ہانی کے ساتھ صحیح ہوجائے اور آپ مہ پارہ پھپھو کے لیے کوئی ہیرو لے آئیں میرے دل میں آرہا ہے کے مہ پارہ کی جوڑی ثانیہ کے پاپا سے بن جائے۔ اس پر غور کیجیے گا' باقی آپ خود بہتر سمجھتی ہیں۔
"میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابر راجہ نے اینڈ اتنی جلدی کیوں کردیا' تھوڑا سا اور لکھ دیتیں نا۔ بیسٹ ناول تھا۔ ہر ماہ اس کا انتظار رہتا تھا۔ آپ کو بہت مبارک ہو' اتنا اچھا ناول لکھنے پر اور پلیز اب غائب مت ہوجایئے گا۔ مجھے آپ کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ "دامن دل" عنبرین ولی نے بھی بہت ہی اچھا لکھا' اس کو پڑھ کر سوچنے لگی کے کیا کوئی باپ اتنا سفاک بھی ہوسکتا ہے۔ جس نے اپنے ہاتھوں پہلے اپنی بچی کو مارا' پھر بعد میں اپنی بیوی کو بھی جلا کر مار دیا۔ سیماب' صولت' ماہی' ماموں کی ماہی کے لیے محبت دیکھ کر رشک آیا۔ شاہ دل کا رویہ ماہی کے ساتھ شادی والی رات بہت برا لگا مگر پھر بھی ماہی نے اسے معاف کردیا یہ اچھا لگا۔ ناول ہر لحاظ سے پرفیکٹ تھا۔ "ردائے وفا" میں ماہا کو ولید کو اپنا بیٹا مان لینا چاہیے' وہ تو معصوم ہے' حبیب کی محبت میں ولید کو قبول کرنا برا سودا نہیں ہے' جہاں محبت ہوتی ہے وہاں محبوب کی ہر غلطی معاف کردی جاتی ہے۔ "راپنزل" بہت ہی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

کاشف کتنا چالاک ہے' دو عورتوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ "یادوں کے دریچے" میں آپ بہنوں کے پاس اگر یہ غزل ہو تو بھیج دیجیے۔ "تم کیسی محبت کرتے ہو"۔

ج۔ ثناء! آپ ہماری مستقل قاری ہیں' ہمیں ہر ماہ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کرتی ہیں' اس کے لیے بے حد شکریہ۔ آپ نے جو غزل کی فرمائش کی ہے اس کو پورا کرنے کی ہم بھرپور کوشش کریں گے۔

## قرۃ العین کمبوہ۔۔۔ راجہ رام

زندگی میں پہلی بار قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے تو وجہ ہیں صرف "فرحانہ ناز ملک" آہ۔۔۔ ایک سال گزر گیا' ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے۔ اتنے سال سے کرن پڑھتی ہوں مگر ان کی ڈیتھ کے بعد میں نے کرن ڈائجسٹ منگوانا ہی چھوڑ دیا' ایک سال ایک ماہ گزر گیا' حالانکہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی ماہ کوئی رسالہ نہ آیا ہو۔ مجھے بہت دکھ ہوگا جب میں ان کا "شام آرزو" نہیں دیکھوں گی۔ اس حادثے کا غم ابھی تک دلوں پہ اول روز کی طرح تازہ ہے۔ امید ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی رسالہ زبردست آتا ہوگا۔ خدا کرے یہ ادارہ ایسے ہی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین)

ج۔ قرۃ العین! آپ نے صحیح کہا' دن' سال' مہینے اتنی ہی تیزی سے گزر رہے ہیں اور ہم جن سے محبت کرتے ہیں اور جنہیں پسند کرتے ہیں ان کو تو ہم بھول ہی نہیں پاتے لیکن ہمیں آپ سے ایک شکایت ہے کہ آپ نے کرن کو پڑھنا کیوں چھوڑ دیا' بے شک فرحانہ ناز ملک آج ہمارے درمیان میں نہیں ہیں لیکن بہت سی رائٹرز آپ کی توجہ کی منتظر ہیں' ہر رائٹر کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

## ستارہ امین کومل۔۔۔ پیر محل

2015ء کا یہ میرا لاسٹ تبصرہ ہے۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔ تو جناب من کرن آپ کے محنتی ہاتھوں سے سج سنور کر ہمارے سامنے ہے۔ سرورق مجھے کسی کی یاد دلا گیا۔ تنزیلہ ریاض ماشاء اللہ بہت خوب لکھ رہی ہیں۔ ہماری فرحین اظفر نے ہمیں خاصا خوش کیا شبو کو اندر کرا کے۔ نبیلہ ابر راجہ کو بہت سا پیار' ڈھیروں دعائیں' اختتام زبردست تھا۔ لوٹ کے رنم فراز کے پاس ہی آگئی۔ عنبرین ولی نے بھی بہت اچھا ناول لکھا' شاباش۔۔۔ فائزہ افتخار کے "شاید" کے کیا کہنے۔ سورج کو چراغ دکھانا ممکن نہیں۔ مریم ماہ منیر سے بہت عرصے بعد سلام دعا ہوئی۔ ام ایمان ویری گڈ' عائشہ جمیل نے ہلکے پھلکے انداز میں خوب لکھا' واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ گلوں کے ابا گلوں کی اماں اور ان کا گلدستہ۔۔۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں' ایک گل ہمارے گھر بھی ہے۔ آسیہ عارف نے بھی بہت اچھا لکھا ہے' ہائے کیسی ماں تھی کنزی کی۔ عابدہ احمد' اچھا لکھ رہی ہیں۔ سمیرا غزل بہت خوب۔ ہماری تمام سسٹرز بہت اچھے اچھے موتی چن چن کر لاتی ہیں۔ ان کے ذوق کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ "کرن کرن خوشبو" کی خوشبو چار سو پھیلی ہوئی ہے۔ "یادوں کے دریچے" سے بھی اچھی خاصی زبردستی تانکا جھانکی ہو جائے ہے۔ مجال ہے میں نے کبھی کرن کے دسترخوان سے کچھ چکھا ہو۔

ج۔ ستارہ امین کومل آپ کا بہت شکریہ کہ آپ کرن پڑھتی ہیں اور باقاعدگی سے اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کرتی ہیں۔

## رضوانہ ملک۔۔۔ جلال پور پیروالا

نومبر کا شمارہ 12 کو ملا۔ ٹائٹل بس سو سو لگا۔ "حمد و نعت" سے دل کو معطر کرتے ہوئے آگے بڑھے تو "زاہد افتخار احمد" سے ملاقات کی۔ وہ اپنی تینوں پکچرز میں ڈیفرنٹ لگ رہے تھے۔ ایک میں سوبر' تو دوسری میں شرارتی اور تیسری میں تو بالکل معصوم۔ "میری بھی سنیے" میں منشا پاشا اور "آواز کی دنیا" سے مظہر قریشی سے ملاقات اچھی رہی۔ شاہین رشید سے ریکوئسٹ ہے کہ وہ اپنا بھی انٹرویو دیں اور پلیز عمران عباس کا بھی انٹرویو شائع کریں۔ "مقابل ہے آئینہ" میں شفق راجپوت اچھی لگیں۔ "راپنزل" میں حبیبہ تو پوری طرح کاشف کو چمٹ گئی ہے۔ حبیبہ بہت ہی سیلفش قسم کی ہے کہ اسے تو اپنے شوہر کا ذرا بھی افسوس نہیں ہے اور کاشف نے بھی اپنی بیوی کو بے وقوف بنایا ہوا ہے کہ اس کا حبیبہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سمیع اور شہرین کا اچھا کپل ہے اور شہرین کی ہلکی پھلکی سرگرمیاں اچھی لگ رہی ہیں۔ "راپنزل" کے بارے میں سسپنس ہے کہ کون ہے راپنزل۔ "ردائے وفا" میں تھینکس گاڈ کہ حسیب کو ہوش آگیا ہے اور وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ نائلہ اور حدید کی جوڑی بھی سیٹ ہوگئی ہے۔ شبیر حسین ابھی تو جیل میں ہے' وہاں سے رہا ہونے کے بعد پتا نہیں وہ نائلہ کے ساتھ کیا کرتا

ہے۔ معراج تو اپنی بیوی سے بات کرتا ہے لیکن اس کی ماں سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا' کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ عورت ہی عورت کا گھر تباہ کرتی ہے' اگر عورتیں آپس میں سیٹ ہو جائیں تو کسی کے گھر میں لڑائی نہ ہو۔ حبیب کے بیٹے پر ترس آتا ہے کہ اس کا کیا قصور ہے کہ وہ بے چارہ تماشا رہا ہے۔ نبیلہ ابر راجہ کا ناول "میں گمان نہیں یقین ہوں" کا اچھا اینڈ ہوا ہے۔ ایک اور زیان کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور رنم کو بھی اس کا آئیڈیل مل گیا۔

فائزہ افتخار کا ناول "شاید" بھی اچھا جا رہا ہے لیکن اس میں سالار کی سمجھ نہیں آتی کہ وہ ایسا کیوں بی ہیو کر رہا ہے' ہانی سے لو میرج کر کے اسے کس بات کی سزا دے رہا ہے۔ اسے کیوں گھر میں قید کر کے رکھا ہوا ہے اور ہانی کو بھی سالار کے بارے میں اپنے چچا رضوان اور نائلہ کو بتانا چاہیے تھا۔ سعد کا ہانی سے سچا پیار ہے' وہ اسے اب تک نہیں بھول پایا' ہانی ویسے سعد کو ملنی چاہیے تھی۔ عنبرین ولی کا "دامن دل" بیسٹ ناول تھا۔ عالی شان' سیماب' صولت' ماہی اس کے ماموں' ممانی سارے بہت اچھے تھے۔ ماہی اور شاہ ول کا اچھا کپل تھا۔ شاہ نواز جیسے لالچی لوگ بھی ہوتے ہیں' جو جائیداد کی خاطر اپنی بیوی اور بیٹی تک کو مار دیتے ہیں۔ "زندگی مسکرانے لگی" بھی اچھا ناولٹ تھا۔ نوبیہ گھریلو سیاستوں میں تو ماہر تھی لیکن اپنی چیزیں اتنی آسانی سے کاشان اور باقی لوگوں کو دے دیتی تھی' اسید بہت سمجھ دار تھا کہ اس نے ان حالات میں اپنی تعلیم بھی مکمل کی' جاب بھی کی اور اپنا گھر بھی بنایا' نوبیہ اور اسید کی اچھی جوڑی تھی۔ مریم ماہ منیر کا ناولٹ بھی اچھا تھا' اس میں روشن اور عفت دونوں نے اچھے طریقے سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ "میرے نصیب کی بارش" میں کیسی ماں تھی' جو پیسوں کی خاطر اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن کنزی کے والد نے اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے اچھا قدم اٹھایا تھا۔ شازیہ ستار نایاب کا بیسٹ افسانہ تھا۔ عریشہ اور عمران کا "مرکز یقین" بہت اچھا لگا۔ عائشہ جمیل کا بھی اچھا افسانہ تھا۔ گل کا اچھا فیصلہ تھا کہ اس نے اپنے ماں باپ کا مان رکھا اور اپنی دوسری بہنوں کے بارے میں سوچا۔ عابدہ احمد اور سمیرا غزل کے افسانے بھی اچھے تھے۔ کرن کتاب بھی ہمیشہ کی طرح بیسٹ تھی اور باقی سارے سلسلے بھی اچھے تھے۔ رابعہ عمران چوہدری تھینکس کہ آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا۔ آپ بھی اسی طرح تبصرہ کرتی رہنا اور غائب نہ ہو جانا۔

ج رضوانہ ملک! آپ کا کرن پر تبصرہ کا بہت شکریہ۔

**طاہرہ ملک۔۔۔ جلال پور پیر والا**

کرن ہمیشہ کی طرح 12 اکتوبر کو ہمارے ہاتھوں میں سمایا۔ ٹائٹل گرل سے نظریں چراتے ہوئے سیدھے پہنچے

"نامے میرے نام" میں جہاں ہمیشہ کی طرح اپنے خط کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ مدیرہ جی آپ کو میرا خط پسند آیا' بہت بہت شکریہ۔

حمد و نعت ہمیشہ کی طرح پسند آئی۔ زاہد افتخار' منشاء پاشا اور مظہر قریشی کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ "مقابل ہے آئینہ" میں شفق راجپوت سے مل کر بہت اچھا لگا۔

"راپنزل" تنزیلہ ریاض کی قسط ہمیشہ کی طرح لاجواب تھی۔ صوفیہ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اس کے ساتھ کچھ برا نہ ہو۔ "خواب زندہ ہیں" شازیہ ستار نایاب نے کرکٹ کے شوق کے بارے میں زبردست افسانہ لکھا۔ وقار پہ افسوس ہوا کہ اتنے جنون کے باوجود اس کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ "زندگی مسکرانے لگی" اسید نے نویہ کی قسمت بالآخر سنوار ہی لی' اسید کے بارے میں یہ جان کر اچھا لگا کہ اس نے اپنی محرومی کو خود پہ سوار نہیں کیا بلکہ اعلا تعلیم حاصل کرکے اپنی زندگی سنوار لی۔ نویہ ویسے تو چالاک تھی لیکن اپنی ممانیوں کو نہیں سمجھ سکی' اپنی دولت ان پہ لٹاتی رہی۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابر جی ویل ڈن! کیا ناول لکھا آپ نے' ایک اور زیان کے ملاپ کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ رنم جیسی لڑکیاں ایڈونچر کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ مستقل مزاجی نہیں ہوتی ان میں اور ایک کے ساتھ ویسے بھی زیان سوٹ کرتی ہے۔ "فیصلہ" عائشہ جمیل کے افسانے میں ان لوگوں کے لیے بہت اچھا سبق تھا جو سمجھتے ہیں کہ تعلیم انسان کو بگاڑ دیتی ہے' بلکہ یہ تعلیم ہی تو ہے جو صحیح غلط میں تمیز کا فرق سکھاتی ہے۔

"برف کے آدمی" جب یہ پڑھتے ہیں کہ لوگوں نے دین کو بھی کاروبار سمجھ لیا ہے تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ خاتون بی بی اپنی شہرت میں مگن رہیں اور اپنے اکلوتے بیٹے کا خیال نہ رکھ سکی لیکن مدثر کی قسمت اچھی تھی جو وہ جلدی ہی سدھر گیا' دنیا کے ساتھ آخرت سنوارنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں سما گیا۔

"ردائے وفا" میں حسیب بالآخر کومے سے باہر آگیا' اب شاید ان کی ازدواجی زندگی میں حسیب کے بیٹے اور اس کی ماں کی وجہ سے کوئی پرابلم نہ آجائے' نائلہ بالآخر سدھر ہی گئی۔ پلان تو اچھا تھا لیکن دیکھتے ہیں کہ نائلہ کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹی ہے یا نہیں عفت جیسی اچھی لڑکی کے ساتھ برا نہیں ہونا چاہیے' شاید معراج کی ماں بنیں اس کے لیے مشکلات کھڑی کریں۔

"روشن لمحہ" سمیرا غزل صدیقی جی ٹھیک کہا آپ نے جب انسان میں ایمان داری ختم ہو جائے تو برکت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ بالآخر نادیہ کی دعائیں رنگ لائیں اور رشید سدھر گیا۔

"کچھ موتی چنے" میں ثریا شاہ' آسیہ مرزا' سیدہ نسبت زہرا کا انتخاب اچھا لگا۔۔۔ کرن کرن خوشبو پورا سلسلہ لاجواب تھا۔ "یادوں کے دریچے" سے روبینہ صدف' صبا ایشال' رضوانہ وسیم کی شاعری دل میں اتر گئی۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" اقصیٰ ناصر' روبی' روبینہ یاسمین' حنا کرن' صائمہ سلیم اور صبا سلیم کے اشعار بے حد پسند آئے۔ "کرن کا دسترخوان" لاجواب تھا۔ "حسن و صحت" مائی موسٹ فیورٹ سلسلہ ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اتنے زیادہ فائدے ہوتے ہیں کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں' اب کی بار تلوں کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔

"مسکرائی کرنیں" میں مصباح' غزل' حیا اور سنعیہ نے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیں۔ "نہلے پہ دہلا" ذوالقرنین جی کے خوب صورت جواب پسند آئے۔ نامے میرے نام میں منزہ نقی نقوی علی میرے تبصروں کا پسند کرنے کا شکریہ۔ معیز بھائی کے لیے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ خوب صورت کرن کتاب یوگا کے حوالے سے لاجواب تھی۔

ج ۔ طاہرہ ملک! کرن پر تبصرے کا بہت شکریہ۔۔۔ سعدیہ ملک اور جنید ملک کو ہماری طرف سے بھی سالگرہ مبارک ہو۔

### صباء عیشل۔۔۔ فیصل آباد

ج ۔ صباء عیشل! آپ نے کرن پر اپنی رائے کا اظہار کیا شکریہ۔ ہم کرن کے چاہنے والوں کے خط ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالتے۔ آپ کا خط ہمیں موصول ہی نہیں ہوا تھا۔ اور اس ماہ بھی آپ کا خط ہمیں دیر سے موصول ہوا' جس کو ہم شائع نہیں کرسکے۔ آئندہ آپ ذرا کوشش کرکے جلدی بھیجے گا' تاکہ آپ کا خط ہماری محفل کی زینت بن جائے۔